اکیسویں صدی کے منتخب اردو ناولوں میں مقامیت: مابعد جدیدیت کے تناظر میں

Localism into Selective Novel of Twenty First century:
In The Context of Post Modernism

(تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اردو)

مقالہ نگار: نعمان نذیر

رجسٹریشن نمبر:79-FLL/PHDURD/S20

نگران: ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

شعبۂ اردو

کلیہ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

اقرار نامہ

میں، نعمان نذیر، رجسٹریشن نمبر 79-FLL/PHDURD/S20، حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ مقالہ **"اکیسویں صدی کے منتخب اردو ناولوں میں مقامیت: مابعد جدیدیت کے تناظر میں"** میں پیش کیا گیا کام ذاتی ہے اور بین الا قوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد کے پی ایچ۔ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عزیز ابن الحسن کی نگرانی میں کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔ نیز یہ کہ مقالہ ہذا سرقہ سے پاک ہے۔

نعمان نذیر

پی ایچ ڈی سکالر

بین الا قوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

صداقت نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ نعمان نذیر، رجسٹریشن نمبر79-FLL/PHDURD/S20، سکالر بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد، اپنا مقالہ بعنوان "**اکیسویں صدی کے منتخب اردو ناولوں میں مقامیت: مابعد جدیدیت کے تناظر میں**"، میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ تحقیقی و تنقیدی حوالے سے پی ایچ ڈی کے معیار کے مطابق ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ مقالہ جانچ کے لیے ممتحنین کو بھجوا دیا جائے۔

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر، (ریٹائرڈ) شعبہ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

ABSRACT

Postmodernism rejects the concept of epic narratives. She encourages small cultural groups to compete with larger group narratives. All narratives that have been suppressed by these larger narratives seek to raise their voice. It is from this point of view that this paper is drawn from.

In the first chapter, along with the discussion of post-modernism and the introduction of localism, the relationship between localism and Urdu literature and Urdu novel localism, how localism is presented in Urdu novels is examined. In the second chapter, the twenty-first century. The social aspect of localism has been described in the selected Urdu novels of Below this, the external aspects of the economic nature, Bodo Bash, lifestyle and locality in the novels have been examined. Below this, the nature and expression of these elements have also been analyzed. The rhetorical aspect of localism in selected Urdu novels, in which religious, cultural and political narratives have been examined. Their presence and nature in different novels have also been examined to determine which element is abundant in which novel. In the fourth chapter, the historical aspect of localism in these novels of the 21st century has been searched and analyzed. The nature of the effects of local history on the novels, an important event has been examined. Historical events have made local people different from other nations. Correlations are also analyzed. In the fifth chapter, the elements of localism in these novels are compared. Similarities in Local Elements Which elements are common in all novels and what is their nature in the novels. In the second part, the differences in local elements are also described, it also identifies and explains elements that are different from one another. are present in the novel with individuality.

As a whole, according to Markum al-Haraf, these novels have a wealth of different elements of locality. The novelists have richly explained their cultural and small narratives in the narration of their local narratives through their local characters. The concept of modernity is evident in localism in practice.

فہرست ابواب

باب اول:	مابعد جدید تنقید میں مقامیت کے مباحث	۱۰
	حوالہ جات	۶۲
باب دوم:	اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں مقامیت کا سماجیاتی پہلو	۶۶
	حوالہ جات	۱۶۴
باب سوم:	اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں مقامیت کا بیانیاتی پہلو	۱۷۲
	حوالہ جات	۳۰۱
باب چہارم:	اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں مقامیت کا تاریخی پہلو	۳۱۰
	حوالہ جات	۳۵۱
باب پنجم:	اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں موجود عناصر کا تقابل	۳۵۳
	حوالہ جات	۳۸۹
ماحصل		۳۹۲
نتائج		۳۹۶
کتابیات		۳۹۹

انتساب

امی جان کے نام(مرحوم)

جو بظاہر تو دور ہیں مگر مجھ میں

ہر دم شامل ہیں

اللہ تعالیٰ آپ پہ اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے۔ امین

حرفِ آغاز

تمام تعریفیں اس خالقِ کائنات کے لیے جس نے ہمارے دلوں کو ایمان کے نور سے روشن کیا۔ تمام تعریفیں اسی خالق ازل کے لیے کہ جس نے ہمیں علم کی دولت سے سرفراز فرمایا۔ شکر اس رب کائنات کا جس نے حضرت محمدؐ کا امتی بنایا۔

کہانی سے لگاؤ میرا فطری ہے۔ بچپن سے اس کا آغاز ہوا اور وقت کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ مزید گہرا ہوتا گیا۔ اردو ادب میں بطور طالب علم آیا تو اس کے ساتھ جڑت مزید مضبوط ہو گئی۔ ایم۔ اے کے دوران میں بھی ناول اور افسانہ پسندیدہ اصناف رہیں۔ یونیورسٹی آف سرگودھا میں ڈاکٹر ساجد جاوید جیسے اساتذہ سے اکتساب فیض کا موقع ملا تو افسانے پر سیر حاصل گفتگو نے جہاں بولنا سکھایا وہیں ذہن کی پرتیں بھی کھلیں اور خارج سے زیادہ داخل میں جھانکنے کا ہنر ہاتھ لگا۔

پی ایچ ڈی میں موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو پھر ذہن افسانے اور ناول کی طرف ہی گیا۔ بہر حال ناول کا انتخاب ڈاکٹر طاہر نواز صاحب کی مدد سے طے پایا۔ اردو ناول کی مقامیت کو مابعد جدید تصورات کے تحت پرکھنا ایک دلچسپ اور مشکل مرحلہ بھی تھا۔ اس ضمن میں تحقیقی کام نہ ہونے کے مترادف ہے۔ زیرِ نظر مقالہ مابعد جدید تصور کے تحت اکیسویں صدی کے ناولوں کو پرکھنے کی ایک کاوش ہے۔

مابعد جدیدیت گم شدہ اور معدوم ہوتی ثقافتوں کی بازیافت کی بات کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت مہابیانیوں کے تصور کو رد کرتی ہے۔ وہ بڑے گروہوں کے بیانیے کے مقابلے میں چھوٹے سے ثقافتی گروہوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ایسے تمام بیانیے جو ان بڑے بیانیوں کی وجہ سے دب گئے۔ ان کی آواز کو بلند کرنے کی خواہاں ہے۔ اکیسویں صدی کے منتخب ناولوں کا مابعد جدیدیت کے اسی نقطہ نظر سے اس مقالے میں مطالعہ کیا گیا ہے۔

باب اول میں مابعد جدیدیت کے مباحث اور مقامیت کے تعارف کے ساتھ ساتھ مقامیت اور اردو ادب کا تعلق اور اردو ناول میں مقامیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو ناولوں میں کس طرح سے مقامیت کی پیشکش کی گئی ہے۔ باب دوم میں اکیسویں صدی کے منتخب اردو ناولوں میں مقامیت کے سماجی پہلو کی پیش کش کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کی ذیل میں ناولوں میں موجود معاشی نوعیت، بود و باش، رہن سہن اور مقامیت کے خارجی پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کی ذیل میں ان عناصر کی فروانی/نوعیت اور بیان کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ باب سوم اکیسویں صدی کے منتخب اردو ناولوں میں مقامیت کا بیاناتی پہلو جس میں مذہبی ثقافتی اور سیاسی بیانیوں کو نشاندہی اور تجزیہ کیا ہے۔ مختلف ناولوں میں ان کی موجودگی اور نوعیت کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ کس ناول میں ان میں سے کس عنصر کی فراوانی ہے۔ باب چہارم میں

اکیسویں صدی کے ان ناولوں میں مقامیت کے تاریخی پہلو کی نشاندہی ور ان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ناولوں پہ اپنی مقامی تاریخ کے اثرات کی نوعیت،اہم واقعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔تاریخی واقعات سے مقامی لوگوں کا کسی دوسری قوم سے روابط کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔پانچویں باب میں ان ناولوں میں موجود مقامیت کے عناصر کا تقابل بیان کیا گیا ہے۔مقامی عناصر میں موجود ان عناصر کا تجزیہ کیا گیا ہے۔جو سب ناولوں میں مشترک ہیں۔دوسرے حصے میں مقامی عناصر میں موجود اختلافات کو بھی بیان کیا گیا۔ایسے عناصر کی بھی نشاندہی اور وضاحت کی گئی ہے جو کسی ایک ناول میں انفرادیت کے ساتھ موجود ہیں۔

مجموعی طور پر تحقیق سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان ناولوں میں مقامیت کے مختلف عناصر کی فراوانی ہے۔ناول نگاروں نے اپنے مقامی بیانیوں کے بیان میں اپنے ان ثقافتی اور چھوٹے بیانیوں کی بھرپور وضاحت اپنے مقامی کرداروں کے ذریعے سے کی ہے۔جس سے مابعد جدیت کا تصور مقامیت عملی طور پہ واضح دکھائی دیتا ہے۔

پیشہ ورانہ زندگی کی مصروفیات کے ساتھ بھی ادبی ذوق جاری رہا۔پی۔ایچ۔ڈی کی تمنا مجھ سے زیادہ شاید میرے والدین کو تھی۔والدہ کا اصرار اس ضمن میں سب سے زیادہ تھا۔جب داخلہ ہوا تو سب سے پہلے ان کو کال کر کے بتایا یہ الفاظ لکھتے ہوئے قلم چلانا مشکل ہے۔ان کو قدرت نے زیادہ وقت نہ دیا۔اب تقدیر کا لکھا سمجھ کر ماننے کے علاوہ اور چارہ بھی نہیں۔۔۔جانے سے چند روز قبل انہوں نے کہا تھا" میری زندگی میں تمہاری پی ایچ ڈی مکمل نہیں ہونی "۔وہ چلی گئیں پھر واقعی بہت مشکل ہو گیا۔اس دوران سب سے زیادہ نانا نے یہ بات بار آور کرائی کہ "یار تیری ماں کی بہت خواہش تھی مکمل کرا سے جلد از جلد" آج اللہ کے فضل سے اور میری ماں کی دعا سے یہ مرحلہ اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے۔کاش کا لفظ ساتھ رہے گا مگر یہ سوچ کہ کسی قدر تسلی ہو رہی ہے کہ ان کے جانے کے بعد ہی سہی مگر یہ مرحلہ بہر حال آج طے کرنے کے قابل ہوا ہوں۔

میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گا اپنے نگران ڈاکٹر عزیز ابن الحسن صاحب کا جنھوں نے میرے لیے آسانیاں پیدا کیں۔ بہت ہی عمدہ شفیق و مہربان استاد صدر شعبہ اردو ڈاکٹر سائرہ بتول صاحبہ ، ڈاکٹر کامران عباس کاظمی، ڈاکٹر غلام فریدہ، محمد اسحاق خان، میرے وہ دوست ، احباب جنھوں نے کسی بھی حوالے سے مقالہ کے لیے کسی بھی حوالے سے مدد کی ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ خصوصی طور پہ ڈاکٹر سدرہ طاہر ، سابق پرنسپل امجد پرویز (مرحوم)، محمد حفیظ خان (ناول نگار) اور تمام دعا گو احباب کا تہ دل سے شکریہ۔ خصوصاً (ہاجرہ) ہالہ امینہ علی جن کی علمی دوستی اور پر خلوص دعائیں ساتھ رہیں۔

اس مقالے کے دوران سب سے زیادہ رہنمائی استاد محترم ڈاکٹر طاہر نواز صاحب کی رہی جو قدم قدم پہ میری رہنمائی کرتے رہے۔میرے ابو اور بھائی کا بھی شکریہ کہ جنہوں نے میرے حصے کے کام کر کے میرے لیے آسانیاں

پیدا کیں۔ان کی بدولت میں آج یہاں تک پہنچا ہوں۔میری بیگم بھی شکریے کی حق دار ہے جس کے حصے کا وقت بھی میری کتابوں کو ملا۔ اللہ تعالٰی میرے علم و عمل میں مزید اضافہ فرمائے۔آمین

نعمان نذیر

باب اول:

مابعد جدید تنقید میں مقامیت کے مباحث

1۔1 تعارف

مابعد جدیدیت:

مابعد جدیدیت کسی مخصوص نظریہ یا تصور تک محدود نہیں ہے۔ یہ مختلف تصورات اور خیالات کی آماجگاہ ہے۔ یہ کسی مخصوص شعبے کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ مختلف شعبوں کا احاطہ کرتی ہے۔اس کی ذیل میں بیک وقت کئی شعبے آتے ہیں۔ان میں ادب، آرٹ، ثقافت، فن تعمیر، مذہب، موسیقی جیسے متنوع شعبے شامل ہیں۔اس میں مختلف تفکری رویے شامل ہیں۔ یہ مرکزیت کی قائل نہیں ہے۔اس ضمن میں متعدد تصورات نے مابعد جدیدیت کو ایک نظریے کا روپ عطا کیا ہے۔مابعد جدیدیت کی اصطلاح اور آغاز کے بارے میں مشہور مورخ اور دانشور آرنلڈ ٹوائن بی کی تصنیف The study in History vol.8 کا حوالہ معتبر مانا جاتا ہے۔اس نے اپنی تصنیف میں جو 1947ء میں شائع ہوئی ۔ جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال اور ثقافتوں کے ملاپ Multi culturalism کی بڑھتی اہمیت کے پیش نظر مابعد جدیدیت یعنی post Modernism کی اصطلاح استعمال کی۔ مابعد جدیت دراصل جدید انسان کے جدید دنیا میں پیدا ہونے والے مسائل کے بعد اٹھنے والی آواز ہے ۔جدید سائنسی مشینوں سے مزین زندگی نے سہولتوں کے ساتھ ساتھ بہت سے دکھوں کا بوجھ بھی پیدا کر دیا ہے۔فرد ایک طرف اپنے اصل سے کٹ رہا ہے تو دوسری طرف بین الاقوامی سطح پہ جڑنے کا بھی دعویدار ہے۔اس جڑت میں بھی وہ پر سکون نہیں۔وہ اپنے اصل کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ بالآخر وہ اپنے اصل کی طرف رجوع کرنے پہ آمادہ ہوتا ہے۔عافیت اسی میں تلاش کرتا ہے کہ کسی طرح اپنے اصل کی جانب لوٹ جائے یا جڑ جائے۔مابعد جدیدیت اس کے اس عمل کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔مابعد جدیدیت بڑی طاقتوں کے غلبے میں چھوٹی ثقافتی اکائیوں کے ختم ہونے کے تصور کے خلاف علم بغاوت بلند کرتی ہے تاکہ فرد کو اصل شناخت تک رسائی مل سکے۔وہ ان قائم شدہ تصورات کی بھی نفی کرتی ہے جو جدیدیت نے قائم کیے ہیں۔مابعد جدیدیت طے شدہ حدبندیوں کے خلاف ہے۔ یہ معنی کی تکثیریت پہ زور دیتی ہے۔

مابعد جدیدیت کی اصل وضاحت J.F Lytord نے اپنی تصنیف "The post Modern condition" میں کی۔لیوتار کا شمار مابعد جدیدیت کے اولین معماروں میں ہوتا ہے۔اس کا تعلق فرانس سے تھا۔

مابعد جدیدیت کے مختلف پہلوؤں ثقافت، آرٹ، مہابیانیے کے نظریات کی وضاحت کی ہے۔ لیوتار نے ہی مہابیانیے کا تصور پیش کیا۔ جسے مابعد جدیدیت میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بقول مہابیانیوں نے اصل حقائق کا قلع قمع کیا ہے۔ ان کی ذیل میں آرٹ، ثقافت، تمدن اور روایت شامل ہیں۔ ان کے تحت چھوٹے گروہوں کو حاشیے میں دھکیلا گیا ہے۔ مابعد جدیدیت عالمگیریت کے مقابلے میں مقامیت کا تصور پیش کرتی ہے۔ مقامیت عالمگیریت کے زیر اثر اپنی شناخت گم کر رہی ہے۔ مابعد جدیدیت نے مقامیت کا تصور پیش کر کے مقامی ثقافتوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ان کو اپنی آواز کو طاقتور بنانے پہ بھی زور دیا ہے۔ مقامی نوعیت کی ثقافتیں رسم ورواج چھوٹے پیمانے پہ قائم ہونے والی صنعتیں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کے فروغ کی بات کرتی ہے۔

> "مقامیت سے مراد عالمی یا مرکزی ماڈلز پر مقامی کمیونٹیز اور چھوٹے پیمانے کی معیشتوں کی ترجیح یا ترجیح ہے۔ یہ تصور مقامی وسائل، ثقافت اور شناخت کی قدر پر زور دیتا ہے، لوگوں کو اپنی برادریوں میں سرمایہ کاری کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ مقامیت اکثر ان تحریکوں میں ظاہر ہوتی ہے جو مقامی کاروباروں، پائیدار طریقوں، اور نچلی سطح کے اقدامات کو فروغ دیتی ہیں جو رہائشیوں کو بااختیار بناتے ہیں۔ حامیوں کا استدلال ہے کہ مقامی معیشتوں کو فروغ دینے سے لچک میں اضافہ، سماجی بندھنوں میں اضافہ اور ماحولیاتی اثرات میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔ یہ زیادہ متنوع اور ثقافتی لحاظ سے امیر معاشرے کی وکالت کرتے ہوئے اکثر عالمگیریت سے وابستہ ہم آہنگی کو چیلنج کرتا ہے۔ تاہم، مقامیت شہری اور دیہی برادریوں، یا بڑے پیمانے پر صنعت کے حامیوں اور چھوٹے پیمانے پر مقامی پیداوار کو ترجیح دینے والوں کے درمیان تناؤ کو بھی بھڑکا سکتی ہے۔ بالآخر، مقامیت پائیداری، کمیونٹی کی شمولیت، اور بڑھتی ہوئی ایک دوسرے سے جڑی ہوئی دنیا میں جگہ کی اہمیت کے بارے میں بات چیت کو فروغ دیتی ہے۔"(1)

مابعد جدیدیت کے عناصر کی تفصیل سے قبل مشرقی و مغربی ماہرین کی آراء کی روشنی میں مابعد جدیدیت کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔ مابعد جدیدیت کا تصور مغرب سے آیا۔ مغربی مفکرین نے اس کے حوالے سے مختلف آراء پیش کی ہیں۔ مابعد جدیدیت کے تصور کے آنے کے بعد سے اب تک مختلف ماہرین نے اس کے حوالے سے متنوع رائے قائم کی ہیں۔ اس حوالے سے چند مغربی اور مشرقی آراء کو سامنے رکھتے ہوئے اس کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے چند آراء ملاحظہ ہوں:۔

یونیورسٹی آف لٹریری ٹرمز:

"Post Modernism : A general (and sometimes controversial) term used to refer to changes , developments and (and are

taking place) in literature ,art, music, or chitecture, philosophy ,etc(2)"

مابعد جدیدیت کو بعض اوقات متنازع بھی کہا جاتا ہے۔ جس کی وجہ اس کے مختلف نظریات ہیں۔ مندرجہ بالا تعریف کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہاں بھی مابعد جدیدیت کو بعض نظریات کی بنا متنازع کہا جاتا ہے مگر مابعد جدیدیت کا اصل منشا زندگی اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں مثلاً ادب، فن موسیقی، فن تعمیر اور فلسفہ میں طے شدہ بیانیوں کے برعکس معنی کی تکثیریت اور نئے مفاہیم کی تلاش ہے۔ مابعد جدیدیت اس رویے کو رد کرتی ہے جو مہابیانیوں کے نتیجے میں قائم ہوئے ہیں۔ وہ اصل حقائق کی متلاشی ہے اور کسی طے شدہ چیز کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔

Harvey David:

"Postmodernity can mean a personal response to a postmodern society, the conditions in a society which make it postmodern or the state of being that is associated with a postmodern society as well as a historical epoch. In most contexts it should be distinguished from postmodernism, the adoption of postmodern philosophies or traits in the arts, culture and society."(3)

مابعد جدیدیت کا مطلب ایک ایسا رویہ بھی ہو سکتا ہے جو کسی فرد کا ذاتی رد عمل ہو۔ یہ رد عمل ان حالات کے تناظر میں وقوع پذیر ہو گا جب کسی معاشرے کے حالات جدیدیت سے متاثر ہوتے دکھائی دیں گے۔ اس کی تاریخ، اس کا فنون ثقافت اور معاشرے کے دوسرے عناصر جب اپنی وقعت کھوتے محسوس ہوں گے یا جدیدیت کی آڑ میں ان کا قلع قمع کیا جا رہا ہو گا تو ایسے حالات میں مابعد جدید رویہ سامنے آ سکتا ہے۔ مابعد جدیدیت کی جس طرح سے مختلف تعریفیں سامنے آئی ہیں اس طرح سے یہ کسی فرد کا ذاتی خیال یا نظریہ بھی ہو سکتا ہے۔ جس کا مقصد اپنی ثقافتی پہچان اور انفرادیت کو سامنے لانا بھی ہو سکتا ہے۔ ہنری ڈیوڈ کے بیان کے تناظر میں دیکھا جائے تو مابعد جدیدیت ایک رد عمل کے تصور کے طور پہ بھی سامنے آتا ہے۔ اس کی ذیل میں انہوں نے فنونِ لطیف، ثقافت اور معاشرے کے دوسرے عناصر شامل ہوتے ہیں۔

Akbar S Ahmed :

"In order to discover Postmodernism one must look for richness of meaning rather than clarity of meanings;avoid choices between black and white: either or and accept both

and evoke many levels of meaning and combination of focus:and attempt self discover through self knowledge."(4)

مابعد جدیدیت متن کے کسی طے شدہ معنی کو تسلیم کرنے کی قائل نہیں ہے۔وہ اس بات کی قائل ہے کہ معنی نئے سے نئے تلاش کیے جائیں۔اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ معنی کی تکثیریت کے نقطہ نظر کے تحت مابعد جدیدیت متن کو معنی کی قید سے آزاد کرتے ہوئے نئی سے نئی جہتیں سامنے لانے کی قائل ہے۔اس نظریے کے پس پردہ یہ بھی نقطہ مد نظر ہے کہ ایسے نظریات جو بڑی ثقافتوں یا بڑے بیانیوں کی طرف سے مسلط کردہ ہیں ان کی نفی بھی ہو جائے۔اس سے اصل حقائق کی تلاش میں آسانی بھی ہو۔اس طرح سے جہاں معنی کی بندش توڑنے سے نئی جہات سامنے آتی ہیں وہیں اصل حقائق کی تلاش میں بھی یہ طریقہ کار گر ثابت ہوتا ہے۔

مابعد جدیدیت کے تعلق سے اردو دانشوروں اور نقادوں کی آراء کو ملحوظ خاطر رکھنا بھی ضروری ہے۔ دانشوروں اور ناقدین نے مختلف نقطہ نظر سے مابعد جدیدیت کی تعریف کی ہے۔

گوپی چند نارنگ کے مطابق:

حقیقت یہ ہے کہ آزاد تخلیقیت اور آزاد مکالمہ (مابعد جدیدیت) نئے عہد کا دستخط ہے۔"(5)

مابعد جدیدیت تخلیق کار اور قاری دونوں کو آزادی دیتی ہے۔تحریروں میں نئے موضوعات کا آنا، قاری کو بھی معنی کی تفہیم کی آزادی دیتی ہے۔پرانی بندشوں کو توڑ کر نئے زاویوں سے دیکھنے کا کام بھی مابعد جدیدیت کرتی ہے۔مابعد جدیدیت کو بعض نقاد ہنوز ایک تھیوری ماننے سے انکاری ہیں۔ان کے نزدیک یہ ایک فکری رجحان ہے۔یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے کہ مختلف دانشوروں اور فلسفیوں نے اس حوالے سے اپنی رائے دی ہے۔مابعد جدیدیت کسی خاص شعبے کو نہیں بلکہ مختلف شعبوں کو اپنے لپیٹ میں لیتی ہے۔مختلف شعبوں کے حوالے سے اس کے ہاں نظریات موجود ہیں۔

قدوس جاوید لکھتے ہیں:

"مابعد جدیدیت عام مفہوم میں تھیوری نہیں اور نہ تحریک ہے بلکہ ایک نئی صورت حال ہے۔جس کی تشکیل متضاد و مختلف دانشورانہ لہروں کے ان گنت دائروں سے ہوئی ہے۔یہ صورت حال اپنے اندر متعدد متنوع شعبوں کے مثبت و منفی امتیازات اور نامساعدتوں (inadequacies) کو سمیٹے ہوئے ہے۔"(6)

مابعد جدیدیت ادب، کلچر، فنون لطیفہ کے شعبوں کو متاثر کرتی ہے۔ادب میں مابعد جدید تصور سے مصنفین اور قاری کے لیے نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔معنی آفرینی کے لحاظ سے یہ قاری کو ذہنی آزادی فراہم کرتی ہے۔متن کی قرات میں قاری کو آزادی فراہم کرتی ہے۔طے شدہ اصولوں کے برعکس نئے اصول وضع کرتی ہے جس میں تبدیلی کی گنجائش بھی باقی رہتی ہے۔

ضمیر بدایوانی کے مطابق:

"مابعد جدیدیت ایک تہذیبی، تخلیقی اور فلسفیانہ نقطہ نظر ہے۔ جس کے اثرات ادب اور کلچر اور فنون لطیفہ پر واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ ادب کسی ادیب کے لئے مابعد جدید نقطہ نظر اپنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"(7)

مابعد جدیدیت کا اصل خاصا مہابیانیے کا رد کرنا ہے۔ وہ قائم شدہ تصورات پہ چلنے کی قائل ہے۔ وہ ایسے بیانیوں کے تصور کو رد کرتی ہے جو چھوٹے بیانیوں کا قلع قمع کرتے ہیں۔ ان کے تصورات نے مقامی ثقافتوں کو دبا دیا ہے۔ وہ ہر نئے تصور کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت متنوع شعبوں کا احاطہ کرتی ہے اور بیانیے کے لحاظ سے نہ صرف قائم شدہ تصورات بلکہ وہ کسی بھی حتمی بیانیے کی قائل نہیں۔ اس میں معانی آفرینی کی گنجائش رہتی ہے۔

ناصر عباس نیر مابعد جدیدیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"مابعد جدیدیت کسی ایک اور مرکزی بیانیے کی بجائے متعدد، متنوع معنی اور بیانیوں کا تصور پیش کرتی ہے۔ ان میں سے کوئی بیانیہ حتمی اور مطلق نہیں ہے۔ ہر بیانیے کی معنویت اس کے مخصوص تناظر کے اندر ہے۔"(8)

مابعد جدیدیت کے تعارف میں بھی یہ بات زیر بحث آئی ہے کہ مابعد جدیدیت متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ ایک آزاد ذہنی فکر کا بھی نام ہے جو چیزوں کو طے شدہ معیارات سے ہٹ کے پرکھنے کی بھی قائل ہے۔ اس لئے وہ متن کی تفہیم کے لئے معنی کی قید سے بھی اسے آزاد کر دیتی ہے۔

اقبال آفاقی کے مطابق:

"مابعد جدیدیت کثیر الجہت ثقافتی تحریک ہے۔ یہ تحریک گذشتہ کئی سو سال سے یورپی سماجیات میں رائج تفکر کے غالب دعوؤں اور اصولوں کو شک کی نگاہ سے دیکھ اور پرکھ رہی ہے۔ یہ وہ مفروضے اور دعوے ہیں جنھیں جدیدیت کے دور میں مرکزیت حاصل رہی ہے۔"(9)

مابعد جدیدیت کی ان تعاریف کی روشنی میں یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ مابعد جدیدیت ایک ایسا فکری رجحان ہے۔ جو نہ تو ماضی سے مکمل ناطہ توڑتا ہے اور نہ ہی اس کی اندھی تقلید کا قائل ہے۔ مابعد جدیدیت دوسرے لفظوں میں پرانے معاملات کی نئے انداز میں بازیافت کا نام ہے۔ مابعد جدیدیت نئے دور کے تقاضوں کے مطابق پرانی روایت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دیکھنے کی قائل ہے۔ مابعد جدیدیت قائم شدہ تصورات کو از سر نو پرکھنے کی قائل ہے۔ مابعد جدیدیت کی کوئی سکہ بند تعریف کرنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ اس کا دائرہ کار خاصا وسیع ہے۔

مغرب میں مابعد جدیدیت کو فکری سطح پہ برتنے والوں میں لیوتار، فریڈک جیمسن اور ژاں بودیلا کے نام نمایاں ہیں۔ انہوں نے متن کو معنی کی وحدت سے آزاد کرا دیا۔ فوکو نے انسانی فکر کو ثقافتی تشکیل قرار دیا ہے۔ فوکو اپنی

فکر کو لامرکزیت کی طرف جوڑتا ہے۔ فوکو اپنے مطالعے اور فکر کو لامرکز رکھتا ہے۔ وہ کسی مخصوص مرکز سے نہیں جڑتا۔ لیوتار بھی مہابیانیے کا تصور دیتے ہوئے بڑے ثقافتی گرہوؤں کی آواز کو رد کرتا ہے۔ مابعد جدیدیت کے احساس کو مکمل طور پہ سمجھنے کے لیے اس کے امتیازات یا عناصر کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ جو مابعد جدیدیت کے امتیازی اوصاف ہیں۔ مابعد جدیدیت کے عناصر کی ذیل میں مندرجہ ذیل اہم نکات ہیں:۔

مابعد جدیدیت کے عناصر:

(الف) مہابیانیے (Meta Narrative)

مابعد جدیدیت کا اہم تصور مہابیانیے کا رد تھا۔ مابعد جدیدیت نے قائم شدہ تصورات کو شک کی نگاہ سے دیکھا۔ بڑے بیانیے کے مقابلے میں چھوٹے بیانیے کو رائج کیا۔ یوں بڑے ثقافتی گروہوں کے بجائے چھوٹے ثقافتی گروہوں کی آواز کو بلند کیا گیا۔ بڑے بیانیے کی آڑ میں چھوٹے ثقافتی گروہوں کی آواز کو حاشیے میں دھکیلا گیا۔ جدید دنیا میں گلوبل ویلیج کی اصطلاح استعمال کر کے (Meta Narrative) مہابیانیے کو استعمال کیا ہے۔ اس مہابیانیے کے تصور کو بھی مخصوص گروہوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جس میں اپنی ثقافت کی ترویج بھی شامل تھی۔ ایسے مہابیانیوں کو استعماری قوتوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا اور کسی طور پہ آج بھی کیا جارہا ہے۔ چند بڑی قوتیں اپنے تسلط کو برقرار رکھنے کے لئے ایسے حربوں کا استعمال کرتی ہیں۔

لیوتار J F Lytord نے سب سے پہلے مہابیانیے (Meta Narrative) کا تصور پیش کیا۔ اس کے نزدیک مہابیانیوں نے ہی اصل صداقتوں کو پس پشت ڈال کر حقیقت کو چھپایا۔ مہابیانیے کے بجائے چھوٹے ثقافتی گروہوں کی آواز کی حمایت کرتا ہے۔ لیوتار تکثیریت کا قائل ہے۔ مہابیانیے کا رد اس لیے کرتا ہے کہ ان مہابیانیوں میں کلی صداقتوں کو فراموش کیا جاتا ہے۔ مہابیانیوں کے ذریعے جہاں اپنے کلچر/ثقافت کی آواز کو بلند کیا جاتا ہے وہیں چھوٹی ثقافتوں میں موجود سچائیوں اور حقیقتوں کا قلع قمع کیا جاتا ہے۔ اس کے نزدیک ہماری ثقافت ہی ہماری پہچان ہوتی ہے۔

> "Lyotard point of departure is the demise of what he terms metanarrative, Simplifying to extreme .Identifine post modern as incredulity towards metanarratives.These metanaratives or grand narratives.These metanarratives supprosedly transcendent and universal truths that underpin

western civilization and that function to give that civilization objects legitimation".(10)

وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

"لیوتار کے مطابق دراصل ہماری ثقافت ہی ہماری زندگی کا پیمانہ ہے اور اسی ثقافت میں آج کے اثرات مرتب کرنے والے تمام ذرائع ہمارے کلچر کا حصہ بن گئے ہیں۔ایسی صورت میں انہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ لیوتار کی نگاہ میں سوسائٹی کے computerization کی جو صورت ہے وہ آج بدیہی ہے۔"(11)

مہابیانیوں کے تصور پہ غور کریں تو ان کا مفہوم تقریباً وہی ہے جو فوکو کے ہاں episteme کا ہے۔ مہابیانیے وہ بھی ہیں جو جدیدیت کے علمبرداروں نے قائم کئے۔ مابعد جدیدیت نے محض ان کی ضد میں تصورات پیش نہیں کئے بلکہ ان کے ہاں دلائل اور نظریات ملتے ہیں۔ مہابیانیوں کے تصور کو چیلنج کرتے ہوئے اصل حقائق کی بازیافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو بڑے فلسفیوں، مفکروں اور استعماری قوتوں نے قائم کر رکھے تھے۔ ان مہابیانیوں میں صداقتوں کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی مقاصد کو ملحوظ رکھنا زیادہ نمایاں تھا۔مابعد جدیدیت نے ان مسخ شدہ حقائق کی بازیافت کے لئے ان کو چیلنج کیا اور مہابیانیوں کا تصور پیش کیا۔ ناصر عباس نیئر اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"مابعد جدیدیت کسی ایک اور مرکزی بیانیے میں متعدد، متنوع بیانیوں کا تصور پیش کرتی ہے ان میں سے کوئی بیانیہ حتمی اور مطلق تناظر کے اندر رہے۔"(12)

مابعد جدیدیت کو ان تعریفوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو مابعد جدیدیت کسی ایک مرکزی بیانیہ کی قائل نہیں ہے۔ وہ متعدد بیانیوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔اس کا مہابیانیے کا تصور دراصل اس بات کی وضاحت ہے کہ قائم کردہ تصورات میں کچھ حقائق کو مسخ کر دیا جاتا ہے اور چھوٹے علاقائی یا چھوٹے بیانیوں کو اس میں مناسب نمائندگی نہیں ملتی، اس لیے وہ چھوٹی آوازوں کو بھی طاقتور بنانے کی خواہاں ہے تاکہ اصل حقائق کو سامنے لایا جاسکے اور چھوٹے علاقوں یا گروہوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی آواز کو طاقتور بنا کہ ان کے بیانیے کو بھی شامل کیا جاسکے۔

تکثیریت :(polarity of meanings)

تکثیریت کا نظریہ بیسویں صدی کے آغاز میں آیا۔اس نظریے کا کوئی طے شدہ بیانیہ نہیں بلکہ مختلف فلسفیوں نے اس کی احساس واضح کی ہے۔ یہ وسیع مفہوم کا حامل نظریہ ہے جو مختلف شعبوں سیاسیات، سماجیات، مذہب، ادب اور فلسفہ تک پھیلا ہوا ہے۔ فلسفے میں تکثیریت کے حوالے سے ولیم جیمز کا نام نمایاں ہے۔ یہ امریکہ سے تعلق رکھتا تھا۔اس نے تکثیریت کو فلسفے کے طور پر بھی پیش کیا۔ان کے مطابق دنیا مختلف حقیقتوں کا مجموعہ ہے کسی ایک حقیقت کو درست سمجھنا درست نہیں ہے۔

ادب کے تناظر میں تکثیریت کو دیکھا جائے تو تکثیرت مختلف ثقافتوں، طبقاتی، معاشرتی گروہوں/بیانیوں کو اہمیت دیتی ہے۔ وہ بڑی ثقافتوں کے بیانیے کے بجائے چھوٹے بیانیوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت کا نقطہ تکثیریت یکسانیت پیدا کرنے کا خواہاں ہے۔ یہ مختلف شعبوں، طبقوں، زبانوں، بولیوں اور رسم و رواج کو آواز دیتا ہے۔ اس نقطہ نظر میں ادب میں اسلوب کے متنوع انداز کی بھی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ لیوتار اس کے مختلف پہلوؤں اور عناصر کی وضاحت کرتا ہے۔ مہابیانیے کے تصور کے رد کے طور پر تکثیریت مختلف شعبوں کو بیانیے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ چھوٹے مقامی بیانیے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

> "لیوتار کا دعوی ہے کہ سیاسی دنیا میں کوئی مہابیانیہ یا برتر نظریہ موجود نہیں۔ سیاست کے میدان میں چھوٹے بیانیے کام کرتے ہیں جو اپنے محدود دائرہ کار کے اندر رہ کر مقاصد کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔ رولاں بارتھ نے استدلال کیا ہے کہ متون میں مرکزی معنویت کے تلاش اور اس کا انکشاف ایک فضول کاروائی ہے کیونکہ متن بہت سی توضیحات کا ماخذ ہوتا ہے۔ مابعد جدیدیت نے اس نقطہ نظر کو فروغ دیا ہے۔ یہ خیال بے بنیاد ہے کہ کوئی ایسی مرکزی حاکمیت سیاست اور دانش کے میدان میں موجود ہے جس کی پیروی سب پر لازم ہو۔ مابعد جدیدیت نے اس خیال کو محض فریبِ خیال قرار دیا ہے۔"(13)

ادب میں تکثیریت کا نظریہ یہ ہے کہ ادب بھی کسی بیانیے ثقافتی گروہ کی اجارہ داری زبان بیانیے یا سماجی حیثیت کے لوگوں اور کرداروں تک محدود نہیں ہو سکتا، مختلف زبانوں کے الفاظ ان کے مقامی کرداروں کے ضمن میں استعمال کیے جا سکتے ہیں جبکہ کسی مخصوص مقامیت کا بیان ہو گا تو اس کی اصلیت تبھی واضح ہو سکتی ہے جب اس کے تمام مقامی عناصر کی بھی وضاحت ہو گی۔ مابعد جدیدیت اسی نقطہ نظر کی قائل ہے۔ متن کی بات کی جائے تو مابعد جدیدیت میں متن کسی ایک معنی تک محدود و مقید نہیں رہ سکتا اس کے معنی اور مفاہیم میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ مابابعد جدیدیت اس میں تکثیریت کی قائل ہے۔

متن کو کسی مخصوص معنی یا مفہوم تک محدود و مقید نہیں رکھا جا سکتا بلکہ وقت اور حالات کے مطابق اس کی تشریح اور تعبیر ہوتی رہتی ہے۔ مابعد جدیدیت اس لیے مقامیت کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ چھوٹے بیانیوں کی حوصلہ افزائی کر کے وہ مقامی نوعیت کے بیانیوں کی طرف رجوع اور ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

> "مابعد جدیدیت ہر درجہ مقامی مزاج رکھتی ہے۔ وہ مختلف ضابطوں نظاموں کے درمیان سریع التحلیل ہونے کا وصف رکھتی ہے۔ لیوتار کے مطابق ان مختلف ضابطوں نظاموں صداقتوں کا احترام اور ان کے درمیان خود کو بدل لینے کا وصف ہی دراصل pluralism ہے۔"(14)

لیوتار کے اس بیان سے اس کے ہاں تکثیریت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیوتار ما بعد جدیدیت کے علمبرداروں میں سے ایک ہے۔ وہ مقامیت کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جس سے یکسانیت کا تصور ابھرتا اور اکہرا پن

معدوم ہونے لگتا ہے۔ ہر شے کی چمک دمک باقی رہتی ہے۔ پہلے سے طے شدہ تصورات کا جمہور ٹوٹتا ہے اور ضمنی حقیقتیں بھی سامنے آتی ہیں۔ تکثیریت کے نقطہ نظر سے مقامی ثقافتوں کے بیانیوں کو بھی اہمیت ملتی ہے۔ان کا معدوم ہوتا تصور جو عالمگیریت اور جدیدیت کی زد میں آیا اس کی باضیافت ہوتی ہے ۔

"مابعد جدید انداز فکر ادبی متن کی معانی آفرینی اور اس کے تسلسل کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔یعنی متن کو معنی کی وحدت سے نجات دلاتا ہے بلکہ متن کو آزاد کر دیتا ہے۔"(15)

مابعد جدیدیت مرکزیت کے بجائے لامرکزیت کی قائل ہے ۔ معنی کی تکثیریت بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ چھوٹے بیانیوں کی طرف انحراف سے ادب کی اصناف میں مختلف مقامی ثقافتوں کا بیان واضح ہوا۔ادیبوں نے اپنی علاقائی ثقافتوں کو بھی ادب میں شامل کر کے ادب کی معنوی اور موضوعاتی وسعت کو بڑھایا۔ مختلف نظریات کے حامل ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اردو ادب کی بات کی جائے تو اس نقطہ نظر سے مختلف اصناف میں کام دکھائی دیتا ہے ۔ مختلف مقامی ثقافتوں کی طرف رجحان نمایاں ہوا اور اکیسویں صدی میں اس میں روز افزاں اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔

مقامیت : Localism

مقامیت کا لفظ عربی زبان کے لفظ مقام سے نکلا ہے۔ جس کے معنی جگہ یا ٹھکانہ ہیں۔ لغوی طور پر مقامیت کا مطلب ہے کسی خاص جگہ یا مقام سے تعلق رکھنے والی چیز۔ادبی اصطلاح میں مقامیت کو دیکھا جائے تو مقامیت سے مراد کسی خاص علاقائی ثقافت، جغرافیہ اور مقامی نوعیت کی ثقافت جس میں مخصوص رسم و رواج بیان کیے گئے ہوں۔

مقامیت کے لیے localism یا localization کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے ۔ مقامیت سے مراد ایسی علاقائی شناخت یا ثقافت جو اپنی انفرادیت کے ساتھ موجود ہو۔ایسی علاقائی شناخت جس کی اپنی اہمیت ہو۔ جس کے اوصاف اور اس کے عناصر اس کو اپنی مخصوص پہچان عطا کرتے ہوں۔

کیمبرج ڈکشنری میں مقامیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

The idea that people should have control our what happens in their local area that local businesses should be supported and the differences between places should be respected(16).

اس تعریف کے مطابق لوگوں کو اپنے مقامی علاقے میں جو کچھ ہوتا ہے اسے کنڑول کرنا چاہیے کہ مقامی کاروبار کو سپورٹ کیا جانا چاہیے اور جگہوں کے درمیان فرق کا احترام کیا جانا چاہیے۔ مقامی علاقوں ان کی مصنوعات اور پہچان کی اہمیت کو بار آور کیا گیا ہے۔ مقامیت ثقافت کی اکائی ہے۔ مقامیت کے عناصر میں مذہب، ثقافت، رسم و رواج

،سیاست ،تاریخ،آرٹ،ادب اور فن تعمیر شامل ہیں۔ان تمام عناصر میں مقامیت کی انفرادیت دکھائی دیتی ہے۔جو اسے دوسری مقامی ثقافتوں سے الگ کرتی ہے۔مقامیت کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

"مقامیت سے مراد وہ طرزِ فکر، عمل یا اظہار ہے جو کسی مخصوص علاقے ثقافت یا زبان سے جڑا ہو اور جس میں مقامی روایت،احساس اور شناخت کی جھلک نمایاں ہو۔"(17)

مقامیت کا ادبی تصور بھی اس سے تعبیر شدہ ہے۔ادب میں ادیب کسی خاص مقام،علاقے کی ثقافت کو بیان کرے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ مقامیت کے نقطہ نظر کا حامل ہے۔اردو ادب میں اکیسویں صدی میں اس رجحان میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ مصنفین اپنے آبائی علاقوں یا چھوٹی ثقافتوں کو ناولوں میں بیان کر رہے ہیں۔ادب میں مقامیت کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ :

"ادب میں مقامیت کا مطلب ہے کہ تخلیق کار اپنے گردونواح کی معاشرت،بول چال،رسم و رواج اور مسائل کو اس انداز سے پیش کرے کہ وہ مقامی تہذیب کی عکاسی کرے۔"(18)

دور حاضر میں ادیبوں نے بڑے بیانیوں کے بجائے چھوٹے،علاقائی بیانیوں کو ادب کا حصہ بنایا ہے۔ناول جیسی صنف جو زیادہ جزیات نگاری اور طویل کہانی کے حامل ہوتی ہے۔مقامیت کو بہتر انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس میں مقامیت کے مختلف مناظر کی وضاحت بھی ہوتی ہے اور علاقائی بیانیہ کو بھی نمایاں کیا جا سکتا ہے۔

مقامیت کے عناصر:

مقامیت ایک ایسی اکائی ہے جو اپنے عناصر کے ساتھ اپنی شناخت قائم رکھتی ہے۔کسی بھی مقامیت میں اس کا مخصوص رہن سہن،رسم و رواج،زبان،مذہبی بیانیے اور ثقافتی بیانیوں کے ساتھ ساتھ فنِ تعمیر،فنون اور آرٹ ہوتا ہے۔یہ تمام عناصر مقامیت کی انفرادیت کی دلیل ہوتے ہیں۔ان عناصر سے مقامیت کی وضاحت ہوتی ہے۔زِیر نظر مقالے میں ان تمام عناصر کا جائزہ لیا جائے گا۔یہ تمام عناصر مقامیت کی شناخت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

مقامیت سے ہماری مراد مقامی ثقافت بھی ہے۔ایسی مقامیت جو اپنی مخصوص پہچان،شناخت اور انفرادیت کے ساتھ موجود ہو۔ایسی علاقائی شناخت جس کی اپنی اہمیت ہو؛جس کے اوصاف اس کے عناصر اس کو اپنی مخصوص پہچان عطا کرتے ہوں۔زیر نظر مقالہ میں محور ہی مقامیت ہے۔مقامیت میں ان عناصر کا بیان بھی ضروری ہے جن کے تحت اس مقالے میں منتخب ناولوں کو پرکھا جائے گا۔مقامیت کل ہے جس کے مختلف اجزاء ہیں۔زیر نظر مقالہ میں منتخب ناولوں میں انہی عناصر کا جائزہ لیا جائے گا۔مقامیت کے عناصر میں مذہب،ثقافت،سماجی نظام،سیاست، تاریخ،آرٹ،ادب اور فن تعمیر شامل ہیں۔ان کا جائزہ لیا جائے گا کہ کس طرح یہ عناصر مقامیت کی شناخت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ثقافت:

مقامیت مختلف عناصر سے تشکیل پاتی ہے۔ کسی بھی مقامیت میں مختلف خارجی، داخلی پہلو ہوتے ہیں۔ جن کو مزید کئی سطحوں پہ تقسیم کیا جاتا ہے۔ مقامیت ایک ایسی اصطلاح ہے۔ جس کے مترادف علاقائیت کی اصطلاع بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔ مقامیت کی ذیل میں چھوٹی ثقافتوں کو رکھا جاتا ہے۔ مقامیت اپنے اندر ایک مکمل نظام رکھتی ہے ۔ہر مقامیت میں ایک الگ ثقافت سماجی نظام مذہب، سیاست ، بودو باش جیسے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ جن کا مختصر تعارف پیش کیا جائے گا۔

ثقافت ایک وسیع تر اصطلاح ہے جو مختلف عناصر پہ مشتمل ہوتی ہے۔ثقافت کے لئے انگریزی میں کلچر (culture) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔اس کے مترادف تہذیب کی اصطلاح بھی رائج ہے۔ بغور مطالعے سے دونوں کا مقصد و مدعا ایک ہی ثابت ہوتا ہے۔ ثقافت ایک وسیع تر نظام کا نام ہے۔ ثقافت یک دم پروان نہیں چڑھتی بلکہ خاص تسلسل کے بعد ثقافت اپنی شناخت بناتی ہے۔ ثقافت کے حوالے سے ڈاکٹر مظفر حسین ملک لکھتے ہیں:

> "ثقافت یا تہذیب سے نسلیات کے وسیع تناظر میں کسی معاشرے کا وہ پیچیدہ نظام مراد ہے۔ جس میں علم، عقیدہ، فن ،اخلاقیات، قانون، رسم و روایات کے علاوہ دیگر تمام اہلیتیں اور ادو اد شامل ہیں جو اس کے افراد اپنے معاشرے سے حاصل کرتے ہیں"(19)

ہیری سپیرو نے ثقافت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> "ثقافت اکتسابی طرز عمل کا نام ہے۔ اکتسابی طرزِ عمل میں ہماری وہ تمام عادات ،افعال، خیالات اور اقدار شامل ہیں۔ جنھیں ہم ایک منظم معاشرے یا گروہ یا خاندان کے رکن کی حیثیت سے عزیز رکھتے ہیں ان پر عمل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔"(20)

ثقافت کسی مخصوص علاقے کے مکینوں کی رسوم و رواج، عادات و اطوار ،تاریخ، معاشی نوعیت اور سماجی نظام کے تحت پروان چڑھتی ہے۔ فرد اپنے ثقافتی ماحول سے بلاواسطہ یا بلواسطہ متاثر ضرور ہوتا ہے۔ اس کا اثر اس کی زندگی، اس کے اعمال پہ ضرور پڑتا ہے اور بسا اوقات وہ اس سے دور جا کے بھی ذہنی ارتقاء کو اس سے دور نہیں کر سکتا۔ ثقافت کے بارے میں ڈاکٹر کامران عباس کاظمی لکھتے ہیں کہ:

> "تہذیب و ثقافت فطری حد بندیوں یا جغرافیہ کے اندر جنم لیتی اور پنپتی ہے یعنی ثقافت یا کلچر اس وقت جنم لے گا ۔جب کوئی سماجی گروہ دوسرے گروہ سے الگ اپنی انفرادی اور امتیازی حیثیت کا برملا اظہار کرنا چاہے گا۔"(21)

ہر مقامیت کی الگ ثقافتی پہچان ہوتی ہے۔ یہ ثقافتی پہچان بعض اوقات بڑے ثقافتی گروہ کے زیر اثر جا کے ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی اپنی ایک الگ پہچان بہر حال برقرار رہتی ہے۔ بڑے ثقافتی گروہوں کے زیر اثر

اس کی اہمیت کو کم کیا جاتا ہے۔ یہ اپنے طور پہ ایک پورا نظام رکھتی ہے۔ لباس، خوراک، رہائش، بود و باش اور معیشت کا نظام اور پہچان ہوتی ہے۔ بڑے شہروں میں آکر لوگ خاص طرز رہائش، خوراک اور نظام زندگی اختیار لیتے ہیں تاہم اس سے مقامی ثقافتوں کو پس پردہ ڈالا تو جاسکتا ہے لیکن ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود وہ اپنی شناخت کسی نہ کسی طور پر قائم رکھتی ہیں۔ دور جدید میں ایک طرف گلوبلائزیشن ہے تو دوسری طرف اب مقامی ثقافتوں کے رنگوں کو بھی اجاگر کیا جارہا ہے۔ مختلف سطحوں پہ ان کی نمائندگی ملتی ہے۔ لہذا یہ بات طے ہے کہ بڑی ثقافتوں کے زیر اثر آکر بھی ان کی اہمیت باقی رہتی ہے۔ دور حاضر میں مختلف موقعوں پہ خواہ سفارتی ملاپ ہو یا کھیلوں کے عالمی مقابلے میزبان قوم ایسے موقعے کو غنیمت جان کر اپنی ثقافت کا پرچار ضرور کرتی ہیں۔ قومیں اپنی مقامی ثقافت کو اجاگر کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتیں بلکہ اب وہ بڑی ثقافتوں کے زیر اثر رہ رہ کے اس میں گھٹن محسوس کرتے ہوئے اپنی ثقافت کی طرف مراجعت کرنے میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔

سماجی نظام:

سماجی نظام ایسا نظام ہے جس کے تحت کوئی قوم، گروہ آپس میں مل کر رہتے ہیں۔ ان کا ایک ساتھ رہنا باہمی اصول وضوابط اور قوانین کے تحت ہوتا ہے۔ یہ اپنے ان اصولوں کے تحت اپنا ایک الگ نظام وضع کرتے ہیں۔ اسی انتظام کے تحت وہ باہم مل جل کر رہتے ہیں۔ اس نظام میں قانون، رسم و رواج، روایت، مذہب، سیاست اور معاشی نظام کارفرما ہوتے ہیں۔

ہر مقامیت کا بھی اپنا ایک سماجی نظام ہوتا ہے۔ اس سماجی نظام کے مختلف عناصر ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی صورت زبانی یا روایتی اور کچھ کی صورت تحریری بھی ہوتی ہے۔

> "ہر قوم اور ملت کا اپنا ایک مخصوص معاشرتی نظام اور اپنی ایک منفرد تہذیب ہوتی ہے۔ جس کے ذریعے اس کی قومی شناخت اور ملی تشخص قائم رہتا ہے اور اس کا معاشرہ شکست اور ریخت اور دوسری تہذیبوں میں جذب ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔ البتہ دیگر اقوام و مذاہب کے معاشرتی آئین بالعموم خود ان کے اپنے وضع کردہ عادات اور سوم پر مشتمل ہوتے ہیں۔"(22)

اس سماجی نظام کی اصل بنیاد اصول و نظریات، قواعد وضوابط ہوتے ہیں۔ سماجی نظام کا مقصد ایک مشترکہ زندگی کا اصول ہے جو ایک گروہ پرامن طریقے سے زندگی گزارنے کے لیے وضع کرتا ہے۔ مقامیت کا ایک الگ ایسا سماجی ڈھانچہ ہوتا ہے جس کے تحت اس کا انتظام چلتا رہتا ہے۔ سماجی نظام میں عقائد کے ساتھ ساتھ اساطیر بھی ہوتی ہیں۔ اس میں بھی مقامیت کا رنگ موجود ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد میں جغرافیائی، معاشرتی حالات وسائل بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ بعض مقامی ثقافتیں بڑے ثقافتی گروہوں کے اثرات سے دور ہوتی ہیں۔ ان کے دوری کی وجہ بعض اوقات جغرافیائی حالات بھی ہوتے ہیں۔

"سماجی نظام سماجی تعاملات اور باہمی تعلقات کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔انسانوں کے درمیان تعاملات اور باہمی تعلقات کے نتیجے میں مختلف رسم و رواج، کام کے نظام کمیٹیاں، ادارے کنڑول کے ذرائع وغیرہ پروان چڑھتے ہیں۔یہ مختلف عناصر فعال طور پر مل کر رہتے ہیں۔"(23)

اس سماجی نظام میں ان کا معاشی نظام بھی اہمیت کا حامل ہے۔کچھ مقامی علاقے اپنی حدود تک محدود ہوتے ہیں یاان کے علاقے دور دراز ہونے کی وجہ سے اپنی حدود میں مقید رہتے ہیں اس لیے ان پر بیرونی اثرات زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے۔تاہم کچھ ایسے بھی ہیں جن کا تعلق بڑے ثقافتی گروہوں سے بھی رہتا ہے۔ان کے سماجی نظام پر وہ بڑی ثقافت بھی اثرانداز ہوتی رہتی ہیں۔

سماجی نظام کی تشکیل کے مختلف عناصر اور عوامل ہوتے ہیں۔اس کی تشکیل میں سیاست ، مذہب ، زبان ، معاشی نظام ، سیاست اور نظامِ حکومت کار فرما ہوتے ہیں۔ زبان باہمی میل جول قائم رکھنے کا نظام ہے۔مذہب کے ساتھ روایت اور اخلاقیات بھی معاشرے کی تعمیر میں ہم کردار ادا کرتی ہیں۔ معاشی نظام کی نوعیت جغرافیائی حالات کے تناظر میں مختلف ہوتی ہے۔اس کی نوعیت بھی اس مقامیت کے داخلی اور خارجی نظام کو متاثر کرتی ہے۔حکومت کے انتظامات ان کے نظم وضبط قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔سماجی نظام مختلف طریقوں سے کام کرتا ہے۔وقت اور حالات کے مطابق اس میں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔سماجی نظام کوئی جامد اور ساکت چیز نہیں بلکہ بیرونی اثرات اس کی نوعیت کو متاثر کرتی ہے جس کے اثرات قبول کرتے ہوئے اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔

تاریخ:

مقامیت کی اپنی ایک خاص تاریخ بھی ہوتی ہے۔اس تاریخ کے ساتھ جڑے واقعات بھی اس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔تاریخی نوعیت کی تبدیلی کے اثرات کا بھی اس پر اثر پڑتا ہے۔مقامیت کا اپنی تاریخ خواہ وہ مذہبی نوعیت کی ہو یاسیاسی یااس پہ آنے والے کسی انقلاب، قدرتی سانحہ ؛اس سے جڑے ہوئے واقعات اساطیر کا بھی اثر قبول کرتی ہیں۔ مقامیت اپنی تاریخ کے سائے میں پروان چڑھتی ہے۔تاریخی واقعات پوری تہذیب پہ گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں جن کا اثر کئی صدیوں تک جاری وساری رہتا ہے۔اس کے علاوہ بعض مقامی علاقوں کی اپنی تاریخ ان کی شناخت کا ایک اہم حوالہ بھی بن جاتی ہے۔اسی تاریخی حوالے سے اس کو دیکھا یا پہچانا جاتا ہے۔یہ تاریخی حوالہ اس کی پہچان بھی بن جاتا ہے اور اس کی انفرادیت بھی۔اس تاریخ کے زیر اثر بعض اوقات اس کے باقی تشکیلی عناصر بنتے ہیں۔

"تاریخیت ایک تھیوری کے طور پر انسانی اعتقادات تصورات اخلاقیات اور رہائش کے طریقہ کار کا ایک واضح بیانیہ سمجھی جاتی رہی ہے۔اس کا مقصد ثقافتی رابطے کو بھی واضح کرنا ہے۔تاریخ کا علم دراصل رشتوں رابطوں کا علم ہے اور یہ رابطے تاریکی تجزیے میں نظرانداز نہیں کیے جاسکتے۔"(24)

تاریخ میں کسی بھی قوم کی ثقافت اس کی رسومات اور بہت سے تہذیبی اور ثقافتی عناصر محفوظ ہوتے ہیں۔ تاریخ میں کسی بھی قوم کا ثقافتی اور علمی ورثہ بھی محفوظ ہوتا ہے۔تاریخ کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ بعض اوقات کسی خاص تاریخی واقعے کا اس مقامی علاقے میں خاص اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔ کسی فاتح اور مفتوح یا کسی قدرتی سانحے کے نتیجے میں ہونے والی تبدیلی اس مقامیت کے داخلی اور خارجی معاملات کی تبدیلی کا باعث بھی بن جاتی ہے۔زِیرِ نظر مقالے میں ناولوں میں مقامیت کے تاریخی عوامل کا بھی جائزہ لیا جائے گا کہ کن ناولوں میں تاریخ نے کوئی اہم کردار ادا کیا یا ان کی اپنی تاریخ کے بارے میں ناولوں کے اندر کیا موجود ہے۔اس کا اس مقامیت سے تعلق اور اثرات کا جائزہ لیا جائے گا۔

مذہب:

کسی بھی علاقے یا ثقافتی گروہ کے تشکیلی عناصر میں مذہب بھی ایک خاص پہلو ہوتا ہے۔ مذہب بعض اوقات ثقافت کے اثرات قبول کرتا ہے۔ مثلاً لباس اور چند رسوم و رواج کی حد تک لیکن مذہب کے فرمودات، احکامات دوسرے عناصر پہ غالب آ جاتے ہیں۔ مذہب اگر اس علاقے کے بجائے کسی دوسرے علاقے سے آیا ہے تو ایسی صورت میں بہت سے ثقافتی مقامی عناصر کے اثرات مذہب بھی قبول کرتا ہے۔ کچھ نظریات مقامی طور پہ پروان چڑھتے ہیں۔ جو مذہب کے نہ ہوتے ہوئے بھی مذہب کا حصہ تصور کیے جانے لگتے ہیں۔

مقامیت کی تشکیل میں مذہب کا عمل دخل بھی ہوتا ہے۔ مذہبی رسومات، سماجی نظام بھی مختلف ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک مذہب کے پیروکار بھی مختلف رسومات کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ان رسومات کا تعلق مقامی نوعیت سے ہوتا ہے۔ ایک علاقے میں مذہبی رسومات دوسرے علاقے سے مختلف ہو سکتی ہیں۔ایک علاقے میں رسومات کو جو اہمیت ہوتی ہے وہ دوسرے میں اس کے انکاری یا مخالف ہوتے ہیں۔ یوں مقامیت کا اپنا ایک خاص مذہبی پہلو اور نقطہ نظر بھی ہوتا ہے۔ کسی ایک مقامی ثقافت میں مذہب کی پابندی زیادہ اور دوسرے میں کم یا اس کے اثرات زندگی کے تمام معاملات میں واضح ہو سکتے ہیں۔اس کی تاریخ میں اگر مذہب کا کوئی اہم واقعہ ہے تو اس کے بھی اثرات مقامی ثقافت میں موجود ہوتے ہیں۔ بعض اوقات مذہب کی آڑ میں اس کے ساتھ جڑے من گھڑت واقعات یا توہمات بھی اس میں شامل ہوتے ہیں جن کے زیرِ سایہ تہذیب پروان چڑھتی ہے اس لیے مقامیت کے عناصر میں مذہب ایک اہم اور مضبوط عنصر ہیں بعض اوقات کسی مقامی علاقے میں مذہب کی تبدیلی بھی ایک اہم واقعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ مذہب کی تبدیلی کے ساتھ بھی بعض اوقات پرانے رسم و رواج نئے احکامات سے مدغم ہو کے ایک نئی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ بسا اوقات کسی ایک علاقے یا بڑے گروہ کے ساتھ جڑتے ہوئے کچھ اثرات قبول ضرور کر لیے جاتے ہیں مگر

مقامی مذہبی رنگ بھی موجود رہتا ہے جس کا تعلق ایک خاص مقامی ثقافت سے ہوتا ہے۔اس کا تعلق ضروری نہیں کہ مذہب سے یا کسی بڑے ثقافتی گروہ سے ہو۔اس کا ایک خاص مقامی رنگ ہی اس کی ایک الگ پہچان بھی بن جاتا ہے۔

سیاست:

مقامیت میں سیاست کا بھی اہم عمل دخل ہوتا ہے۔ سیاسی معاملات کی وجہ سے ہونے والا تغیر بھی اس کی بناوٹ میں کردار ادا کرتا ہے۔ہر علاقے میں انتظامی امور کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔کچھ علاقوں میں مقامی نوعیت کے معاملات کو خود مقامی سطح پہ حل کرنے کا چلن ابھی باقی ہے۔اس طرح ان کے سماجی معاملات دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ بعض علاقوں میں آج بھی قبائلی جرگے اور پنجاب کے دیہاتوں میں پنچایت کا نظام ہے۔ جو مقامی نوعیت کے مسائل کو باہم افہام و تفہیم سے حل کر لیتے ہیں۔ بعض مقامیت اپنے کچھ رسوم ورواج کے ساتھ جڑے ہونے کے باوجود انتظامی معاملات میں جدت کا رویہ اپناتی ہے۔ بہر حال اس کے باوجود ان کے کچھ خاص پہلو موجود ہوتے ہیں۔ سیاست کے معاملات بھی ان کے مقامی نوعیت کے ہوتے ہیں جس میں ذات برادری کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔اسی سوچ کے زیر سایہ ان کی سیاسی سوچ پروان چڑھتی ہے۔اس کے علاوہ کچھ علاقوں میں سیاست دانوں یا معاشی طور پہ مضبوط گھرانوں خاندانوں کا اثر ورسوخ زیادہ ہوتا ہے۔علاقے کے لوگ ان کے زیر عتاب رہتے ہیں۔ان کی سوچ کو اس طرح پروان چڑھایا جاتا ہے کہ وہ ان کی تابعداری ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ایسے علاقوں کی ثقافت پر بھی ان کے گہرے اثرات ہوتے ہیں۔مقامیت میں ان پہلوؤں کو شامل کیا جاتا ہے۔یہ سیاسی رہنما مذہبی ثقافتی معاملات میں بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ بعض اوقات اس علاقے کو اسی پسماندگی میں ہی مقید رکھا جاتا ہے تاکہ پرانے رسم ورواج کی آڑ میں اپنے سیاسی معاملات کی آبیاری کی جا سکے۔ان لوگوں پہ اپنی دسترس اور حاکمیت کو برقرار رکھا جا سکے۔اس طرح کچھ علاقے ایسے بھی ہوتے ہیں اور کچھ مقامی علاقوں میں جدت پسندی غالب آجاتی ہے۔وہاں کے سیاسی رہنما عوام کو باشعور بنانا چاہتے ہیں جس سے مقامی رسم ورواج کے ساتھ ساتھ عوام جدید تعلیم سے آراستہ ہو کہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہو جاتی ہے۔یوں ہر مقامی یونٹ میں سیاسی معاملات کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے۔ان کی سوچ کا زاویہ بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ان کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھ کے ان پہ حکمرانی مضبوط کی جاتی ہے۔

زبان:

سماجی نظام کا ایک عنصر زبان ہے۔زبان نہ صرف رابطے کا ذریعہ ہے بلکہ اس کے تحت کسی قوم کی ثقافت کی ترجمانی ہوتی ہے۔زبان ایک وسیع نظام کا نام ہے جبکہ بولی اس کی ابتدائی شکل قرار دی جاتی ہے۔جہاں بھی انسان بستے ہیں۔ان کا باہمی ربط زبان کے ذریعے سے ہی ہوتا ہے زبان کا علم بھی وسعت اختیار کر چکا ہے۔زبان کے سائنسی مطالعہ کو لسانیات کا نام دیا جاتا ہے۔ مقامیت کے پیرائے زبان کے عنصر کو ملحوظ خاطر رکھنا بھی ضروری ہے۔ ہر

مقامیت کی زبان مختلف نہ بھی ہو تو اس کے لب ولہجہ میں فرق کے ساتھ ساتھ چند مخصوص مقامی الفاظ کا استعمال ضرور ہوتا ہے۔ زبان اور مقامیت کے موضوع پہ تفصیل سے قبل زبان کی چند تعریفوں کو ملحوظ خاطر رکھنے سے اس امر کی وضاحت زیادہ سہل ہو جائے گی۔

"پس زبان کی واضح تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ زبان لسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوت گویائی شامل ہے اور جن کو دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادے سے دہرا سکتا ہے۔"(25)

زبان کے بارے میں ماہرین لسانیات کا یہ بھی نظریہ ہے کہ یہ موروثی نہیں ہوتی بلکہ علاقائی ہوتی ہے۔ زبان دوسرے علاقوں پر بھی اثرانداز ہو سکتی ہے۔ زبان کا تعلق مخصوص ماحول سے ہوتا ہے۔ علاقائی اثرات اس پہ غالب ہوتے ہیں دوسری صورت میں زبان کے اثرات بڑی ثقافتوں سے چھوٹیوں میں منتقل ہوتے ہیں یا کسی بڑی حکومتی تبدیلی کسی فوج کی لشکر کشی یا حکومت کی صورت میں اس کے اثرات دوسری قوم کو قبول کرنے پڑتے ہیں۔

"زبان بنیادی طور پر موروثی نہیں ہوتی یعنی کہ بولنے والے کو کسی بھی زبان کی صلاحیت اس کے آباؤاجداد یا والدین کی طرف سے منتقل نہیں ہوتی بلکہ زبان ماحول کی دین ہوتی ہے اگر کسی بھی نومولود بچے کو ہم اپنے سماج یا مسلک سے باہر کسی اجنبی ملک یا ایسی جگہ بھیج دیں جہاں ہماری مادری زبان بالکل نہیں بولی جاتی تو وہ ہمارا بچہ وہیں دوسری زبان کو بولنا شروع کر دے گا مادری زبان کو کبھی نہیں بول پائے گا۔"(26)

زبان کے مختلف لہجے ہوتے ہیں۔ مقامیت کو لاحق مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ جغرافیائی حد بندیاں اور حکومتی انتظامیہ کے تحت ہونے والی تقسیم بھی ہے ملکوں اور صوبوں کے انتظامی معاملات کو چلانے کے لیے علاقوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑی ثقافت کے اثرات نمایاں ہو جاتے ہیں چھوٹی علاقائی مقامیت اس کے پیچھے دھندلا جاتی ہے اس کو بڑی ثقافتوں کے زیر انتظام یا زیر اثر خیال کر کے ان کی انفرادیت کو ختم کر دیا جاتا ہے۔

پاکستان کو چار بڑے صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تقسیم سے قبل بھی پنجاب کا شمار ہندوستان کے بڑے صوبوں میں ہوتا تھا۔ پنجاب وسیع و عریض علاقہ ہے۔ اس کا رقبہ اور آبادی باقی صوبوں کی نسبت نمایاں برتری کی حامل ہے۔ موجودہ پنجاب کی بات کی جائے تو اٹک سے رحیم یار خان تک پاکستان کا ایک بڑا علاقہ اور سب سے زیادہ آبادی اس علاقے میں موجود ہے۔ پنجاب کے مختلف علاقوں میں مجموعی زبان ہونے کے باوجود زبان کے الفاظ لہجوں اور مجموعی ثقافت میں فرق بھی موجود ہے۔ مجموعی طور پر سب ہی پنجاب کی ثقافت کہلاتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر کے ایس بیدی کا بیان اہم ہے۔

"پنجاب بھی کئی حصوں میں منقسم ہے سارے خطے کی زبان تو پنجابی ہے مگر مقامی بولیاں بھی پنجابی زبان کے زیر اثر ترقی کر رہی ہیں۔ مرکزی پنجابی معیاری زبان کادرجہ حاصل کر گئی باقی حصوں میں معمولی اختلاف سے علاقائی بولیاں مروج ہیں۔ پہاڑی وادیوں اور دور دراز گوشوں کی بولیاں بھی اپنی مخصوص شکل اختیار کر گئی ہیں باقی حصوں کے لوگوں سے پہاڑی دور رہتے ہیں اس لیے ان کی بولی پر دوسری بولی کا اثر بہت کم ہوتا ہے۔ پنجاب گو میں میدانی علاقہ ہے مگر اس کے دریاؤں نے اسے کئی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے نتیجہ کے طور پر دعبہ کی بولی میں خفیف سفر کہا گیا ہے مقامی بولیاں مرکزی زبان کی مددگار اور معاون ثابت ہوتی ہیں اور خود مرکزی زبان سے کسب فیض کرتی ہیں۔"(27)

پنجاب میں مجموعی طور پر پنجابی ثقافت ہونے کے باوجود کئی ضمنی ثقافتیں بھی موجود ہیں ان مقامی علاقوں کی مخصوص شناخت ہے۔ شمالی پنجاب میں پٹوار کا علاقہ ہے کشمیر کے قریب والے علاقوں پہ کشمیری ثقافت کے بھی اثرات ہیں جغرافیائی لحاظ سے پہاڑوں اور میدانوں سے سجا یہ علاقہ مخصوص مقامی پٹواری زبان اور کشمیری زبان کے الفاظ میں بہت حد تک یکسانیت ہے جو پنجابی کے لب و لہجے سے بھی مختلف ہے جنوب کی طرف ریتلا میدان موسم اور آب و ہوا کے ساتھ جغرافیے کی تبدیلی تاریخی اعتبار سے شہروں لشکروں کی گزرگاہ یہ سب عوامل بھی مقامیت کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ان علاقوں کی مقامیت اپنے انفرادی رنگ میں بھی موجود ہے۔ بہاولپور اور ملتان اس علاقے کے بڑے شہر ہیں ڈی جی خان میں بلوچستان سے قربت کے باعث زبان کے لحاظ سے بھی وہاں نمایاں فرق موجود ہے

"ملتانی زبان نہ تو لینڈا کی شاخ ہے اور نہ ہی پنجابی یا مغربی ہندی کی بلکہ ان سب بولیوں سے علیحدہ مستقل اور قائم بالذات زبان ہے اور اس کا رشتہ صرف سندھی سے ہے جو اس کی چھوٹی بہن ہے۔ ہندوستان کی باقی زبانوں کی طرح ملتانی زبان بھی علاقائی ناموں سے موسوم رہی ہے مثلاً ملتان اور اس کے نواح میں اسے ملتانی کا نام دیا گیا کچھ میں دارالعلوم قائم ہوا تو بہاولپور کے علاقے میں سے بہاول پوری کہا گیا وہاں کی زبان اچی کہلانے لگی بلوچی اور پشتو بولنے والی اقوام پہاڑوں سے اتر کر میدانوں میں آئے تو وہاں کی زبان کو ہند کو کہنے لگے ڈیرہ غازی خان کی بلوچی والوں کہ اسے جگدائی اور بغدالی کا نام بھی دیا گیا۔"(28)

زبان کے عناصر کے ذیل میں مندرجہ بالا اقتباس سے بھی پنجاب کے علاقے میں دوسری زبانوں کا تصور ملتا ہے۔ مقامی ثقافتوں میں بولیوں اور مقامی زبان کا نظام رائج ہے۔ان مقامی علاقوں کی ثقافت کا اظہار ان کے مقامی زبان کے ذریعے سے ہی ہو سکتا ہے۔ پنجاب کی مثال کے ذریعے سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ بڑی ثقافت خاصی مضبوط اور قدیم ہے۔ مقامیت کے عناصر میں زبان بھی اہم ہے۔اسی طرح ملک میں موجود دوسری بڑی ثقافتوں کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں بھی ضمنی اور چھوٹی ثقافتیں بھی ہیں۔

آرٹ، ادب اور فن تعمیر:

مقامیت کے عناصر میں مزید کچھ اہم پہلو آرٹ، ادب، فن تعمیر بھی ہیں۔ ہر علاقے کا مخصوص فن تعمیر ہوتا ہے۔ جس میں اس کے موسمی اور جغرافیائی حالات کو عمل دخل ہوتا ہے۔

"لٹریچر علوم ادبی اور فنون نے لطیفہ یہ بھی انسانی تمدن کے اجزا ہیں لیکن یہ ایک جدید مجموعہ ہے ان تفریحوں اور نصرتوں کا جو صرف حواسوں کی خستگی مٹانے اور تسکین و تسلی حاصل ہونے پر مستزاد کی گئی ہیں اور ان کی نوعیت اس طرح ہے کہ ان سے بڑے بڑے گروہ ایک ساتھ حظ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ ان سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کا مقصد انسان کے احتیاج کو فراہم کرنا نہیں ہوتا اس وجہ سے بجائے رشک و رقابت کے جو کھانے پینے، مال دولت اور اقتدار و قوت کی کوشش اور کشاکش کے لیے لازمی ہے۔ یہ فنون لطیفہ باہمی معاشرت اور بنائے جنس میں صلہ رحمی اور ہمدردی کو بڑھانے والے ہیں۔"(29)

اس کے علاوہ ثقافتی عناصر میں کچھ مقامی تہوار اور رسومات اور عقائد بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ تہوار ان مقامی نوعیت کے علاقوں کی پہچان بھی ہوتے ہیں۔ مختلف کھیل، فنون لطیفہ اور مشاغل ان کو دوسرے علاقوں سے ممتاز کراتے ہیں۔ ان میں ان کی ثقافت کا خاص رنگ موجود ہوتا ہے۔ ادب اور فنون لطیفہ کے لحاظ سے بھی ان کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنی ثقافت کے ساتھ کسی نہ کسی سطح پر جڑا ہوتا ہے۔ ان کا اظہار وہ بعض اوقات عملی اور بعض اوقات بیانیے کی صورت میں ضرور کرتا ہے۔ یہی ان کی مقامی شناخت ہوتی ہے۔ فن تعمیر ہو یا ادب اس کا ایک خاص رنگ ہوتا ہے۔ ان مقامی نوعیت کی رہائشی مکانوں ان کی تعمیر ان کے ڈیزائن سجاوٹ میں ایک مخصوص ثقافت کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ یہ مخصوص طرز تعمیر کسی نہ کسی حد تک دوسروں سے مختلف ضرور ہوتا ہے۔ جو ان کی مہارت کے ساتھ ساتھ ان کی مخصوص شناخت بھی بن جاتی ہے۔ لسانی اور جغرافیائی لحاظ سے تقسیم علاقوں میں مجموعی، عمومی ثقافت کے ساتھ ساتھ ان کے ضمنی شاخیں بھی ہوتی ہیں۔ جن میں محض تھوڑا ہی سہی ثقافتی فرق ضرور ہوتا ہے۔ مثال کے طور پہ پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے لیکن محض کسی ایک تہذیب و ثقافت کو نہیں بلکہ مختلف چھوٹی ثقافتوں کا حامل ہے۔ پوٹھوہار کے لوگوں کا رہن سہن، بولیاں، زبان، رسوم و رواج مختلف ہوں گے۔ جنوبی اور وسطی اضلاع میں زبان سے ثقافت کے دوسرے عناصر کے امور مختلف ہیں۔ جنوبی پنجاب میں موسم کی مناسبت سے رہائشی مکانوں کا طرز تعمیر، لباس اور دوسرے معاملات وسطی اور شمالی پنجاب سے مختلف ہوں گے۔

"لیوتار اس کا احساس دلاتا ہے کہ مصنوعی یکساں مکان کی تعمیر سے زندگی کی چہل پہل کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ہمدردیاں پتھر بن جاتی ہیں اور زندگی کے بہت سے مطالبات لایعنی بن کر مشین کے پرزے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔"(30)

جدید طرز رہائش اور طرز زندگی نے مختلف لوگوں کو ایک جگہ لا کے کھڑا کر دیا ہے جہاں ان کے رہائش سے لباس اور خوراک اور دوسرے معاملات یکساں ہیں۔ اس کے باوجود بعض اوقات کچھ لوگ اپنے مقامی عناصر کو بھی ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ ان کے منظر ان کی تہذیب ان کی ثقافت بھی رہتی ہے۔ ایسے میں جہاں گلوبلائزیشن نے تمام افراد کو ایک جگہ لا کھڑا کیا ہے وہیں پہ اکثر مقامی نوعیت کے کھانے مقامی نوعیت کے لباس اور مقامی نوعیت کی رہائش لوگوں کے لیے کشش کا باعث بنتی ہے اور لوگ اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ لوگ اپنی مقامی ثقافت کو کسی نہ کسی صورت میں قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

عالمگیریت:

عالمگیریت (گلوبلائزیشن) وسیع معنوی اصطلاح ہے۔ عالمگیریت کا نعرہ لگانے والوں نے دنیا کو ایک گلوبل ویلج بنانے کا پرکشش تصور دیا ہے۔ اس عالمگیریت کے تصور میں بہت تیزی آچکی ہے۔ اس کے اثرات تیزی سے دنیا کے ہر حصے میں سرایت کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے کاروبار کو دنیا کے ہر خطے میں پہنچا رہی ہیں۔ ایک طرف تو اب یہ چیزیں دور دراز کے لوگوں کی بھی پہنچ میں آچکی ہیں تو دوسری طرف ان کے منفی اثرات کا بھی رونا رویا جا رہا ہوتا ہے۔ یہاں سوال یہ جنم لیتا ہے کہ کیا یہ محض کاروباری مالیاتی ادارے ہیں؟ یا ان کے محرکات اس سے بڑھ کر بھی کچھ ہیں۔

ان کاروباری کمپنیوں نے مالیاتی حوالے سے بھی خود کو اتنا مستحکم کر لیا ہے کہ ریاستوں کی حیثیت بھی ثانوی رہ جاتی ہے۔ لوگوں کو انہوں نے اپنی طرف اس قدر کر لیا ہے کہ وہ ان کے صارف بن چکے ہیں۔ ان کی شاخیں اور کاروبار تیزی سے چھوٹے علاقوں تک پہنچ رہا ہے۔ یہاں یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا ان کمپنیوں کے مقصد محض کاروبار ہے یا کچھ اور بھی؟ ان کمپنیوں کا تعلق بھی دیکھا جائے تو مخصوص بڑے ممالک/ ثقافتوں سے ہی ہے۔ ان کا کھانا، لباس، ان کی مصنوعات، ان کی ثقافت کے ساتھ دنیا کے دور دراز علاقوں میں بھی استعمال ہو رہی ہیں۔ یہ محض مالیاتی مفاد کا مسئلہ نہیں بلکہ ثقافت کی برتری ثابت کرنا بھی ہے۔ اپنے لباس، خوراک، کلچر کی اجاداری ثابت کرنا ان کا مقصد ہے۔

کرونا وبا کے بعد اس سلسلے میں مزید آسانی اور اضافہ ہوا ہے۔ دنیا میں آن لائن کاروبار تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ دور دراز علاقوں کے لوگوں کی بھی رسائی ان چیزوں تک ممکن ہو گئی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اب دوسرے ملکوں سے بھی براہ راست چیزوں کو منگوایا جا سکتا ہے۔ کشمیر کے پہاڑوں میں گھرے گاؤں میں بیٹھا شخص ہو یا سندھ کے دور دراز علاقے میں بسنے والا دیہاتی، وہی چیز نہ صرف دیکھ رہا ہے بلکہ اس کو استعمال بھی کر سکتا ہے۔

> "عالمگیریت دنیا بھر میں سماجی تعلقات کی شدت ہے۔ جو دور دراز علاقوں کو اس انداز سے جوڑتی ہے کہ ایک مقام کے حالات دوسرے مقام پر اثر انداز ہوتے ہیں۔"(31)

عالمگیریت کا دوسرا بڑا حربہ میڈیا کی یلغار ہے۔الیکٹرانک میڈیا کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد سوشل میڈیا نے تو دنیا کو یکثر بدل کرر کھ دیا ہے۔ سوشل میڈیا کی رسائی آج دور دراز بیٹھے شخص کے پاس بھی ہیں۔ سوشل میڈیا کے ذریعے ان بڑے بیانیوں، ثقافتوں اور دور بیٹھے شخص تک بھی اپنی رسائی ممکن بنادی ہے۔ترقی یافتہ اقوام کو دیکھ کر ترقی مزید ممالک کے لوگ ان کی عظمت کے قائل ہوتے ہیں۔ان تمام کے ساتھ ساتھ زبان میں تبدیلی کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے۔ گلوبل ویلج کے تصور والوں نے گلوبل لینگوتیج بھی دے دی ہے۔ان کے ہوٹل ہوں یا ان کی عطا کردہ ترقی کی علامت چیزیں ان کی زبان بھی وہی ہے جو استعماری قوتوں نے واضح کر دی ہے۔اس گلوبل لینگوتیج کے بدلے مقامی زبانوں کا زوال بھی آرہا ہے۔لوگ اسی کھانے،اسی لباس،اسی زبان کے استعمال میں خود کو مہذب خیال کرنے لگے ہیں۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی ان سے متاثر ہو رہا ہے۔پاکستانی معاشرے کی بات کی جائے تو اچھی نوکری انٹرویو کے لیے لباس مغربی طرز کا ہی انتخاب کیا جاتا ہے بعض اداروں کی تو باقاعدہ ہدایات میں شامل ہیں کہ لباس مغربی طرز کا ہو مثلا بینک میں لازم ہے کہ پتلون زیب تن کی جائے،ٹائی لگائی جائے۔ کھانے کی بات کی جائے تو دیسی کھانے بھی روایتی ولائیتی انداز سے ہی کھانے میں مہذب تصور کیا جانے لگا ہے اگر کوئی ان سب چیزوں سے دوری اختیار کرے گا تو اسے سو طرح کی توجیہات دینی ہوں گی یا وہ احساس کمتری کا شکار ہو کے رہ جائے گا۔عالمگیریت کے ان حربوں سے مقامیت متاثر ہو رہی ہے۔رسم ورواج،اخلاقی قدریں،زبان،ثقافت اور خوراک طرز رہن سہن سب ہی اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔

"عالم گیریت کے بہاؤ میں ہماری روایتی معاشرتی قدریں بھی متاثر ہوئی ہیں اور ہمارا معاشرہ دنیا کے دوسرے معاشروں کی طرح خاص طور پر ترقی پذیر ممالک کی طرح تبدیل ہوا ہے ۔"(32)

عالمگیریت نے روایتی قدروں کو بھی زوال سے دوچار کر دیا ہے۔ مثلا روایتی خاندانی نظام میں لوگ اپنے روایتی رسم ورواج کے قائل تھے،خاندانی نظام مضبوط تھے۔عالمگیریت کی یلغار نے تمام لوگوں کو ایک مقام پہ کھڑا کر دیا ہے۔یوٹیوب اور سوشل میڈیا میں لوگ ایک دوسرے سے منسلک تو ہو گئے ہیں مگر فرد کی تنہائی کا رونا مزید گہرا ہوتا جارہا ہے۔لوگوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیا گیا ہے چھوٹے ملکوں علاقوں کے لوگ بھی ان کی برتری کے قائل دکھائی دیتے ہیں۔انفرادیت بھی ان لوگوں کی ہی قائم ہے جن لوگوں نے یہ تصورات قائم کیے ہیں۔ ثقافتی اختلاط کی صورت حال سامنے آرہی ہے مگر اس میں بھی مقامی ثقافت ہی متاثر ہو رہی ہیں۔عالمی سطح پہ اگر انگریزی زبان کی اہمیت اور پتلون کی اہمیت مسلم ہے تو اسی ایسی صورت میں شلوار قمیض اور چوغے کو دوسرا درجہ ہی حاصل ہو گا۔ نئی نسل کا نوجوان اپنی زبان کے بجائے یہ زبان ہی سیکھنا پسند کرے گا جس سے اس کے تعلقات اور رابطے میں بین الاقوامی دنیا سے استوار ہو سکیں۔

مادیت کا دور دورہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اپنی جڑیں مضبوط کر چکا ہے۔ دور دراز بیٹھا شخص بھی پیسے کمانے اور زندگی کی آسائشوں کے بارے میں سوچتا ہے۔اس کے بدلے وہ کسی حد تک بھی جانے کو تیار ہے۔ایسی تمام صورتحال میں مقامیتوں کو زوال آرہا ہے۔لوگ اپنی مقامیت سے ہٹ کے ایک مرکز کی جانب جڑتے جا رہے ہیں۔ایسا مرکز جس میں ان کا اپنا کچھ نہیں ہے لیکن بالآخر اس مرکز پہ جا کے بھی وہ اپنے آپ کو آسودہ خیال نہیں کرتے اور واپسی کی طرف رجحان بھی ممکن ہو رہا ہے لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے اصل کی جانب لوٹ نہیں پاتے۔ مابعد جدیدیت اسی کی مخالفت کرتی ہے۔ جو بیانیہ، تصورات مہابیانیہ کی شکل اختیار کر چکے ہیں مابعد جدیدیت کسی ایک نقطے کی تائید نہیں کرتی بلکہ چھوٹے بیانیوں علاقائی ثقافتوں اور مقامیتوں کی آواز کو بھی طاقتور بنانے پہ زور دیتی ہے۔

عالمگیریت کے کچھ مثبت انداز بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ مثلاً سوشل میڈیا کے استعمال والا شخص دور بیٹھے اپنی ثقافت اور تہذیب کو بھی روشناس کرا رہا ہے۔اس کے وسیلے سے وہ لوگ جو اپنی مقامیتوں سے دور ہو چکے ہیں جو ظاہری طور پہ دوسرے ملکوں یا دوسری ثقافتوں کا حصہ بن چکے ہیں اور ان کے دل میں اپنی مقامیت کا احساس کسی قدر موجود ہے۔ وہ اس کسی وسیلے سے اپنی اصل کی جانب کسی نہ کسی طور پر اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ مثلاً پنجابی یا سرائیکی زبان میں گایا جانے والا ایک گانا ہزاروں یا لاکھوں لوگ دیکھتے ہیں تو ایسا نہیں ہے کہ ان کے دیکھنے والے انگریز، ہسپانوی یا فرانسیسی لوگ ہیں۔ یقیناً ان کے دیکھنے والے ان کے اپنے ہی لوگ ہیں اور اس بات کا بھی کبھی کبھی امکان ہے کہ وہ محض اس خاص مقامیت میں بیٹھے ہوئے شخص ہی اسے نہیں دیکھ رہے بلکہ دور دراز بیٹھے بھی لوگ جن کا تعلق ان مقامی علاقوں سے ہے، ان کو ضرور دیکھ رہے ہیں۔ عالمگیریت کے اس سارے وبال میں کسی قدر مقامی علاقوں کی ثقافت کی حوصلہ افزائی کا پہلو بھی کہیں نہ کہیں نکل رہا ہے۔ گلگت بلتستان کے پہاڑوں میں بیٹھی ہوئی عورتیں اور بلوچستان کے دور دراز عورتیں اپنے دستکاری کے ہنر عالمی سطح پہ بارآور کرا رہی ہیں۔ لوگ اپنے مقامی علاقوں، اپنی زبان اپنے رسم و رواج کو دور بیٹھے ہوئے لوگوں کو دکھا رہے ہیں۔ مگر ان سب کو اس پیرائے میں یا مثبت انداز میں ہی نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ عالمگیریت کے جتنے مثبت اثرات ہوئے ہیں اس سے کہیں زیادہ انہوں نے منفی اثرات ڈالے ہیں اور چھوٹی مقامی علاقائی ثقافتیں س سے بہت حد تک متاثر ہو چکی ہیں۔

عالمگیریت کے مقامیت پہ اثرات:

عالمگیریت نے مقامیت کو ہر سطح پہ متاثر کیا ہے۔ مقامی علاقے ان کے اثرات سے کسی نہ کسی طرح ضرور متاثر ہو رہے ہیں۔ گلوبل ویلج کی اصطلاح ایک پورا نظام ہے جو زندگی کے مختلف شعبوں کو متاثر کر رہی ہے۔ بعض مقامی ثقافتیں تو معدومیت کے خطرے سے دوچار ہیں۔ معیشت، رسم و رواج، لباس، خوراک اور ادب ہر سطح پہ اس کے اثرات مقامی سطح پہ قبول کیے جا رہے ہیں۔ مقامی لوگ ان ملٹی نیشنل برانڈ کی چیزوں کو خرید کر، استعمال میں لا کر

خود کو اس بڑی دنیا کے فرد کے طور پر منوانے کے خواہاں ہیں۔ یکسانیت کی اس دلدل میں مقامی رنگ معدوم ہو رہے ہیں۔ مقامیت کا زوال اسی کے بدلے مول لیا جا رہا ہے۔ عالمگیریت کے مقامیت پہ اثرات کے ضمن میں چند اہم عناصر کی وضاحت کی جائے گی جو عالمگیریت سے زیادہ متاثر ہو رہے ہیں۔

ثقافتی اثرات :

عالمگیریت نے مقامی ثقافتوں کو اس قدر متاثر کیا ہے کہ بعض چھوٹی ثقافتیں معدومیت کے قریب ہیں۔ ملٹی نیشنل برانڈ اور کمپنیوں نے ایسا جال بچھایا ہے کہ لوگ ان کی طرف بڑی حد تک راغب ہو گئے ہیں۔ ان کے ذریعے وہ اپنی ثقافتی برتری ثابت کر کے اپنی ثقافت کی آبیاری کر رہے ہیں۔ بڑے ملکوں سے چھوٹے ملکوں ان کے بڑے شہروں سے اب علاقائی سطح پہ ان کا پرچار کیا جا رہا ہے میکڈونلڈ اور کے ایف سی کو مہذب کھانا تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی آڑ میں مقامی لوگ بھی اپنے کاروبار کو نہ صرف اس طرز پر ڈھالنے لگے ہیں بلکہ اس ولایتی خوراک کو ہی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ لباس کی بات کی جائے تو اس میں بھی صورتحال یہی دکھائی دیتی ہے۔ عالمی سطح پہ بین الاقوامی معیارات طے کر دیے گئے ہیں۔ ان کی تقلید میں ہی لوگ اپنی بقا تصور کر رہے ہیں۔ روایتی ملکوں علاقوں میں بھی ان کے ملبوسات کے ڈیزائن چل رہے ہیں۔ میڈیا کے ذریعے ان بڑی ثقافتوں کو پھیلانے میں مزید مدد ملی ہے۔ موسیقی طرز رہائش لباس طرز زندگی بڑی حد تک مغرب سے متاثر ہو رہی ہے۔ مقامی علاقوں میں ان کی آمد سے مقامی چیزوں کی اہمیت کم ہو گئی ہے لوگ اپنے روایتی طریقوں کو فرسودہ خیال کر رہے ہیں۔ اس دوڑ میں مقامی رسم و رواج کو بھی دقیانوسی خیال کیا جانے لگا ہے۔ مادیت پرستی کی دوڑ میں لوگ اسی طرز کو طرز زندگی کو حاصل کرنے کے لیے دوڑ رہے ہیں۔ معاشرتی قدروں کا زوال آ رہا ہے۔ مقامی علاقوں سے لوگ دور ہو رہے ہیں لوگوں کی بڑی تعداد دیہاتوں سے شہروں کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ بڑے مراکز کی طرف مراجعت بہتر سہولتوں اور عالمی دنیا تک رسائی کا مقصد ہے۔ نوجوان نسل بڑی تعداد میں بیرون ملک کی طرف سفر کر رہی ہے روایتی تعلیمی ادارے نصاب کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ خیال کر کے مغربی طرز کے نصاب اور ادارے بنائے جا رہے ہیں۔ مادیت کا مادہ ہر سطح پہ شامل کر دیا گیا ہے شہروں اور دیہاتوں میں زیادہ فرق نہیں رہا۔ وہاں بھی سہولتوں کی بڑھتی طلب نے ان کو اپنے مرکز سے دور کر دیا ہے لوگ روایتی زمینداری کے بجائے شہر میں نوکری کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ اعلی تعلیم کے حصول کے لیے بیرونی ملک سفر اختیار کیا جاتا ہے مقامی لوگوں کو اسکالرشپ کے جھانسے میں پھنسا کر ترقی پذیر ملکوں کے ذہین لوگوں کو اپنا بنایا جا رہا ہے اس تمام صورتحال میں مقامی ثقافتیں بری طرح سے متاثر ہو رہی ہیں اپنی مقامی ثقافتوں سے دوری کو ترقی سے تعبیر کرنے کی سوچ سرائیت کر رہی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ مقامیت اکثر تبدیل نہ بھی ہو تو اس کے اثرات سے متاثر ضرور ہو گی مقامی لوگوں کو مقامی چیزوں کے استعمال رسم و روائی سے ذرائع حمد و رفت مشینوں کی آمد نے سہولتوں میں اضافے کے

ساتھ ساتھ انسان کی آپس کی جرٔت بھی ختم کر دی ہے۔انسانوں کی جگہ مشینوں نے لے لی ہے۔اب تو ٹیکنالوجی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ انسانوں کا کام ریوبوٹوں اور مشینوں سے لیا جا رہا ہے۔ مشینی ایجادات نے سہولتوں کے ساتھ ساتھ معاشرے قدروں کو بھی مات دے دی ہے۔ذرائع آمدورفت میڈیا کی رسائی نے دور بیٹھے لوگوں کو بھی بڑے مراکز کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ مقامی علاقوں میں رہنے والے لوگ مغرب کی تہذیب کے فریب میں گرفتار ہو کر اپنی مقامیوں سے بیزار ہو رہے ہیں۔ نئی نسل بڑی حد تک جدیدیت کے دل فریب نظاروں سے متاثر ہو کر اسی جانب گامزن ہے۔اس طرح سے لوگوں کی اپنی مقامی ثقافتی شناخت کے معدوم ہونے کا خطرہ لاحق ہے اور وہ اپنی مقامی شناخت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔

معاشی اثرات:

عالمگیریت کے اثرات کا آغاز معاشی اثرات سے شروع ہوا۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں نے اپنے کاروبار کو وسعت دے کر چھوٹے ممالک اور علاقوں تک پھیلا دیا ہے۔ان کمپنیوں کا کاروبار کئی ملکوں تک پھیل چکا ہے لوگ برانڈ کے نرغے میں اس قد آ چکے ہیں کہ وہ ان کمپنیوں کی چیزوں کو استعمال کرنا ہی خود کو مہذب سمجھنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ان مالیاتی کمپنیوں کا کاروبار اس قدر وسیع اور طاقتور ہو چکا ہے کہ ریاستوں کی معیشت کا دارومدار ان سے جڑ گیا ہے۔یہ مالیاتی کمپنیاں اس قدر طاقتور ہیں کہ ریاستیں بھی بعض جگہوں پر ان کے سامنے بے بس ہیں۔ان بین الاقوامی کمپنیوں سے مقامی کاروبار متاثر ہو رہے ہیں لوگ ان مصنوعات کی طرف بڑی تعداد میں راغب ہو کر اپنی مقامی مصنوعات کو ترک کر دیتے ہیں۔

"عالمگیریت کا معاشی پہلو اکثر مقامی معیشتوں کو مٹا دیتا ہے اور تنوع کی جگہ یکسانیت کو فروغ دیتا ہے۔"(33)

مقامی مصنوعات کی جگہ ان مصنوعات کی بڑھتی طلب نہ صرف ان کے معاشی اثرات مرتب ہو رہے ہیں بلکہ مقامی ثقافتوں کو بھی تبدیلی کا سامنا ہے۔ خوراک، لباس، طرز رہن سہن ہر سطح پہ ان کمپنیوں کے اجارہ داری ہے۔روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کی بھی کثرت ان ملٹی نیشنل کمپنیوں سے تعلق رکھتی ہے۔ مقامی مصنوعات کی طلب میں نہ صرف کمی ہو رہی ہے بلکہ ان کی رسائی بھی باہر کی مارکیٹوں میں نہیں ہو پا رہی۔ مقامی صنعتوں کو زوال آ رہا ہے۔ مقامی صنعتوں کی جگہ ان مصنوعات نے لے لی ہے۔ معاشی اجارہ داری بھی ان کمپنیوں کی قائم ہو چکی ہے۔ مقامی مصنوعات کی جگہ ان مصنوعات کو ترجیح دے کر اپنے احساس کمتری کا ازالہ تصور کیا جا رہا ہے۔ مقامی صنعتوں کو زوال آنے کے ساتھ ساتھ سرمایہ درانہ نظام بھی مضبوط ہو رہا ہے۔

لسانی اثرات:

انگریزی زبان کو گلوبل لینگوئج (عالمی زبان) کا مقام حاصل ہے۔ اس زبان میں تمام الیکٹرانک مشینیں، موبائل، انٹرنیٹ، ویب گاہیں اور دوسرے ذرائع چل رہے ہیں۔ اس سے قبل باقی عوامل کا جائزہ لیا جاچکا ہے کہ کس طرح عالمگیریت مقامی عناصر کو متاثر کر رہی ہے۔ اس عالمی زبان کا اثر روز بروز بڑھ رہا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر ہونے والے معاملات میں اسی زبان کا عمل دخل ہے۔ یہ زبان مقامی زبان پہ اثر انداز ہو رہی ہے۔ مثال کے طور پر پاکستانی معاشرے کو دیکھا جائے تو اردو قومی زبان ہونے کے باوجود تعلیمی ادارے ہوں یا عام روزمرہ کی زندگی انگریزی کو ہی ہر حوالے سے برتری حاصل ہو چکی ہے۔ بول چال میں اردو زبان بولنے کے باوجود اس میں انگریزی الفاظ کی بھرمار ہے۔ تعلیمی اداروں میں برتری اسی گلوبل لینگوئج کی ہے۔ طلبہ قومی زبان کو قدرِ بوجھ سمجھنے لگے ہیں۔ محاورات، الفاظ میں انگریزی کی کثرت ہے۔ یہ صورتحال بڑے ملکوں یا شہروں تک نہیں بلکہ مقامی سطح پر بھی یہی صورتحال ہے۔ دور دراز کے دیہات میں بیٹھا آدمی بھی زبان سے اس قدر واقف ضرور ہے کہ وہ اسے پڑھ سکتا ہے۔ مقامی زبانوں کے متبادل مترادفات ہونے کے باوجود انگریزی زبان کے الفاظ کے استعمال کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لکھنے میں بھی دکانوں کے بورڈ ہوں یا اشتہارات انگریزی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مقامی زبانوں کو انگریزی حروف تہجی میں لکھنے کی وجہ سے مقامی زبانوں کے الفاظ اور املا کے معیار میں فرق آیا ہے۔ مجموعی طور پر گلوبل لینگوئج کی وجہ سے مقامی زبانوں کے بولنے والے افراد کی تعداد میں کمی ہونے کے ساتھ ساتھ معیار میں بھی کمی آتی جارہی ہے۔ ترقی پذیر ممالک نے گلوبل لینگوئج کے اثرات کو زیادہ قبول کیا ہے۔ مقامی لوگ بڑی تیزی سے دوسری زبان کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ زبان رابطے کا ذریعہ ہے مگر اس زبان کے ذریعے سے استعماری قوتوں اور گلوبل ویلج کا تصور دینے والوں نے اپنی زبان کی آبیاری اس طرح سے کی ہے کہ لوگ اپنی زبان اور مقامی شناخت کو ہی بھلا بیٹھے ہیں۔ زبان کسی بھی علاقے کی مقامیت کی ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس زبان میں نہ صرف رابطہ بلکہ مقامی ثقافتی عناصر بھی کارفرما ہوتے ہیں جس سے وہ اپنا مدعا بہتر انداز میں بیان کر سکتے ہیں۔ زبان کا یہ مسئلہ سنگین صورتحال اختیار کرتا جارہا ہے اور دوسری زبانوں کے الفاظ سے مقامی زبانیں اپنی اصل شناخت کو کھوتی جارہی ہیں۔

شناخت کا مسئلہ:

عالمگیریت کے اثرات میں سے ایک اہم مسئلہ مقامی شناخت کے بحران کا پیدا ہونا ہے۔ ہر انسان کی علاقائی، آبائی شناخت ہوتی ہے۔ وہ جس ماحول میں پلتا، بڑھتا جنم لیتا ہے وہ مخصوص فضا اور ماحول اس کی پہچان ہوتی ہے۔ عالمگیریت کے جھانسے میں فرد اس گلوبل ویلج کا فرد بننے کی صورت میں اپنی اصل شناخت سے محروم ہو جاتا ہے۔ بڑی ثقافتوں کا حصہ بن کر وہ اپنی اصل شناخت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اصل بھیانک صورتحال اس وقت جنم لیتی

ہے جب یہ بڑی شناخت اس کو مکمل اپنانے سے عاری ہو جاتی ہے۔ وہ کوشش کے باوجود بھی اس بڑے تصور کا حصہ نہیں بن پاتا۔ کچھ نہ کچھ مقامی پن اس کے آڑے ضرور آجاتا ہے۔ ایسی صورتحال میں واپس پلٹنے کے سوا چارہ نہیں ہوتا۔ مگر اس کا موقع کم ہی میسر آتا ہے۔ آدمی اپنی اصل شناخت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک اور صورت چھوٹے علاقوں کا بڑے علاقوں میں انضمام بھی ہے۔ کچھ لوگ بہتر زندگی کے حصول کے لیے ان بڑے ملکوں میں جاتے ہیں وہاں کی رسم ورواج اپنا لیتے ہیں۔ اس طرح بھی مقامیت اپنا وجود ختم کر دیتی ہے۔ بڑے علاقوں میں ضم ہونے کے باوجود بھی مقامی شناختی بحران کا مسئلہ جنم ضرور لیتا ہے۔

مقامیت کے تصورات:

مقامیت ایک وسیع اصطلاح ہے۔ مقامیت کا تصور آتے ہی ذہن میں اس قدر خیال ضرور آتا ہے کہ اس سے مراد کسی مقامی ثقافت کا بیان ہے۔ مقامیت کو عموماً یہی خیال کیا جاتا ہے کہ مقامیت سے مراد محض مقامی ثقافت کا بیان ہے مگر مقامیت کے مختلف تصورات ہیں۔ مقامیت کسی ایک شعبے تک محدود نہیں ہے۔ اس کا تعلق مختلف سماجی عوامل سے ہے۔ مقامیت کی مختلف صورتوں کے حوالے سے آئندہ صفحات میں بحث کی جائے گی۔ مقامیت کو اس کے وسیع تصورات میں دیکھنا ضروری ہے کہ مقامیت پہ کون سے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں اور کون سے عوامل مقامی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کسی بھی علاقائی ثقافت یا شناخت کو یک دم نہ تو ختم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اپنے اثرات کو مکمل مقامیت پہ نافذ کیا جا سکتا ہے۔ مقامیت کا تعلق مختلف سماجی اداروں اور صورتوں سے ہے۔ سماجی زندگی میں مقامیت کا گہرا تعلق ہے۔ جس کی وضاحت الگ سے عناصر میں کی جائے گی۔ مقامیت کے گہرے لسانی سماجی مذہبی تصورات موجود ہیں بعض اوقات بڑے بیانیے چاہتے ہوئے بھی اپنے تسلط کو اس پہ نافذ نہیں کر سکتے۔

مقامیت مختلف اعتبار سے اپنی اہمیت منواتی ہے۔ عالمگیریت کے عوامل نے اس پہ اثر انداز ہونا شروع کر دیا ہے۔ مختلف حوالوں سے مقامیت کے تصورات کو معدومیت سے دوچار کیا وہیں مقامیت بھی مختلف حوالوں سے اپنا وجود برقرار رکھتی ہے۔ مقامیت کی یہ صورتیں اپنی اہمیت کو بار آور کراتی ہیں کسی بھی ثقافتی اکائی میں وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہو اس کے اثر کو کم کرنے کے لیے اس مقامیت کا سہارا ہی لیا جاتا ہے۔ اس کو سمجھے بغیر اس کے سماجی عوامل کو مقامی تناظر میں سمجھے بغیر اس کے وسیع تناظر کو سمجھنا مشکل ہے۔

سماجی مقامیت:Social localization

سماجی مقامیت سے مراد کسی خاص گروہ یا شخص کے نظریات و افکار کو اس کے مخصوص سماجی ماحول، ثقافت، تاریخ اور معاشی حالات کے تناظر میں سمجھنا ہے۔ کسی بھی سماجی تصور مثلاً رسم و رواج، رہن

سہن، سماجی رویے، اصولوں کو اس کے مخصوص حالات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ جہاں سے اس کا تعلق ہے یا جہاں یہ واقعہ ہوا ہے۔

زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً لباس خوراک رسم و رواج تعلیم و فن کو اس کے مخصوص سماجی ماحول کے تناظر میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کا تعلق مقامی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ان تمام عوامل کو ان کے مخصوص ماحول میں ہی پرکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً خوراک، لباس کا تعلق کسی خاص مقامیت میں الگ ہو گا۔ اس کا وسیع تناظر میں جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آئے گی کہ اس کا موسم، جغرافیائی حالات، مقامی رسم و رواج اور مذہبی عوامل کا بھی اس پہ اثر ہے۔ وہ محض لباس نہیں بلکہ مختلف مقامی عوامل کا مجموعہ اور آئینہ دار ہے۔ اس کو اس مقامیت کے تصور کے تحت ہی پرکھا جا سکتا ہے۔ یہ خاص مقامی ماحول اس مقامیت کی پیداوار یا شناخت کہلاتا ہے۔ مقامیت کا سماجی تصور یہ ہے کہ کسی بھی سماجی مظہر کو اس کے سماجی سیاق و سباق کی روشنی میں دیکھا اور سمجھا جائے۔

"سماجی مقامیت ایسا عمل ہے جس میں عالمی طریقہ کار میں سماجی اور ثقافتی اصولوں کو شامل کیا جاتا ہے تا کہ وہ مقامی سطح پر قابل قبول اور متعلقہ بن سکیں۔"(34)

مقامیت کے سماجی تصور کے کئی اہم رخ ہیں۔ موجودہ زمانہ گلوبلائزیشن کا زمانہ ہے۔ بڑی ثقافتوں کی اقدار بڑی تیزی سے مقامی ثقافتوں پہ اندر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ اس کے باوجود مقامیت کے سانچے میں ان کو ڈھلنا پڑتا ہے۔ مقامیت کے تصور کو سمجھے بغیر ان کو مقامیت پہ لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ مقامیت کو ملحوظ خاطر رکھ کر اس کی آبیاری کی جا سکتی ہے۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں دی جا رہی ہیں۔

تعلیمی نظام اور نصاب تعلیم کسی بھی مقامی ثقافت کا وہ اہم وسیلہ ہے۔ جو اس کی تاریخ، اس کی سماجی اقدار کو نئی نسل تک منتقل کرنے کا اہم ذریعہ ہوتی ہے۔ تعلیم کے تصور کے ذریعے سے ہی مقامی لوگوں کے حالات اور سوچ کو بدلہ جا سکتا ہے۔ اس نظریے کے تحت کئی چھوٹے علاقوں یا پسماندہ ممالک میں مغربی طرز کے نصاب کو اپنایا جاتا ہے ۔اس کو ترقی کا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے یا اس کے پیچھے جو بھی محرک ہوں اسے لاگو کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی ایسا نصاب جو کہ کسی اور قوم یا معاشرے سے آیا ہوا سے مقامی تصور سے جوڑے بغیر نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو کسی خاص مقامی علاقے میں نافذ کرنے سے قبل معاشرے کی اخلاقی سماجی قدریں قدروں کو دیکھ کر اس کے مطابق ڈھالا جائے گا۔ مثلاً انگریزی زبان کے تراجم جب روایتی معاشرے میں ہوں گے تو ایسے تمام الفاظ، واقعات یا مقامی ثقافت کے مزاج کے خلاف اور اخلاقی قدروں سے ہٹ کر ہوں گے ان کی نفی کر دی جائے گی۔ مقامی اخلاقی قدروں اور رسم و رواج، زبان کا تعین کیا جائے گا۔ اس طرح مقامیت کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

دوسرا اہم ذریعہ میڈیا ہے۔میڈیا کی یلغار مشرق سے مغرب تک یکساں ہے۔مغرب اور جدید ترقی یافتہ بڑی ثقافتوں کے بیانیوں اور اقوام کا چرچا ہر جگہ ہے۔ان کو ترقی پذیر پسماندہ ممالک میں بڑی تیزی سے پھیلنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ایسی صورتحال میں ملٹی نیشنل کمپنی ہر جگہ آرہی ہیں۔میڈیا کے ذریعے اشتہار مہم چلائی جاتی ہے کسی بھی چھوٹی علاقائی ثقافت، علاقے میں اشتہاری مہم بھی مقامیت کے مزاج کے مطابق ڈھالی جائے گی۔مقامی لباس، زبان ، سماجی اقدار کے مطابق بنایا جائے گا۔

"سماجی مقامیت اس نظریے کا حصہ ہے جسے گلوبلائزیشن کہا جاتا ہے یعنی کسی عالمی خیال کو مقامی تہذیب و معاشرت کے سانچے میں ڈھالنا۔"(35)

مقامی سماجیت میں میڈیا کو بھی مقامی انداز اپنانا پڑتا ہے۔اس کے تحت وہ اپنے نظریے کی آبیاری ہی کیوں نہ ہو مگر اس کے مقامی انداز میں ڈھالے بغیر ممکن نہیں بنایا جا سکتا۔مقامی لباس، مقامی ماحول، مقامی زبان کے تحت ہی مقامی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے۔سماجی مقامیت ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے اور مقامی عوامل کو سمجھتے ہوئے بھی مقامی نظریے کو سمجھنا ممکن ہے۔سماجی مقامیوں کو مقامی انداز اور فکر کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ بھی تصور کیا جا سکتا ہے۔

مذہبی مقامیت: Religious localism

مذہب ایک بڑا تصور ہے۔مذہب عموماً بڑے عالمگیر تصور کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔یعنی مذہب کا بدلاؤ ہر مقامی علاقے یا خطے کے ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے۔ایک مذہب کئی علاقوں، ملکوں تک بھی وسیع ہو سکتا ہے۔مثلاً اسلام اور عیسائیت وغیرہ بڑے مذاہب میں سے ہیں۔دنیا کے ہر حصے میں ان کے ماننے والے موجود ہیں۔مذہبی مقامیت سے مراد مذہب کا وہ خاص تصور جو کسی مخصوص علاقے جغرافیہ کی مذہبی اہمیت کو بیان کرے مذاہب کی مقامی سطح پہ قائم تصور کی تفصیل سے آگاہ کریں۔مذہب کی مقامی ثقافت کے ساتھ مل کے جو شکل سامنے آتی ہے وہ مقامی مذہبی تصورات کہلاتی ہے۔

"مذہبی مقامیت سے مراد وہ عمل ہے جس کے ذریعے کوئی مقصود جغرافیائی مقامی مذہبی یا روحانی اہمیت حاصل کرتا ہے اور لوگوں کے مذہبی شعور میں مرکزی حیثیت اختیار کرتا ہے۔"(36)

مذہب اور مقامیت کا گہرا تعلق ہے۔جب مذہب کسی اور جگہ سے آئے تو اس کے اثرات مقامیت پہ پڑتے ہیں۔اسی طرح سے مقامی رسم و رواج، زبان اور عقائد کا بھی مذہب پر اثر پڑتا ہے۔اسلام ایک آفاقی مذہب ہے مگر اس کے باوجود بعض علاقوں میں مقامی مذہبی رسومات موجود ہیں۔مقامی ثقافت نے مذہب کو متاثر کیا اسی طرح عقیدہ جب فروغ پاتا ہے تو مقامی رسم و رواج رہن سہن تک کو متاثر کرتا ہے۔مقامیت کے اثرات اور مذہب دونوں ایک دوسرے کے اثرات کو قبول کرتے ہیں۔پنجاب میں ہندوستان کی تقسیم کی قبل سکھوں اور مسلمانوں کی اکثریت تھی

جاٹ برادری میں سکھ اور مسلمان دونوں تھے مگر مذہب کے فرق کے ساتھ لباس، خوراک اور رسومات میں بھی فرق تھا۔ دونوں مذاہب کی اپنی شناخت تھی۔

مذہبی رسومات میں مقامی عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔ مذاہب ایک ہونے کے باوجود علاقائی ثقافتوں کے اثرات اس کی رسومات اور ارکان کے ادائیگی میں فرق ڈال دیتے ہیں۔ مقامی رسم ورواج مخصوص فضا میں پروان چڑھتا ہے۔ لوگ ان کو مقامی رنگوں میں پرو دیتے ہیں۔ اسلام کی یہی مثال دی جائے تو عرب و عجم میں اس تناظر میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ صوفیانہ عقائد کے تناظر میں کئی مذہبی عقائد مقامی رنگوں میں رنگے نظر آتے ہیں۔ مثلاً عرب میں محرم اور ربیع الاول کی صورت مختلف ہے۔ ہمارے ہاں برِصغیر میں جلوس کی صورتوں میں عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے ۔ مذہبی مسالک کی وجہ سے بھی مذہبی رسومات میں فرق دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً مزارات پہ قوالیاں اور تقریبات محرم کے جلوس، عید میلادالنبی کے جلوس، نیازوں کی تقسیم ان تمام رسومات کا تعلق مقامی ثقافت سے ہے۔ مقامیت کے زیر اثر پروان چڑھنے والی یہ رسومات مذہب کا مستقل حصہ تصور کی جانے لگتی ہے اور ان کے نفاذ میں اس قدر شدت کی جاتی ہے کہ ان کے بغیر مذہب کا تصور ادھورا تصور کیا جاتا ہے۔

مذہبی شناخت میں مقامی جغرافیہ کا بھی اہم کردار ہوتا ہے۔ مقامیت، مذہب کے تصور کو متاثر کرتی ہے۔ اس کا خاص ماحول، مقامی ثقافتی رسومات اس کی خاص پہچان ہوتی ہیں۔ مقامی جغرافیہ اس کی مخصوص شکل واضح کرتا ہے ۔ مثلاً گرم علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کا لباس مختلف ہوگا اور سرد علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کا لباس مختلف، ان کی ظاہری حالت، اس طرح ان کی خوراک کی بات کی جائے تو عرب کے گرم علاقوں اور کشمیر اور گلگت کے مسلمانوں کی خوراک میں بھی فرق ہوگا۔ یہ خوراک جغرافیائی، ماحول انسان کے مجموعی مزاج کو بھی مختلف بناتا ہے اور ان کی ظاہری پہچان میں بھی فرق آجاتا ہے۔

بعض مقامی علاقوں میں مختلف فرقوں کے لوگ ہوتے ہیں اور بعض میں اس کے مخالف فرقوں کے لوگ اس طرح سے بھی ان کی مقامی شناخت تشکیل پاتی ہے اور وہ اس جغرافیہ کے ساتھ مخصوص حقائق کے حامل لوگوں کی مخصوص شناخت بن جاتی ہے۔ بعض جگہوں پہ صورتحال اس سے مختلف بھی دکھائی دیتی ہے۔ اسلام کے آفاقی تصور نے اس کی علاقائی شناخت کو نمایاں کر دیا ہے۔ مقامیت کا مذہبی تصور بہرحال اس کے باوجود کسی نہ کسی صورت میں قائم رہتا ہے۔

کچھ علاقوں میں مذہبی ساکھ کے حامل لوگ سیاسی اہمیت بھی رکھتے ہیں۔ اس طرح ان کا سیاسی مقامی عنصر ان کی پہچان بن جاتا ہے مثلاً افغانستان پر اس وقت طالبان کی اسلامی حکومت ہے تو ان کی مقامی ثقافتوں پر بھی اس کے

اثرات نمایاں ہوں گے۔ مقامی حوالے سے ان کی مخصوص پہچان اور شناخت بن جائے گی ان کا اثر رسوخ بھی زیادہ ہوگا اور وہ محض مذہب کے تصور کے حامل نہیں بلکہ مخصوص شناخت اور طاقت کے حامل بھی ہوں گے۔

اس تمام بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقامیت کا مذہبی پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔ جہاں مذہبی ثقافت کے ملاپ سے مخصوص فضا تشکیل پاتی ہے کہیں مذاہب اپنے اثرات کو مقامی ثقافت پر اور کہیں مقامی ثقافت ان مذاہب پر اثرانداز ہوتی ہے۔ اس امتزاج سے مذہبی مقامیت کی مخصوص شکل پروان چڑھتی ہے جو اس نظریے کی تائید ہے کہ وہ مقامیت کا مذہبی پہلو بھی اس کا اہم شعبہ ہے۔

تجارتی، معاشی مقامیت:Commercial and economical localism

کسی بھی علاقے کی تجارت اور معاشی سرگرمیاں اس کے لیے نہایت اہم ہوتی ہیں۔ کسی بھی علاقے میں تجارت کرنا اس کے جغرافیائی، معاشی حالات کے سیاق وسباق کے بغیر ناممکن ہیں جغرافیائی حالات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہی اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ بیرونی سرمایہ کاروں کو سرمایہ کاری کرنے سے قبل تجارتی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مقامی بازاروں کی نوعیت، گاہکوں کی معاشی حالت، مقامی رسم ورواج، جغرافیائی حالات کو ملحوظ خاطر رکھنا لازم ہوگا۔ ان تمام امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تجارتی سرگرمیاں کی جائیں گی۔ اشیاء کی طلب اور عوامی کے مقامی مزاج کو بھی مد نظر رکھنا پڑے گا۔

ہر مقامیت کا اپنا مخصوص معاشی نظام ہوتا ہے۔ تجارتی مقامیت کسی بھی مقامیت کے معاشی نظام ذریعہ معاش سے بحث کرتی ہے۔ مقامی معاشی نظام کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ جغرافیائی حالات بھی اس میں ہم کردار ادا کرتے ہیں مثلا پہاڑی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کا ذریعہ معاش غلہ بانی بھی ہوتا ہے تاہم کچھ پہاڑی علاقوں میں رہنے والے افراد وہاں وجود آنے والی صنعتوں سے بھی جڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئلے کی کانیں، سنگ مرمر کے ذخائر جن علاقوں میں دریافت ہو جاتے ہیں ان کی معاشی حالت کا دارومدار اس کے گرد گھومتا ہے۔ بیرونی تجارت کرنے والوں کو بھی اس کے مطابق اپنے کاروبار کی بنیاد رکھنا پڑے گی۔

معاشی مقامی صنعتوں کی موجودگی روزگار کے مواقع قدرتی وسائل مقامی نوعیت کی فصلیں بنیادی معاشی ڈھانچے کو وضع کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جغرافیائی حالات اور مزاج بھی اس کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ مثلا پہاڑوں میں بسنے والے پتھروں کان کنی، غلابانی کی طرف ہی مائل ہوں گے۔ وہ اپنے روزگار کو اسی میں تلاش کریں گے۔ تجارتی حوالے سے بھی مقامی علاقوں میں بننے والی مصنوعات کی بازاروں میں رسائی، منڈیوں تک رسائی، خریداروں کا مزاج، تعداد، معاشی حالت اور طلب ورسد کے امور کو بھی ملحوظ خاطر رکھتی ہے۔ بیرونی تجارتی لوگ ہوں یا مقامی لوگ تجارت کرنے جائیں دونوں صورتوں میں ان امور کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس مقامیت کا معاشی

نظامی مقامیت کا اہم حصہ ہے۔ صورتحال کا اثر مقامیت کی دوسری حالتوں پہ بھی بہر حال پڑتا ہے۔ مقامی حالت مقامی لوگوں کے مزاج کو بھی متعین کرتی ہے۔ آسودہ حال معاشرہ ذہنی طور پر زیادہ متحرک ہو گا۔

سیاسی مقامیت: Political localism

سیاسی مقامیت سے مراد سیاسی نظام کی مقامی صورت یا سیاسی اختیارات کو مقامی سطح پہ منتقل کرنا ہے۔ مقامی کمیونٹیز کو اختیار تفویض کیے جاتے ہیں۔ ان مقامی کمیونٹیز کو فروغ دیا جاتا ہے۔ سیاسی مقامیت مرکزی حکومت یا Cenrtlized system کی ضد بھی ہے۔ یہ اختیارات کو مرکزیت کے بجائے مقامی سطح پہ منتقل کرنے پہ زور دیتی ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی مقامیتوں سے مراد وہ تمام سیاسی نظام بھی ہیں جو کسی مقامیت میں مخصوص انداز میں ہوتے ہیں مثلاً بلوچستان اور خیبر پختون خواہ کے قبائلی علاقوں میں مقامی سیاسی نظام موجود ہے۔ ان کے اس نظام میں روایت کا خاصا عمل دخل ہے اور وہ اس کے تحت فیصلہ سازی کرتے ہیں۔ مقامی طور پر عدالتی اور دوسرے نظام قبائلی عمائدین کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ اگر مقامی کمیونٹیز کو فال کر دیا جائے اور مقامی سطح پہ اختیارات حاصل ہوں تو اس سے مقامیت کے سیاسی نظام میں تسلسل اور بہتری پیدا ہو گی۔

مقامی سیاسی عمائدین مقامی مسائل ضروریات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ وہ عوام کے مزاج و ضروریات سے بخوبی واقف ہوں گے۔ ان کے اختیارات ملنے سے وہ ان کا بہتر طور پہ حل کر سکتے ہیں۔ عوام کے مقامی نمائندے اسی نظام کا حصہ ہونے کی وجہ سے ان مسائل سے بہتر طور پر واقف ہو سکتے ہیں جن کا مقامی لوگ شکار ہیں۔ وسائل کی منصفانہ تقسیم اور حقداروں تک ان کا حق بہتر طور پر منتقل ہو سکے گا۔ محض مفروضوں پہ چلنے کے بجائے مقامی لوگوں کے مسائل کا بہتر طور پہ حل کر سکیں گے۔

ادب میں سیاسی مقامیوں سے مراد فن پارے میں سیاسی سماجی مسائل کا بیان اور ترجمانی ہے۔ مقامیت کے بیان میں اس مقامیت کے سیاسی نظام کو بیان کیا جاتا ہے۔ جاگیردارانہ سماج، زمینوں کے تنازعے، مرکزی انتظامیہ کی ملی بھگت یہ تمام امور ادب میں سیاسی مقامیت کی ذیل میں بیان ہوتے ہیں۔ کسی مخصوص مقامیت کے بیان میں اس کے سیاسی نظریات کا بھی علم ہوتا ہے۔ مختلف مقامی علاقوں کے سیاسی نظام سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس سیاسی نظام کے اثرات کا جائزہ بھی بلوسطہ یا بلاواسطہ شامل ہو جاتا ہے بعض اوقات مرکزی سیاسی بیانیے بھی اس مقامی بیانیے کے مطابق ڈھلتے ہیں۔ مقامی سیاسی نظام مرکزی سیاسی نظام کے مسلط ہونے کے خلاف رد عمل بھی دے سکتا ہے۔

مقامی سیاسی نظام کو سمجھے بغیر اس پہ بڑا سیاسی نظام نافذ کرنے سے خاطر خواہ نتائج بھی بر آمد نہیں ہوں گے۔ بعض ادیب کسی مقامی سیاسی واقعے کو بنیاد بنا کر ہی کہانی لکھتے ہیں۔ اس کے ذریعے بھی مقامی بیانیہ ابھرتا ہے۔ تاریخی تناظر میں کسی بڑے سیاسی فیصلے کے اثرات بھی مقامی تناظر میں دکھائی دیتے ہیں۔

سیاسی مقامیت میں ان تمام پہلوؤں کے ذریعے سیاسی مقامی نظام کا علم ہوتا ہے۔سیاسی مقامیت بھی باقی عوامل کی طرح مرکزی سیاسی نظام پر اثرات مرتب کرتی ہے۔کئی علاقوں میں آج بھی مقامی لوگوں کو کچھ سمجھانے کے لیے جرگوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ان تمام پہلوؤں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سیاسی مقامیت بھی مقامیت کا اہم شعبہ ہے۔

مقامیت اور ادب کا تعلق:

ادب کا سماج سے تعلق اور سماج کا ادب سے تعلق ہونا لازمی امر ہے۔کوئی بھی ادیب کسی معاشرے کا ترجمان ہوتا ہے اور اس کے اثرات کو قبول بھی کرتا ہے۔شاعر ہو یا ادیب وہ اپنے سماج کا بیان کسی نہ کسی طور پہ ضرور کر رہا ہوتا ہے۔یہ بات تو واضح ہے کہ سماج اور ثقافت کا اثر ادیب کے تخلیقی شعور پہ ضرور ہوتا ہے۔مابعد جدیدیت بھی ثقافتی پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے معنی کی تکثیریت کی قائل ہے۔اردو ادب کی تاریخ پہ نگاہ دوڑائی جائے تو ثقافتی عناصر تو آغاز سے ہی شعر و ادب کا حصہ رہے ہیں۔میرؔ و غالب، مصحفیؔ و انشاءؔ ہوں یا جراتؔ و داغؔ سب کے ہاں ثقافتی بیانیہ دیکھنے کو ملتا ہے۔اس عہد میں دبستان دلی اور لکھنؤ کی چھاپ اس قدر حاوی تھی کہ مقامی ثقافتی عناصر ان دونوں ثقافتوں کی ذیل میں پروان نہ چڑھ سکے۔شعر و ادب کے جو جوہر ان دبستانوں میں تخلیق ہوئے۔ان میں کسی دوسری چیز کی گنجائش ہی کم رہی اور اگر کچھ ادب تخلیق بھی ہوا تو ان کے سامنے وقت کی گرد میں دھندلا گیا۔

نظیرؔ اکبر آبادی اور اکبر الٰہ آبادی نے اس جمود کو توڑا۔بطور خاص نظیرؔ نے غزل کی مشکل پسندی کے بجائے نظم کو ذریعہ اظہار بنایا۔نظیرؔ اکبر آبادی نے ایسے وقت میں نظم کا انتخاب کیا جب غزل اپنے موضوعات اور فن کے اعتبار سے بلندیوں کو چھو رہی تھی۔استعارات کی بلندی، زبان و بیان کی شگفتگی اپنے عروج پہ تھی۔نظیرؔ نے مقامی موضوعات کو موضوع سخن بنانے کے ساتھ ساتھ ان کے بیان میں مقامی بولیوں کے الفاظ کو بھی شامل کیا۔یوں اردو ادب دبستان لکھنو اور دلی کے سحر سے نکل کر عوامی نوعیت کے ادب سے روشناس ہوا۔نظیرؔ اکبر آبادی کی نظم کے موضوعات میں ہندوستان کی ثقافت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ان کے موضوعات میں عوامی مسائل، عوامی لب و لہجہ اور چھوٹے موضوعات کی کثرت ملتی ہے۔اکبر الٰہ آبادی بھی مقامی تہذیب و ثقافت کا مغربی تہذیب سے موازنہ کر کے اس کا دفاع کرتے دکھائی دیتے ہیں۔بیسویں صدی میں نظم کے فروغ نے اس بیانیے کو بھی مزید فروغ دیا۔مجید امجد، ناصر کاظمی، منیر نیازی، قتیل شفائی، ن۔م۔راشد، وزیر آغا اور جانثار اختر جیسے شعراء کے ہاں بھی یہ بیانیہ ملتا ہے

۔

بیسویں صدی انقلاب کی صدی ہے جس نے ہر شعبہ زندگی کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی اپنے اثرات سے متاثر کیا۔نثر کی بات کی جائے تو افسانے کی صنف نے ترقی کا سفر طے کر کے بلندی بھی حاصل کی۔اس کے ساتھ ساتھ ناول نگاری، ڈرامہ سفر نامہ، انشائیہ کی اصناف نے بھی نئی راہوں کا انتخاب کرتے ہوئے اپنی اہمیت کو ثابت کیا۔ناول

میں دوسری اصنافِ نظم و نثر کے اعتبار سے منظر نگاری کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے۔ ناول نگاروں نے عمومی موضوعات کے ساتھ ساتھ مقامی نوعیت کے موضوعات کو بھی اپنے قلم کی زینت بنایا اور افسانہ نگاری نے بھی اپنا لوہا منوایا۔ سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، منٹو، غلام عباس، انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، بیدی، بلونت سنگھ، شوکت صدیقی، احمد ندیم قاسمی سے ہوتا ہوا منشا یاد، رشید امجد اور حمید شاہد تک پہنچا۔ افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے ہاں متنوع موضوعات کے ساتھ ساتھ متنوع ثقافتوں کا بیان بھی ملتا ہے۔ پریم چند نے دیہات نگاری کو بیان کرتے ہوئے مابعد جدیدیت کے اصولوں کی طرح شہروں سے دیہاتوں، چھوٹی ثقافتوں کی طرف انحراف کیا۔ ان کے افسانوں میں دیہات نگاری کے بیان کی ذیل میں مختلف سماجی و ثقافتی عوامل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ منٹو کے ہاں تقسیم ہند، ہجرت اور طوائف کے موضوعات کے ساتھ ساتھ لاہور کی مقامی ثقافت اور ہندوستان کی مقامی ثقافت کا بیان بھی ملتا ہے۔ ان کے افسانوں میں لاہور کی ثقافت کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ غلام عباس دھیمے لہجے کے افسانہ نگار جنہوں نے زیر لب ادبی پیرائے میں معاشرے میں موجود مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ لاہور کی ثقافت کا بیان بھی ملتا ہے۔ شوکت صدیقی کا نام ناول نگار اور افسانہ نگار دونوں کے لحاظ سے نمایاں ہے۔ شوکت صدیقی کے ہاں کراچی کی ثقافت، اس کی شہری زندگی کے مسائل اور انڈرورلڈ کا بیان ملتا ہے۔ بیدی اور بلونت سنگھ کے افسانوں میں پنجاب کی ثقافت کا بیان ملتا ہے۔ پنجاب کی ثقافت، معاشرتی مسائل کا بیان رسوم و رواج توہمات پرستیاں ان سب کا بیان اس ثقافت کی ذیل میں ملتا ہے۔ پنجاب کے دیہاتوں میں سماجی معاملات، رسوم و رواج، بود و باش اور مختلف ثقافتی عوامل کو ادب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اردو ادب میں پنجاب کی مقامی ثقافت کو بیان کر کے مقامیت کی روایت کو وسعت دی گئی۔ احمد ندیم قاسمی اور منشا یاد کے ہاں بھی مقامی نوعیت کے مسائل اور چھوٹی ثقافتوں کا بیان ہے۔ منشا یاد کے ہاں بھی دیہات نگاری کا عنصر غالب ہے۔ پنجاب سے تعلق کے باعث ان کے افسانوں میں پنجابی ثقافت کا بیان کثرت سے ملتا ہے۔ حمید شاہد، رشید امجد جدید افسانہ نگاروں کے نمائندے ہیں۔ ان کے ہاں جدید انسان کے مسائل، مشینی زندگی کے فوائد اور نقصانات کے ساتھ ساتھ راولپنڈی، اسلام آباد کی مقامی ثقافتوں کا بیان بھی کسی حد تک ملتا ہے۔ اردو افسانے کا مختصر ترین جائزہ لینے کا مقصد اس کے ہاں مقامیت کی روایت کا جائزہ لینا ہے۔ اس کے علاوہ انشائیہ کی بات کی جائے تو اس روایت میں وزیر آغا کا نام نمایاں ہے۔ وزیر آغا کا تعلق پنجاب کے ضلع سرگودھا سے ہے۔ ان کے انشائیوں میں مقامیت کے عناصر موجود ہیں۔ ان کے اکثر انشائیوں کا تعلق ان کی دیہات کی زندگی سے ہے جو اپنے ثقافتی پہلوؤں کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

سفر نامہ کی تو بنیاد ہی عموماً مقامی نوعیت پہ ہوتی ہے۔ جس تہذیب، علاقے یا جس معاشرے کا سفر نامہ لکھا جا رہا ہے اس کی تہذیب، اس کی روایت، اس کی ثقافت اس میں موجود ہوتی ہے۔ ڈرامے کی بات کی جائے تو ڈرامے میں

بھی مختلف موضوعات کو چھیڑا جاتا ہے۔ ڈراما نگاری میں اشفاق حسین اور دوسرے ڈرامانگاروں نے اپنے علاقائی موضوعات اور مسائل اور ثقافت کو اس میں بیان کیا ہے۔

اردو ناول میں مقامیت کی روایت:

اردو ناول کی ابتداء 1869ء میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول مراۃالعروس سے ہوئی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں پہ اصلاح کی چھاپ لگی ہے۔ ان کے ناولوں میں مقصدیت کا پہلو نمایاں ہے۔ فن کے حوالے سے ان کے ناولوں میں نقائص کی نشاندہی بارہا کی جاتی رہی ہے لیکن ڈپٹی اردو ناول کے اولین معماروں میں سے ہیں۔ اس لیے نقائص کا ہونا کوئی انوکھی بات بھی نہیں۔ مراۃالعروس میں دو بہنوں کے کردارں کے دو رخوں کے ذریعے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کی اہمیت باور کرائی گئی ہے۔ جو اس معاشرت کا ایک وصف بھی تھا۔ توبۃ النصوح میں ڈپٹی کا تیسرا ناول تھا۔ 1877ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں بھی اصلاحی پہلو اگرچہ غالب ہے۔ اس ناول میں دلی کی خاص تہذیب جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ نصوح کی اولاد، اصلاح کے اقدام کے بیان اور اس کے بیٹوں کے بیان میں دلی کی ثقافت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ اس وقت کے دلی کی زندگی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ روایات، رسم و رواج، رکھ رکھاؤ، رشتوں کا تقدس یہ تمام مقامی پہلو ناول میں نمایاں ہیں۔ ڈپٹی کے ناولوں کا ثقافتی پہلو عموماً دلی کے ارد گرد ہی گھومتا ہے۔ دلی کی ثقافت کو ان کے ناولوں میں بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اکبری اور اصغری کا قصہ ہو یا توبۃ النصوح کا قصہ دونوں میں دلی کی معاشرتی زندگی چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔

رتن ناتھ سرشار نے ڈپٹی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اردو ادب کو فسانہ آزاد، جام سرشار اور سیر کہسار جیسے ناول عطا کیے۔ ان میں فسانہ آزاد کو خاص شہرت ملی۔ فسانہ آزاد میں لکھنؤ کی تہذیب کا بیان ہے۔ لکھنؤ کی ثقافت تہذیب کے زوال کی داستان اور اس کے اسباب کو ناول نگار نے بہت عمدہ جزئیات نگاری کے ساتھ بیان کیا ہے۔ طوالت کے باوجود اس ناول کی خاص بات لکھنو کی تہذیب و معاشرت کا تفصیلی بیان ہے۔ ڈاکٹر سنبل نگار اس ضمن میں لکھتی ہیں:

> "تہذیب و معاشرت کی مرقع کشی سرشار کے ناولوں کا خاص وصف ہے۔ ان کے اجداد کا وطن کشمیر تھا لیکن ان کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی یہاں کی تہذیب اور یہاں کے رہن سہن کو بچپن سے دیکھا۔ اس متاع عزیز کو وہ اپنے سینے سے جدا نہ کرسکے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں جابجا لکھنو کی زندگی کی اصلی اور سچی تصویر پیش کردی ہیں (37)"۔

فسانہ آزاد کے کردار مرزا خوجی اور لکھنو کے نوابوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ لکھنؤ کے اس زوال کی وجہ بھی یہ ہی نظام اور نظام چلانے والے ہی ہیں۔ ناول نگار نے لکھنؤ کے رئیسوں کی زندگی کا نقشہ بہت عمدگی سے کھینچا

ہے۔ جس سے لکھنؤ کے زوال کے اثرات اور اسباب کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس ضخیم ناول میں لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

مرزا ہادی رسواء کا ناول امراؤ جان ادا اردو ناول میں ایک اہم اضافہ اور حوالہ ہے۔ رتن ناتھ سرشار کی طرح ان کا تعلق بھی لکھنؤ سے تھا ان کے ناول کا مرکزی کردار امراؤ جان ادا اپنی مرضی سے طائف نہیں بنتی بلکہ زمانے کے ستم نے اس کو طوائف کے منصب پہ فائز کر دیا۔ اس کردار کے بیان میں لکھنؤ کی معاشرت کو بیان کیا ہے۔ لکھنؤ کے معاشرے میں طوائف کے کردار کے ساتھ ساتھ معاشرے کے دوسرے ثقافتی اور سماجی معیارات کا بیان بھی ملتا ہے۔ ناول نگار ایک طوائف کے کردار کو مرکز بنا کر لکھنؤ کے باقی کرداروں جاگیر داروں سے لے کر عام آدمی بوڑھے سے نوجوان تک سب کو ایک مرکز پر لا کھڑا کرتا ہے۔ یوں ایک طوائف کے بیان میں رسوا لکھنؤ کی پوری معاشرت کی عکاسی کر دی ہے۔ رسوم ورواج، عقائد، نظریات کے مختلف پہلوؤں کا بیان اس ناول میں ملتا ہے۔ جو لکھنؤ کی مقامی ثقافت کا بھرپور مظاہرہ ناول کے کرداروں کے ذریعے کیا گیا ہے۔ مختلف طبقوں کے بیان اور ان کو ایک مرکز پر جمع کر کے اس معاشرت کی زبوں حالی اور اس کی سوچ کی عکاسی کی گئی ہے۔

> "ناول کی فضا بالکل ویسی ہی ہے جیسی اس زمانے کے لکھنؤ کی تھی۔ ہر طرف عیش و عشرت کا بازار گرم تھا۔ فارغ البالی کا دور دورہ تھا۔ طوائفوں کے کوٹھے، بے فکرے رئیسوں اور نوابوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ جابجا راگ رنگ کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ شعر و شاعری کی فضا غالب تھی اور مشاعروں کا عام رواج تھا۔ میلوں اور عرسوں میں خوب رونق ہوتی تھی۔ تہوار بڑی شان سے منائے جاتے تھے غرض اس ناول میں لکھنو پوری طرح جی اٹھا ہے"۔(38)

امراؤ جان ادا محض ایک کردار نہیں بلکہ پوری ثقافت کا نمائندہ ہے۔ جس کی ذیل اور ضمن میں لکھنؤ کی پوری ثقافت نظر آتی ہے۔ لکھنؤ کے اشرافیہ، عوام اور مجموعی طور پہ پورے معاشرے کی عکاسی ملتی ہے۔ اس ناول میں لکھنؤ کی مقامی ثقافت کے تمام پہلوؤں کو بڑی تفصیل کے ساتھ مصنف نے اجاگر کیا ہے۔

ترقی پسندوں کے ہاں اردو ناول میں مقامیت کی راویت:

پریم چند:

بیسویں صدی کا ہندوستان مختلف سماجی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی مسائل کا شکار تھا۔ انگریز حکومت مستحکم تھی ہر سطح پہ نت نئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ہندوستان کا وسیع و عریض خطہ جس کی اصل شناخت اور اہمیت زراعت تھی، صنعتوں کے آنے سے بھی مسائل بڑھے۔ وہ مقامی لوگوں کی فلاح کی غرض سے تعمیر نہ کی گئیں بلکہ استعماری سوچ کے تحت تعمیر کی گئیں۔ ان مقاصد کی تکمیل میں وسائل کو قبضہ کر کے چند لقمے بھوکے رہ جانے والے افراد کو کھلا

دینااور اپنا وفادار اور ہم نوابنانا تھا۔ زراعت کا پیشہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلا تھا۔ زیادہ آبادی کا ذریعہ معاش تھا۔ حکومت کی طرف سے لگان کی بھاری مقدار نے کسانوں کی کمر توڑ دی اور رہی سہی کسر ان مقامی ساہو کاروں نے ان کو سود پہ رقم دینے کے عمل سے پوری کر دی۔ مقامی اشرافیہ نے انگریزوں کے ساتھ وفاداریاں طے کر کے خود کو بچا لیا لیکن عوام کا دوہرا استحصال ہونے لگا۔ ان کے استحصال میں مقامی آقا بھی اپنی عیاشوں اور اپنے اتحادیوں کی خوشنودی کے لیے ان کا خون چوسنے لگے۔ ایک طرف جاگیر دارانہ استحصال تو دوسری طرف خراج اور لگان تھا۔

پریم چند کا فکری ارتقاء ہندوستان کے دیہی طبقے میں پروان چڑھا۔ ترقی پسندوں کے نظریات کے حامل ان تصورات میں دیہات نگاری کا عنصر نمایاں ہیں۔ پریم چند اپنے ناولوں میں ہندوستانی معاشرے میں نچلے طبقے کے ساتھ ہونے والے مظالم کو جا بجا بیان کرتے ہیں۔ بازار حسن میں انہوں نے طوائف کی زندگی کو موضوع بنایا ہے تو میدان عمل میں بھی ہندوستانی معاشرے کی تصویر کشی کی ہے۔ نرملا میں وہ ہندوستانی عورت کے مختلف سماجی روپ کو اجاگر کرتے ہیں۔

گئودان پریم چند کا آخری اور اہم ناول ہے۔ گئودان میں ایک چھوٹے کسان ہوری کی کہانی ہے۔ جو اپنی بیوی دھنیا، بیٹا گوبر، بیٹیاں روپا اور سونا کے ساتھ رہتا ہے۔ اس غریب کے کسان کی خواہش ہے کہ وہ ایک ذاتی گائے کا مالک ہو۔ اس کے بچے اس کا دودھ پییں لیکن بمشکل وہ اپنی خواہش پوری کر پاتا ہے کہ گاؤں کا مکھیا تک اس سے حسد کرنے لگتا ہے اور 80 روپے کی گائے 50 روپے میں خریدنا چاہتا ہے۔ جلد ہی اس کا بھائی ہیرا اس گائے کو زہر دے دیتا ہے ۔ وہ بھائی کو بچانے کے لیے اس پہ الزام لگانے سے بری ہو جاتا ہے جس کے بدلے سزا کے طور پر اسے سال بھر کا اناج اور نقدی رقم جرمانہ کیا جاتا ہے۔ اس جرمانے سے اس کی معاشی حالت انتہائی ابتر ہو جاتی ہے۔ سود پہ قرضہ لینا اس سے بھی بڑا مسئلہ ثابت ہوتا ہے۔ تو اسی دوران اس کا بیٹا ناجائز تعلق سے گاؤں کی لڑکی کو حاملہ کر کے فرار ہو جاتا ہے۔ پنچائیت کی طرف سے عائد جرمانہ ادا کرنے کے باوجود وہ اخلاقی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس لڑکی کو گھر لے آتا ہے ۔ بیٹیوں کی شادی کے لیے بھی اسے قرض لینا پڑتا ہے اور دوسری بیٹی کو ایک زیادہ عمر کے شخص سے بیاہ دیتا ہے۔ قرضوں کا بوجھ اور جرمانے نے اسے کبھی سکون نہیں لینے دیا اور بالآخر وہ کام کرتے کرتے لو لگنے سے جاں بحق ہو جاتا ہے۔ ہوری کی موت کے بارے میں احتشام حسین لکھتے ہیں:

> "ہوری نے زندہ رہ کر چاہے زیادہ احتجاج نہ کیا ہو۔ لیکن اس کی موت اس نظام کے خلاف زبردست احتجاج ہے۔ جس نے ایک معمولی سے ایک کسان کو ظلم کے ہزار بندھنوں میں جکڑ رکھا تھا۔"(39)

گئودان میں ایک عام دیہاتی کسان کی زندگی کا المناک واقعہ ہے۔ اس ناول میں کسی خاص مقامی علاقے کی بات نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے کسانوں کے مجموعی صورتحال کا جائزہ ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز کے ہندوستان

کے کسان معاشی بدحالی کا شکار تھے۔ جاگیردارانہ نظام نے اس کے لیے اس اناج کو بھی تنگ کر دیا جس کے لیے وہ سارا سال محنت کرتا ہے۔ ناول میں ذات پات کے مقامی ہندوستانی مسائل کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس عرصے میں ہندوستان کے کسانوں کا استحصال مہاجنوں نے بھی کیا۔ ہندو سماج میں ساہوکاری ایک بڑا عیب تھا۔ غریب لوگوں کو سودی نظام میں جکڑ کر ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ ہوری کی بیٹیوں کے واقعات میں ان مقامی رسوم و رواج کا بھی پول کھلتا ہے۔ بیٹی کسی کے ساتھ بیاہنے کے لیے باپ کو کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ جہیز کی مد میں نہ جانے کتنے ہوری ایسے ہوں گے جو اپنی بیٹیوں کے جہیز کا قرض اتارتے اتارتے اپنی جان گنوا دیتے ہیں۔ دوسری طرف مقامی نوعیت کی پنچائیتوں میں بھی عام آدمی کا ہی استحصال کیا جاتا ہے۔ طاقتور کو ہمیشہ دوسری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جبکہ غریب کے لیے الگ قانون ہوتا ہے۔ گاؤں میں جب ہوری کے لیے گوبر اور جھنیا کے ناجائز تعلقات پہ پنچائیت بٹھا کر جرمانہ کیا جاتا ہے تو ہوری کی بیوی دھنیا صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ ایک ایسا جرم جس میں براہ راست ان کا کوئی قصور نہ تھا لیکن گاؤں کا طاقتور طبقہ ان غریبوں کا ہی استحصال کرنے پہ تلا ہوا ہے۔

> "میں جانتی ہوں یہاں تو حصہ بانٹ ہونے والا تھا۔ سب ہی کے منہ میٹھے ہوتے یہ ہتھیارے گاؤں کھیاں ہیں گریبوں کا خون چوسنے والے سود، بیاج، ڈیڑھی سوائی، نجر، بھینٹ، گھوس، رشوت جیسے ہو گریبوں کو لوٹو۔"(40)

ناول میں ہندوستانی دیہات کے مقامی مسائل کو بیان کرنا اور ہندوانہ رسم و رواج کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا پریم چند کی گہری بصیرت کا غماز ہے۔ مقامی ثقافت میں تمام پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے تو دوسری طرف امراء اور جاگیرداروں کے رویوں کو بھی عیاں کیا گیا ہے۔

آگ **عزیز احمد** کا ناول 1946ء میں چھپا۔ ناول میں زمانی اعتبار سے 1908ء سے 1946ء تک کے سماجی ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔ ناول میں کشمیری سماج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کشمیر میں انگریزوں کے ظلم و ستم، کشمیر کی آزادی کی تحریکیں، سیاسی ماحول اور کشمیری سماج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول نگار نے کشمیر کی مقامی زندگی کو اس کے رسم و رواج، معاشرت، ثقافت کے اعتبار سے اجاگر کیا ہے۔ ناول کے کردار خواجہ غضنفر، خواجہ سکندر، انور کشمیری سماج کے نمائندے ہیں۔ قالین بنانا کشمیر میں اہم صنعت اور ذریعہ معاش ہے۔ ناول نگار نے کاریگروں کے ساتھ ہونے والے استحصال کو بھی موضوع بحث بنایا کہ کس طرح سے سرمایہ دار ان کی محنت کے عوض ان کا فن اور مہارت خرید کر اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔ کشمیری مقامیت جگہ جگہ نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ ناول نگار نے تین نسلوں کے قصے کے ذریعے مختلف ادوار میں کشمیر کی سماجی زندگی اور اس کی معاشرتی اور معاشی زندگی کو بیان کیا ہے نثار دانش لکھتے ہیں کہ:

"عزیزاحمد کشمیری کھانوں، رسم ورواج، رہن سہن اور کشمیری عوام کی مصروفیات اور طرز زندگی کو بیان کرتے ہیں تو ناول میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور قاری کی توجہ ناول میں شروع سے لے کر آخر تک برقرار رہتی ہے۔"(41)

ناول نگار نے کشمیر کی مقامیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کے تمام سماجی معاملات ،معاشرتی زندگی، سیاسی سرگرمیاں نئی نسلوں کی ترجیحات کشمیر کی ان سرسبز وادیوں میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ مقامیت کے اعتبار سے یہ ناول اردو کا ایک نیا رخ تھا جس میں کشمیر کی مقامیت کو ایک گہرے مشاہدے کے ذریعے سے بیان کیا گیا ہے۔

خدیجہ مستور:

خدیجہ مستور کا ناول آنگن 1962ء میں چھپا۔ یہ ناول ان کی اصل وجہ شہرت بھی ثابت ہوا۔آنگن میں یوپی کے خاندان کا قصہ ہے۔ ناول میں ماضی و حال کی شکست وریخت بیان ہوئی ہے۔ ناول نگار نے تقسیم ہندوستان کے تناظر میں لکھے۔ اس ناول میں یوپی کی مقامی ثقافت کو بیان کیا ہے۔ایک جاگیردار گھرانے کی زندگی کا بیان ہے جو جاگیردارانہ نظام کے زوال کے بعد شہر منتقل ہو جاتے ہیں جن کی زندگی میں آنے والے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل زیادہ گھمبیر ہیں۔

بڑے چچا کے آنگن کے گرد ناول کا سارا قصہ ہے جو ایک جاگیردار کی اولاد ہیں۔ایسے جاگیردار جن کا اپنی مقامی روایت کے اعتبار سے کئی عورتوں / طوائفوں سے تعلقات ہوتے تھے۔ مصنفہ نے مقامی ثقافت کو بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ایسا کرنا ان کی ثقافت میں معمولی بات تھی بلکہ ایسا کرنا نوابوں کی شان کے مطابق سمجھا جاتا تھا۔مالی فوائد کی خاطر اور غربت کی چکی میں پسی یہ عورتیں بھی سنہرے خواب آنکھوں میں سجائے ان پہ نچھاور ہوتی تھیں۔ تاہم ان کی روایت کے مطابق ایسی عورتوں کے رہنے اور ان کے نان ونفقہ کے لیے الگ بندوبست کرنا پڑتا تھا۔ نوابوں کی بیویاں ان عورتوں کو کبھی قبول نہ کرتی۔ عالیہ کے دادا کے بھی ایسی کئی عورتوں سے تعلقات تھے۔ان عورتوں میں سے ان جاگیرداروں کی اولادیں بھی ہوئیں لیکن مقامی ثقافت اور رسم و رواج کے مطابق ان کا مقام الگ ہی ہوتا۔ وہ نہ وراثت میں حصے دار ہوتے اور نہ ہی ان کی دوسری اولاد کے مدمقابل کھڑے ہو سکتے ہیں۔ عالیہ کے دادا کی بھی اسرار میاں کی صورت میں ایسی ہی اولاد تھی جن کو بڑے چچا نے خداترسی کے طور پر ساتھ تو رکھا تھا لیکن ان کے لیے الگ کمرہ تھا؛ زنان خانے اور گھر کے معاملات میں ان کو دخل انداز ہونے کی قطعاً اجازت نہ تھی۔ گویا ایک اچھوت قسم کی زندگی جیسے پورے سماج پہ بوجھ ہوں۔ حتی کہ گھر کے ملازم بھی ان کو عزت دینے کے لیے تیار نہ تھے۔اسرار میاں کا

کردار جاگیردارانہ نظام کی ایک یادگار کے طور پر موجود ہے۔ جہاں اس نظام کی باقی قباحتوں کے ساتھ ایسے فرسودہ قسم کے رسم ورواج بھی موجود تھے۔

مصنفہ نے اس ناول کے ذریعے مقامی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ عورتوں کا آزادانہ گھر سے باہر نکلنا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا، مخصوص رسم ورواج سے لے کر اخلاقی قدروں کے زوال تک مقامیت کے پہلوؤں کا بیان ملتا ہے۔ عقیل احمد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "آنگن کی کہانی گھر کے آنگن سے شروع ہو کر ہندوستانی سماج اور سیاست کے دائرے میں پہنچ جاتی ہے۔ گھر کے آنگن میں مذہب، سیاست، ادب، تعلیمی مسائل جیسے موضوعات زیر گفتگو ہوتے ہیں۔ ناول ماضی اور حال دو حصوں میں منقسم ہے۔ یہ آنگن ایسے خاندان کا آنگن ہے۔ جو پہلے خوشحال تھا لیکن جاگیردارانہ نظام کی شکست وریخت سے مالی دشواریوں سے دوچار ہو گیا۔"(42)

کریمن بوا کا کردار ماضی میں موجود مقامی ثقافت کا ایک اہم حوالہ ہے۔ کریمن بوا کی گفتگو میں جابجا مقامی رسم ورواج رہن سہن، روایت اور ثقافتی عناصر کا بیان معلوم ہوتا ہے۔ ان کا اپنا کردار بھی اس خاص مقامیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے جو جاگیردارنہ نظام کے خاتمے کے باوجود اپنے مالکوں سے وفاداری نبھاتی ہے۔ محض روٹی پہ پلنے والی ایک ایسی ثقافت کا نمائندہ کردار ہے جس میں ان کو اپنے مالکوں آقاؤں کی ہر حال میں وفاداری کا درس دیا جاتا ہے۔ جنہوں نے ہر حال میں اپنے فرائض ادا کرنے ہیں، اپنے مالکوں کی اولادوں کی خدمت بھی اس میں شامل ہے۔ یہ خاص مقامی روایت کی پاسداری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جو اس گھر سے زندگی میں نکلنے کا تصور بھی نہیں کرتی۔ ایسا کرنا شاید اس کے لیے باعث گناہ ہے نہ جانے کتنی کریمن بوا ایسی ہوں گی جس کی زندگیاں ایسے جاگیرداروں اور ان کی اولادوں کی خدمت کرتے کرتے ختم ہو گئی ہوں گی۔ مصنفہ نے اس مقامیت کے دونوں رخوں کا احاطہ کیا ہے۔ جہاں عورت کا ایک روپ تقدس سے مزین ہے اور دوسرا داشتہ کا کردار ہے۔ کریمن بوا جیسی وفادار ملازمہ کا جس کا اپنی زندگی کا کوئی رخ نہیں ہوتا بلکہ وہ دوسروں کے رحم وکرم پہ ہی اپنی زندگی گزار دیتی ہے تو دوسری طرف بعض وضع داریاں ایسی بھی دکھائی دیتی ہیں کہ ان ملازموں کو گھریلو افراد کا سا درجہ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

> "جاگیردارانہ نظام ہندوستانی عقائد اور جہالت نے بعض بدعتوں کو بھی جنم دیا ہے۔ ہمارے سماج میں خصوصاً نچلے طبقے اور متوسط گھرانے میں یہ اعتقاد تھا یا کسی حد تک اب بھی ہے کہ نمک کا پاس رکھنا ضروری ہے ورنہ قدرت کی طرف سے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ دراصل یہ اس نظام کا ایک حربہ ہے جس کی لعنتوں کا طوق گلے میں ڈال کر سماجی استحصال کیا جاتا رہا ہے۔ ان کو یہی درس دیا جاتا رہا ہے کہ آقا کی خوشی ہی نمک کی شریعت ہے۔"(43)

ناول کا اصل موضوع تقسیم پاکستان اور اس کے پس منظر میں سیاسی معاملات کا بیان ہے۔ تقسیم پاکستان سے قبل اتر پردیش اور اس طرف بسنے والے مسلمانوں کا رہن سہن شب و روز اور زندگی کا بیان ہے۔ایک خاندان کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول بہت سے دوسرے عوامل کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ناول میں جو اپنے اندر اس عہد کی سیاسی سماجی مسائل کو سموئے ہے۔اتر پردیش کے گھرانے کے ضمن میں مصنفہ نے اس مقامیت کو بھی بھرپور انداز میں بیان کیا ہے جو اپنے اصل سے وقت تقاضوں، سمجھوتوں کی بنا پر اپنا وجود معدوم کر بیٹھی ہے۔ مقامیت کے تناظر میں اس ناول میں خاص ثقافت کے عناصر بھی وافر مقدار میں موجود ہیں۔ ناول میں مختلف اوقات میں دو نسلوں کی زندگیوں کی تبدیلی اور سماجی لحاظ سے برپا ہونے والے نظام کی تبدیلی کا بیان بھی موجود ہے۔

کرشن چندر:

کرشن چندر کا شمار ترقی پسند ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کے ہاں ترقی پسند نظریات کی فراوانی ملتی ہے۔ان کے ناولوں کا عمومی موضوع سماج میں موجود ظلم و جبر نچلے طبقے کے مسائل اور ان کے ساتھ ہونے والا استحصال ہے۔ان کے ناولوں میں امیر طبقے کے غیر منصفانہ اقدامات کا بیان جا بجا ملتا ہے۔کرشن چندر کثرت سے لکھنے والے ناول نگاروں میں شامل ہوتے ہیں۔ان کے ناولوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ان کے ناولوں میں متنوع مضامین کا اظہار ہے۔

شکست فنی و فکری لحاظ سے ان کا اہم ناول ہے۔شکست میں ان کا موضوع دو نوجوانوں کی داستان محبت ہے لیکن اس پیرائے میں وہ کشمیر کے دلفریب وادیوں میں موجود سماجی و معاشرتی مسائل کا نوحہ پڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ شکست میں وادی کشمیر کی مقامی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔جو اس سے قبل عزیز احمد کے ناول آگ کا بھی موضوع تھا۔کرشن چندر نے کشمیر کی وادیوں میں رہنے والے مختلف مذاہب طبقے اور معاشرتی حیثیت کے لوگوں کا تذکرہ کیا ہے۔کشمیر کی مقامی زندگی کے مسائل، ان کے رسم و رواج، ان کی توہمات پرستیاں بہت عمدگی سے بیان کی گئی ہیں۔ ان مسائل کو ہندوستان کی مجموعی کیفیت کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔یہاں بھی وہی ذات پات کا نظام ہے۔کشمیر کی مقامی زندگی کے مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ بھوک ہے۔یہاں کے لوگوں کے معاشی حالات ناگفتہ بہ ہیں جن کی ایک وجہ امراء کی جنسی عیاشیاں اور دوسرا سرمایہ داروں کا استحصال ہے۔گاؤں میں پیر کے میلے کے تناظر میں مصنف نے یہاں کے مقامی مذہبی عقائد کو بھی بیان کیا ہے جو عمومی طور پر ان دور دراز پہاڑی علاقوں کا خاصہ ہوتا ہے۔جو اپنے تمام دکھوں، دردوں کی دوا ان کے ہاں تلاش کرتے ہیں۔شیام نامی نوجوان فرسودہ رسوم کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا چاہتا تو ہے مگر وہ سماج سے ٹکر کی جرات نہیں رکھتا وہ ان مقامی فرسودہ رسوم کے سامنے کھڑا ہونے کی عملی جرات سے قاصر ہے۔ علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

"کشمیر کے پر فضا مناظر کو کرشن چندر کی تحریر نے اور بھی دلفریب بنادیا ہے وہاں کے تروتازہ درخت اور ان کے پھلوں پھولوں سے لدی ڈالی، وہاں کی اونچی اونچی پہاڑیاں اور ان پر مانگ کی نشان کی طرح چمکتے ہوئے رواں دواں چشمے اور ندیاں صامت ہونے پر بھی شکست میں بولتی تصویر بن گئی۔"(44)

کشمیر کے پیرائے میں نوجوان نسل کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ ابھی اس قابل نہیں ہو سکے کہ ان فرسودہ رسم و رواج کو مکمل طور پر ختم کر سکیں۔ ناول نگار نے نئی نسل اور پرانی رسم و رواج میں کشمیر کے مقامی زندگی کا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے جو وہاں کے سماجی اور معاشرتی، معاشی حالات کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

"قدرت نے کشمیر کو خوبصورت وادی بنایا ہے جس میں رواں دواں چشمے اور تروتازہ پھل بکثرت ملتے ہیں لیکن وہاں کی عوام معاشی، اخلاقی، تمدنی آزادی سے محروم ہے۔"(45)

ناول میں مقامیت کے مختلف مقامی پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے جن میں مذہب، سماج، رسم و رواج سبھی کا ہی احاطہ کیا گیا ہے۔ جزئیات نگاری سے ناول نگار نے مقامیت کے پہلوؤں کو زیادہ نمایاں کر کے دکھایا ہے۔

غلام الثقلین:

غلام الثقلین کے ہاں دیہات نگاری جا بجا ملتی ہے۔ ان کے افسانوں اور ناولوں کا دائرہ کار اکثر دیہات کی زندگی ہی ہوتا ہے۔ مقامیت کی روایت کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کا ناول میرا گاؤں ایک نمایاں تحریر ہے۔ یہ ناول ان کی اصل وجہ شہرت بھی بنا جس نے اردو ناول کے دامن کو وسیع کرتے ہوئے موضوعات کے نئے امکانات وا کیے ہیں۔ میرا گاؤں 1980ء میں چھپا۔ اس ناول میں لائل پور موجودہ فیصل آباد کے ایک نواحی چک (گاؤں) کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ ناول کا زمانہ 1947ء کے بعد کے حالات پہ مشتمل ہے۔ ناول نگار نے ایک عام دیہات کی زندگی پہ شہر میں ہونے والے واقعات کے اثرات کو بھی بیان کیا ہے۔ ناول نگار نے تمام جزئیات کے ساتھ مقامی ثقافت کو جا گر کیا ہے وہیں بڑی ثقافتوں کے مختلف عناصر مثلاً دیہات کی سیاست پہ شہر اور ملکی سیاست کے اثرات تک کا بیان ہے۔ ایک عام دیہات کی زندگی اس کی ثقافت کے پس منظر میں بڑے سیاسی فیصلوں ان کے اثرات اور عام آدمی کے استحصال کو بہت فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

"میرا گاؤں دیہاتی زندگی کو محض فراغت اور باہمی رشتہ داریوں کے تقدس کے طور پر ہی نہیں دکھاتا بلکہ دیہاتوں کے شہروں پر پڑنے والے اثرات کو بھی نمایاں کرتا ہے۔"(46)

ناول میں پنجاب کے مقامی رسم و رواج کسان کی زندگی کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک عام کسان مختلف طریقوں سے استحصال کا شکار ہے۔ کسان کی فصل میں محض اس کا حق نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ جڑے بہت سے دوسرے پیشوں کے افراد بھی اس میں سے حصہ وصول کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اس کے اوزار بناتے ہیں

اور کسی نہ کسی طرح مدد کرتے ہیں اور بعض رسم و رواج کے نام پہ اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ وہ خسارے کے باوجود اپنی مقامی ثقافت کو توڑنے کو تیار نہیں اور ان رسوم و رواج کی پابندی کرتا ہے۔

"جب بھوسہ الگ ہوا اور گندم کا چھوٹا سا ڈھیر لگا تو میراجی بیٹھ گیا۔ بڑھی، لوہار، نائی، دھوبی، مولوی اور دوسرے سیپیوں کا حصہ دینے کے بعد گندم کا ڈھیر اور بھی کم ہو گیا تو میں نے سوچا کسان کی کمائی میں کتنے لوگ شریک ہیں۔ مجھے ڈوم، ڈھاری، مراثی، شیخ بھرائیں اور کھیت منگتے یاد آئے جو کٹتی فصل میں اپنا حصہ لے جا چکے تھے اور سلا چگنے والیوں نے گراپڑا خوشہ اٹھالیا تھا اور پنچھی پکھیرو بچے کھچے دانوں میں سے اپنے پوٹے بھر چکے تھے اور کسان کے حصے کا ڈھیر گھٹتا رہا حتی کہ چھ مہینوں کی محنت، سردی، گرمی، بیماری، دکھ، سکھ اور لہو پسینے کا ڈھیر اس سے بلند ہو گیا"۔(47)

ناول میں مقامی ثقافت کے دوسرے عناصر کے ساتھ ساتھ سب سے مضبوط عنصر مذہب اور اپنی دھرتی سے محبت کو بیان کیا گیا ہے۔ ان لوگوں کے ہاں مذہبی تصورات بہت واضح ہیں۔ وہ تمام مشکلات کے حل کے لیے خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مشکلات کے باوجود وہ توکل کا دامن نہیں چھوڑتے۔ ان لوگوں کا اپنی مٹی/دھرتی سے لگاؤ اور پیار بھی مثالی ہے۔ جو کسی بھی ثقافت کا اہم جزو ہے اور اسے زندہ رکھنے کا سبب بنتا ہے۔ اس جذبے میں پنجاب کی ثقافت کا عمومی رنگ بھی نمایاں ہے جہاں زمین دھرتی کو ماں کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

"میرا گاؤں مذہب کے علاوہ جس دوسرے اہم نقطے کو اجاگر کرتا ہے وہ دھرتی سے محبت کا جذبہ ہے۔ اس ناول کے سبھی کردار اپنی دھرتی اور اپنی زمین سے خاص محبت رکھتے ہیں۔ دھرتی اور زمین ان کے نزدیک ماں کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ دھرتی سے اس حد تک پیار کرتے ہیں کہ اس کے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتے۔"(48)

ناول میں پنجاب کے دیہات کے عکاسی کرتے ہوئے ناول نگار نے ثقافت کے مختلف عناصر کی اپنے عہد کے تناظر میں بہترین پیشکش کی ہے۔ ناول محض دیہات نگاری ہی نہیں بلکہ مقامی حوالے سے ثقافت کا ایک اہم بیان ہے۔ روایت کی تقلید میں محض غلام الثقلین نے کسان کے استحصال کو ہی موضوع نہیں بنایا بلکہ گاؤں کے چودھری، بڑے زمینداروں اور سیاسی لوگوں کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں ہونے والے چھوٹے کسانوں اور دیہات کے لوگوں کے ساتھ ہونے والے استحصال کو بیان کیا ہے۔ مقامی رسوم و رواج، پیشوں کو بھی ناول نگار نے بھرپور نمائندگی دی ہے۔ اردو ناول میں مقامیت کی روایت میں اس ناول کو بھی ایک اہم حصہ گردانا جائے گا۔

جمیلہ ہاشمی:

جمیلہ ہاشمی اردو میں خواتین ناول نگاروں کی ذیل میں ایک نمایاں نام ہیں۔ ان کے ناول سماجی، معاشرتی، تہذیبی اور تاریخی اعتبار سے مختلف موضوعات کے حامل ہیں۔ ان کا مشہور زمانہ ناول تلاش بہاراں ہے۔ تاہم مقامیت کے اعتبار سے ان کا اہم ناول آتش رفتہ ہے۔ آتش رفتہ میں مشرقی پنجاب کے

سکھوں کی ثقافت کو بیان کیا گیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے ناول میں سکھوں کے سماجی نظام ان کے رسم ورواج مذہبی عقائد کو مصنفہ نے باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ ناول میں ان کے مقامی، سماجی روابط، رسم ورواج کو بیان کرتے ہوئے مختلف ثقافتی عناصر کی وضاحت کی گئی ہے۔ خالص پنجابی ثقافت کو سکھوں کے عقائد و تصورات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان لوگوں میں کہیں مضبوط یارانہ ہے تو کہیں ایک دوسرے پہ برتری جتانے کے لیے برسوں کی وفاداری اور محبت کو بھی پل میں مٹا دیا جاتا ہے۔ انا، عزت، خودداری کے جذبات پہ لوگ مٹنے کو تیار ہیں۔ ان کی مقامی ثقافت ان کو اس بات کا پابند کرتی ہے۔ احساس برتری کو ثابت کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک چلے جائیں روایات کا پاس خاندانی وجاہت کا تحفظ ان میں نسل در نسل چلا رہا ہے۔ باپ سے ہونے والی زیادتی کا بدلہ بیٹا اور پوتا بھی بعد ازاں چکانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ یہ لوگ اپنی ثقافت سے اچھی طرح جڑے ہیں۔ حاکم سنگھ پڑھا لکھا تعلیم یافتہ نوجوان ہے جو انگلستان سے تعلیم حاصل کر کے آیا ہے۔ دیپو سے شادی کے بعد جب وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے تو اسے گلے میں دوپٹہ ڈال کر مار دیتا ہے۔ اس طرح کی مقامی سوچ اس کے دل و دماغ پر حاوی رہتی ہے۔ ناول میں مصنفہ نے گہرے مشاہدے کے ذریعے پوری ثقافت کی بھرپور نمائندگی کی ہے۔ رہن سہن، بودوباش، رسم ورواج جابجا ان کرداروں کے ذریعے چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں اس معاشرے کے بودوباش کا ایک منظر ملاحظہ ہو:

> "ایک دن شام کو جب دادی دیے میں تیل ڈال کر بتی بٹ رہی تھی، ماں چولہے میں بیٹھی اپلوں کی آگ پر روٹیاں پکا رہی تھی اور سیلے اپلوں کی دھوئیں سے اس کی آنکھوں سے پانی نکل رہا تھا۔ جنتی چاٹی میں سے ملائی ہٹا کر دودھ کا گلاس نکال رہی تھی کہ گیانی جی کے گھر دے آئے۔ ہماری سفید بطخیں کٹ کٹ کر کے بھاگیں اور دروازے میں ایسے کسی کے ہائے کرنے کی آواز سنائی دی تو میں نے ٹوکے کو ہاتھ سے رکھ کر دروازے کی طرف دیکھا دیپو بطخوں سے ڈری سہمی کھڑی تھی نہ آگے جاتی تھی نہ پیچھے۔۔۔ ہمارے صحن میں دن کی بارش کی وجہ سے پانی اور گوبر اور گائیوں کے موت کی سرانڈ بھرا کیچڑ پھیلا تھا۔ صرف پاؤں دھرنے کی جگہ تھی جو شام کے دھندلکے میں دکھائی نہیں دیتی تھی۔"(49)

آتش رفتہ میں پنجاب کی ثقافت کو جزئیات اور گہرے مشاہدے سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک ایسی ثقافت کا بیان جہاں اخلاقی سماجی رشتے مضبوط ہوتے ہیں۔ بودوباش کے تناظر میں کھیتی باڑی، گھر میں جانوروں کا پالنا، گوبر سے ایندھن کا کام لینا، یہ تمام ثقافتی عناصر موجود ہیں۔ سکھوں کی مقامی ثقافت کو بہترین انداز میں ناول کے دامن میں سمو دیا گیا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی:

راجندر سنگھ بیدی کے ہاں اپنی ثقافت کی ترجمانی ان کی تحریروں میں جا بجا ملتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے سکھ، پنجابی سماج کی اپنی تحریروں میں بھرپور نمائندگی کی ہے۔ ان کے اکثر کردار مقامی ثقافت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ جزئیات نگاری سے وہ اس فطری ماحول کے قریب چلے جاتے ہیں جہاں حقیقت کا ادراک ہونے لگتا ہے۔

ایک چادر میلی سی ایک مختصر ناول جسے نقادوں نے ناولٹ کی ذیل میں شامل کیا ہے مگر اس مختصر ناول میں گہرا تہذیبی و سماجی شعور موجود ہے۔ مقامی اعتبار سے مخصوص پنجابی معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس ناول کو محض دیہات نگاری کے ضمن میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ مخصوص مقامی ثقافت کی نمائندگی کرتا ناول ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ایک عورت ہے۔ عورت کے کردار کو اس مقامی ثقافت میں مختلف جہتوں سے روشناس کرایا گیا ہے۔ پنجاب کی عورت میں اپنی مقامی روایات کا پاس و لحاظ ہے۔ وہ اپنے ہر کردار کو نبھانے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس کی تہذیب اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ وہ مشکل حالات سے بچ نکلنے کے لیے کوئی نیا حربہ استعمال کرے وہ مشکلات کا حل اپنے مخصوص سماجی بندھن میں تلاش کرتی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن رقم طراز ہیں:

"راجندر سنگھ بیدی کے ناول ایک چادر میلی سی کا حسن تہذیبی تصویر کشی ہی میں مضمر ہے۔"(50)

ناول کا مرکزی کردار رانو ہے۔ رانو اپنے نشئی شوہر کی مار کھا کر بھی مطمئن ہے۔ وہ ایسے سماج کی عورت ہے؛ جہاں مرد کا کردار اس کے لیے سہارا اور آسرا ہے جس کے ہونے سے وہ اپنے آپ کو اپنی اولاد کو محفوظ خیال کرتی ہے۔ شوہر کے قتل کے بعد وہ غیر یقینی کی صورتحال سے دوچار ہے۔ اس کا وجود بھی اس کے سسرال میں بھاری پڑ جاتا ہے۔ وہ اپنی جواں سال بیٹی کو بچانے کے لیے فکر مند ہے۔ بیدی نے اس ناول کے ذریعے جہاں تہذیبی ثقافتی عوامل کی وضاحت کی ہے وہیں طاقتور اور کمزور کا ازلی تضاد بھی بیان کیا ہے۔ طاقتور غریب کی عزت اور مال پہ بھی اپنا حق ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اس کے استحصال کے طریقے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہو سکتے ہیں لیکن ختم نہیں ہو سکتے۔ بالآخر مقامی روایات کے مطابق اسے تحفظ اور اس گھر میں رہنے کے لیے اپنے دیور منگل سے جسے وہ بڑی بھابی اور اماں کی طرح پالتی ہے شادی کا کہا جاتا ہے۔ منگل بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتا لیکن روایات کے آگے دونوں بے بس ہو جاتے ہیں۔ یہاں مقامی ثقافت کا ایک اہم کردار سرپنچ کو بھی شامل کیا ہے۔ پنجاب کے گاؤں میں اس کا خاص مقام ہوتا ہے۔ اس کے فیصلوں کو تسلیم نہ کرنا کوئی بھی قبول نہیں کر پاتا۔ سرپنچ کے حکم اور کوشش سے یہ شادی طے ہو جاتی ہے ۔ رانو اپنی بیٹی کی عزت کو بچانے کے لیے اس فیصلے کو تسلیم کرتی ہے۔ ڈاکٹر افضال بٹ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"راجندر سنگھ بیدی کا ناولٹ ایک چادر میلی سی میں ہندوستان کے دیہی سماج میں رہنے والی ایک مجبور اور بے بس عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ جس میں رانو کو اپنی اولاد کو بچانے کے لیے مختلف پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بھوک افلاس، عزت و ناموس کو بچانے کے لیے رانو اپنے دیور کی بیوی بن جاتی ہے۔ بالخصوص دیہاتی سماج

میں اپنی حیثیت اور اپنے دیور کی چادر کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔رانو اور منگل اپنے نئے رشتے پر ذہنی طور پر مطمئن نہیں ہیں لیکن باامر مجبوری ان کو اس رشتے میں جڑنا پڑتا ہے۔وہ گاؤں میں موجود انسانی درندوں سے اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے اپنی ذات کی قربانی دے دیتی ہے"۔(51)

مقامی مذہبی تصورات کا بیان بھی مختصراً ملتا ہے۔جہاں لوگ میلوں میں عقیدت و احترام سے آتے ہیں لیکن مذہبی رہنماؤں کے لبادے میں چھپے درندے ان خوش عقیدہ لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔ان کی بیٹیوں عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔المختصر بیدی اس مختصر ناول میں مقامی پنجابی معاشرے کے غریبوں کا استحصال اور اس معاشرے میں عورت کے مقام کو گہرے مشاہدے سے بیان کرتا ہے۔مقامیت کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ناول محض دیہات نگاری کا بیان نہیں ہے اور نہ ہی عورت کے ساتھ ہونے والے ظلم کا رونا دھونا بلکہ اس ناول میں مقامی ثقافتی عناصر، سماجی مذہبی بود و باش کی منظر کشی ہے۔ایک خاص عہد اور علاقے کی مخصوص اجتماعی نفسیات علامتی رموز ،پیچیدہ معاشرتی مسائل اور حیات و ممات کے فکری منظر نامے کے حوالے سے ایک چادر میلی سی ایک مکمل ناول ہے۔

بلونت سنگھ:

کئی دوسرے ادیبوں کی طرح فکری طور پہ بلونت سنگھ نے بھی رومانوی سے ترقی پسند نظریات کی طرف انحراف کیا۔بیدی کی طرح بلونت سنگھ نے بھی اپنی جنم بھونی کو اپنی تخلیقی فکر میں مرکز بنایا۔ان کی تحریروں میں پنجاب کی ثقافت کا پرچار ہے۔عموماً انسان اپنے ابتدائی ایام کی فکر یا ایام تک شعوری یا غیر شعوری طور پر محدود رہتا ہے اور اس کے موضوعات کی داغ بیل تو انہی موضوعات سے شروع ہوتی ہے یا اس کا اختتام آخر کار اس طرف ہو جاتا ہے۔پنجاب کا تاریخی اور سماجی ورثہ بہت وسیع ہے۔اردو ادب میں ڈپٹی سے آغاز ہونے والی ناول صنف کا ابتداء کا موضوع تو شہر کی زندگی ہی رہا بعد ازاں پریم چند نے اس کا رخ دیہات کی طرف موڑا۔محض دیہات نگاری کا ہی بیان کسی مخصوص ثقافت کا نمائندہ نہیں ہو سکتا۔بلونت سنگھ نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ناول کی صنف کی بھی اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ۔ناول کا تنوع تخلیق کار کو کردار نگاری اور منظر نگاری کی آزادی دیتا ہے، بلونت سنگھ نے پنجاب کی مقامیت کے بیان میں کہانی محض پنجاب کے دیہاتوں میں لاکھڑی نہیں کی بلکہ ان کی کہانی کا خمیر بھی اس مٹی سے لیا گیا ہے۔ان کے کردار اسی مقامی دھرتی کے سپوت ہیں۔شہروں کی ہنگامہ خیز زندگی سے انہوں نے دیہات کے کرداروں کی طرف انحراف کیا۔ان کے کردار محض دیہات نگاری کا پرچار بھی نہیں ہے بلکہ ان کے ہاں مثبت منفی دونوں پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس زندگی کی مکمل عکاسی ملتی ہے۔بلونت سنگھ کا ماضی پریم چند کی طرح دیہات سے جڑا نہیں ہے۔وہ شہری زندگی میں پروان چڑھے اس کے باوجود اپنی ثقافت سے تعارف اور تعلق گہرا ہے۔مقامی کرداروں، لب و لہجے، رسوم و

رواج سے بخوبی واقف ہیں۔ان کے کرداروں کے زبان وبیان میں اس مقامی ثقافت کا رنگ نمایاں ہے۔ محض خیالی کرداروں کے بجائے ان کے ہاں کرداروں میں مقامیت کا اصلی پن دکھائی دیتا ہے کہ قاری کے ذہن میں ان کرداروں کے خیالی ہونے کے بجائے اس مقامیت کا اصل نمائندہ ہونے کا تاثر ابھرتا ہے۔

"وہ ایک متوسط طبقے کے شہری کے طور پر پلے بڑھے لیکن اپنے افسانوی ادب میں بار بار اپنی شہری شخصیت سے گریز کرتے ہیں اور دیہاتی جڑوں کے متھ سے مردانگی اور بہادری کے وہ خوفناک لیکن خوشکلیں تراشتے ہیں جو ان کی سائیکی میں آباد ہیں یہ ان کے معاشرتی حلیے کا وہ نقش ہے جو تخلیق کا خون بن کر ان کی رگوں میں دوڑتا ہے اور پورے ثقافتی ڈسکورس کو وہ معنی دیتا ہے جو معنی اجتماعی سائیکی میں بسے آرا کی امیج اس کو دینا چاہتے ہیں یہ اشخاص کردار محض نہیں ہیں۔۔۔ان کے پیچھے ثقافتی معنی کی پوری کائنات تہہ در تہہ موجود ہے۔"(52)

اس ناول میں بلونت سنگھ نے ایک دیہات کے گاؤں کے پیرائے میں مقامیت کے مختلف مسائل رسم ورواج ،مسائل ،مثبت اور منفی پہلوؤں کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ گاؤں کا نام "ڈنگا" جس کے ساتھ مقامی طور پر مخصوص تاریخی اساطیری واقعات جڑے ہیں۔ "پالا سنگھ "اس کا مرکزی کردار ہے۔ناول کا کردار بھی شہر پلٹ ہے جو گاؤں کی جانب اپنے باپ جیسی دھاک بٹھانے کے لیے واپس آتا ہے۔ جلدی گاؤں کے لوگوں پہ اس کا رعب قائم ہو جاتا ہے ۔پالا بچپن کی محبت کو پالینے کا خواہش مند ہے مگر وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے جو اسے دھوکہ دے دیتا ہے۔اس کے تعلق کا علم ہوتا ہے تو وہ اسے زدو کوب کرتے ہیں۔اس کی شادی ایک اور جگہ کر دی جاتی ہے۔ سرنو اس فیصلے کو دل سے تسلیم کرتی ہے۔ سرنو اس مقامیت کا نمائندہ نسوانی کردار ہے۔ پالا بعد ازاں اس کے گھر جا کے اس کی عزت لوٹ لیتا ہے۔اس طرح اپنے آپ کو وہ مطمئن خیال کرتا ہے۔ عورت کی سماجی حالت، مرد کی اجارہ داری کو بھی ان کرداروں کے ذریعے سے بیان کیا گیا ہے۔ جسمانی حظ اٹھانا مرد کا عورت پہ برتری ثابت کرنا خیال کیا جاتا ہے۔ناول کے آخر میں پالا زخمی حالت میں قانون کی گرفت میں آجاتا ہے۔بظاہر ایک ڈاکو کی ڈرامائی کہانی ہے۔تاہم اس میں مقامیت کے ضمن میں بہت سے عناصر کار فرما ہیں۔ناول پنجاب کے مقامی کرداروں کے ساتھ ساتھ مقامی زبان اور لب ولہجہ کا بھی خوبصورت بیان ہے جو ان مقامی کرداروں کے بیانیے کو واضح کر دیتا ہے۔

شوکت صدیقی:

شوکت صدیقی کے ناول خدا کی بستی کا شمار اردو ادب کے نامور ناولوں میں ہوتا ہے جس کے لاتعداد ایڈیشن اس کی شہرت کی دلیل ہے۔ شوکت صدیقی کا ناول خدا کی بستی 1957ء میں منظر عام پر آیا۔ ناول کئی حوالوں سے اہم ہے۔بنیادی طور پر ناول میں شہری زندگی کے مسائل،اس میں پروان چڑھنے والے جرائم کی لامحدود داستانوں کا بیان ہے۔ ناول نگار نے جرائم پیشہ افراد کو بے نقاب کرنے کی جرات مندانہ سعی کی ہے۔اس کے علاوہ اس میں نام نہاد جمہوریت پسند لیڈروں کی بھی قلعی کھولی ہے۔ جرائم پیشہ افراد اور طاقتور مظلوموں کا استحصال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ناول میں بنیادی طور پر کراچی کی فضا آفرینی ہے۔ کرداروں کی بول چال، لب و لہجہ، زبان و بیان میں مقامی الفاظ کی کثرت ہے۔ ناول نگار نے کراچی کی مقامیت کو بیان کیا ہے۔اس مقامی سماج میں مختلف طبقوں کو دکھایا گیا ہے۔ایک ایسے دور کی داستان ہے۔ جہاں پر کوئی اب ہر کوئی اپنے مفادات کی جنگ لڑ رہا ہے۔اس کے تخلیقی محرکات کے تناظر میں اپنے ایک انٹرویو میں شوکت صدیقی کہتے ہیں:

"بڑی غربت کا سماں تھا10*8 کے کمرے میں بیٹھا افسانے لکھتا تھا اور میرے اطراف لوگ بیٹھے جوا کھیلتے تھے۔چرس پیتے تھے روزگار نہیں تھا۔کاروبار کے ذرائع نہیں تھے۔لوگ پریشان تھے میرا ناول 1958ء کے کراچی کی تصویر تھی۔"(53)

خدا کی بستی میں شوکت صدیقی نے کراچی کی معاشرت کو بیان کیا ہے۔ جرائم پیشہ افراد کی کارستانی جو دیہات سے آنے والے نوجوانوں کو ایسی دلدل میں پھنسا دیتے ہیں جس سے نکلنا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی، کرداروں کے ذریعے کراچی کے مقامی تہذیبی عوامل کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

شوکت صدیقی کا دوسرا ناول بھی مقامیت کے اعتبار سے اہم ہے۔ خدا کی بستی میں کراچی کی مقامیت کو بیان کرتے ہیں، توجا نگلوس میں پنجاب کے دیہات کی فضا کا بیان ملتا ہے۔مقامی ثقافت مختلف پہلوؤں کے ساتھ جاگیردارانہ نظام کے مظالم کے بارے میں بھی آگاہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔جا نگلوس میں مقامی ثقافتی عوامل کے تحت پروان چڑھنے والے نظام کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بڑے زمیندار کس طرح نچلے طبقے کا استحصال کرتے ہیں۔ بظاہر لوگوں کی ہمدردی اور رحم دلی کا لبادہ اوڑھے یہ ان لوگوں کے کا صدیوں سے استحصال کرتے آرہے ہیں اور وہ اس پہ صدائے احتجاج بلند کرنا تو درکنار ان کی حرمت و تقدس کا پاس رکھتے ہوئے اس استحصال کو جاری رکھتے ہیں۔یہ استحصالی کردار تو جدید ذرائع سے ہم آہنگ ہیں۔ان کی اولادیں دوسرے ملکوں میں تعلیم حاصل کرتی ہیں لیکن ان سادہ لوگوں کو مسلسل استحصال کا نشانہ بناتے ہیں۔

"دیہات کی کھلی فضا میں جاگیردارانہ اور زمیندارنہ تنگ نظری نے سماج میں بگاڑ پیدا کردیا۔ وہ کمزور اور لاچار عوام کی زندگی کو کسمپرسی اور مظلومیت سے دوچار کر دیتے ہیں۔ بڑے زمیندار اپنی طاقت بے دریغ استعمال کر کے غریب اور محنت کش مزارعین کی زمینوں کو چھین لیتے ہیں۔ان کے مویشی کھلوادیتے ہیں ان کی عورتوں کو استحصال کا نشانہ بناتے ہیں۔"(54)

جا نگلوس میں ناول نگار نے مقامی نوعیت کے مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ کہ نچلے طبقے کو کس طرح سے اپنا تابع بنا کر رکھا جاتا ہے۔ بعد ازاں مقامی وڈیروں جاگیرداروں نے شہر میں موجود بڑے عہدے داروں اور افسران سے تعلقات قائم کر لیے۔جو ان کے دم بھرنے لگتے ہیں۔ان کی مدد کر کے اور ان کی مدد حاصل کر کے دونوں صورتوں میں مقامی لوگوں کا استحصال جاری رکھے ہوئے ہیں۔ نچلے طبقے کو محرومی اور جہالت کے اندھیروں میں دھکیل کر ان کی

سوچ کو مفلوج کر دیا جاتا ہے۔ مقامی رسم و رواج اور روایات کی پاسداری ان محکوموں کا فرض بنا دیا جاتا ہے اور اسی مقامی روایت کے تحت اپنی حکومت، اقتدار چودھراہٹ کو دوام بخشتے دکھائی دیتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

اردو ناول کی روایت میں قرۃ العین حیدر کا نام ایک مستحکم روایت کے طور پہ موجود ہے۔ ناول نگاری کے فن کو انہوں نے کئی نئی جہتوں سے روشناس کرایا ہے۔میرے بھی صنم خانے ہو یا گردش رنگ چمن ان کے ہاں تہذیبی شعور بہت گہرا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں بیک وقت تاریخ، زمان و مکان، تہذیب اور کئی دوسرے تصورات و نظریات دکھائی دیتے ہیں۔آگ کا دریا نہ صرف ان کا بلکہ اردو ادب کا ایک شاہکار ناول ہے۔

آگ کا دریا ایک طویل ناول ہے۔ جو اپنے دامن میں مختلف تصورات کو سموئے ہوئے ہے۔ تمام تصورات سے بالاتر اس ناول میں گہرا تہذیبی شعور موجود ہے۔ مقامیت کے اعتبار سے اس ناول کو دیکھا جائے تو اس ناول میں ہندوستان کی ہزاروں سالہ تہذیب کی بازیافت کی گئی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ جہاں مختلف تہذیبوں کے اثرات مقامی تہذیب نے قبول کیے۔ ہندوستان کی تہذیب کئی نازک مراحل سے گزری ان سانحات کے باوجود جہاں اس نے دوسری تہذیبوں کے اثرات کو قبول کیا وہیں اس نے اپنے تشخص کو بھی کسی نہ کسی طرح قائم رکھا۔

ناول کی ابتداء میں ہندومت کے عروج کا زمانہ دکھایا گیا ہے۔ جب ہندوستان میں ہندومت اور اس کے پیروکار بڑی تعداد میں تھے۔ گوتم اس عہد کا مرکزی کردار ہے جس کے ذریعے مصنفہ نے مقامی روایات اور ثقافت کو بیان کیا ہے۔ گوتم برہمن (اونچے درجے کا ہندو) ہے۔ جو اپنے رواج کے مطابق ہندومت کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اس عہد میں مذہبی تعلیم حاصل کرنا محض برہمنوں کا حق تھا۔ ہندومت کی تعلیمات کی غرض سے آشرم یعنی یونیورسٹیاں بھی قائم تھیں۔ یہ لوگ مذہبی تعلیم حاصل کرتے اور روحانیت کی ترقی کے لیے ترک دنیا کر دیتے تھے۔ دنیاوی لذتوں سے کنارہ کشی کی جاتی۔ ایک روز دریا پار کرتے اس کی نظر چمپک اور نرملا نامی لڑکی پر پڑتی ہے۔ باوجود اس کے کہ اس کے مذہب میں ایک طالب علم کے لیے عورت کے بارے میں سوچنا اور دیکھنا جائز نہیں، فطری جذبات پہ قابو نہیں پا سکتا۔ اس کے تصورات میں کھویا رہتا ہے۔ مصنفہ نے باور کرایا ہے کہ انسان کے بنیادی تقاضے اس کی خواہشات کسی بھی رسم و رواج یا پابندی میں جکڑی نہیں جا سکتی۔

گوتم کی ہری شنکر سے ملاقات اور فلسفیانہ گفتگو بھی اس عہد کا حصہ ہے۔ ایک خاص ماحول میں پروان چڑھنے والی اس داستان میں خاص نقطہ اس وقت جنم لیتا ہے جب گوتم کا تھیٹر دیکھنے آئی چمپک سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ اسے پہچان کر ملنے کا پیغام بھیجتی ہے لیکن وہ ایک شادی شدہ عورت سے ملنا معیوب سمجھتا ہے۔ یہاں مصنفہ نے مقامیت کے ان

تہذیبی و ثقافتی اصولوں کی نشاندہی کی ہے کہ ہزاروں سال قبل بھی ہندوستان کی تہذیب میں رشتوں کا تقدس اور رکھ رکھاؤ کس قدر موجود تھا۔ چمپک بھی اپنے سے بڑی عمر کے شوہر کے ساتھ بھی وفاداری نبھاتی نظر آتی ہے۔ ہزاروں سال قبل کی مقامی روایات اور رسم و رواج کو بیان کیا گیا ہے۔ مقامیت کے اعتبار سے اس عرصے میں مذہب ثقافت اور تہذیب کے عناصر کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

دوسرے حصے میں افغان اقوام کی ہندوستان آمد کا دور ہے۔ جب مسلمانوں کا تعلیمی عروج کا زمانہ تھا۔ علم و حکمت لائبریریاں اور تحقیق ان کا خاصہ تھا۔ مسلمانوں کی عملداری کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں روحانیت اور مختلف علوم کا بھی رواج عام ہوا۔ مقامی مذہبی تصورات کے ساتھ اسلامی تصورات کا بھی رواج عام ہوا۔ مختلف مذہبی تصورات کے باوجود امن و بھائی چارے کی فضا نظر آتی ہے۔ اس عہد میں کمال الدین منصور اسلامی تہذیب کا نمائندہ ہے۔ جو علم اور تحقیق کی خاطر ہندوستان آیا ہے۔ کمال الدین المنصور کی ملاقات چمپا نامی لڑکی (پنڈت کی بیٹی) سے ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان محبت کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ دونوں اپنی تہذیبوں کے نمائندے ہیں لیکن وہ فطری انسانی جذبات کو اپنی تہذیبی روایات پہ حاوی نہیں ہونے دیتے اسی اضطراب میں جنگ کی وجہ سے کمال کو چمپا سے الگ ہونا پڑتا ہے۔ تیسرے حصے میں لکھنؤ کی تہذیب کو بیان کیا گیا ہے۔ اس عہد میں لکھنؤ کی تہذیب آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ لکھنؤ کی مقامی تہذیب کا بیان قرۃ العین حیدر کے ناول میرے بھی صنم ،خانے اور چاندنی بیگم میں بھی ملتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ اسی وجہ سے وہ داخلی طور پر اس تہذیبی اثر کو کبھی فراموش نہ کر سکیں ان کی تخلیقات میں جابجا تہذیب کا بیان اور زوال کا نوحہ ملتا ہے۔

> "تیسرا حصہ لکھنؤ اور فیض آباد کی تہذیب و ثقافت پر مشتمل ہے۔ مصنفہ کا اپنا تعلق بھی لکھنؤ سے تھا اس لیے انہوں نے اس شہر اور تہذیب کی بڑے اچھے انداز میں عکاسی کی ہے۔ یہ مشترکہ تہذیب کا زمانہ تھا جس میں ہندو جوگی اور مسلمان صوفیا کا اظہار بڑے دلچسپ انداز میں ملتا ہے۔ یہ تہذیب ہندو راجوں اور مسلمان نوابین کی کوشش سے پروان چڑھ رہی ہے۔"(55)

طوائف لکھنؤ کی تہذیب کا استعارہ بن گئی۔ مصنفہ نے لکھنؤ کے عروج اور نوابین کی عیاشیوں کا بیان اسی کردار کے ضمن میں کرایا ہے۔ چمپا کو اس عہد میں ایک طوائف کا کردار دیا گیا ہے۔ ناول میں جہاں مختلف ادوار میں مقامی تہذیب اور اس پہ دوسری تہذیبوں کے اثرات کو بیان کیا ہے وہیں عورت کے کردار کو بھی اس مناسبت سے بیان کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی قدیم مقامی روایات میں عورت کو ایک مقدس مقام حاصل تھا۔ گوتم اور کمال الدین منصور اس کے رتبے سے آشنا ہیں۔ وہ اسے عزت کا مقام دیتے ہیں کہ وہی مقامی تہذیب کا تقاضا ہے لیکن بعد ازاں مشترکہ تہذیبوں کے ملاپ سے امراء اور نوابین کی عیاشیوں نے اس مقدم و محترم رشتے کو کوٹھے کی زینت بنا دیا۔ اس حصے میں لکھنؤ کی مقامی ثقافت کا بیان ملتا ہے۔ اس عہد کا گوتم ایک گورنر کی حیثیت سے لکھنؤ کی چمپا طوائف کے حسن کے سحر

میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح اسے چھوڑ کر بنگال چلا جاتا ہے۔ اس عہد کے بیان میں مصنفہ نے لکھنؤ کی مقامیت کو بیان کیا اور اس عہد میں 1857ء کے بعد کے زمانے کے لکھنؤ کی مختصر تصویر کشی کی ہے۔ زوال کے بعد چمپا سڑکوں پہ بھیک مانگتی نظر آتی ہے۔ لکھنؤ کی مقامی ثقافت کے عروج سے زوال تک کا بیان ملتا ہے۔ اس بیان میں لکھنؤ کی مقامی ثقافت کے مختلف عناصر کار فرما دکھائی دیتے ہیں۔

ناول کا آخری حصہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم اور نازک موڑ ہے۔ اس عہد میں صدیوں پرانی جنم لینے والی تہذیب کی تقسیم کا مرحلہ ہے۔ اس عہد کے اہم کردار کمال، گوتم، ہری شنکر، چمپا، طلت، نرملا سراشلے، عامر اور ساجدہ ہیں۔ یہ تمام کردار مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والوں کی اولادوں میں سے ہیں۔ دراصل یہ پچھلے عہد کا تسلسل ہی ہے۔ جو ایک مشترکہ ہندوستان کے کردار ہیں۔ اس مقامی تہذیب نے مختلف پیچ و خم کے بعد ایک ایسا روپ اختیار کیا جہاں یہ پڑھی لکھی نوجوان نسل اپنے نظریات اور دوسروں کے نظریات کے احترام کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ اس عہد میں کسی خاص مقامی تصور کی وضاحت نہیں ملتی۔ تقسیم کے بعد مسلمان کرداروں کی اکثریت پاکستان کی طرف ہجرت کر جاتی ہے۔ چمپا بدستور اس تہذیب کے نمائندہ کردار کے طور پر اپنا مقامی تشخص برقرار رکھتے ہوئے اسی تہذیب کے نمائندہ کردار کے طور پر ہندوستان میں رہ جاتی ہے۔

ناول میں مقامیت کے عناصر کی بات کی جائے تو ہندوستان کے مقامی ثقافت کے عناصر ناول کے چاروں ادوار اور خصوصاً پہلے تینوں ادوار میں کثرت سے ملتے ہیں جہاں کردار اپنی مقامی تہذیب کی نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ناول میں چند ضمنی ثقافتوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ مثلاً کمال الدین منصور کا بنگال میں رہ جانا، بنگال کی معاشی اور سماجی زندگی کا احوال بھی کسی قدر ناول میں ملتا ہے۔

> "ہندوستان جو مختلف قوموں کا مسکن اور مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ اس نے اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں نسلوں اور خیالوں کے عروج و تصادم اور زوال کے ان گنت مناظر دیکھے ہیں۔ نسلوں اور تہذیبوں کو ترقی کرتے ہوئے اور مرتے ہوئے دیکھا ہے لیکن اس سارے عروج و زوال افسانوں کے ساتھ ایک چیز اس کے ساتھ دائمی طور پر ہے اور وہ ہے اس کی مخصوص تہذیبی روایت کا تسلسل۔"(56)

ناول میں مصنفہ ہندوستان کی اڑھائی ہزار سالہ تہذیبی و ثقافتی تاریخ کو مختلف ادوار اور مختلف تہذیبوں کے اثرات میں بیان کرتی ہیں۔ ہندوستان کی مقامی تہذیب کو تاریخ کے مختلف ادوار میں بیان کرنا قابل ستائش کام ہے۔ نیلم فرزانہ اس ضمن میں لکھتی ہیں:۔

> "آگ کا دریا کا اصل موضوع ہندوستانی کلچر، جس کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کے آئینہ میں فنکار نے انسانی وجود کا مفہوم تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور کلچر کی تبدیلیوں کو اپنے فن کارانہ زاویہ نظر سے دیکھا ہے۔ فنکارانہ

زاویہ نظر کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں قرۃ العین حیدر کا رویہ مورخ یا سوشیالوجسٹ کا نہیں ہے۔ بلکہ ایک فنکار کا ہے فنکار پورے ہندوستان کے کلچر کی روح کو سمجھنا چاہتا ہے۔"(57)

مقامیت کے نقطہ نظر سے آگ کا دریا کو اس ضمن میں شامل کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی مقامی تہذیب و ثقافت کو اس کے تمام جذبات کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ ناول میں ہندوستانی تہذیب کے مختلف عناصر کی وضاحت ملتی ہے۔ مذہبی تصورات، رسم و رواج، معاشی نوعیت سمیت مختلف عناصر کا بیان ہے۔

قرۃ العین حیدر کے تمام ناولوں میں مقامی تہذیبی عناصر شامل ہیں۔ بطور خاص لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت ان کے مختلف ناولوں میں پورے ثقافتی عناصر کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب کا عروج و زوال ان کے ناولوں میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

مقامیت کی ذیل میں ان کا ناول آخر شب کے ہم سفر بھی اہم ہے۔آخر شب کے ہم سفر اردو ناول میں مقامیت کی روایت کا ایک اہم اضافہ و حوالہ ہے۔اس ناول کا بنیادی موضوع بنگال میں ہونے والی انقلابی آزادی کی تحریکوں کا بیان ہے۔ جو 1942ء سے قیام بنگلہ دیش تک کے عرصے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا اہم وصف بنگال کی مقامی تہذیب کا بیان ہے۔ اردو ناول کا موضوعاتی تنوع وقت کے ساتھ بڑھتا گیا اور چند تہذیبوں، ثقافتوں سے بڑھ کر مزید ثقافتوں کو اپنے دامن میں سمویا اور اپنے دامن کو وسیع کرتا گیا۔ ناول کا قصہ بنگال کے مخصوص گھرانے کے تحت چلتا ہے۔ جس میں مختلف سماجی حیثیت کے لوگوں کا بیان ملتا ہے۔ بنگال کی پرامن فضا کا احوال بھی ملتا ہے جہاں مختلف مذاہب کے لوگ آپس میں امن و سکون کے ساتھ زندگیاں بسر کر رہے ہیں اور ان کی اولادیں انقلاب کی متلاشی ہیں۔ ان کے بیان میں بنگال کے مختلف مقامات، رسومات رہن سہن، مذہبی و سیاسی عوامل کا تذکرہ مصنفہ نے بہت باریک بینی سے کیا ہے۔ شہنشاہ مرزا لکھتے ہیں:

"اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے بنگال کے تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کو بہت عمدگی سے نمایاں کیا ہے۔ بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اس پس منظر سے اسی طرح واقف ہوں جس طرح وہ اپنے تہذیبی پس منظر سے واقف ہیں۔ بنگال کے ہرے بھرے کھیت دیہات اور جنگلات سبھی بہت عمدہ طریقے سے ہمارے سامنے لائے گئے ہیں۔ خاص طور پر سندر بن کا علاقہ اپنی ہریالی کے ساتھ بخوبی اجاگر ہوا ہے۔"(58)

ناول میں مختلف سماجی حیثیت کے لوگوں کا بیان ملتا ہے۔ ارجمند منزل نوابین کے عہد کی علامت کے طور پر موجود ہے۔ مقامی اعتبار سے ان نوابوں کا بیان ہے۔ جن کا اپنے علاقے کے سیاسی معاملات میں گہرا عمل دخل ہے۔ وقت کے ساتھ ان لوگوں کا اثر و رسوخ سیاسی حلقوں میں دکھائی دیتا ہے۔ جو اپنی وضع داریاں قائم رکھتے ہوئے اپنے مفادات کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس حویلی کے بیان میں مصنفہ نے مقامی نوابین کی وضع داریاں اور رسم و رواج کو بیان کیا ہے۔ جو اپنی ثقافتی روایات کے ساتھ کسی حد تک جڑے ہیں لیکن نوجوان نسل جدید وقت کے اثر کو قبول کر رہی ہے۔

نواب صاحب کا اپنے ملازمین غریب مولوی اور پادری کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھنا ان کے کردار کی برتری کو ثابت کرتا ہے۔ ریحان الدین ان کا بھانجا ہے۔ جو اس طرح کے نظریات کا حامل ہے۔ دیپالی روزی بیز رجی بھی اس کی ہم خیال ہو جاتی ہے۔ یہ نوجوان انقلاب کے متلاشی ہیں اور اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہیں جبکہ دیپالی اپنی ماں کے جہیز کی ساریاں چوری کر کے تحریک کی خدمت کے لیے پیش کر دیتی ہے۔

ان کرداروں کے یہ نظریات بہت کھوکھلے ثابت ہوتے ہیں اور تمام ہی اپنی زندگی کے فائدوں میں سمجھوتے کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ دیپالی بعد ازاں بیرون ملک جا کر ایک ہندو ڈاکٹر سے شادی کر لیتی ہے۔ ریحان بھی کاروباری شخص بن جاتا ہے۔ روزی بزرجی اپنے مذہب کو بالائے طاق رکھ کے ایک پادری کی بیٹی ہونے کے باوجود ہندو سے شادی کر لیتی ہے۔ یوں ان نام نہاد انقلابیوں کی زندگی بہت جلد اپنے ذاتی مفادات کی جانب لوٹ آتی ہے۔ یہاں قرۃ العین حیدر نے ان تمام کرداروں میں ثقافتی و مذہبی تصورات کو بھی پس پردہ بیان کیا ہے۔ دیپالی اور ریحان ایک دوسرے سے محبت کے باوجود ایک نہیں ہو سکے کیونکہ دونوں اپنے مذہب اور ثقافت کو توڑنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

یاسمین ایک مولوی کی بیٹی ہے۔ جو اپنے گھریلو ماحول کے برعکس رقص کی تربیت حاصل کر کے ماڈلنگ کے شعبے میں چلی جاتی ہے بعد ازاں بیرون ملک جا کے ایک غیر مذہب سے شادی کرتی ہے جو؛ بعد ازاں ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ جاتا ہے۔ اس بے کسی کے عالم میں وہ مر جاتی ہے۔ اس کردار کے بیان میں مصنفہ نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اپنے اصل کے ساتھ جڑے رہنے میں ہی انسان کی بقاء ہے۔ یاسمین نے اپنے اصل کو فراموش کرنے کی سعی کی لیکن وہ بدحالی کا شکار ہوئی۔ ناول کے دوسرے کرداروں نے اپنے تہذیبی ورثے میں ہی رہ کر پناہ لی اس حوالے سے دیپالی ایک جگہ لکھتی ہے:

> "ریحان اپنی روٹس میں واپس آ گیا اوما دیبی بھی ایک وقت آتا ہے۔ جب انسان محسوس کرتا ہے کہ مستقل تہذیبی تصادم اور بے آرامی سے بہتر ہے کہ انسان اپنی جڑوں میں واپس چلا جائے"۔(59)

دیپالی کا بیان مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر کی بھی توثیق ہے۔ مابعد جدیدیت بھی اپنی ثقافتوں کی طرف لوٹنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ وہ جہاں جدیدیت کے ساتھ جڑنے کا درس دیتی ہے وہیں اپنے اصل سے جڑنے کا بھی کہتی ہے۔ انسان ایک وقت واقعی اپنی جڑوں کی طرف لوٹ آتا ہے اور ایسا ہونا کسی حد تک فطری عمل ہے۔ اگر وقت زیادہ گزر جائے تو انسان کی سوچ ضرور اپنے اصل کی طرف لوٹ کر جاتی ہے۔

> "اپنی تہذیب کے بارے میں جاننے کا یہ عمل محض ریحان کے ساتھ ہی نہیں ہوا۔ خود اوما دیبی کو بھی اپنے تہذیبی پس منظر میں پہنچ کر ہی سکون نصیب ہوا۔ شاید ایسا ہونا فطری ہے کیوں کہ کوئی بھی انسان اپنی روٹس کے باہر رہ کر زیادہ عرصے تک خوش نہیں رہ سکتا۔"(60)

ناول کے سیاسی نظام سے در کنار مقامیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو ناول میں بنگال کی ثقافت کو گہرے مشاہدے سے بیان کر کے ناول نگار نے مقامیت کی روایت کو مزید مستحکم کیا ہے۔ناول کے تمام مقامی کردار اپنے تہذیبی ثقافتی عوامل کو بیان کر کے مقامیت کو مزید واضح کیا گیا ہے۔مابعد جدیدیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس ناول میں اس حوالے سے گہرے تہذیبی و ثقافتی اثرات موجود ہیں۔ناول کے اکثر کردار اپنے اصل کی جانب لوٹ جاتے ہیں کیونکہ جب اس نظام سے نکلنے کی کوشش کے باوجود انہیں آگے کچھ نظر نہ آیا تو انہوں نے واپس لوٹ جانے میں ہی عافیت محسوس کی دوسری طرف یاسمین اس تہذیب سے ہٹ کر دوسری تہذیب کا حصہ بننے کی جدوجہد میں اپنی زندگی گنوا بیٹھی؛ لیکن وہ اس تہذیب کا حصہ نہ بن سکی اس کے اثرات یہ ہوئے کہ ایسے لوگوں کو نہ تو اگلی تہذیب نے قبول کیا اور نہ ہی وہ اپنی اصل ثقافتی شناخت کو برقرار رکھ سکے، یوں ان کی زندگی ایک المیے کی داستان بن جاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ناول چاندنی بیگم میں لکھنو کی تہذیب کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں مختلف حوالوں، کرداروں کے ذریعے سے لکھنؤ کی تہذیب کے عروج وزوال، رکھ رکھاؤ، رہن سہن، بول چال نوابوں کی زندگیاں، ان کی اولادوں کی زندگیاں، ان کے مسائل بڑی سراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔قراۃ العین حیدر کے تمام ناولوں میں مقامیت کے حوالے سے اہم مواد موجود ہے۔

حوالہ جات

1. www. ur.englishlib.org/definition/AA.html وقت ملاحظہ 10نومبر:2024ء

2. Dictoinory and Literary Terms and Literary Theories ,J.A.Cuddon ,Lonndon ,Penguin Books ,1998.p.689

3. Harvey, David (1997). The Condition of Postmodernity : An Enquiry into the Origins of Cultural Change. Blackwell Publishing. p. 42

4. Akbar S.Ahmad,Post Modrenism and Islam ,Landon ,Routledge,1992,Page 10.

5۔ گوپی چند نارنگ۔اردو ما بعد جدیدیت پر مکالمہ۔(دہلی:اردو اکادمی دہلی،1998ء)ص91

6۔ قدوس جاوید۔مابعد جدید تصورِادب۔مشمولہ؛ماہنامہ آجکل شعبہ نشرواشاعت حکومت ہند(دہلی:نومبر 2011ء)ص۔9

7۔ ضمیر بدایونی۔مابعد جدید یت کا دوسرا رخ(کراچی:شہرزاد پبلشرز،2006ء)ص56

8۔ ناصر عباس نیر۔جد ید اور ما بعد جد ید تنقید(مغربی اور اردو تنا ظر میں) (کراچی:انجمن ترقی اردو،پاکستان۔2016ء)ص202ء

9۔ اقبال آفاقی- مابعد جدیدیت(اصطلاحات اور معانی تعبیرات و تشریحات)،(اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2018ء)ص105

10 The Idea of the Postmodrenism,P,124

11۔ ناصر عباس نیر۔جد ید اور ما بعد جد ید تنقید(مغربی اور اردو تنا ظر میں)۔(کراچی:انجمن ترقی اردو،پاکستان۔2016ء)ص202ء

12۔ اقبال آفاقی۔ مابعد جدیدیت(اصطلاحات اور معانی تعبیرات و تشریحات)،(اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2018ء)ص98

13۔ رؤف نیازی۔ما بعد جدیدیت تاریخ وتنقید۔(کراچی:ناظم آباد،2003ء)ص248

14۔ الطاف انجم الطاف۔اردو میں مابعد جدید تنقید (اطلاق ،مثالیں،مسائل و ممکنات)۔(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،2013ء)،ص۔179

15۔ Dictionary.com bridge.org/dictionary/english / localism
وقت ملاحظہ مارچ 2025ء

16۔ گیان جین چند۔ اردو تنقید پر ایک نظر۔(دہلی:ادارہ یادگار غالب،1986ء)ص102

17۔ وزیر آغا۔ادب فن اور تنقید ۔(لاہور:سنگ میل پبلیکیشنز،1993)ص145

18۔ مظفر حسن ملک ۔ ثقافتی شریات ۔(اسلام آباد: طبع اول مقتدرہ قومی زبان،2004ء)ص66

19۔ سپیرو،ہیری، مترجم۔ سید محمود۔سید احتشام ۔ ثقافت کا مسئلہ ۔(لاہور: فکشن ہاؤس2017ء)ص،8

20۔ کامران حسین کاظمی- اردو ناول اور عصریت۔(لاہور:الاوقار پبلی کیشنز،2023ء)ص32

21۔ مولانا حبیب الرحمن اعظمی۔ معاشرتی نظام۔ماہنامہ دیو بند ۔(دیوبند: دارالعلوم،جولائی2014ء)ص

22۔ وقت ملاحظہ:23مارچ2025 ءسماجی نظامTupadh.com

23۔ وہاب اشرفی۔مابعد جدیدیت مضمرات و امکانات۔(اسلام آباد:اکادمی ادبیات،2007ء)ص118

24۔ سید معین الدین قادری۔ ہندوستانی لسانیات۔(حیدرآباد دکن: شمس الاسلام پریس 1923ء) ص27

25۔ غلام مصطفی ۔زبان اور اس کی خصوصیات۔ ترجیحات ۔(دہلی : ورلڈ اردو ایسوسیشن جولائی تا اگست 2023ء)ص،87

26۔ کے۔ایس۔بیدی۔پنجابی ،اردو،ہندی تینوں زبانوں پہ علمی مقالات ۔(دہلی:کتب خانہ انجمن ترقی اردو ۔س،ن)ص97

27۔ ایضاً۔127،128

28۔ وہاب اشرفی۔ مابعد جدیدیت مضمرات و امکانات۔(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔2004ء)ص۔49

29۔ ہینری تھامس؛مترجم۔علامہ شبلی نعمانی۔تاریخ تہذیب و تمدن۔(کراچی: بک ٹائم کراچی،2010ء)ص13

30۔ الطاف انجم۔اردو میں مابعد جدید تنقید (اطلاق ،مثالیں،مسائل و ممکنات)۔(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،2013ء)،ص۔

31. Anthony Glidden's, The Consequences of Modernity, Stanford University Press, 1990, p 64

32۔ طاہرہ فاطمہ۔اردو زبان پر عالمگیریت کے اثرات۔تحقیق نامہ:(سیالکوٹ: گورنمنٹ کالج وومن یونیورسٹی)شمارہ14 جنوری جون2014ص145

33. Ziauddin Sardar, Postmodernism and the Other, 1998, p. 51

34. Esselimk B .A practical guide to localization Amsterdam John Benjamin's publishing company Page. 3

35. Robertson or in global modernisations furtherment strong ATL eds state publisher 1995 p.28

36۔ طاہر حسین۔اسلامی جغرافیہ اور ثقافت۔(ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان)ص112

37۔ سنبل نگار۔اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ ۔(لاہور: مکتبہ یوسفیہ۔2019ء)ص103

38۔ سنبل نگار۔اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ۔(لاہور: مکتبہ یوسفیہ۔2019ء)ص118

39۔ سید احتشام حسین۔افکار و مسائل، ص12

40۔ پریم چند۔ گؤدان۔(دہلی: مکتبہ جامعہ۔1972ء)ص187

41۔ دانش نثار۔اردو ناول کی روایت۔ (لاہور: لڈو یو پبلشر2022ء)ص173

42۔ عقیل احمد۔اردو ناول اور تقسیم ہند،(دہلی: ماڈرن پبلی کیشن ہاؤس،1987ء)ص92

43۔ فقیر حسین۔اسلم آزاد، مرتبین : اردو ناول کا ارتقاء ۔(لاہور: بک ٹاک2014ء)ص211

44۔ علی حسینی عباس۔اردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔ص431

45۔ محمد افضال بٹ۔ اردو ناول میں سماجی شعور۔(اسلام آباد: پورب اکادمی اسلام آباد2009ء)ص133

46۔ ذوالفقار احسن۔غلام الثقلین کا ناول میرا گاؤں ایک تجزیہ۔مشمولہ،سہ ماہی ادبیات ناول نمبر جلد دوم (اسلام آباد:2020ء)ص،348

47۔ غلام الثقلین نقوی،۔میرا گاؤں (لاہور: ضیائے ادب،1988ء)ص،113

48۔ ایضاً،ص،349

49۔ جمیلہ ہاشمی۔ آتش رفتہ ۔لاہور اردو اکیڈمی سندھ(لاہور: شاخ اردو مرکز بار اول نومبر،1964ء)ص،81

50۔ محمد حسن ۔ جدید اردو ادب۔(دہلی: مکتبہ جامعہ ملیا طبع اول،1975ء)ص65

51۔ محمد افضال بٹ۔ اردو ناول میں سماجی شعور۔پورب اکادمی(اسلام آباد:2009ء)ص146

52۔ گوپی چند نارنگ۔فکشن کی شریعت تشکیل و تنقید۔(لاہور:سنگ میل پبلیکیشنز،200ء)ص96،95

53۔ شوکت صدیقی کا انٹرویو مشمولہ :روپ ۔(کراچی:جولائی1987ء)ص2

54۔ محمد افضال بٹ۔اردو ناول میں سماجی شعور۔پورب اکادمی(اسلام آباد:2009ء)ص133

55۔ محمد افضال بٹ۔اردو ناول میں سماجی شعور(اسلام آباد:2009ء)ص168

56۔ انور سیوانی۔قرۃ العین حیدر اردو فکشن کے تناظر میں۔مرتبین:حسن منظر،شہاب قدوائی،ممتاز احمد خان ،ڈاکٹر(کراچی:انجمن ترقی اردو2009ء)ص103

57۔ نیلم فرزانہ۔اردو ادب کی خواتین ناول نگار(لاہور:فکشن ہاوس1992ء)ص51

58۔ شہنشاہ مرزا۔آخر شب کے ہم سفر ایک تجزیہ۔مشمولہ:قرۃ العین حیدر اردو فکشن کے تناظر میں:مرتبین حسن منظر،ڈاکٹر ممتاز احمد خان۔شہاب قداوائی(کراچی:انجمن ترقی اردو2009ء)ص188

59۔ قرۃالعین حیدر۔آخر شب کے ہم سفر(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2010ء)ص387

60۔ شہنشاہ مرزا۔آخر شب کے ہمسفر ایک تجزیہ(کراچی:2009ء)ص151

باب: دوم

اکیسویں صدی میں اردو ناول کا سماجیاتی پہلو

مقامیت محض کسی ایک جز کا نام نہیں بلکہ اس میں پورا نظام موجود ہوتا ہے۔ مقامیت کے مختلف پہلو اس کی انفرادیت کو ثابت کرتے ہیں۔ زیرِ نظر باب میں مقامیت کے سماجیاتی پہلو کو زیر بحث لایا جائے گا۔ سماج ایک کل ہے جو مختلف اکائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ سماجیاتی علوم پر غور کرنے سے اس مقامیت میں موجود مختلف ذیلی نظام دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہر مقامیت مختلف خوبیوں کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے یہ نظام ہی اس کی پہچان بنتے ہیں۔ مقامیت کی مخصوص معاشی حالت یا نظام بھی ہوتا ہے۔ معاش کا مسئلہ انسان کی بقا کے لیے بے حد ضروری ہے۔ غور کیا جائے تو ہر معاشرے کا معاشی نظام یکساں نہیں ہوتا اس میں اس کے جغرافیہ کا عمل دخل بھی ہوتا ہے۔ مخصوص جغرافیائی حالات معاشرتی نظام کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مثلا پہاڑی علاقوں اور میدانی علاقوں میں لوگوں کے ذریعہ معاش کی صورت مختلف ہوتی ہے۔ پہاڑی علاقوں میں رہنے والوں کا ذریعہ معاش مقامی نوعیت کی مختلف، مخصوص فصلوں، غلہ بانی، جنگلات اور اگران پہاڑوں یا علاقوں میں قدرتی معدنیات کوئلہ سنگ مرمر وغیرہ دھاتوں کی دریافت اور پیداوار شروع ہو جائے تو اس علاقے کے لوگوں کا ذریعہ معاش اس کے گرد ڈھل جاتا ہے۔

لوگوں کی بڑی تعداد ان سے منسلک ہو جاتی ہے کچھ ایسے علاقے بھی ہیں جہاں ایسی کوئی دریافت نہیں۔ راستے دشوار اور دور دراز ہیں۔ جدید دنیا سے رابطہ قائم کرنے کے لیے ان کو بڑی مقامیت /علاقوں کی طرف رخ کرنا پڑتا ہے۔ میدانی علاقوں کی بات کی جائے تو وہاں کھیتی باڑی کا رواج بھی ہے کچھ علاقوں میں صنعتی ترقی نے قدم جمائے ہیں۔ اس طرح مختلف مقامی علاقوں میں معاشی نظام بھی مخصوص مختلف ہوتا ہے۔ یہ معاشی نظام ان کی زندگیوں اور حالات کو متاثر کرتا ہے۔ مقامیت کا ایک اور اہم پہلو بود و باش رہن سہن ہے۔ کہیں چند اور کہیں اکثر پہلو مقامی علاقوں کی شناخت کو واضح کرتے ہیں۔ مقامی علاقوں میں رہن سہن بھی جغرافیائی حالات کے مطابق مختلف ہوتا ہے۔ لباس اور مقامی روزمرہ کے معاملات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ کچھ لوگ بڑی مقامیتوں کے مد نظر اس بات سے انکاری ہوتے ہیں کہ لباس تو بڑے گرہوں، مقامیتوں جیسے صوبائی سطح پہ ہوتے ہیں کے مطابق ہوتے ہیں مگر ایسا نہیں مقامی سطح پہ بھی اس کے وجود میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور دیکھائی دیتے ہیں۔ پنجاب پاکستان کا سب سے زیادہ آبادی والا صوبہ ہے ۔ پنجاب کا روایتی لباس دور دراز یہاتوں میں آج بھی پہنا جاتا ہے مگر اس میں کہیں کہیں فرق ہے۔ مرد حضرات لونگی پہنتے ہیں مگر بعض مقامی عورتیں بھی یہ لباس پہنتی ہیں۔ کہیں پگڑی کا انداز اور رنگ مختلف ہوتا ہے لباس کی نوعیت

جغرافیائی حالات کے تابع بھی ہوتی ہے۔ گرم اور سرد علاقوں میں مذہب کی یکسانیت کے باوجود لباس میں فرق ہوتا ہے۔

اس باب میں مقامیت کا ایک بڑا اہم پہلو زبان، ناولوں میں تلاش کیا جائے گا۔ زبان کا تعلق بھی مقامیت سے ہوتا ہے۔ زبان کو عالمگیریت کے غلبے میں ایک زبان مسلط کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ استعماری قوتوں کا ایک بڑا حربہ ثابت ہوا۔ لوگ اپنی مقامی زبانوں کو کم تر خیال کر کے اس مقام اس مرکزی زبان کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ اس سے مقامی زبانوں کو بہت حد تک نقصان ہوا۔ مقامی زبانیں زوال کی طرف گامزن ہوئیں جب اس کے اپنے بولنے والوں نے اسے کمتر خیال کرنا شروع کر دیا۔

زبان رابطے کا اہم وسیلہ ہے۔ زبان کے ذریعے انسان اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتا ہے۔ زبان ثقافت کا ایک اہم پہلو ہے۔ زبان رابطے کے ذریعے کے علاوہ اس قوم کی ثقافت اور تاریخ بھی ہوتی ہے۔ ہر مقامیت کی اپنی زبان نہ بھی ہو تو اس کے الفاظ لہجہ کسی حد تک مقامی شناخت کا حامل اور دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ ان مقامی الفاظ اور لہجوں میں ہی مقامیت کی شناخت پوشیدہ ہوتی ہے۔ زبان کے لہجے اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ بعض اوقات اس زبان کو محض مقامی لوگ ہی سمجھ پاتے ہیں۔ پاکستان میں بولی جانے والی بڑی زبانوں کو صوبوں کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے مگر اس کی ذیل میں مقامی زبان، لہجے بھی اپنے طور پہ مکمل ذخیرہ الفاظ اور بعض تو تخلیقی ادب کے حامل بھی ہیں۔ پنجاب میں پنجابی کے علاوہ سرائیکی اور پوٹھوہاری بھی بڑی تعداد میں لوگ نہ صرف بولتے بلکہ ان میں ادب بھی تخلیق کر رہے ہیں۔ لہذا مقامیت کی زبان بھی اپنی ہو سکتی ہے جو اس کی مقامی شناخت کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے۔ اس باب میں مقامیت میں زبان کے پہلو کے بارے میں بھی تحقیق کی جائے گی اور اس کی نوعیت کا جائزہ لیا جائے گا۔ مقامیت میں رسم ورواج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ روایتی نظام تو چلتے ہی رسم ورواج کے مطابق ہیں۔ جدیدیت اور مجموعی سماجی ڈھانچے میں تبدیلی کی وجہ سے مقامی علاقوں نے بھی ان کے اثرات قبول کیے ہیں۔ روایت پسندی کا زوال شروع ہو چکا ہے مگر اب بھی بعض معاشرے اپنے رسم ورواج کی پابندی کو لازم خیال کرتے ہیں کچھ فرسودہ رسومات معاشروں میں چل رہی ہیں اور کچھ اعلیٰ اخلاقی قدریں بھی زوال کا شکار ہو چکی ہیں۔ مجموعی طور پر اس باب میں مقامیت کے ان پہلوؤں کو تلاش کیا جائے گا۔ ناولوں میں مقامیت کے عناصر تو موجود ہیں۔ تمام ناولوں میں عناصر کی نوعیت یکساں نہیں ان میں سے ہر عنصر کی وضاحت اور نوعیت کا تجزیہ اور جائزہ لیا جائے گا۔

2.1 معاشی نوعیت

انسان کی بقاء کے بغیر تہذیبوں کی بقاء بھی ممکن نہیں۔ تہذیبیں تبھی پروان چڑھتی ہیں جب انسان موجود ہوں۔ ان کا نسلی تسلسل برقرار رہے گا۔ انسان کے زندہ رہنے کے لیے اس کا مخصوص معاشی نظام کا ہونا بھی ضروری ہے۔

جوں جوں انسان معاشرتی، سماجی صورتحال میں آتا گیا اس نے اپنا ایک مخصوص معاشی نظام بھی وضع کیا۔ پہلے کا انسان جنگلوں میں شکار کر کے گزارا کر سکتا تھا مگر جب انسان نے سماجی شکل اختیار کی، آبادی میں اضافہ ہوا تو اس نے اپنے کھانے پینے اور اپنی ضروریات زندگی پورے کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ مخصوص طریقہ معاش اپنایا۔ آج دنیا میں مختلف لوگوں کے ذریعہ معاش مختلف ہیں۔ دیہاتوں میں لوگ زیادہ تر زرعی اجناس سے وابستہ ہوتے ہیں تو شہروں میں صنعتی ترقی آچکی ہے۔ اس معاش کے اہم مسئلے کے ذریعے بہت سے دوسرے ثقافتی عوامل بھی جڑے ہوتے ہیں۔ ہر مقامی علاقے کا مخصوص معاشی نظام یا نوعیت ہوتی ہے۔ اس کے تحت ہی مقامیت پروان چڑھتی ہے۔ معاشی نظام انسان کے داخلی اور خارجی معاملات کو بھی بڑی حد تک متاثر کرتا ہے۔ اس ضمن میں ناولوں میں موجود مقامی معاشی نوعیت کا جائزہ لیا جائے گا۔

اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے ناولوں میں مقامیت کی طرف رجحان زیادہ ملتا ہے۔ ناول نگاروں نے اپنے آبائی علاقوں ثقافتوں کو اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے۔ اختر رضا سلیمی جاگے ہیں خواب میں اور جندر دونوں ناولوں کے خالق ہیں۔ ان کے نالوں میں پہلا ناول "جاگے ہیں خواب میں" ہے۔ اختر رضا سلیمی کے ناولوں میں باقی اوصاف کے ساتھ ساتھ مابعد جدید بیانیہ ایک وصف ہے۔ اس ناول میں انہوں نے اردو کے ناول کو ہزارہ لوکیل سے روشناس کراتے ہوئے اس کی مقامی تاریخ، ثقافت اور دوسرے عوامل کو اردو ادب کے قاری تک پہنچایا ہے۔ یہ وسیع تناظر کا ناول ہے۔ ناول میں ہزارہ کے ایک گاؤں کے تناظر میں مصنف نے کئی صدیوں تک کی ثقافت کو بیان کیا ہے۔

نور آباد کے گاؤں کے تناظر میں ناول نگار نے اس علاقے کی ثقافت کے ساتھ ساتھ اس کے دوسرے عناصر کو بھی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ناول کیونکہ مختلف ادوار کے بیان کا حامل ہے اس لیے اس کی معاشی نوعیت کا اندازہ بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ نور آباد کی بستی کے بیان سے قبل اور اس کے قیام کے کچھ عرصے کے بعد کے معاشی حالات کو قدرِ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ نور آباد کی بنیاد کے ساتھ ہی گاؤں والوں کی زندگیوں کا انحصار اور ان کا ذریعہ معاش بھی قدیم قبائلی دیہاتی زندگی کے طرز کی وضاحت ہے۔ یعنی اناج کے لیے فصلیں اگانا اور اس کے علاوہ غلہ بانی، مال موشی پالنا ان کا اہم ذریعہ معاش تھا۔ نور آباد کی بستی کے قیام کے وقت ایک منظر ان کی معاشی حالت کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ ان پہاڑی علاقوں میں معاش ہمیشہ ایک مسئلہ رہا ہے۔ دور دراز علاقے ہونے کے وجہ سے یہاں کی مقامی آبادی کا ذریعہ معاش عموماً مقامی فصلیں اور غلہ بانی ہی رہا ہے۔

"اگلے سال انہی دنوں میں وہاں دس، بارہ مکان؛ اور ان کے ارد گرد اٹھارہ، بیس کھیت تھے جن میں گندم، جو ہر سرسوں لہرا رہی تھی۔"(1)

ہزارہ کی مقامی ثقافت میں معاش کا پہلا ذریعہ زرعی اجناس اور مال مویشی تھے۔ اس کے علاوہ محنت مزدوری بھی ان کے روزگار کا حصہ رہی ہے۔ انگریز حکومت کے ساتھ ان کی اطاعت گزاری کے بعد خطے میں سڑکوں کی تعمیر اور سکولوں کا آغاز ہوا؛ یوں وہاں سے تعلیم کی امید اور اس کے بعد سرکاری ملازمتوں کی طرف لوگ راغب ہوئے۔ انگریز کی آمد کے بعد جاگیردارانہ نظام نے بھی سر اٹھایا۔ یوں انگریزوں نے مقامی سرداروں کی ملکیت میں کئی علاقے دے دیے اور اس طرح چھوٹے کاشتکاران کے زیرِ اثر آگئے۔ سرداروں کی اطاعت گزاری ان پہ لازم ہو گئی۔ وہ انہیں اپنا مالک تصور کرنے لگے کیونکہ اس کے سوا ان کے لئے کوئی اور چارہ نہ رہا کہ وہ اس زمین سے بے دخل کر دیے جاتے جس سے وہ اپنا گزر اوقات کرتے ہیں۔

"ڈی سی صاحب نے رخصت ہونے سے قبل نور آباد سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک پورا گاؤں موڑاہ، چھوٹے سردار جی کے نام لکھ دیا اور اس کے کاغذات چھوٹے سردار کو پاس بلا کر خود ان کے حوالے کیے اور کہا یہ آپ کی شادی کا تحفہ ہے۔"(2)

جاگیردارانہ نظام نے ان چھوٹے کاشتکاروں کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اگر تو جاگیردار/سردار نرم دل ہو تو عوام کا بھلا ہو، نہ ہو تو ان کا جینا دوبھر ہو جاتا۔ مذکورہ ناول میں بھی اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان سرداروں کی حاکمیت/تقدس کو دکھایا گیا ہے۔ ان کی وجہ ان کی نیک نامی اور غریب پروری بھی ہے۔ ان مقامی لوگوں کی زندگیوں کا زیادہ تر انحصار کھیتی باڑی پر تھا۔ ان سرداروں کے توسط سے مقامی لوگوں کو فائدہ ہوا۔ انگریزوں سے مقامیت کے بدلے ان علاقوں میں اگرچہ ترقی بھی ہوئی۔ تاہم سرداری نظام کے تحت اور قبائلی نظام میں جکڑے ہوئے یہ لوگ ہمیشہ معاشی تنگدستی کا شکار ہی رہے کیونکہ وہ اس حوالے سے خود مختاری حاصل نہ کر سکے۔ کبھی انگریزوں اور کبھی مقامی لوگوں کے ماتحت رہے۔

"ہمارے سردار جی ہیں بھی تو بہت اچھے آدمی۔ کوئی اور ہوتا تو کب کا ہمیں یہاں سے بے دخل کر چکا ہوتا۔ لیکن وہ تو ان داتا ہیں۔ خدا نے جتنی زمین دی ہے اس سے بھی بڑا دل۔"(3)

نور آباد کی نئی بستی کا وجود عمل میں آیا تو ان کے معاشی وسائل بھی محدود تھے۔ یہ حالات محض ان کے ہی نہ تھے بلکہ دور دراز کے پہاڑی علاقوں میں رہنے والے اکثر لوگوں کے حالات ایسے ہی تھے۔ طویل اور مشکل راستوں کی وجہ سے ان کی رسائی بڑے شہروں میں نہ تھی۔ روزگار کے مواقع بھی محدود تھے۔ ان کا زیادہ تر دارومدار کھیت اور جانوروں پہ تھا۔ ان کے قدامت پسندیوں میں ان کی کمزور معاشی حالت کا بھی دخل ہوتا ہے۔ قدرتی آفات ان کا نقصان زیادہ کرتی ہیں کیونکہ وہ ان کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ نور آباد میں ہونے والی بارشوں اور ان کی بے بسی ایک ایسے کی صورت میں دکھائی دی ہے۔ جہاں یہ لوگ اپنی مدد آپ کے تحت تھے۔ اپنے اوپر آنے والی آفتوں

کا سامنا کرتے ہیں۔ دور دراز ہونے کی وجہ سے بڑے شہروں اور حکومتوں کی توجہ ان علاقوں کی طرف نہیں جاتی۔ یوں معاشی حالت میں پسے ہوئے یہ لوگ مزید مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

"اتنے میں فقیر محمد نے اپنی قمیض اتار کر الٹی پہنی اور باہر بارش میں نکل گیا اس کی دیکھا دیکھی کئی دوسرے لوگ بھی قمیض الٹی پہن کر بہت تیز بارش میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ وہ گھنٹا بھر بارش میں ٹہلتے رہے اور بارش بدستور جاری رہی۔"(4)

معاشی مسائل کی وجہ سے وہ اپنی پرانی روایات اور اساطیر کے اندر ہی مقید ہیں۔ ان کی توہمات پرستیوں میں ان کے وسائل کی کمی، موسمی شدت، ماحولیاتی مسائل، زندگی کا بقاء کا مسئلہ ہی ان کی توہمات پرستیوں کی وجہ ہوتا ہے۔ معاشی آسودگی نہ ہونے کے باعث وہ انہی رسومات میں جکڑے ہوئے اپنی زندگیوں کے تسلسل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

مقامی معاشی نوعیت کا اندازہ زلزلے کے زمانے میں بھی ہوتا ہے۔ اس وقت جب ان لوگوں کے وسائل محدود تھے۔ دور دراز کے علاقوں پہاڑی علاقوں میں ہونے کی وجہ سے ان کے وسائل اور معاشی حالت کی کمزوری کے باعث ان کی رسائی بڑے شہروں تک ممکن نہ تھی۔ جس کی وجہ سے وہ ایسے سانحے کو زیادہ برداشت نہ کر پائے۔ لوگوں نے زندگی کی بقاء کے لیے ایک دوسرے کے مال پہ ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیے۔ اکیسویں صدی کے ابتدائی دہائی میں آنے والے کشمیر اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں آنے والے زلزلے سے ان علاقوں کو شدید نقصان پہنچا۔ حکومتی امداد بہت دیر تک ان لوگوں تک پہنچی اور دور دراز کچھ علاقے اس سے محروم رہ گئے۔ جس کی وجہ سے بھوک اور افلاس کی شدت نے لوگوں کو انسانی حقوق کی پامالی پہ مجبور کر دیا اور وہ ایک دوسرے کے مال پہ اپنے ہاتھ صاف کرنے لگے۔

"میری تو مجبوری ہے۔ مجھے رات بھی یہیں گزارنا پڑے گی۔ نہیں تو لوگ میری دکان لوٹ لیں گے۔ آدھی دکانیں تو لوٹ کر لے گئے ہیں"۔(5)

بھوک انسان کو معاشرتی اصولوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ناول نگار نے معاشرتی رویوں کے حوالے سے بھی معنی خیز سوال پیدا کیے ہیں، عذاب، موت کا خوف، قدرتی آفات کے باوجود بھی لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مخلصی کرنے کے بجائے دھوکہ دہی سے باز نہیں آتے۔ ناول نگار نے عمومی معاشرتی رویے کے ساتھ ساتھ حکومتی رویوں پہ بھی طنز کیا ہے۔ اگرچہ اس حوالے سے زیادہ تفصیل نہیں ہے لیکن زیرِ لب طنز ضرور موجود ہے کہ اسلام آباد سے ملحقہ محض چند کلومیٹر دور اس علاقے میں امداد بہت بعد میں پہنچی۔ جس میں راستوں کی دشواری اپنی جگہ مگر حکومتوں کی نااہلیاں بھی اس میں دکھائی دیتی ہیں۔ دوسری طرف لوٹ مار کرنے والے اور دوسروں کے حقوق سلب کرنے والے ہر موقع سے فائدہ اٹھانے پہنچ جاتے ہیں۔ زلزلے کے وقت میں بھی ایسے سانحات اخبارات اور ٹی

وی کی زینت بنے جب امدادی ٹیموں یا سر گرمیوں میں حصہ لینے والوں کی آڑ میں کئی لوگوں نے ان مقامی لوگوں کے مال واسباب کو لوٹ لیا ۔

"مغرب کے بعد بستی والے اپنے اپنے عزیزوں کی تدفین سے پلٹے تو انہوں نے دیکھا کہ نوجوانوں کا گروپ حسب وعدہ کسی دوسری بستی کی مدد کو جا چکا ہے۔ملبے سے برآمد ہونے والے زیورات اور دوسرے سامان سمیت۔"(6)

مجموعی طور پہ ناول میں مقامیت کے بیان میں جہاں مختلف ادوار کا احاطہ کیا ہے وہیں ان لوگوں کے بود و باش، رہن سہن کے ساتھ ساتھ معاشی مسائل کا بھی تذکرہ کیا ہے۔معاشی مسائل اس علاقے کا ایک قدیم مسئلہ رہا ہے۔دور دراز علاقوں کے ہونے کی وجہ سے جہاں ان علاقوں کی رسائی بڑے شہروں تک مشکل رہی ہے وہیں حکومتوں کی عدم توجہ کے باعث بھی ان علاقوں کے معاشی حالات ناگفتہ بہ رہے ہیں۔ناول نگار نے اکیسویں صدی میں آنے والے زلزلے کے تناظر میں بھی ان علاقوں کی معاشی مسائل کو بیان کیا ہے۔اس آفت سے نمٹنے کے لیے ان کے پاس دستیاب وسائل بہت کم تھے اور حکومتوں کی طرف سے دی جانے والی مدد بھی بہت بعد میں پہنچی۔جس سے ان لوگوں کی زندگی مزید مشکلات، پریشانی کا شکار ہوئی۔ان کے معاشی مسائل پہلے ہی اچھے نہیں تھے تو ایسی آفتوں کی وجہ سے وہ مزید پستی کے عالم میں چلے جاتے ہیں۔ناول میں مقامی معاشی بیانیوں کے ضمن میں اس قدر ہی وضاحت ملتی ہے۔ان کا معاشی نظام بھی ان کے جغرافیہ کے گرد ہی گھومتا دکھائی دیتا ہے۔

اختر رضا سلیمی کا دوسرا ناول بھی مابعد ناول قرار دیا جاتا ہے۔جندر کا لوکیل بھی ہزارہ ہے۔ سلیمی کے اس ناول کا موضوع بھی ہزارہ کی مقامی ثقافت کا بیان ہے۔ جندر میں بھی "جاگےہیں خواب میں " کی طرح اختر رضا سلیمی نے مہابیانیہ کو رد کرتے ہوئے مقامی بیانیہ برتا ہے۔مقامی ثقافت کو مختلف جزئیات کے ساتھ نہ صرف بیان کیا ہے۔بلکہ مابعد جدید دنیا میں انہوں نے اپنی مقامیت کا ایک کامیاب مقدمہ بھی لڑا ہے۔"جندر "کا نام ہی مقامی لفظ ہے۔ جس کا مطلب پن چکی ہے۔ناول کا خاصہ ہے کہ اس ایک چکی کو مرکز بنا کر ناول نگار نے پوری تہذیب کو اس کے پیرائے میں بیان کر دیا ہے۔جندر میں مقامیت کے معاشی پہلو کی طرف دیکھا جائے تو ناول میں روایتی قسم کی دیہات کی زندگی، اس کی معاشی حیثیت کے تاثرات ملتے ہیں۔ پہاڑی علاقے میں رہنے والے لوگوں کا ذریعہ معاش زیادہ تر غلہ بانی کھیتی باڑی ہوتا ہے۔ میدانی علاقوں کی نسبت ان علاقوں میں فصلوں کی نوعیت اقسام اور مقدار میں بھی فرق ہوتا ہے۔ جندر کا مرکزی کردار ہی اپنی زبانی ان تمام واقعات کو بیان کرتا ہے جس میں اس کی ثقافت کا بیان بھی ملتا ہے۔

ولی خان کی زبانی اس مقامیت (لوکلائزیشن) کا مقامی بیانیہ مقامی کرداروں کی زبانی ملتا ہے۔مقامی نوعیت کے لوگوں کا پرانے عہد سے دور حاضر تک کے مالی حیثیت کا بھی چیدہ چیدہ تذکرہ ملتا ہے۔ولی خان اپنے دادا کے بیان میں مقامی لوگوں کی مالی حیثیت کا بیان بھی کرتا ہے۔جو راجہ مہاراجوں کا زمانہ تھا۔ان کی مرضی اور منشاء کے بغیر کوئی کام نہ

ہوتا تھا۔ یوں ان کی مالی حیثیت بھی ایسی تھی کہ وہ ہمیشہ راجاؤں کے محتاج رہتے۔ راجہ کی چکی کے پاٹ کی چوری کے موقعے کا ایک منظر ملاحظہ ہو۔

"اور راجہ نئی کہانی سن کر بہت پریشان ہوا کیونکہ علاقے کے راجہ کی کسی چیز کو، اور وہ بھی اتنی اہم اور قیمتی چیز کی چوری کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کسی شخص کو اس کی شملات میں بغیر پوچھے کلہاڑی کے لیے کاہو کا ایک دستہ کاٹنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی تھی۔"(7)

اس پہاڑی علاقے میں دور دراز کی مسافتیں راستے کی دشواریاں اور محدود وسائل میں ان کی زندگیاں دشوار تھیں۔ ناول میں کئی دہائیوں قبل ایک خشک سالی کا بیان بھی یہاں بیان ہوا ہے۔ جب یہاں پہ چلنے والی مقامی پن چکیاں بند ہو گئیں تو لوگ گندم کے دانے ابال کے کھانے پہ مجبور ہوئے۔ دور دراز کی مسافتیں طے کر کے چکی تلاش کی جاتی جہاں سے آٹا پسوایا جا سکتا۔ ان مقامی علاقوں کو اکثر ایسی آفتوں میں اپنے بھروسے پہ ہی زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ ان کے معاشی حالات کی کمزوری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ وہ روٹی سے بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ حکومتی مشینری ہو یا بڑے سرداروں اور جاگیرداروں کی بات تو محض ہمدردی اور نسبتاً آسان علاقوں تک ہی محدود رہتی ہے۔

"جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے پانی کم ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد مجھے خبر ملی کہ کوہ رمال کے دوسری جانب بہنے والے تمام جندر بھی خشک سالی کی وجہ سے بند ہو گئے ہیں اور وہاں کے لوگ ابلے ہوئے دانوں پہ گزارا کرنے پہ مجبور ہو گئے ہیں۔"(8)

اس مقامیت میں ان کی مالی معاشی حیثیت کچھ خاص نہ تھی۔ قدیم دور سے ہی ان نیم پہاڑی نیم میدانی علاقوں میں دور دراز کی مسافتوں میں بٹے قبائل اور ان کے رہنے والے مالی تنگدستی کا شکار ہیں۔ نوآبادیاتی عہد میں بھی اس دشوار گزار علاقے کی طرف صنعتی ترقی نہ ہونے کے برابر رہی۔ حکمرانوں کی عدم توجہ اور مقامی سرداروں اور نوابوں کی عدم دلچسپی بھی عموماً ایسے علاقوں کی پسماندگی میں اضافہ کرتی ہے۔ اسی وجہ سے ان علاقوں کے لوگوں نے سرکاری ملازمتوں اور بعد ازاں مختلف علاقوں اور ملکوں کا سفر بھی کیا۔ لوگ محنت مزدوری، رزق کی تلاش میں بڑے شہروں اور دوسرے ملک تک چلے گئے۔ روزگار کی فراہمی کشمیر و ہزارہ جیسے پر فضا مقامات میں ایک مسئلہ تھا اور ہنوز کسی حد تک موجود ہے۔ ڈاکٹر شیر بہادر پنی تاریخ ہزارہ میں رقم طراز ہیں کہ :

"تاریخ کے مختلف ادوار کا نشان اب بھی ہزارہ میں پایا جاتا ہے۔ مشرقی اور شمالی اور غربی علاقہ کے پہاڑی حصوں میں اب بھی جو پانی عام ہے اور بقیہ آبادی زراعت پیشہ۔ چونکہ یہ دونوں پیشے موجودہ زمانے میں آسائش و آرام کی زندگی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس واسطے آبادی کی کثرت کی زندگی کا دارومدار سرکاری اور نجی ملازمت پر رہا ہے۔ اس تنگی معیشت نے اہل ہزارہ کو دنیا کے سب گوشوں میں منتشر کر دیا"۔(9)

معاشی بدحالی اس مقامیت کا ایک اہم روگ رہی ہے۔ دور دراز کی مسافتیں صنعتی ترقی نہ ہونے کے باعث ان لوگوں کا ذریعہ معاش زراعت تک ہی محدود رہا۔ ان کے معاشی حالات میں بہتری بہت بعد میں آئی۔ ایسی صورت میں اولادوں کا بوجھ اٹھانا بھی ان کے لیے مشکل رہا۔ کم سنی کی شادی، کم عمری میں محنت مزدوری کو پڑھائی پہ ترجیح دی جاتی۔ دور دراز کے علاقوں دشوار گزار راستوں کی وجہ سے تعلیمی سہولیات کا بھی فقدان رہا۔ اب بھی کئی ایسے علاقے موجود ہیں جہاں روزگار بہت مشکل ہے۔ معاشی نظام مربوط نہیں ہے۔ فصلوں کی مقدار محدود اور اگر ہو بھی تو منڈیوں تک رسائی دشوار تھی۔ ولی خان اپنے باپ کے بیان میں جو اولاد نہ ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کا امیدوار ہے، لوگ اس کو خراب معاشی حالات کی وجہ سے بخوشی رشتہ دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس کی مالی حالت بہت سے مقامی لوگوں کی نسبت بہتر ہے۔

> "ہمارا جندر بارہ مہینے چلتا تھا اور میں دن رات محنت کرتا تھا۔ اس لیے گاؤں میں ہماری زرعی زمین بہت کم ہونے کے باوجود بھی ہمارے معاشی حالات دوسروں سے اچھے تھے۔ مالی حالات کی بہتری کی وجہ سے کئی لوگ دوسری شادی کے لیے بھی مجھے رشتہ دینے پہ رضامند تھے کہ بھوک اور افلاس کی کثرت کے باعث زیادہ تر والدین رشتہ طے کرتے ہوئے صرف یہ دیکھتے تھے کہ ان کی بیٹی کو کہاں بہتر نان نفقہ ملے گا"۔(10)

ہزارہ کی مقامیت کو موجودہ ناول کے تناظر میں دیکھا جائے تو ولی خان کی زبانی ہمیں کئی نسلوں کا قصہ بھی ملتا ہے۔ ان مضافات میں معیشت ایک اہم مسئلے کی طور پہ موجود ہے۔ ذریعہ معاش سادہ اور روایتی ہونے کے ساتھ ساتھ تنگدستی بھی ان لوگوں کا مقدر رہی لیکن اس کے باوجود وہ اپنی خود مختاری پر سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس مقامیت میں ان مسائل کے باوجود مختلف رسموں کے ساتھ جڑے دکھائی دیتے ہیں ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ تنگدستی میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

ناول میں اس مقامیت کی معاشی حالت کا نہ صرف اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کے مختلف ذرائع کا بھی بیان ملتا ہے۔ ہزارہ کی مقامیت میں اس کی معاشی نوعیت کا اندازہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس سے جڑے عوامل کا احوال بھی ملتا ہے۔ اس خودکار معاشی نظام کے تحت ہی ان کی مقامیت پروان چڑھتی ہے۔ وہ مشکل حالات کے باوجود بھی اپنی مقامیت کو خود مختاری کے ساتھ ارتقاء کی منازل طے کرواتے ہیں۔ مذہبی اعتبار سے مسجد کے امام کا کردار بھی اہم ہے۔ ہزارہ کی مقامیت میں بھی اس کردار کی معمولی حیثیت کا نوحہ موجود ہے۔ امام مسجد ایک عزت دار کردار کے طور پہ معاشرے میں موجود ہوتا ہے۔ اس کی مالی حالت نہ گفتہ بہ ہے۔ عموماً وہ صدقہ خیرات کی رقم تک محدود ہوتا ہے۔ محض عزت یا احترام ہی کافی نہیں بلکہ اس کی مالی حالات کی طرف بھی معاشرہ کو توجہ دینی چاہیے۔ مسجد خادم کے کردار میں مذہبی معاشرے کی معاشی مفلوک الحالی اور تنگدستی کا سراغ بھی ملتا ہے۔ ولی خان کے بیٹے نے اسے چکی لگانے میں مالی معاونت کی، اس کا بیان ناول میں کچھ اس طرح سے بیان ہوا ہے:

"مسجد کا خادم جو ایک حد تک اس کا بھی خادم تھا کہ گاؤں میں موجود اس کے گھر بار کی دیکھ بھال بھی اسی کے ذمہ تھی۔ ایک غریب آدمی تھا جس کا بیٹا شہر میں کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کرتا تھا۔ راحیل نے اسے اعتماد میں لے کر چکی پر اٹھنے والے اخراجات اس کے بیٹے کے حوالے کیے تا کہ کسی کو شک نہ گزرے کہ اس کے پیچھے اس کا ہاتھ ہے۔"(11)

معاشی نقطہ نظر سے جہاں مختلف پہلوؤں کی وضاحت ناول میں ملتی ہے وہیں مولوی کے کردار کے ضمن میں بھی مجموعی معاشی صورت حال کا ایک اور نمونہ دکھایا گیا ہے۔ جندر میں ناول نگار نے مقامی کرداروں کے ذریعے سے مقامیت کو مختلف حوالوں سے واضح کیا ہے۔ مقامیت کے معاشی نوعیت کو مد نظر رکھے بغیر اس مقامیت کو نہ تو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس کا بیان مکمل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے سلیمی نے مختصراً سہی مگر ان پہلوؤں کو بھی ملحوظ خاطر ضرور رکھا ہے۔ ناول میں مقامی معاشی نظام کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ جس سے مقامی معاشی نظام کی وضاحت ملتی ہے اور لوگوں کے رہن سہن، بود و باش کے ساتھ ساتھ معاشی پہلو کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ناول" ادھ ادھورے لوگ "میں بہاولپور کی مقامی ریاست کا بیان ہے۔ ایسی ریاست جو 1947ء کی تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے ساتھ شامل ہو گئی۔ ریاست بہاولپور ایک خود مختار ریاست تھی، جس کی اپنی مقامی ثقافت، زبان، جغرافیہ نیز تمام معاملات میں خود مختار حیثیت اور مخصوص شناخت کی حامل تھی۔ ناول کا موضوع دراصل گمشدہ شناخت کا بیان ہے۔ ناول کے کرداروں کے ذریعے اس مقامیت کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں ان مقامی کرداروں کی معاشرت اور معاملات کے ساتھ ساتھ مقامیت کے مختلف عناصر کی وضاحت بھی ملتی ہے۔ ناول کا موضوع ہی مقامی لوگوں کی گمشدہ شناخت کا مسئلہ ہے۔

معاشی نظام کی بات کی جائے تو مجموعی طور پر ریاست بہاولپور ایک خود مختار ریاست ہونے کے ناطے اپنے اندرونی معاملات میں خود کفیل تھی۔ یہاں کے لوگوں کی زندگیوں کا دار و مدار ہندوستان کے باقی علاقوں کی طرح فصلیں، کاشتکاری ملازمت وغیرہ تھا۔ ناول کے بنیادی کردار بھی مختلف پیشوں سے منسلک افراد ہیں جو نہ صرف اپنے پیشے یا طبقے بلکہ تمام ریاست کے معاشی نظام کی ایک اجمالی صورت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ناول میں اس تاریخی معاملے کو ناول نگار نے بہت فنکانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس سے بہاولپور کی مقامیت کے مختلف عناصر کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔ لوگ کم آمدنی کے باوجود ایک مطمئن اور پر سکون زندگی گزار رہے ہیں۔ اس عہد کا بہاولپور ایک خوش حال اور پر امن ریاست تھی۔

ناول کی کہانی جولائی 1947ء سے شروع ہوتی ہے۔ ناول میں موجود مقامی کردار ہی معاشی صورتحال کی وضاحت کرتے ہیں۔ وادھو، دھچر، حکیم برام لال کا تعلق مختلف پیشوں سے ہے۔ مقامی بازار میں تینوں دکاندار

ہیں۔ان تین مقامی کرداروں کے ذریعے ریاست کی سیاسی، سماجی صورتحال کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اس مقامی معیشت کا بھی۔ ہندوستان کے باقی علاقوں کی طرح ریاست بہاولپور میں مجموعی طور پر ہندو کاروبار اور معاشی لحاظ سے مسلمانوں سے آگے دکھائی دیتے ہیں۔ حکیم رام لال بھی اس طبقے کا نمائندہ ہے۔ اگرچہ وہ سھوکار تو نہیں لیکن اس کا نام اس کی آمدن زیادہ ہونے کے سبب مقامی مسلمان دکانداروں کے لیے رشک وحسد کا باعث ضرور ہے۔ بدلتی سیاسی صورتحال ان مقامی لوگوں میں بھی رفتہ رفتہ رشک و کینہ کی صورت اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ وہ تہذیب کی آڑ میں اپنے ذاتی مفادات کا سوچنے لگتے ہیں۔یوں شناخت کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے۔ مقامی لوگ اجنبی ہونے لگتے ہیں اور اپنی شناخت کو ثابت کرنے کے چکر میں دربدر ہونے لگتے ہیں۔ان مقامی دکانداروں کے ہاں مختلف خبروں کی بازگشت زیادہ ہے۔ جو تھوڑی بہت معلومات پہ اپنی فہم کے مطابق تبصرے کرتے رہتے ہیں۔ وادھو اور دھچر کا کردار بھی اس طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

> "یار تیرا میرا کیا واسطہ ہے اس گڑ دھال سے ۔ بہاولپور پاکستان میں رہے یا ہندوستان میں، میں نے یوں ہی لونی تیلی کرنی ہے اور تو نے لوگوں کی میل دھوتے رہنا ہے۔ یہ اولاد اگر کسی واسطے ہے تو اِس بہن کے بہنوئی حکیم رام لال کے لیے یہ جو باروں والی اونچی ماڑی بنا کر بیٹھا ہے ناسب کچھ یہیں چھوڑ کر بھاگنا پڑے اسے۔"(12)

بہاولپور ریاست کا معاشی نظام بہتر تھا۔ لوگ سادہ مگر پر سکون زندگی گزار رہے تھے۔ بازاروں کی رونق کا انحصار لوگوں کی مالی اور معاشی حالت پہ منحصر ہوتا ہے۔ بازاروں میں رش رونق اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ وہاں کے لوگ خوشحال ہیں۔امن وامان کی صورتحال بھی بہتر معاشی نظام کی دلیل ہوتے ہیں۔ ریاست کا نظام پرامن تھا۔اس لیے لوگ اپنے کاروبار زندگی آسان اور بے فکری سے کر رہے تھے۔ ناول میں اسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :

> "اگرچہ ریاست میں کوئی پہاڑی سلسلہ نہ تھا مگر پھر بھی یہاں کے میدان اور پانی کی فراوانی نے چاروں جانب ہریالی بچھا رکھی تھی۔لوگ خوشحال اور کھاتے پیتے، جرائم نہ ہونے کے برابر یہاں کے بازار سامان سے لدے پھندے اور گاہکوں سے بھرے ہوئے"(13)

1947ء سے قبل جب ریاست اپنی الگ پہچان اور شناخت کے طور پر موجود تھی تو لوگ خوشحال تھے۔ مقامی لوگ اپنے ریاستی انتظام سے خوش اور اپنے روزگار سے مطمئن تھے۔تاہم تقسیم کے بعد جیسے ہی ریاست بہاولپور کی شناخت ختم ہوئی۔ مقامی لوگوں کے معاشی حالات بھی خراب ہو گئے۔ مہاجرین تو کاروبار کو اپنا رہے تھے۔تاہم مقامی شناخت کو اپنانے سے گریزاں تھے۔ مقامی لوگوں کے کاروبار ماند پڑ گئے اور مہاجروں کا کاروبار پہ تسلط قائم ہو گیا۔دوسری طرف مہاجرین اور پنجاب کے دوسرے علاقوں سے آنے والے مہاجرین اور آبادکاروں کو نواب کی طرف سے زمین آلاٹ کرنے کے بعد مقامی لوگوں کی اجارہ داری ختم ہونے کے قریب ہو گئی۔ مقامی لوگ نہ صرف اپنی شناخت بلکہ اپنی زمینوں اور دکانوں اور کاروبار سے بھی محروم ہونے لگے۔ نواب خود ملک چھوڑ کر عوام کو مزید مایوس کر گیا۔ایسی

صورتحال میں مقامی لوگوں کی معاشی حالت بھی خراب ہو گئی اور شناخت کے بحران نے بھی جنم لیا۔ مقامی لوگوں میں روز بہ روز احساسِ کمتری اور بے چینی بڑھنے لگی۔

"نواب کے ولایت میں ڈیرہ لگانے کے سبب یوں لگتا تھا کہ جیسے یتیمی نے گھیرا ڈال لیا ہو۔ تبھی تو نہ گھر میں دل لگتا اور نہ ہی کسی کام کاج میں جبکہ مہاجروں نے ہر اس دکان کو سنبھال لیا جہاں تھوڑی سی بھی خریداری بالائی چلائی کا امکان ہو سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شہر کے تمام کاروبار ان مہاجروں کے ہاتھ میں آ گیا جو ریاست کو اپنی شناخت اپنی پہچان بنانے کو تیار نہیں تھے اور مقامی لوگ ریاستی ہوتے ہوئے بھی غربت اور احساس کمتری کے کولہو میں اس طرح آئے کہ اپنے گھر میں ہی اپنی شناخت گم کر بیٹھے۔"(14)

مابعد جدید دنیا میں ثقافتی بحران اور شناخت کا مسئلہ ایک بڑے المیے کی صورت میں رونما ہوا۔ ریاست بہاولپور کے باسیوں کے ساتھ بھی یہ سانحہ اس وقت پیش آیا جب وہ اپنی شناخت کو گم کر کے ایک بڑے ثقافتی گروہ کا حصہ بن گئے۔ اس بڑی تبدیلی سے ان مقامی لوگوں میں اپنی دھرتی پہ رہتے ہوئے، اجنبیت کے احساس نے جنم لیا۔ خصوصی حیثیت سے آباد ہونے والے مہاجر بھی ان سے زیادہ بہتر صورتحال میں تھے۔ مقامی لوگوں کی صرف شناخت گم نہیں ہوئی بلکہ ان کی معاشی قوت بھی کمزور ہو گئی۔ نواب کی فوج میں نسل در نسل کام کرنے والے فیاض کے آباؤ اجداد کی طرح کئی ایسے جو ان ملازمتوں سے فارغ ہوئے۔ باقی ماندہ کے کاروبار بھی سمٹ گئے۔ یوں ان کا معاشی نظام یکسر تبدیل ہو گیا اور وہ محض شناخت ہی نہیں اپنے کاروباروں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ ناول نگار نے 1947ء اور بعد کے احوال میں مقامی معاشی نظام کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ جس سے اس مقامیت کے معاشی نظام کا بھی خاصی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے۔

ناول انواسی بستی آدم واہن کے گرد گھومتا ہے۔ یہ ناول ایک بستی کا بیانیہ ہی نہیں ہے۔ یہ بیانیہ دریا کنارے بسے ان لوگوں کا ہے جو قدرتی وسائل کے قریب ہوتے ہوئے بھی ان سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ ان کے پاس یا دور کے وسائل پہ مقامی طاقتور طاقتیں یا بیرونی طاقتیں قابض رہتی ہیں۔ آدم واہن بہاولپور کی ایک مقامی بستی کا بیان ہے۔ ایسے عہد کی یادگار ہے جہاں نو آباد کار اپنے اقتدار کو مستحکم سے مستحکم تر کرنے کے جتن میں طاقت کے نشے میں چور ہیں۔ جو مقامی لوگوں کے معاشی اور جسمانی استحصال کو اپنا حق خیال کرتے ہیں۔ آدم واہن کے لوگوں کا کوئی مستقل روزگار ہے اور نہ ہی پیشہ۔ ناول میں اس ضمن میں زیادہ تر ان لوگوں کے حالات کا جائزہ ان کے سماجی ماحول کے تناظر میں ہو سکتا ہے۔ معاشی اعتبار سے یہ لوگ کمزور ہیں۔ دریا کنارے آباد ان لوگوں میں سے چند کا روزگار دریا سے وابستہ ہے۔ وہ بھی جب اس میں پانی آتا ہو اس کے علاوہ بعض سماجی برائیاں بھی ان کے روزگار کے روپ میں موجود ہیں۔ اپنے پیٹ کو پالنے اور اپنی زندگی کا ارتقاء جاری رکھنے کے لیے وہ چوری جیسے شعبے کو بھی اختیار کرنا معیوب نہیں

سمجھتے۔کمزور معاشی حالات میں اکثر جرائم کی شرح بڑھ جاتی ہے۔ بھوک بہت کچھ کرنے پہ آمادہ کر دیتی ہے۔ یہ مقامیت کا مثبت پہلو تو نہیں ہے۔اس پہلو کے ذریعے اس معاشرے میں موجود ناقص معاشی نظام کی عکاسی ملتی ہے۔

"مال مویشی چونکہ دریائی بستیوں کی معیشت کی بنیادی اکائی سمجھے جاتے ہیں۔اس لیے معاشرتی اکائی یعنی بازو کا اغوا ہو جانا اتنا کاری وار نہیں گردانا جاتا جتنا کہ گائے بھینس کا چوری ہو جانا۔دیگر دریائی بستیوں کے ساکنان کی طرح آدم واہن کے باسیوں کو یقین تھا کہ جس طرح بڑے بڑے ذخیرہ تھنوں اور لامبی سیاہ آنکھوں والی چٹی گوری لڑکیاں اغواء ہو کر ہی رہتی ہیں اسی طرح لشکارے مارتے سیاہ بھینسیں اور دودھ سے بھرے تھنوں والی گائیں بھی پرایا دھن ہی ہوتی ہیں۔"(15)

ایسی نازک معاشی صورتحال کہ جہاں عورت کو فروخت کرنے کا کاروبار بھی عروج پہ ہو،وہاں کے لوگوں کی حالت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔اس چھوٹی سی بستی کے لوگوں کا بھی ارد گرد کے دیہاتوں کی طرح یہی روزگار تھا۔ناول کا مرکزی کردار سنگری اس پورے نظام کی کلی کھولتی ہے۔ سنگری کے کردار کی بے بسی اور لاچارگی میں بھی اس کے معاشی حالات کا دخل ہے۔اس کی شادی کی رسم بھی مقامی رواج کے مطابق اس لیے بچپن میں کر دی جاتی ہے تاکہ وہ بھی کسی کی ہوس اور اغوا کار کا نشانہ نہ بن جائے۔ سیدے کے چلے جانے کے بعد بھی اس کے لیے اصل مسئلہ معاشی تھا۔ جس کے لیے اسے طرح طرح کی اذیت اٹھانی پڑی۔ایسا معاشرہ جہاں روزگار سے عاری مرد ہوں وہاں کوئی دوسرا کسی کا بوجھ کیسے اٹھا سکتا ہے۔ناول میں انہی کرداروں کے ذریعے مقامی معاشی نظام کی جزئیات ملتی ہیں۔

نوآبادیاتی عہد میں بھی ان لوگوں کی اسی مالی حالت کا فائدہ اٹھایا جاتا رہا۔انھیں کم نرخ پر مقامی لوگوں سے مزدوری مل جاتی۔ تو کبھی بغیر پیسوں کے بھی ان مقامی لوگوں پر دباؤ ڈال کر ان سے کام کرا لیا جاتا۔ ریلوے کمپنی کے افسروں کا پکھی واس لڑکی سے زیادتی اور اس کے بدلے رقم کا دے دینا ان زیادہ مقامی لوگوں کی مالی خستہ حالی کا بیان بھی ہے۔ان لوگوں نے مقامی لوگوں کے وسائل پر قابض ہو کر ان میں بھوک اور افلاس کو پروان چڑھایا اور ان کی صلاحیتوں کو اپنے تابع کر لیا۔کمزور معاشی نظام اور حالت نوآبادکاروں کے تسلط کو مضبوط کرنے کے کام بھی آتی ہے۔بستی آدم واہن ہی کیا ایسی ہزاروں بستیاں یہی داستان سناتی ہیں۔ نوآبادکار ان کے معاشی حالات سے ان کی صلاحیتوں کو اپنے زیر تسلط کرتے ہیں۔مالی وسائل کو معدوم کر کے پھر امید کی ایک کرن روشن کی جاتی ہے۔اس ہلکی لو سے مستفید ہونے کو پروانوں کی مانند امڈ آتے ہیں۔ جن کا یہ نوآبادکار استحصال کرتے ہیں۔

"کیشیر سے کہو کہ ان سب کو حاضری کے ساتھ ہی روز کی مزدوری روز پیشگی دے دیا کرے۔ مونک نے اب کے حیران ہو کر گالوے کی طرف دیکھا۔۔۔اس سے اگلے روز اس سے بھی زیادہ تعداد میں بستی کے لوگ مزدوری کرنے پہنچے ہوئے تھے۔"(16)

کمپنی کو اقتدار بھی اور کم دام مزدور بھی اس بستی سے مل جاتے ہیں۔ بستی آدم واہن کے پیرائے میں ناول نگار نے نوآبادیاتی نظام کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ بہاولپور کی مقامی آبادی خصوصاً دیہاتوں اور دور دراز کے علاقوں کے لوگوں کی معاشی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ناول میں معاشی حوالے سے اس طرح کے اشارے ہی ملتے ہیں۔ مقامی لوگوں کو جو زمیندار تھے۔ ان کی زمینوں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے اور باقی ماندہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ جب انگریزوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ان کو مزدوریاں دیں تو اس لیے بھی ان کی باقی ماندہ صلاحیت بھی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ وہ محض کام کرنے والی مشین بن کر رہ گئے۔ ناول میں اس مقامیت کے مجموعی طور پر معاشی نظام کے اتار چڑھاؤ کی بات کی ہے۔ بہاولپور کی مقامیت کے پیرائے میں لکھے گئے اس ناول میں ان مقامی لوگوں کے معاشی نظام کی تصویر کشی ملتی ہے۔ انسان کو اپنی بقاء کے لیے مختلف حربے استعمال کرنا چاہیں۔ یہ مقامی لوگ اپنی مجبوریوں کے تحت ان لوگوں کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ ناول میں بستی کے گرد کہانی میں اس مقامیت کے معاشی نظام کی بھی کسی حد تک وضاحت ہے۔

وسطی پنجاب کے ایسے علاقے کا بیان ہے۔ جہاں زمیندارانہ نظام رائج ہے۔ یہاں کے مقامی باشندے ایک محکوم رعایا اسی صورتحال سے دوچار ہیں۔ ان کی زندگیوں کا دارومدار مقامی وڈیروں اور جاگیرداروں سے جڑا ہے۔ یہی ان کے مالک بھی ہیں اور ان کی کفالت کا ذریعہ بھی۔ اپنے پیٹ کی بھوک مٹانے اور زندگی کے ارتقاء کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے وہ انہی کے در کے گداگر ہیں جو جاہل بھی ہیں اور ان پڑھ بھی، اتنے کہ اپنے خدا کے تعارف سے بھی اتنی حد تک ہی واقف ہیں کہ محض کلمہ ہی سیکھ لیں تو بہت ہے۔ ایسی جہالت میں اٹے رہنے کے باعث وہ اپنے حقوق سے بھی ناواقف ہیں اور اپنی حالت کے بدلنے کا تصور بھی مفقود ہے۔

معاشی نوعیت کی بات کی جائے تو اس مخصوص خطے کا دارومدار زراعت پہ ہے۔ جس سے مقامی جاگیرداروں سے لے کر ان پہ محنت مزدوری کرنے، جاگیرداروں کی فصلوں مویشیوں کی رکھوالی ہو یا ان کی عورتوں کا ان کے گھروں میں خادمہ کا کردار دونوں ہی صورتوں میں اسی سے جڑا ہے۔ جاگیرداروں کا بھی اسی سے رعب ہے اور ان کی محکوم مجبور رعایا کی زندگی کا دارومدار بھی انہی فصلوں پہ ہے۔ کسی بھی محکوم آبادی کا دارومدار ان کے معاشی حالات ہی اس کی اصل اور مضبوط وجہ گردانے جاتے ہیں۔ ان کی روزی روٹی ہی ان کی گردنوں میں غلامی کا طوق ڈالے رکھنے کے لیے کافی ہے۔ طاقتور ان پہ غلبہ پانے کے لیے اس کو اہم ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ زمین داروں اور زیل داروں کی ترقی کی اصل وجہ بھی یہی کم ذات لوگ ہیں۔ ان میں سے ان کو صرف اتنا ہی دیا جاتا ہے کہ وہ زندہ رہ سکیں ۔اتنا نہیں دیا جاتا کہ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے کہ کل وہ اپنے مالک کے سامنے کھڑے ہونے کی جرات نہ پیدا کرلیں۔

"نیلی بار طاہرہ اقبال کا ایک شاندار ناول ہے۔ اس میں دوآبہ رچنا کے باسیوں کی حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ناول اس عہد کی عکاسی کرتا ہے جب یہاں کے مقامی افراد کا ذریعہ معاش صرف مال مویشی تھے۔ ان کی زندگیوں کی جمع پونجی یہ ڈھور ڈنگر ہی تھے۔ قانون کے عملداری صرف زمینداروں کے ہاتھ میں تھی سب افراد ان کی عقیدت کا دم بھرتے تھے۔ ان کے بنائے ہوئے قوانین اپنے تھے یہ لوگ راوی اور چناب کے درمیان مویشی چراتے تھے۔ جو زیادہ تر نمبردار ہوں زیلداروں کے ہوتے تھے۔"(17)

ناول میں تین طبقے موجود ہیں۔ مقامی افراد جو انتہائی کم درجہ خیال کیے جاتے ہیں، جو جاگیرداروں کے غلام ہیں دوسرا طبقہ باہر سے آنے والے مہاجرین جو تقسیم کے وقت مختلف علاقوں یا انگریزوں کی طرف سے عطا کی گئی زمینوں کی وجہ سے اس علاقے میں آبسے۔ تیسرا حکمران / جاگیردار طبقہ جو موروثی طور پر اس علاقے کی عملداری سنبھالے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تو زندگی سے موت تک ان جاگرداروں کی ماتحت ہیں۔ جو ان کے حکم کی خلاف ورزی کو خدا کی حکم عدولی کے مترادف سمجھتے ہیں۔ معاشی طور پر تمام افراد زمین سے ہی جڑے ہیں۔ جو ان کی معیشت کا دارومدار ہے۔ تاہم مہاجرین ان مقامی افراد کی نسبت زیادہ آزاد ہیں۔

مقامی افراد کو چوہڑے یا میراثی کے القابات اور بگڑے ہوئے ناموں سے پکارا جاتا۔ یہی پنچ خیال کئے جانے والے لوگ ان کے خدمت گار ہیں۔ جو خود افلاس کا اس قدر شکار ہیں کہ نوابوں کو پکا کے دینے والے، ان کی دعوتوں کے اہتمام کرنے والے خود پیٹ بھر کے تب ہی کھاتے ہیں جب ان نوابوں جاگیرداروں کے ہاں کوئی خوشی کا موقع ہوتا۔ ناول میں کئی دہائیوں کی تاریخ کا عمل دکھایا گیا ہے لیکن اس تمام عرصے میں مقامی افراد کی معاشی سماجی حالات میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوتی۔ فوجی حکومتوں کے ساتھ ساتھ جمہوری حکومتوں کے آنے سے بھی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ ان مقامی لوگوں کے رسم ورواج، روایات اور معاشی حالات جوں کے توں ہی رہتے ہیں۔

"اب ملکانی جی! ہم پنچ کمینے ہیں سو نسلیں گزر گئیں پر بدلیں گے تھوڑی۔ کتنا رولا مچا بدل جائے گا۔ بھٹو سب بدلنے آیا ہے بھلا کچھ بدلا۔ دان خاندان کبھی بدلے۔ چوہڑے چمار کبھی بدلے۔ گھٹیا خون نسلاً گھٹیا بڑھیا خون سدا بڑھیا۔ محل اونچی ماڑیاں جھگیاں گور کھدی۔۔۔"(18)

اسی معاشی تنگدستی کا ایک اور المیہ اس وقت وجود میں آیا جب مذہب کے نام پر اس کاروبار کا آغاز ہوا۔ دنیا کے بدلتے سیاسی سماجی نظام کے اثرات ان مقامی افراد پر بھی بڑے جو غربت اور افلاس کی زندگی میں نہ تو خود کچھ پڑھ لکھ پاتے نہ ان کی اولادیں بلکہ وہ ایسے نظام کا حصہ ہیں جہاں محض روزی روٹی تک سوچ کو مفلوج رکھا گیا تاکہ ان کی صلاحیتیں مفلوج رہیں۔ مذہبی ٹھیکے داروں نے بھی اس طبقے کو استحصال کا نشانہ بنایا کبھی انہیں غریب اور مفلوک الحال لوگوں نے پیروں اور سجادہ نشینوں کے ہاں اپنی اولادوں کو قربان کیا تو دوسری طرف وقت نے ان کو مزید موقع فراہم کیا کہ وہ ان انسانوں کی عالمی منڈی میں اچھی قیمت وصول کرنے لگے۔ 1980ء کی دہائی میں افغان روس جنگ میں

اپنے مذہبی رہنماؤں نے غریب لوگوں کا استحصال کیا۔ مذہب کے نام پر ان غریب لوگوں کے بچوں کو جنگ کا ایندھن بھی بنایا۔ اس نظام کا شکار ہونے والوں میں یہی نچلا طبقہ تھا۔

"صابر جان کو سگی ماں اور سوتیلے باپ کی وہ لڑائیاں یاد آئیں جو اس کی روٹی کو لے کر ہوا کرتی تھیں اور پھر ممتا انہیں لڑائیوں کی بھینٹ چڑھ گئی اور سوتیلا باپ اس کی روٹی کا بندوبست اس حجرے میں کر گیا۔"(19)

ناول میں مقامی رہتل میں لوگوں کے معاشی مسائل کا بیان بھی ملتا ہے۔ اس مخصوص نچلے طبقے کے مسائل جہاں بچیوں کو جاگیرداروں زیلداروں کی حویلیوں میں ملازمہ کے طور پر سونپ دیا جاتا ہے ۔ ان کے لڑکے ان کی زمینوں میں ان کی فصلوں، مال مویشیوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس طبقے کی مفلوک الحالی نسل در نسل چلتی رہتی ہے جن کی پوری زندگیاں ان جاگیرداروں کے گرد ہی گھومتی ہیں۔ ان کی جواں سال بیٹیاں بھی ان کی ملکیت ہوتی ہیں۔ جس کو چاہیں اپنی ملکیت کا حق سمجھ کر اٹھا سکتے ہیں اور غربت اور افلاس میں اٹے یہ لوگ مزامت کے بجائے اس کو بھی باعث شرف سمجھتے تھے۔

یہ لوگ جس قدر فرمانبردار تھے اسی قدر قناعت پسند اور سلیقہ مند بھی تھے۔ جو ان جاگیرداروں کی خدمت میں مستعد رہتے ہیں ان کی عورتیں ان کے لیے انواع واقسام کے کھانے بناتی، ان کے دستر خوان سجاتی ہیں مگر مجال ہے جو کبھی ان میں ایسی خواہش ابھری ہو کہ وہ بھی ان نعمتوں سے مستفید ہوں۔ وہ بھی ایسے کھانے کھائیں ان کو چکھنے کی جرات کریں۔ ماسوائے اس کے کہ مالک خود بعدازاں ان کو یہ چیزیں پیش نہ کر دیں۔ ان کی قناعت ان کی اطاعت ان جاگیرداروں کے دوام کا باعث بنتی رہی۔ مقامی نوعیت کے اس معاشی نظام میں جاگیرداروں کو ہی مرکزیت حاصل ہے جس کی زمین اختیار سے ہزاروں محکوم لوگ جڑے ہیں۔

اکیسویں صدی کی مقامی ثقافتوں کے ذیل میں لکھے جانے والے ناولوں میں ایک ناول" گراں " بھی ہے۔ ناول کی مصنفہ طاہرہ اقبال نے ایک ایسی ثقافت کا بیان کیا ہے جو عالمگیریت کے زور سے زیر عتاب آچکی ہے۔ یہ ثقافت ایک طرف مٹ رہی ہے تو دوسری طرف کچھ افراد اس کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں بھی وہی مسئلہ ہے جو عموماً مقامی ثقافتوں کو درپیش ہے کہ آنے والی نسل خود ہی اس کے وجود سے منحرف ہو رہی ہے۔ گراں میں خطہ پوٹھوہار کی مقامیت کو بیان کیا گیا ہے۔ راولپنڈی کے ایک نواحی گاؤں کے پیرائے میں اس خطے کی قدیم ثقافت کو بیان کیا گیا ہے ۔ جس میں ناول نگار نے مہارت سے اس ثقافت کے تمام عناصر کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔

پوٹھوہار نیم پہاڑی بارانی علاقہ ہے۔ اس کے باسی کسوں اور نیم ہموار زمینوں کے رہنے والے ہیں۔ ان کا اپنا معاشی نظام ہے۔ ان کی معیشت کا دارومدار بارانی زمینوں میں اُگائی جانے والی فصلوں جو میدانی علاقوں کی نسبت بہت کم پیداوار دیتی ہیں اور دوسرا ذریعہ غلہ بانی عرصہ دراز سے تھا۔ یہ لوگ اپنے ان محدود وسائل میں اپنی روایات کی

پاسداری کرتے ہوئے زندگی گزارتے تھے۔ان کے ہاں گندم اور مکئی باجرہ کی فصلیں زیادہ ہوتیں۔ سال کا کچھ حصہ باجرہ مکئی کھا کر گزارا جاتا۔ ان کا ذریعہ معاش بھی یہی اجناس تھی ۔جن کی خرید و فروخت سے وہ اپنا نظام زندگی چلاتے،جنگلات کی لکڑیاں اور مال مویشی بھی ان کے معاش کا اہم ذریعہ تھے۔

"مر د روئی بھر صدریاں پہنتے جن پر موٹے کپڑے کی قمیصیں اور اونی سویٹر اور اوپر اور کوٹ جن پر دھسے لپٹے ہوتے۔ چھتریاں تانے کبھی پنڈی کبھی ساگری، سہالے اور اوپر اور کوٹ جن پر دھسے لپٹے ہوتے۔ چھتریاں تانے کبھی پنڈی کبھی ساگری، سہالے روات اور ادھر گوجر خان، چکوال اور اٹک تک جانوروں کی گاڑیاں بھر بھر جاتے اور واپسی پر گندم اور چینی کی بوریاں لاتے، کبھی جنگل سے لکڑیاں کٹوا کر چھکڑے لاد کر گوجر خان اور دینہ کی لکڑ منڈیوں میں لے جاتے اور گرم کپڑے اور اُون کے گولے بدلے میں لاتے"(20)

اس مقامی معیشت کا دار و مدار زرعی اجناس اور غلہ بانی پر تھا۔ مقامی لوگوں کا طرز زندگی سادہ تھا اور ان کی ضرورتیں محدود تھیں۔ایک طرح سے بارٹر سسٹم کے تحت اپنی ضروریات کی تکمیل کرتے تھے۔اس مقامیت میں اہم موڑ نو آبادیاتی عہد میں آیا۔ خطہ پوٹھوار کے نوجوان جفاکش اور سخت جان تھے۔ موسمی حالات کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر بھی مضبوط تھے۔مقامی سطح پہ روزگار کے مواقع مفقود تھے کہ ملحقہ بڑے شہروں میں خاطر خواہ صنعتیں نہ تھیں ۔نو آبادیاتی عہد میں انگریزوں نے اپنی دفاعی اور فوجی ضروریات کے تحت ان نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا۔اس طرح ان کے معاشی نظام میں ایک اہم تبدیلی آئی۔ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کوئی گھر ایسا نہ بچا۔ جس میں کوئی نوجوان فوج میں ملازمت نہ کر چکا ہو یا نہ کر رہا ہو۔ یہ سلسلہ قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا۔روزگار کے حصول کے لیے انگریز کے زمانے میں تعلیم یافتہ اور بعد ازاں ابتدائی تعلیم کے بعد بھی نوجوان فوج کا رخ کرتے۔ یہ تاریخی مرحلہ اس خطے کی مقامی معاشی نظام میں ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ کھیتی باڑی اور غلہ بانی سے بڑھ کر نوجوانوں کو ایک نیا ذریعہ روزگار ملنے لگا۔ان کی عورتیں گھروں کے کام اور کھیتی باڑی میں منہمک ہو گئیں۔مقامی سطح پہ ذریعہ معاش کی تبدیلی ان کے لئے اس لحاظ سے بھی بہتر ثابت ہوئی کہ وہ اس مقامیت کو ترقی یافتہ بنانے لگے۔

معاشی نظام کا دوسرا اہم موڑ 70 کی دہائی سے شروع ہوا اور پوٹھوہار کے نوجوان بڑی تعداد میں یورپ اور مشرق وسطیٰ کی طرف جانے لگے۔ بہتر روزگار کی تلاش میں یہ نوجوان اپنے علاقے کو چھوڑنے لگے۔یہیں سے اس مقامیت کے ثقافتی ورثے کو نقصان بھی پہنچنا شروع ہوا۔نوجوان وہاں سے ڈالر اور پاؤنڈ تو بھیجنے لگے لیکن ان کی مقامی نسلیں اتنا ہی اپنی مقامیت سے دور ہوتی گئیں۔انہوں نے امیرانہ اور شاہانہ طرز زندگی اپنایا تو ساتھ ہی مقامیت کا زوال بھی شروع ہو گیا۔پوٹھوہار کے گاؤں کے گاؤں خالی ہونے لگے۔ فوج میں ہوتے ہوئے پھر بھی وہ اپنی مقامی روایات کے ساتھ جڑے تھے۔چھٹیوں میں آکر بھی کھیتی باڑی اور فصلیں گاہنے کا کام کر لیتے۔فوجی عموماً گندم کی کٹائی کے موقع پہ ضرور چھٹی آتے لیکن اس نئے نظام سے اول تو لوگوں نے کھیتی باڑی چھوڑ دی جو کرتے بھی تھے تو مشینوں کے

آنے سے وہ بھائی چارہ جاتا رہا۔ پوٹھوہار کے اس مقامی معاشی نظام میں یکسر تبدیلی رونما ہو گئی۔ گاؤں میں عورتیں زیادہ تھیں اور رہ جانے والے مرد بھی وہاں جانے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ یوں اس مقامیت کی معیشت میں ایسا بدلاؤ آگیا جو خود انحصاری سے زیادہ بیرون ملک سے آنے والی کمائیوں پر انحصار ہونے لگا۔ شہری طرز کے مکانات اور پیسے کی ریل پیل نے مقامی روایتی نظام کو ختم کر دیا۔ ناول میں مقامی معاشی پہلو کے عروج سے زوال تک کی داستان بیان ہوئی ہے۔ جدیدیت نے تمام قدروں کو پامال کر دیا تاہم مصنفہ نے اس دور میں اپنی روایتی مقامیت کو تحریری صورت میں لا کر اسے جلا بخشی ہے۔ جو مابعد جدیدت کا تصور مقامیت کا ہم نوا ہے۔ اس مقامیت کے زوال سے قبل ایک مخصوص ذریعہ معاش ملتا ہے۔ لوگ اپنے وسائل میں رہتے ہوئے ہی اس مقامیت کے زندہ رہنے کا سبب ہیں۔

ناول نگاری میں طاہر نواز کا نام زیادہ پرانا نہیں ہے تاہم تین سالوں میں تین ناول ان کی فکری اور فنی پختگی کی دلیل ہے۔ اکیسویں صدی کے ناولوں میں مقامیت کا قافلہ رواں دواں ہے۔ طاہر نواز بھی اس قافلے کے مسافر بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ جدید مسائل سے آشنائی کے ساتھ ساتھ وہ قدیم روایت سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ ناول شہرِمرگ میں بھی مقامیت کا بیان ہے۔ اس مقامیت کی کوئی طے شدہ حدود نہیں ہے بلکہ اس کے حالات ہندوستان کے کسی بھی علاقے سے مختلف نہیں ہیں۔ اس مقامیت کا نو آبادیاتی عہد دکھایا گیا ہے۔ اس عہد کی بات کی جائے تو معاشی حوالوں سے یہ مقامیت امیر اور غریب کے ایک ایسے فرق میں منقسم ہیں کہ امراء اس بات کی بھی پرواہ نہیں کرکے دوسری طرف لوگ موت کے گھاٹ اتر کر اس قدر کم ہو جائیں کہ شہر کے دوسرے حصے کو ویران کر دیں۔ شہرِ مرگ میں ایسے ہی لوگوں کی بدحالی کا تذکرہ ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں مقامی لوگوں کی خستہ حالی ناقابل یقین حد تک ہے۔ مقامی لوگوں کی خستہ حالی انگریزوں کے ساتھ ساتھ مقامی نوابین اور اس طبقے کا بھی ہاتھ ہے جو ان آباد کاروں کا آلہ کار بنے ۔ناول میں ایسے ہی طبقے کی وضاحت ملتی ہے۔ شہر کی ایک طرف خوشحالی ہے تو دوسری طرف مفلوک الحالی ہے ۔معاشی حوالے سے یہ لوگ انتہائی غربت کا شکار ہیں۔ ان کے وسائل پہ حکمران طبقہ قابض ہے۔ اس غربت اور افلاس کی وجہ سے وہ قدرتی آفات کا نشانہ تیزی سے بن جاتے ہیں۔ ان کی معاشی حالت اس قدر کمزور ہے کہ ان کے بچوں کا نہ لباس ہے اور نہ اتنی خوراک کہ وہ موسم اور قدرتی آفات سے بچ سکیں۔ روز میری کے بیان میں ان مقامی لوگوں کا احوال ناول میں کچھ اس طرح سے بیان ہوا ہے کہ :

"پہلی بار جب وہ بارٹن کے ساتھ اندرون شہر آئی تو تنگ و تاریک گلیوں اور ان گلیوں میں سرانڈ چھوڑتے گند کو دیکھ کر اس کی حالت عجیب ہو گئی۔۔۔۔ وہ تو سول لائن کے صاف و شفاف علاقے میں رہتی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ اس علاقے سے باہر بھی ایسے لوگ ہیں جو عجیب و غریب زندگی گزارتے ہیں۔۔۔ گلیوں میں پھرنے والے مفلوک الحال لوگ جن کے چہروں سے بھوک صاف عیاں ہوتی تھی اور ننگ دھڑنگ بچے ان کی گھوڑا گاڑی کو عجیب نظروں سے دیکھتے تھے جب وہ اندرون شہر کی گلیوں میں سے گزرتے تھے۔"(21)

اس ناول میں دکھائی جانے والی مقامیت ہندوستان کے گردونواح میں پھیلے ہوئے چھوٹے بڑے شہروں کا بیان ہے۔ماسوائے چند بڑے شہروں کے ہندوستان کے بیشتر علاقوں کی صورتحال ایسی ہی تھی اور بڑے شہر بھی کئی حصوں میں تقسیم تھے۔ جن میں ایک حصہ اشرافیہ اور نوآبادکاروں کا علاقہ تھاجو ہر طرح کی سہولتوں سے مزین تھا۔تو دوسری طرف لوگ بھوک ،افلاس، قحط وبائی امراض میں مبتلا تھے۔اس مقامیت میں کمزور معاشی حالت کے ساتھ لوگ احساس کمتری میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔وہ اپنی حالت کو بدلنے پہ قادر نہیں ہیں اور نہ ہی وہ اس کی مزید کوشش کرتے ہیں۔ کبھی ملیریا تو کبھی ہیضہ جیسی وبائی امراض ان کو لقمہ اجل بناتے ہیں۔ ناول نگار نے نوآبادیاتی عہد میں دکھائی جانے والی اس مقامیت کا جو حلیہ بیان کیا ہے۔وہ عمومی طور پر ہندوستان کے اکثر علاقوں کا نقشہ ہے۔ہندوستان کے مقامی لوگ اسی افلاس اور وباؤں کا شکار ہو کر مرتے رہے اور اگر زندہ رہے تو ان کی صلاحیتیں مقامی اشرافیہ اور نوآبادکاروں کی زندگیوں کو پرسکون بنانے میں بیت گئیں۔

قحط اور وباؤں نے ان کی زندگیوں کو المیہ کی صورت میں بدل دیا۔پے درپے کی وبائی امراض اور سہولیات کے فقدان نے ان کی زندگیوں کو مزید مشکل بنایا تو وہیں قحط نے ان کی زندگیوں کا مزید تیزی سے خاتمہ شروع کر دیا۔ مرنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی اور جو رہ گئے وہ بھوک اور افلاس کا شکار ہونے لگے۔اس شہر میں خوراک کا بحران اس قدر سنگین صورتحال اختیار کر گیا کہ بھیک مانگنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ بھوک اور افلاس کا شکار ننگ دھڑنگ بچے بھیک مانگتے لیکن ایک وقت آیا کہ بھیک ملنا بھی بند ہو گئی۔ پھر دنیا کا قدیم ترین اور گھٹیا ترین کام شروع ہوا۔ جسم کی فروخت کا کام کیونکہ اس کے علاوہ ان کے پاس بچا ہی کچھ نہ تھا شاید بھوک اور افلاس کے زمانے میں آسودہ جسموں کو جنس کی طلب قدرے زیادہ ہوتی ہے۔

"پھر دیکھتے ہی دیکھتے شہر میں جنسی زیادتی کے واقعات بڑھنے لگے تھے۔۔۔یہ جنسی زیادتی صرف عورتوں کے ساتھ ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ ان بھیک مانگنے والے بچوں کو بھی اس کام کے لیے استعمال کیا جانے لگا تھا۔۔۔ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے عورتیں اور بچے اپنے جسم بیچنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔"(22)

بھوک اور افلاس کی اس صورتحال میں ہندوستان کے تناظر میں خصوصاً قحطِ بنگال کو بھی مد نظر رکھا جا سکتا ہے۔بنگال کا قحط ہو یا ہندوستان کے ایسے علاقے جو بھوک اور افلاس کا شکار اور جہاں پہ کسانوں کی کمر لگان ادا کر کر کے ٹوٹ چکی تھی۔ قحط سے درکنار بعض ایسے سرسبز و شاداب علاقے بھی ایسی ہی بھوک اور افلاس کا شکار تھے۔جب نوآبادکاروں کی طرف سے لگان کی مقدار میں اضافے سے مقامی کسان اس قدر بہتر صورتحال میں نہ تھے بلکہ اس قدر مفلوک الحال تھے کہ وہ سال بھر کے لیے اپنے لیے اناج بھی نہ رکھ پاتے۔ان کی سال بھر کی محنت سے اپنی روح اور جسم کا رشتہ برقرار رکھنا بھی ان کے لیے مشکل بن جاتا۔شہرِ مرگ نے مقامیت کے پیرائے میں ہندوستان کی اس معاشی نوعیت کا عمدہ احاطہ کیا ہے۔ ناول میں لوگوں کے مجموعی طور پر مشکلات کا تذکرہ ہے تو وہیں اس کا تقابل ان

حکمرانی کرنے والے لوگوں کے بارے میں بھی بات کی گئی ہے۔ایسے لوگ جوان کی محنتوں کا حظ تو اٹھاتے ہیں لیکن ان کی بے حسی کی انتہا اس قدر ہے کہ ان کی زندگی ان کے لیے بے معنی ہیں۔ناول میں طے شدہ مقامیت کے نہ ہونے کے باوجود ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی سینکڑوں چھوٹے بڑے شہروں کی منہ بولتی تصویر اور جیتی جاگتی تصویر دکھائی دیتی ہے۔مابعد جدیدیت کے تصور مقامیت کے تناظر میں اس مخصوص خطے کے معاشی حالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ان حالات کا بیان اس کے مقامی وسائل کا مسئلہ ہے۔

عاصم بٹ کا ناول دائرہ اکیسویں صدی کی ابتداء کی تحریر ہے۔2001ء میں ناول منظر عام پہ آیا۔مابعد جدید نقطہ نظر کے تناظر میں ناول مختلف پہلوؤں کا حامل ہے۔ناول میں لاہور کی مقامی ثقافت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ناول کی مقامیت اپنی آب وتاب کے ساتھ ماضی اور حال کے تلازم کے ساتھ موجود ہے۔عاصم بٹ کا تعلق لاہور سے ہی ہے۔لاہور کی مخصوص فضا اپنے اندر گہرا تاریخی و تہذیبی شعور سموئے ہوئے ہیں۔اس ثقافت کا بیان بڑی صراحت سے کیا گیا ہے۔لاہور پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔تاریخی اعتبار سے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ناول میں لاہور خصوصاً اندرون لاہور کی ثقافت اور ثقافتی زندگی کا بیان زیادہ ہے۔ناول میں چند ایک مقامات پہ لاہور کی اس مقامیت کے معاشی پہلو کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

لاہور کی مقامیت میں اس قدر وسعت ہے کہ اس نے کئی ثقافتوں کو اپنے دامن میں سمو لیا ہے۔معاشی اعتبار سے دیکھا جائے تو بڑا قدیم صنعتی شہر ہونے کے باعث شہر کے اطراف،نواحات دوسرے علاقوں کے طرف سے یہاں آنے والوں کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔بڑے شہر میں روزگار کے مواقعوں کی تلاش میں چھوٹے شہروں اور علاقوں سے لوگوں کا آنا ایک لازمی امر بن گیا۔اندرون شہر کی مقامی زندگی کو مصنف نے بطور خاص ناول کا موضوع بنایا ہے۔ان تنگ وتاریخ گلیوں میں رہنے والے مکین عموماً متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ان میں زیادہ تعداد محنت مزدوری کرنے والے یا چھوٹے کاروبار کرنے والے اور ملازم پیشہ افراد کی ہوتی ہے۔ان میں سے بھی اکثر وہ لوگ ہوتے ہیں جو حالات کے ستائے اس شہر میں آکر پناہ لیتے ہیں اور ان کی نسلیں اس قابل ہو جاتی ہیں کہ وہ دووقت کی روٹی عزت سے کما کے کھا لیتے ہیں۔کاروباری افراد کا کاروبار بھی عموماً درمیانے درجے کا ہی ہوتا ہے۔آصف کے کردار کے تناظر میں اس طبقے کے مسائل کو دیکھا جا سکتا ہے۔ان گلیوں میں بسنے والے اکثر گھروں کی معاشی حیثیت اسی طرح کی ہوتی ہے۔ان میں سے اکثر لوگ سرکاری ملازمت کو ترجیح دیتے ہیں۔سرکاری ملازمت کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تھوڑی ہی صحیح مگر باقاعدہ وقت پہ تنخواہ ملتی رہتی ہے۔بڑھاپے میں پینشن کا سہارا ہوتا ہے۔آصف کے والد نے ملازمت کے بعد ایک دکان کھولی۔ان کی معاشی ومالی حالت کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

"ریٹائرمنٹ کے بعد جب سے اس نے پرچون کی دکان کھولی آمدنی بڑھی ضرور تھی مگر بے قاعدہ ہو گئی تھی۔ کبھی وہ بہت خوشحال ہو جاتے اور روز گوشت پکتا اور کبھی یکدم تنگی آجاتی۔ تب مہینہ بھر صرف دال اور سبزی ہی پر گزارا ہوتا۔ دال بھی ماش یا چنے کی اور سبزی آلو یا بینگن۔"(23)

ناول میں ایسے ہی کئی موقعوں پہ اس متوسط طبقے کے مالی مسائل کا تذکرہ ملتا ہے۔ مقامی نوعیت کے ان مسائل میں معاش ایک اہم مسئلہ ہے، جو ان کی زندگیوں پر مختلف حوالوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی بازگشت ان کی زندگیوں میں سنائی دیتی ہیں۔ متوسط طبقہ ان مسائل سے بری طرح نبرد آزما ہوتا ہے۔ تنخواہ دار اور متوسط طبقہ دونوں کے مسائل تقریباً یکساں ہی ہوتے ہیں۔ اندرون شہر کی جہاں ثقافت کی بات کی جاتی ہے وہیں ان لوگوں کی مالی اور معاشی حیثیت کا بھی اندازہ ان کرداروں کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔

"اسے عجیب لگا کہ لوگ کیوں مہنگائی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ انہیں تو چیزوں کے مہنگے ہونے سے الٹا فائدہ ہی ہوتا ہے۔ مہنگائی اگر ایک روپیہ ہے تو کرایہ دس روپے بڑھا لیتے ہیں۔ سارا بوجھ سہارتے ہیں تنخواہ پر کام کرنے والے جن کی تنخواہ مہنگائی کے تناسب سے نہیں بڑھتی شاید اس لیے کہ وہ سفید پوش ہیں اور ہمیشہ اس خطرہ میں رہتے ہیں کہ کہیں ان کی پول دوسروں پہ کھل جائے۔ وہ احتجاج نہیں کرتے اور اپنا رونا کسی کے سامنے نہیں روتے۔ شور مچاتے ہیں تو یہی لوگ جو کسی بھی صورتحال میں نقصان میں نہیں ہوتے۔"(24)

لاہور کی ان مضافاتی اور تاریخی گلیوں میں بسنے والے لوگوں کو بہت سے مسائل کے ساتھ ساتھ معاشی مسائل بھی درپیش ہوتے ہیں۔ ناول میں لاہور کی ثقافت کے ساتھ جڑے ان مضافاتی علاقوں کا بھی بیان ہے۔ جو شہر کے کنارے آباد ہوتے ہیں۔ ان مضافاتی قصبوں/بستیوں کا بھی شہر کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ مزدور اور غریب طبقہ جو ان شہروں کی ترقی میں اپنے ہنر کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ انہی نواحات میں بستے ہیں۔ ایسی بستیاں بڑے شہروں کی حدود سے باہر موجود ہوتی ہیں جن کا عمل دخل شہر کی حدود میں ہوتا ضرور ہے۔ یہ طبقہ عموماً مالی تنگدستی کا شکار ہوتا ہے۔ ان کے مرد و زن امیر طبقے کے گھروں اور دفتروں میں نچلے درجے کے کام کرتے ہیں۔ ان میں بسنے والے شہر کی بڑی فیکٹریوں کارخانوں کے مزدور بھی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ حکومت کی عدم توجہ کا شکار رہتے ہیں۔ ناول میں ان کی معاشی حیثیت کا بھی کسی حد تک تذکرہ موجود ہے۔

معاش کا مسئلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا خود انسان کا معاشرتی نظام پرانا ہے۔ معاشرتی نظام میں جڑنے کے بعد انسان کو باقاعدہ ذریعہ معاش کی تلاش میں باقاعدہ کوئی پیشہ اختیار کرنا پڑا ہو گا۔ شہروں کی طرف لوگوں کی منتقلی کا ایک وسیلہ روزگار اور معاش بھی ہے۔ لاہور کی ثقافت کا ایک پہلو اور ایک اہم مرکز شاہی محلہ بھی ہے۔ جو لاہور کی ثقافت اور تاریخ کا ایک اہم حصہ تھا۔ گو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب اس کی حیثیت بدل گئی ہے۔ معاشی لحاظ سے ایک اہم مرکز بھی تھا۔ جنس کا کاروبار دنیا کا قدیم کاروبار ہے۔ انسان نے مادی وسائل کو پورا کرنے کے لیے جنس کے کاروبار کو

بھی اپنایا۔اس ہیرا منڈی میں محض جنس کا کاروبار نہیں ہوتا بلکہ اس کے ارد گرد اپنے بازاروں سے کئی لوگوں کے روزگار وابستہ ہوتے ہیں۔ناول نگار نے مقامیت کے اس پہلو کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی ہے۔معاشرتی جبر کا شکار یا نسل در نسل پیشہ اپنانے اور کچھ عورتیں مجبوریوں کی وجہ سے یہاں آئیں۔عورتیں جنس کا کاروبار کرتی ہیں۔ان میں سے اکثر کا تعلق ایسی زندگی سے ہوتا ہے جہاں مجبوریوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔معاشرہ اس کاروبار کے علاوہ ان سے کچھ اور کرانے کو تیار بھی نہیں ہے۔ایسے ہی ایک طوائف کے تناظر میں اس معاشرتی بیانیے کا ایک منظر کچھ اس طرح سے ناول میں بیان ہوا ہے:

"وہ ہر روز پانچ سے بیس گاہک بھگتا لیتی۔دلال ڈھائی سو یا تین سو روپے میں گاہک گھیر کر لاتا۔تیس روپے وہ پہلے ہی کھرے کر لیتا۔اتنے ہی روپے فی گاہک سنتری بادشاہ کی جیب میں جاتے۔کوئی بیس میں ایک علاقے کے ٹھیکیدار کو ملتے اور باقی میں سے کوئی ستر بہتر کے لگ بھگ اس کے حصے میں آتے۔باقی ڈیرے دارنی لے جاتی۔عام مندے کے حالات میں بھی اسے تین ایک سو کی دیہاڑی لگ جاتی۔کوئی میلہ تہوار ہوتا جیسے داتا گنج بخش کا میلہ یا عیدیں تو آس پاس کے دیہاتوں سے آئے تماش بین ان کی خوب کمائی کراتے۔"(25)

لاہور کی مقامی ثقافت اور معاشی سرگرمیوں میں اس بازار کا بھی خاص حصہ ہے۔جو باقاعدہ ثقافت کے ایک پہلو کا روپ دھار چکا ہے۔ناول میں مقامیت کے معاشی پہلوؤں کا بطور خاص نا سہی ضمنی طور پر ان کا تذکرہ موجود ہے۔اندرونِ شہر کے چھوٹے چھوٹے کھوکھے ہوں یا چھوٹی موٹی دکانیں ان تمام معاشی سرگرمیوں کا بیان ملتا ہے؛تو دوسری طرف عوام کا طبقاتی نظام خصوصاً نچلے طبقے کے معاشی مسائل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔یوں لاہور کی مقامی معاشرت بہت واضح اور نمایاں انداز میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔اس مقامیت کا معاشی نظام اور نوعیت ہی ہے جو اس کو مزید بڑھا چڑھا رہی ہے۔لاہور شہر زمانہ قدیم سے ان سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔داتا دربار کے ارد گرد بننے والا بازار اہم تجارتی مرکز بھی بن گیا۔یہاں مختلف علاقوں سے لوگ آتے۔لاہور جیسے شہر کی وقعت میں مزید اضافہ ہوا۔

عاصم بٹ نے اپنے دوسرے ناول کی طرح بھید میں بھی لاہور کی ثقافت کو ہی موضوع بنایا ہے۔عاصم بٹ کے ناولوں میں لاہور شہر کی زندگی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔عاصم بٹ کے ناولوں کی مخصوص فضا عموماً نچلے اور درمیانے متوسط طبقے تک محدود رہتی ہے۔دائرہ ہو یا بھید دونوں ناولوں میں متوسط طبقے کی زندگی کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ان کے ناولوں کے کرداروں کا تعلق بھی اسی طبقے سے ہے۔وہ اپنے محدود وسائل میں رہتے ہوئے جدوجہد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کی کامیابیوں کے پیچھے ان کی محنت پنہاں ہوتی ہے تو کہیں ان کے راستے میں طاقتور طبقہ روڑے اٹکاتا نظر آتا ہے۔

بھید میں مقامیت کے اس خاص طبقے کے معاشی مسائل کا اندازہ ہوتا ہے جو کوئی بڑے خواب تو نہیں رکھتے لیکن اپنی ضروریات،ذمہ داریوں کے گھن چکر میں پستے رہتے ہیں۔اس دھارے میں بہتے بہتے وہ اس دنیا کے منظر سے

غائب ہو جاتے ہیں۔ بھید میں ناول کے مرکزی کردار کے بیان میں اور دوسرے کرداروں کے بیان میں ایسے مسائل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ نوجوان نسل اپنے مستقبل کے خواب سجاتے یا تو بیرون ملک کی راہ لیتی ہے یا کسی غلط راستے کا انتخاب اور بعض اوقات اپنی وفاداریاں تک فروخت کرنے کی نوبت آ جاتی ہے۔

"موٹے نے اسے بتایا کہ کیسے کراچی سے لانچ میں بیٹھ کر فرار ہوا۔ لڑکوں کی ایک بڑی ٹولی کے ساتھ مسقط پہنچے تو ایک مقامی ٹریولنگ ایجنٹ نے انہیں کئی ایک دن ایک گھر میں چھپائے رکھا پھر بارڈر پر لے گیا اور کس طرح سرحد پار کرائی۔ یوں وہ نئے سے نئے ٹریولنگ ایجنٹس کے ذریعے ملکوں ملک گھوما، سرحدیں پار کرتا بارڈر پولیس سے بچتا بچاتا، اٹلی گیا اور پھر ہالینڈ۔۔۔ بیلجیم کی ایک لڑکی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ جس سے اس کے دو بچے تھے۔ وہ ملک واپس آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا کیوں کہ دیارِ غیر میں اتنا کچھ اسے میسر تھا کہ یہاں کے چھپڑوں کے کنارے بیٹھ کر تیرتے ہوئے مینڈکوں جیسے نیم انسان لوگ کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے "(26)

ایسی صورتحال میں بہتر معاش کی تلاش میں مقامی ثقافتوں کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ معاشی حالات سازگار نہ ہوں تو متوسط طبقہ جو عموماً زیادہ روایت پسند اور قدامت پسند ہوتا ہے۔ اگر وہی اس سے کٹنا شروع ہو جائے تو اس مقامیت کی شناخت معدوم ہونے کے امکانات وسیع سے وسیع تر ہو جائیں گے۔ ناول میں ایسے طبقے کی ذہنی کشمکش کا بارہا بیان ملتا ہے۔ پڑھے لکھے نوجوان بے روزگاری اور نامساعد معاشی حالات سے تنگ آکر مقامیت سے کٹ رہے ہیں جو کسی اور نظام کا حصہ بن بیٹھے ہیں اور اپنی شناخت کو بھی کھو بیٹھتے ہیں۔

بھید کے تناظر میں دیکھا جائے تو ناول کے بیشتر کردار ایسے مسائل سے نبرد آزما ہیں جو حالات کی گردش میں پس رہے ہیں۔ وہ اپنے جسم اور روح کی تسکین کبھی ہوٹلوں میں بحث و مباحثے میں تو کبھی نشوں میں تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نئی نسل آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ سہل پسندی، مادیت پرستی میں بھی کہیں آگے ہے اور ایسی صورتحال میں وہ اپنی صلاحیتوں کو باآسانی کسی کے ہاتھ فروخت کر سکتی ہیں۔ ناول میں ہیرو کی کہانی کے بیان میں ایسی ہی صورتحال دکھائی دیتی ہے۔

"اس طویل یکطرفہ گفتگو کا خاتمہ ہر مہینے پچیس روپے کے تعین پر ہوا جو میدا مجھے پہنچا دیا کرے گا۔ موٹر سائیکل بھی ایک نیا خرید کر دیا جائے گا تاکہ میں ریاض راجی کے جلسے جلوسوں میں بروقت پہنچ سکوں۔ جو بیان وہاں قصبوں اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں ہوتے رہتے تھے۔ پینسلوں اور کاغذوں کا سٹاک بھی مہینے کے مہینے مجھے بذریعہ میدا پہنچا دیا جائے گا۔ ریاض راجی کے انٹرویوز کبھی کبھار کہیں لگوانے اور اس کے نام سے کبھی کبھار کالم لکھنے اور اس کے جلسوں کے لیے تقریریں رقم کرنے کے لیے۔ خبریں جیسی وہ کہے گا، مہینہ بھر میں دو ایک وہ بھی اپنے اخبار میں لگائی ہوں گی۔ "(27)

ناول میں اکثر کردار معاشی حالات سے مقابلہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لاہور کے مقامیت کے پیرائے میں جہاں ایک سے بڑھ کر ایک امیر اور جاگیر دار سرمایہ دار موجود ہیں۔ ان کے مقابلے میں عاصم بٹ کے ناولوں کے کردار

عام کرداروں سے تعبیر ہیں۔ وہ ایسے نظام کی عکاسی ہی کرتے ہیں جس سے عموماً لوگوں کا واسطہ ہوتا ہے جو ان مسائل کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں ان کرداروں کے ذریعے مقامیت کی وضاحت ملتی ہے جو تنگ معاشی صورتحال کے باوجود اپنی ثقافت اور روایات سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

"اندرون شہر کی معاشرت اور نچلے طبقے کے کرداروں کے معاشی، ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی جھمیلوں کو سچائی پر مبنی پیشکش عاصم بٹ کا خاصا اور ان کے فن کی پہچان ہے۔"(28)

ناول کے کرداروں کا انتخاب ہی ایسے طبقے سے ہے جن کے مالی مسائل بھی موجود ہیں۔ ناول میں مجموعی طور پر ایسے طبقے کے تناظر میں ہی معاشی مسائل کا بیان ملتا ہے۔ عاصم بٹ کے کردار لاہور کے ان علاقوں کے چلتے پھرتے کردار ہیں جو مقامیت کی شناخت بھی ہیں اور اس مقامیت کا اہم حوالہ بھی ہیں۔ معاشی حالات کا تذکرہ ان کرداروں کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ ہر علاقے کی مخصوص معاشی صورت حال ہوتی ہے۔ بسا اوقات بڑے علاقوں میں بھی معاشی مسائل موجود ہوتے ہیں۔

نولکھی کوٹھی کا زمانہ نو آبادیاتی عہد سے قیام پاکستان کے بعد تک کے حالات پہ محیط ہے مگر اس میں اصل وضاحت تقسیم سے قبل مشرقی پنجاب کی مقامیت ہے۔ ولیم مرکزی کردار کا روپ دھارے ناول کے اختتام تک رہتا ہے۔ اسی کے گرد گھومنے والی کہانی میں اس مقامیت کا بیان ملتا ہے۔ مشرقی پنجاب کی مقامیت کو ناول میں بیان کیا گیا ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں ہندوستان کے زرعی معاشرے میں انگریزوں کی حکومت اور زرعی معاملات میں اٹھائے جانے والے اقدامات ناول میں بیان ہوئے ہیں۔ مقامی لوگوں کا ذریعہ معاش زمین سے جڑا ہے۔ مشرقی پنجاب کے ان علاقوں میں جہاں نہری نظام کی رسائی ہے؛ وہاں خوشحالی قدرے زیادہ ہے۔ جہاں بارشوں پہ انحصار ہے وہاں کے معاشی حالات اچھے نہیں ہیں۔ مقامی لوگوں کی معاشی حالت قابل ستائش نہیں ہے۔ ایک طرف جاگیردارانہ سماج تو دوسری طرف انگریزوں کی طرف سے عائد لگان کی تعداد بڑھنے کے سبب چھوٹے کسانوں کی زندگی قابل رحم بن گئی۔ وہ اپنی زمینوں پہ سارا سال محنت کرنے کے بعد خود بھی پیٹ بھر کے روٹی کھانے کے قابل نہیں ہیں۔ جہاں نہری پانی سے ہریالی آئی وہاں انگریزوں کو بھی لگان زیادہ ملنے کی امیدیں ہیں۔ ان لوگوں کی کمر پہ مزید بوجھ لاد دیا جاتا۔ ناول میں ان لوگوں کی معاشی حالات کے بھی نمونے ملتے ہیں۔ مولوی کرامت کے کردار میں جو مقامی لحاظ سے ایک باعزت مقام یعنی امام کا درجہ رکھتا ہے نہایت غربت و افلاس کی زندگی گزارتا ہے۔ اس کے حصے میں خیرات کی روٹیوں کے سواء اور کچھ نہیں ہے۔ ناول نے ان مقامی کرداروں کے ذریعے اس مقامیت کی معاشی نوعیت کا بھی پتہ دیا ہے۔ قصور جو مولوی کرامت کا اصل علاقہ تھا، اس کے بیان میں ناول میں ان کی معاشی حیثیت کا اس طرح سے بیان ملتا ہے:

"لوگوں کے پاس ملکتی زمین میں دو دو چار چار ایکڑ سے زیادہ نہیں تھی جس میں سبزیاں اور چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں اگاتے اور انہیں آٹھ میل پیدل گدھیوں، گڈوں یا چھکڑوں پر لاد کر قصور شہر میں بیچ آتے ساری آبادی غریب افراد پر مشتمل تھی۔ جن کا گزارا بھی مشکل ہی ہوتا"(29)

بڑے جاگیر داروں اور نو آباد کاروں نے ان مقامی لوگوں کی زندگیوں کو مشکل بنا دیا اور بعض مقامات پہ تو مقامی جاگیر دار بھی استعماری قوتوں کے سامنے بے بس تھے۔ انگریزوں نے اپنی عملداری اس طرح سے قائم کی کہ ان کے سامنے تمام مقامی لوگوں کا ایک جیسا تصور تھا۔ بس فرق تھا تو محض اپنے مفادات کا جس سے جتنا کام لیا جا سکتا اس کے ساتھ اتنی ہی ہمدردی دکھائی جاتی جن علاقوں میں مقامی جاگیر داروں کا رویہ عوام دوست تھا وہاں کے لوگوں کی زندگیوں میں کسی قدر خوشحالی ضرور تھی۔ ناول میں شیر حیدر کا کردار ایسے مقامی لوگوں کا نمائندہ کردار ہے جو اپنے عوام کا خیر خواہ اور ان کا ہمدرد ہے۔ ناول میں مختلف گاؤں دیہاتوں کے بیان میں مجموعی طور پر اس مقامیت کی معاشی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جودھا پور کے گاؤں کا احوال ناول میں کچھ اس طرح سے بیان ہوا ہے:

"کہنے کو تو یہ گاؤں تھا۔ مگر اصل میں ساری آبادی چھوٹے موٹے کچے گھروں کا جمگھٹا سا تھی۔ لوگوں کی معاشی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ مکمل اور آزادانہ زندگی گزار سکتے اور عمدہ مکان بناتے مگر یہ ضرور تھا کہ سارا گاؤں دو وقت کی روٹی آسانی سے کھا سکتا تھا۔ جتنے لوگ یہاں رہتے تھے سب کو شیر حیدر نے اپنا رقبہ برابر بانٹ رکھا تھا۔ جسے وہ کاشت کرتے اور مالکانہ کا تیسرا حصہ شیر حیدر کو پہنچا دیتے"(30)

ولیم کی ذاتی دلچسپی اور نہروں کے نظام کے حوالے سے اس علاقے کی زرخیزی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان علاقوں میں لوگوں کے لیے سب سے بڑی دولت اور سب سے بڑا اہم معاشی ذریعہ ان کی زمین ہے۔ زمیندار زمین سے جڑے ہیں۔ تو ان کے ساتھ بہت سارے اور بھی پیشوں کے افراد اس زمین سے جڑے ہیں۔ جن کا رزق اسی زمین کے مدار کے گرد گھومتا ہے۔ ناول میں ایسے کئی مقامات کا تذکرہ ملتا ہے جو نہ صرف کسی ایک علاقے بلکہ پورے ہندوستان کے دیہاتوں کا یہی حال تھا۔ پنجاب اس خطے میں خاص اہمیت کا حامل تھا یہ علاقہ اپنی زرخیزی کے حوالے سے بھی خاص پہچان رکھتا ہے۔ اس کے دیہاتوں کی ایسی حالت تھی کہ دوسرے علاقوں کا تو تصور بھی محال ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندو بنیے بھی اس صورتحال میں بہت فائدہ اٹھاتے۔ وہ لوگوں کو سود پہ رقم دے کر ان کو ایسے جال میں پھنسا لیتے کہ اس سے نکلنا ممکن نہ ہوتا ولیم کو بھی ایسے بنیوں کو قابو کرنے کے لیے کہا گیا جو غریب لوگوں کا استحصال کرتے تھے۔

ناول کی کہانی کا مرکزی موضوع مشرقی اور وسطی پنجاب کی مقامیت ہے۔ اس لحاظ سے اس مقامیت کے خاص پہلو زمین اور زمینداری کا بیان بارہا ملتا ہے۔ ان مقامی لوگوں کا تعلق زمین سے ہی تھا کہ جس کے بسنے والے اور اُگنے والی فصلیں ان کی نسلوں کی پرورش کرتی ہیں۔ ان لوگوں کی معاشی حالت ایسی تھی کہ اپنی زندگیوں کو رواں دواں

رکھے ہوئے تھے۔ناول میں اس ضمن میں اس قدر ضرور بحث ہوتی ہے کہ اس مقامیت کا معاشی پہلو واضح ہو جاتا ہے۔ معاشی پہلو کے حوالے سے ایک پہلو یہ بھی تھا کہ بڑے بڑے زمینداروں اور چودھریوں کو بھی نئے جوتے تک نصیب نہ ہوتے تھے اور وہ گاؤں میں اکثر بغیر جوتوں کے ہی چلتے تھے۔ مجموعی طور پر پورے پنجاب کے اکثر دیہاتوں کی مقامیت کا بیان ہے۔

غلام باغ تیکنیک کے اعتبار سے اردو کا ایک منفرد ناول ہے۔ غلام باغ کے حوالے سے نقادوں نے کئی مابعد جدید تصورات کو اخذ کیا ہے۔اسے مابعد جدیدیت کا نمائندہ ناول قرار دیا جاتا ہے- غلام باغ ایک وسیع دائرہ کار ناول ہے جس میں بیک وقت مختلف نفسیاتی،تاریخی، معاشرتی ،سماجی اور ثقافتی پہلوؤں کا بیان ملتا ہے۔ ناول اکیسویں صدی کی ابتدائی تحریروں میں سے ہے۔ایسازمانہ جب زندگی کے مختلف سطحوں پہ مختلف مباحث زیر بحث ہیں۔ ناول نگارنے کرداروں کے ذریعے قدیم اور جدید انسانی رویوں کا بیان کیا ہے۔ارزل نسلوں کے بیان سے جہاں ان معدوم ہوتی نسلوں کی تہذیب کا بیان ہے تو وہیں کبیر مہدی کے بیان میں جدید انسان کے نظریات اور اس کی موت کو اس کے آبائی علاقے میں پہاڑوں جنگلوں اور چشموں کے تصور سے محض کبیر مہدی کے اصل کی طرف لوٹنے کا اشارہ نہیں ہے بلکہ انسان کو اپنے اصل کی جانب لوٹ جانے کا تصور بھی ہے۔یوں ناول محض مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر کی تائید معلوم ہوتا ہے۔ ناول کا آغاز ارزل نسلوں کے بیان سے ہوتا ہے۔ایسی نسلیں جو بے نام اور بے نشان رہنے کے بعد اب اسی گمنامی میں مٹ رہی ہیں۔انسان کا طبقاتی نظام تو کائنات کے ارتقائی مرحلے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔یہ سوال قابل غور اور حل طلب ہیں کیا واقعی انسان کے طبقاتی نظام میں منقسم ہونے میں محض اس کا ذاتی دخل یا فعل ہے یا پھر انسانوں کے بیچ اس فاصلے کا دارومدار روایت پہ ہے ؟روایت کیا ہے ؟آخر اس کی داغ بیل کہاں سے پھوٹتی ہے۔اس بحث کو مختصراًیوں سمجھا جاسکتا ہے کہ روایت بھی انسانوں کی وضع کردہ ہے۔ جس پہ زور ہمیشہ طاقتور کا چلتا ہے۔طاقتور کون ہے طاقتور کی تشریح کے جواب میں یہ بات ذہن میں ضرور آتی ہے کہ جو تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ وسائل پہ دسترس اور تسلط انسان کو طاقتور بناتا ہے۔ طاقتور سماج میں حکمرانی کے منصب پہ پہنچتا ہے اور اس کے بعد وہ پہلا کام دوسروں کو مطیع کرنے کا کرتا ہے۔تاکہ اس کے تسلط کو دوام ملے۔اسی کی خاطر وہ تمام حدیں پار کر جاتا ہے۔اس کے ظلم کا شکار دوسرا طبقہ ذہنی طور پر مفلوج کر دیا جاتا ہے۔اس کی صلاحیتیں اس کی ضروریات کے ہاتھوں سلب کر لی جاتی ہیں۔اس اثر سے زیادہ تر تو اپنے مسائل کے گرد اپنی صلاحیتوں سے محروم ہوتے ہیں اور اگر کوئی ہمت کر بھی بیٹھے تو اس کی صلاحیتوں کو باغیانہ قرار دے کر اس کا رد کرنا بھی لازم خیال کیا جاتا ہے۔اس مسلسل عمل سے بہت سی نسلیں اور قبیلے اسی شکست کو تسلیم کر کے ایک ایسی زندگی کے عمل میں جکڑ جاتے ہیں جن کا تصور بھی محال لگتا ہے۔ ناول میں موجود مانگر جاتی نسل کا بیان بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مرزا اطہر بیگ نے ناول غلام باغ میں مرکزی کرداروں کا انتخاب اس طبقے سے کیا ہے۔ ناول کے آغاز میں دوسرا باب ارذل نسلوں کے اساطیر کے نام سے موسوم ہے جس میں نسلوں کے قدیم اور جدید تصور کا تقابل موجود ہے ۔مندرجہ بالا اقتباس میں راقم نے وسائل پہ تسلط کی بات کی ہے۔ معاش پہ کنڑول انسان کو دوسرے پہ برتری دلاتا ہے۔ دوسروں پہ برتری ثابت کرنا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ معاشی حوالے سے مانگر جاتی قبیلے کے ضمن میں ناول نگار نے ان مقامی قبیلے کے لوگوں کی معاشی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ اس سے ان کی پسماندگی کا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ناول کا مرکزی کردار یاور عطائی اور اس کی بیٹی زہرہ ہیں۔ یاور عطائی کا تعلق اس مانگر جاتی قبیلے سے ہے۔ اس قبیلے کو درپیش مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ معاش کا ہی تھا جو ناول کے آغاز سے ناول کے اختتام تک مختلف صورتوں میں ماضی اور حال کے تقابل میں بیان کیا گیا ہے۔

مانگر جاتی قبیلے کے بیان میں ناول نگار نے سماج کے طاقتور طبقہ کی بالادستی کے ساتھ ساتھ ان پنچ خیال کیے جانے والوں کی زندگیوں کے شب و روز کے بارے میں ان کی ثقافت کو بیان کیا ہے۔ یاور عطائی کا باپ ایک ڈاکیا تھا۔ جو اپنے حالات کو تبدیل کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے لیکن اس کو مکمل طور پہ تبدیل نہ کر پایا۔ سامراجی طاقتیں ان کو اپنے سامنے سرنگوں دیکھنا چاہتی ہیں تاکہ ان کی بالادستی قائم رہے۔ یاور کے باپ خادم حسین سے قبل بھی کئی لوگ اس نسل کے آگے بڑھنے لگے تو ان کو راستے سے ہٹا دیا گیا۔ جیسے کہ ان کا زندگی میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل کرنے کا کوئی حق ہی نہ ہو۔ خادم حسین سے قبل جو نمایاں لوگ اس نسل میں پیدا ہوئے کسی کو مار دیا گیا تو کسی کو سرکاری ملازمت چھوڑنے کے عوض زیادہ تنخواہ کا جھانسہ دیا گیا۔ ان تمام اقدامات کا مقصد اس قبیلے کو اپنا ماتحت رکھنا تھا۔ ان میں سے ایک کا احوال ناول میں کچھ اس طرح سے بیان ہوا ہے:

> "ایک تو ان میں حاکو کانٹے والا ہو گزرا تھا۔ جب انگریز نے علاقے میں سے ریلوے لائن گزاری تو حاکو (حاکم دین) انعام گڑھ کے اسٹیشن پر کانٹے والا بھرتی ہو گیا۔ سرکاری نوکری ملنے پر وہ اپنی اصل بھول گیا اور کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اسے اس کی اصل کی طرف واپس پہنچانے کے لیے چند بڑوں نے آسان طریقہ نکالا اور اسے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسی ریل کی پٹڑی پر ڈال دیا۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کا منہ نہ باندھا اور آتی ریل کی آواز سن کر وہ پاگل ہو گیا قہقے لگانے لگا اور ایک ہی بات کہتا تھا میں بھورا بادشاہ بن گیا ہوں ریل گڈی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"(31)

خادم حسین اپنا آبائی علاقہ چھوڑ کر انعام گڑھ آجاتا ہے جہاں اس کی اولاد پڑھ لکھ کر عزت کا مقام حاصل کرے اور اپنی زندگی عزت سے گزارے۔ ارزل نسل کے ان لوگوں کو کوئی ڈھنگ کا کام بھی کرنے کو نہ دیا جاتا بلکہ ان کو غلاظت کی علامت سمجھا جاتا۔ ناول نگار ارزل نسل کے بیان میں کئی ایسی نسلوں کا نوحہ پڑا جن کو معاشرہ کبھی انسان قبول ہی نہیں کرتا ان کو معاشی مسائل میں الجھا کر اس قدر مجبور کیا جاتا کہ ان کا جسمانی استحصال بھی ان کے لیے معمولی

کھیل بن جاتا ہے۔ان کو گھٹیااور پنچ خیال کرتے ہوئے اپنے برابر تو در کنار عزت والی جگہوں سے بھی دور رکھا جاتا ہے ۔خادم حسین اسی ذلت سے اپنی اولاد کو نکالنا چاہتا تھا لیکن یاور کے علاوہ اس کی اولاد اپنے حالات تبدیل نہیں کر پاتی۔ اس تمام صورتحال کا کرب خادم حسین کے آخری مکالمہ جو یاور کے ساتھ ہوا،اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اس کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود بھی وہ عزت والا مقام حاصل نہ کر سکا جس کا وہ متلاشی تھا۔ جس کی خاطر اس نے اپنے قبیلے کو اپنے علاقے کو خیر آباد کہا اور عزت دار لوگوں میں آبیٹھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ عزت کا مقام حاصل نہ کر سکا جس کا وہ متلاشی تھا۔

"میں ساری عمر عزت دار بننے کی کوشش کرتا رہا۔ایسا جو اپنی روزی خود کماتا ہے اور اس کی اولاد پہلی صف میں سب کے برابر نماز پڑھ سکتی ہے۔۔۔ مگر یہ سب جھوٹ تھا۔۔۔اس کی آواز بھرا گئی۔"(32)

اس نسل کو نہ صرف دنیاوی بلکہ دینی علم سے بھی دور رکھا جاتا۔ان کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان حد نہ صرف دنیاوی معاملات میں بلکہ دینی معاملات میں بھی قائم تھی۔عبادت خانوں میں بھی ان کو نیچے خیال کیا جاتا اور اپنے برابر کھڑا ہونے نہ دیا جاتا۔جبکہ ایک ایسے دین کا پیروکار ہوتے ہوئے بھی جہاں اپنے رنگ، نسل، زبان، علاقے کی کسی چیز کی بھی برتری نہیں ہے۔خادم حسین آخری مکالمے! اپنے بیٹے جو شہر میں ایک کلرکی نوکری کرتا ہے۔جس سے اسے امید بھی ہے کہ وہ اپنے حالات کو مزید بہتر بنا کر واقعتاً عزت کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔جس کا آغاز اس نے پہلے خود کیا تھا۔یاور حسین کو بھی اپنی اصلیت کا ادراک ہے۔وہ اس نظام سے نکل کر اپنی الگ دنیا بسانا چاہتا ہے جب کہ اس کا چھوٹا بھائی اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لیتا اور اپنی روایتی ذلت کو کھلے دل سے تسلیم کرتا ہے۔ان کی معاشی حالت ہی ان کی ذلت کا اصل سبب ہے اور ان کے حکمرانی کرنے والے اس ہنر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ کس طرح ان کو بھوک کے بعد چند نوالے دے کر اپنا احسان مند بنانا ہے۔آدم حسین کو اس بات کا دکھ بھی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اس دلدل سے نکال نہ سکا۔

ان مانگر جاتی یا کم ذات لوگوں کی ذہن سازی ہی اس طرح سے کی جاتی ہے کہ وہ کچھ کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔وہ تو ان کو نوابوں، وڈیروں اور پگلوں کی خوشی میں اپنی خوشیوں سے زیادہ بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے ہیں۔ان کی شرکت کا باعث دنیا کا سب سے بڑا فلسفہ ضرورت بھوک جو شامل حال ہوتی ہے۔ان کی زبانوں کو مختلف ذائقوں سے آشنائی اور پیٹوں کو آسودگی ان موقعوں پہ چلنے والے لنگر خانوں سے ہوتی ہے جو اشرافیہ اپنی خوشیوں کا صدقہ اتارنے، اپنی وجاہت کا اعلان بھی کرتے ہیں۔نوازش علی کے چند جملے اس ذہنی اور نسلی غلامی کی وضاحت کے لیے کافی ہیں۔

"ابا میں تیرے لیے چاول لایا ہوں اوپر بوٹیاں اور شوروا بھی ڈلوا لایا ہوں۔" یاور بے حس و حرکت کھڑا پوٹلی سے گرتے قطروں کو دیکھتا رہا پھر اس نے باپ کو کہتے سنا۔اچھا چاول لایا ہے کہاں سے وہ نوازش سے پوچھ رہا تھا

۔وہ بتایا تھاناامیر بگل کے چھوٹے کاکے کے ختنے تھے۔ تیس دیگیں پلا کی، چار زردے کی اور آٹھ گوشت کی پکوائی بڑا جشن ہوا۔ پہلے مجرا ہوا پھر روٹی پہلے تو وڈیرے، وڈیرے برادری بھگتی۔ پھر خیر ہماری باری آئی کارخانے کے سارے بندے پہنچے ہوئے تھے۔ کھلا کھانا تھا جتنا کوئی کھا لے اور ہم نے بھی خوب کسریں نکالی اگلی پچھلی۔"(33)

خادم حسین مرتے وقت یاور حسین کو ایک کتاب کے بارے میں بتاتا ہے۔ جو ڈاک اس کے اصل مالک کے مر جانے کی وجہ سے اس نے اپنے پاس محفوظ کر لی تھی۔ اس کتاب کو مختلف تحریروں کو ایک جگہ جمع کر کے بنایا گیا تھا جس کا عنوان گنجینہ نشاط تھا۔ یاور حسین باپ کے مرنے کے بعد شہر چلا جاتا ہے اور کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ وہ شہر جا کر لوگوں کو اس کتاب سے حاصل شدہ نسخوں کے ذریعے قابو کرتا ہے۔ وہ شہر جا کے لوگوں کو جوانی کے نسخے فروخت کرتا ہے اور بہت جلدی اچھے پوش علاقے میں مکان خرید کر رہائش اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے در پہ ایک سے ایک امیر آدمی آتا ہے۔ جو اپنے مطلوبہ نسخے خریدتے ہیں۔ یاور عطائی کے نام سے مشہور یاور حسین کی ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی ہے ۔ کچھ عرصے بعد ہی اس کے پاس آنے والا ایک شخص اسے اپنی بیٹی کا رشتہ دے دیتا ہے۔ جس سے اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہوتی ہے۔ یوں انعام گڑھ کی ارزل نسل کا باشندا یاور اب نامور یاور عطائی ہے جس کے سامنے بڑے بڑے کاروباری، تاجر صحافی، ایڈیٹر، بیوروکریٹ بے بس ہیں۔ راحیلہ الطاف اس ضمن میں لکھتی ہیں کہ :

"ارزل نسلوں کا نمائندہ یاور عطائی جو اپنی اصل سے فرار حاصل کر کے بڑے شہر کے بڑوں کو اپنی جڑی بوٹیوں سے بنی موہیات (Aphrodisiac) سے لوٹتا اور اپنی سلطنت تعمیر کرتا ہے۔"(34)

یاور عطائی ایک کامیاب زندگی گزارتا ہے۔ اس کے باوجود اس کی بیوی اس کو ایک اچھا آدمی خیال نہیں کرتی۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس نے اس کے باپ کو ورغلاء کر شادی کی، اُسے اس کی جڑی بوٹیوں سے نفرت ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یاور عطائی ایک نیچ ذات کا آدمی ہے۔ اگرچہ کبھی وہ اس کی اصلیت کو کھوج نہیں لگاتی لیکن اس سے نفرت ضرور کرتی ہے۔ وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ الگ رہتی ہے جبکہ بیٹی کے بارے میں بھی اس کا خیال ہے کہ وہ اپنے باپ پہ گئی ہے۔ بیٹی یارو کے ساتھ دلی لگاؤ رکھتی ہے۔ اس کے اندر فطرتی طور پر اپنی نسل کی کشش ہے وہ اپنے باپ کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ وہ اس کے اصل کو تلاش کر کے اپنی نسل کا کھوج لگانا چاہتی ہے۔ ایسے حالات کا اندازہ لگانے کی متلاشی ہے جن سے مقابلہ کر کے اس کا باپ اس مقام تک پہنچا۔ یاور عطائی لوگوں کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھا کر یا انہیں قابو کر کے بھی اپنی بیوی سے عزت حاصل نہیں کر پاتا۔ ڈاکٹر شاہد نواز ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

"ناول کی بنیادی کہانی اس خطے میں قدیمی ادوار سے چلتی طبقاتی کشمکش کی کہانی ہے۔ جس میں بالائی طبقہ نچلے طبقے کو کبھی انسان نہ سمجھنے کی روش پر قائم ہے۔ نچلے طبقے کا ایک کردار یاور عطائی جو اس ظلم کا بدلہ ان بڑے لوگوں

سے یوں لیتا ہے کہ انہیں زندگی کی لذت کشید کرنے کے لیے اس کے در کا بھی بھکاری بننا پڑتا ہے۔اس عمل سے اور یاور عطائی اپنے نفس کو تسکین پہنچاتا نظر آتا ہے۔"(35)

جدید زمانے میں تین نسلوں بعد بھی ان مانگر جاتی لوگوں کی حالت نہیں بدلتی۔ ناول کے آخری حصے میں ان کی حالت زار کا بیان اس وقت ملتا ہے جب زارا اپنی اصل نسل کی بازیافت کے لیے انعام گڑھ کا رخ کرتی ہے۔امیروں ،وڈیروں اور پگلوں نے ان کے رہنے کی زمینوں پر بھی قبضہ کر لیا اور ان کو وہاں سے بے دخل کر دیا۔وہ مٹی کے گھروندوں میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ شہر سے باہر غلاظت کے ڈھیروں کے پاس زندگی گزار رہے ہیں۔ پگلوں نے حکومت میں بڑے بڑے عہدے حاصل کر رکھے ہیں۔ملک کی کئی اہم وزارتیں اس علاقے سے ہوتی ہیں۔تاہم ان لوگوں کی حالت روز بروز تباہ ہوتی گئی۔یہاں تک کہ اس قبیلے میں سے محض گنتی کے چند لوگ باقی رہ گئے۔

"کھانے کو کسی کے پاس کچھ نہیں بال بچے گند میں سے رزق ڈھونڈتے ہیں ادھر پیچھے بلڈوزر لگے ہیں ادھر سب کچھ برابر ہو جاتا ہے سکھڑنہر انہوں نے پر کر دینی ہے۔ادھر کچھ نہیں بچا۔"(36)

انعام گڑھ میں مانگر جاتی قبیلہ تو معدوم ہونے کے قریب ہے اس کے ساتھ ساتھ دوسرے نچلے طبقات کی حالت زار بھی ناقابل بیان ہے۔انعام گڑھ کے بیان میں ناول نگار نے دیہاتوں کی عمومی معاشی حالت کا بیان کیا ہے کہیں مذہبی خاندان مسلط ہیں تو کہیں بڑے بڑے وڈیرے اور زمیندار ان کے آنے والی نسلوں نے اپنے آپ کو مزید طاقتور کرنے کے لیے سیاسی مختلف اشرافیہ کی نمائندوں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ان کے مفادات کی بھینٹ پھر بھی عوام ہی چڑھ رہی ہے۔جو عقیدت واحترام کے پیرائے میں لپٹے ان کے جلسوں میں آتے ہیں تاکہ کچھ وقت کے لیے اپنے پیٹ کو آسودہ کر سکیں بدلے میں اپنے قیمتی ووٹ کا سودا کراتے ہیں۔استحصال کی یہ خوفناک صورتحال یوں ہی جاری و ساری ہے۔

"پھر میں نے دیکھا کہ مندری اپنا کرتا اتار رہا ہے اور پھر اس نے دیکھتے ہی دیکھتے بازوں کے سوراخوں کو گانٹھیں دے کر بند کیا تو کرتا اچھا خاصا تھیلا بن گیا۔میں سمجھ گیا وہ اس ریڈی میڈ تھیلے میں لنگر ڈلوائے گا اور کچھ ادھر بھی کھائے گا باقی ساتھ لے جائے گا۔"(37)

زہرہ کے اس جلسے کے بیان میں جو اس نے انعام گڑھ میں دیکھا جس میں بیک وقت مقامی بااثر شخصیات کے ساتھ ساتھ ملکی سطح کی شخصیات بھی شامل تھیں۔ان کا مقصد ان لوگوں کا ووٹ حاصل کرنا جن کا احساس ان کے آباؤ اجداد بھی کرتے آئے ہیں اور اب یہ بھی نئے ڈھنگ سے کر رہے ہیں۔ کبھی پگلوں کے بچوں کے ختنوں کی دیگیں ان لوگوں میں تقسیم ہوتی تھیں تو اب سیاسی جلسوں کے بعد جس میں اس بے زبان رعایا کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ آپ کے نواب کا شملہ اونچا رہنے میں ہی آپ کی عافیت اور بقاء اور عزت ہے۔

"لنگر کھل گیا۔ عظیم نامی گرامی ہستیاں با حفاظت رخصت ہوئیں۔ کاروں جیپوں کا اژدہام ختم ہوا تو لاؤڈ سپیکروں نے ایک بار پھر مژدہ دارسنایا کہ لنگراس قدر زیادہ ہے کہ انعام گڑھ کی ساری آبادی بھی کھالے تو ختم نہ ہو۔اس لیے عوام اب پورے صبر و تحمل کے ساتھ جائیں اور لنگر لیں۔"(38)

ناول میں انعام گڑھ کے علاوہ پوٹھوہار کے علاقے سنیمال کا بیان ہے۔اس علاقے سے کبیر جو ناول کا ہیرو کا بھی تعلق ہے۔سنمیال کے بیان میں ناول نگار نے مقامیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔پوٹھوہار کا علاقہ نہ تو مکمل طور پہ ہموار ہے اور نہ ہی پہاڑی علاقہ بلکہ یہاں دونوں صورتحال ملتی ہیں۔کبیر مہدی جو شہر میں کتابوں کی پرانی دکان میں رہتا ہے،اس کا تعلق عام طبقے کے دیہاتی خاندان سے ہے۔جس کے باپ کے پاس چندایکڑ زمین ہے جس سے وہ گزر بسر کرتا ہے۔یہ عام سادہ لوح دیہاتی لوگ اس بات کی امید میں ہیں کہ ان کا بیٹا اعلی تعلیم یافتہ ہو کر ایک اعلی مقام حاصل کرلے گا اور اپنے خاندان کی مالی مدد کرے گا۔کبیر مہدی جب چند روز کے لیے سنیمال میں آتا ہے تو اس علاقے کا ناول میں بیان ملتا ہے۔ناول نگار اس علاقے کا مختصر تعارف یوں کراتا ہے:

"سنیمال ایک چھوٹا گاؤں ہے۔یہ ایک نیم پہاڑی علاقہ ہے۔جیسے یہاں کے دوسرے گاؤں ہیں ویسا ہی یہ گاؤں ہے۔اس گاؤں میں جو لوگ رہتے ہیں ان کو اگر گنا جائے تو ہزار سے زیادہ اور پندرہ سو سے کم ہوں گے۔سنمیال ایک چھوٹی سی وادی میں ہے۔جس میں لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔باقی لوگ نمک یا کوئلے کی کانوں میں کام کرتے ہیں۔کچھ لوگ فوج میں بھی کام کرتے ہیں۔"(39)

اس علاقے کے لوگوں کا بودوباش بھی ناول میں بیان ہوا ہے۔ان لوگوں کا ذریعہ آمدنی محدود ہے۔زمینوں میں فصلوں کی کاشت بھی بارشوں سے مشروط ہوتی ہے۔مالی لحاظ سے کمزور لوگ ہیں جن کے لیے کچھ پڑھ لکھ کر سرکاری نوکری کا حصول ایک اہم کامیابی تصور کی جاتی ہے۔چھوٹی موٹی سرکاری نوکریاں بھی ان کے سہانے مستقبل کی امید ہوتی ہیں۔ناول نگار نے اس خطے کی نہ صرف مقامی سماجی پہلوؤں بلکہ ثقافتی،مذہبی پہلوں کو بھی بیان کیا ہے۔ناول میں مابعد جدید رویے کی آبیاری نظر آتی ہے۔جہاں بڑے بیانیے کے بجائے مقامی بیانیے کی طرف زور ملتا ہے۔ناول نگار کبھی انعام گڑھ کے مانگر جو قبیلے اور کبھی سنمیال کی پہاڑیوں میں بسی زندگی کی خدوخال بیان کرتا ہے۔جہاں زندگی اپنی سادگی لیکن سکون اور رنگینی کے ساتھ موجود ہیں۔کبیر کی ماں ایک عام سادہ لوح دیہاتی خاتون ہے۔

"کبیر کے آنے کے بعد گھر میں چائے زیادہ بننے لگی تھی۔مہراں نے سوچا کہ صبح جب راسب نمک کی کانوں میں اپنے کام پر جانے لگے گا تو اسے کہے گی کہ وہ چائے کا ایسا ڈبہ وہاں قریبی قصبے کے بازار سے لیتا آئے۔جو چائے کبیر پیتا تھا۔وہ سنیمال کے اکلوتے دکاندار بابے سراج کے پرچون کے ذخیرے میں شاذونادر ہی ملتی تھی۔یہ چائے تو امیر لوگ پیتے ہیں۔سراج نے ایک دن رازدانہ لہجے میں مہدی خان کے گھر والی مہراں کو بتایا تھا۔"(40)

ان دونوں مقامی ثقافتوں کے مختلف عناصر کے ساتھ ساتھ معاشی عناصر کی بھی مختصر لیکن وضاحت ضرور ملتی ہے۔ناول کے یہ مقامی کردار سادہ طرز زندگی اپنائے ہوئے ہیں۔جہاں کے معاشی مسائل بھی اپنی جگہ قائم

ہیں۔ان کے محدود معاشی وسائل ہی ان کی زندگیوں کی مشکلات میں اضافہ کرتے ہیں۔جوان کی وقعت کم کرنے کے لیے کافی ہیں۔سنمیال کے پہاڑی علاقوں میں رہنے والے لوگ اگرچہ معاشی تنگدستی کا شکار ضرور ہیں تاہم اس کے باوجود کسی قدر آزاد اور آگے بڑھنے کے متلاشی اور موقعوں کی تلاش میں ضرور رہتے ہیں جبکہ مانگر جو ایک ایسا قبیلہ ہے،جو اس قدر پنچ خیال کیا جاتا ہے کہ جس آگے بڑھنے کے امکانات بھی معدوم نظر آتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ اردو ناول نگاری میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ناول کا تاریخی ارتقاء تقریباً ایک صدی پہ محیط ہے۔ناول نگار نے 1929ء سے اکیسویں صدی تک برصغیر کی مقامی ثقافتوں سے بین الاقوامی تناظر تک مختلف تہذیبوں کا بیان کیا ہے۔ناول کا وسیع تناظر مختلف پہلوؤں اور سیاسی،سماجی،معاشرتی کو اپنے وسیع دامن میں سموئے ہوئے ہے۔"خس و خا شاک زمانے میں" میں تارڑ نے " بہاؤ"کی طرح مقامیت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ناول میں بہت سے دوسرے عناصر کی طرح مقامیت کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ناول کے کردار مقامی کردار ہیں۔ان کرداروں کا تسلسل تین نسلوں تک دکھائی دیتا ہے۔موجودہ عالمی تناظر میں بڑی ثقافتوں کا حصہ بن کر بھی اپنی مقامی ثقافتوں کے ترجمان رہتے ہیں۔ان کا خمیر اسی مقامی مٹی سے گندھا ہے،جس میں ان کے آباواجداد کی ہڈیاں مٹی میں مل چکی ہیں۔مابعد جدید دنیا میں وہ اپنے اصل سے دور رہ کر تنہائی کے کرب میں مبتلا ہیں۔جو اپنے اصل کی جانب لوٹنے میں عافیت جانتے ہیں۔

ناول کا آغاز 1929ء کے قریب ہوتا ہے۔ناول کا ارتقاء پنجاب کے شہر گجرات اور گجرانوالہ کے گردونواح کے دیہاتوں سے ہوتا ہے۔ان دیہاتوں میں جٹ برادری کی اکثریت ہے۔سکھوں اور مسلمانوں کی جٹ برادری ان مقامی لوگوں میں زیادہ معزز اور معتبر ہیں۔ان کی مالی حالت بھی ضمنی پیشوں/اقوام اور کمیوں کی نسبت بہتر ہے۔مقامی رسم ورواج میں گندھے یہ لوگ جاٹ برادری کو بعض مقامات پہ اپنے مذہب پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔یہ وہ عرصہ تھا جب مقامی لوگ مختلف مذاہب کے پیروکار ہونے کے باوجود بھی اس مٹی کے بیٹے تھے۔ان میں اس مٹی کی حیثیت بھی اس قدر زیادہ ہے کہ جو اسے اپنی ماں کا درجہ دیتے تھے۔مقامی رسم ورواج میں بندھے یہ لوگ اپنے محدود وسائل کے باوجود فراغ دل بھی ہیں اور ان کے درمیان مذہبی ہم آہنگی اور بھائی چارہ بھی ہے۔

جاٹ قوم جس میں مسلمان اور سکھ دونوں شامل ہیں۔ان علاقوں کے چوہدری کے منصب فائز ہیں۔سردار اور چوہدری زمیندار ہیں۔ان زمینوں میں ہل چلانا مال مویشی پالنا ہی ان کا پیشہ اور ان کا فخر ہے۔ان کے نسلی تفاخر میں اسی زمین کے سینے میں ہل چلانا اور اس سے اپنا رزق کشید کرنا ہے۔باقی تمام قومیں اپنی زمینوں سے اُگنے والے رزق سے اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔لوہار،ترکھان،نائی اور کمی سارے ان زمینداروں کے ساتھ جڑے ہیں۔نسلی برتری کے باعث یہ چوہدری اور سردار اپنی حیثیت سے بڑھ کر ان لوگوں کی مالی مدد بھی کر دیتے ہیں۔اس مقامی معاشی نظام

کی بات کی جائے تو وہ کھیت اور مال مویشی لوگوں کی معاشی نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ زمیندار ان کھیتوں میں ہل چلانا ہی اپنا فخر سمجھتا ہے۔ وہ دوسرے پیشوں تجارت یا شہر میں جا کہ رزق کمانے کو اپنے لیے ہتک محسوس کرتے ہیں وہ کم ہو یا زیادہ آمدن وہ اپنے اس آبائی کام کو جاری رکھنے پہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس عہد میں ان جاٹوں کا محور و مرکز زمین اور زمینداری ہی ہے۔ چھوٹی قوموں کے لوگ ان چوہدریوں کے در کے سوالی ہیں۔ وہ اسی تفاخر میں زندہ ہیں کہ چوہدری ہیں۔ تاہم اس کے باوجود ایک پر امن فضا قائم ہے۔ معاشی حالت مقامی زمینداروں کی بھی زیادہ اچھی نہیں وہ سال بھر کی محنت سے اپنے بیوی بچوں کا پیٹ ہی پال پاتے ہیں۔ جب ضرورت پیش آئے تو زمین گروی رکھ کر ادھار رقم وصول کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کے اہم معاملات ادھار پہ چلتے ہیں۔ وضع داری قائم رکھنے کے لئے بھی وہ اس عمل کے پیرو کار تھے۔

برصغیر کے دوسرے دیہاتوں اور شہروں کی طرح یہاں بھی ہندو، سکھوں اور مسلمانوں سے زیادہ آسودہ حال ہیں۔ جس کی وجہ سکھوں اور مسلمان جاٹوں کا محض زمینداری کرنا؛ اپنی محنت کے بل پہ زمینوں کا سینہ چیر کر رزق کشید کرنا ہوتا ہے۔ ہندو تجارت اور سود کے کاروبار میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ ہندو لوگوں کی زمینوں کو گروی رکھتے اور سود پہ پیسہ دیتے ہیں۔ ناول نگار نے ان مقامی جاٹوں کی معاشی حالت کی قلعی کھولی ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے رسم و رواج کے ہاتھوں اور اپنے نسلی تفاخر کے ہاتھوں اس قدر عاجز ہیں کہ کسی بھی قیمت پر اپنے نام پہ آنچ آنے نہیں دیتے یہ ان کو قبول نہیں ہے۔ جوتے اور کپڑے بھی کئی کئی سالوں تک بدل نہیں سکتے کہ ان کی معاشی حالت اس قابل نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے سے کم درجے لوگوں کے سامنے اس بھرم کو توڑنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

"کوئی جاٹ زمیندار اپنی جوتی کو بغل میں دبائے ننگے پاؤں سفر کرتا اور جب کوئی گاؤں آتا تو اسے پہن کر اس میں سے گزر کر پھر سے اسے بغل میں دبا لیتا کہ کہیں وہ خراب نہ ہو جائے"۔(41)

ان مقامی جاٹوں کی اکثریت نے زندگی کے تمام ایام انہی دیہاتوں میں گزار دیے۔ وہ کبھی ان علاقوں سے باہر نہ گئے کہ ان کے لیے اپنی زمین کے علاوہ کوئی اور کام کرنا عزت کا باعث نہ تھا۔ وہ اسی میں سے حاصل والے آمدنی سے کسی نہ کسی طرح گزران کرتے۔ امیر بخش، عزیز جہاں نئی نسل کے نمائندہ کردار ثابت ہوتے ہیں۔ جو اس مقامیت کی حدود سے نکل کر اپنے لیے ایک نئی دنیا تخلیق کرتے ہیں۔ مقامی لوگوں کی معاشی حالت کا اندازہ کئی برس بعد امیر بخش کی شادی کے موقع پر دیکھا جاسکتا ہے کہ یہ مقامی چودھری کس طرح غربت کی زندگی گزار رہے تھے۔

"کورٹ ستارہ سے نکلتے ہی انہوں نے اپنی جوتیاں اتار کر سروں پر رکھ دی تھیں تاکہ یوں ہی بیکار چلتے پھرنے سے وہ گھس نہ جائیں۔۔۔ اسٹیشن کے واحد نلکے کو گیڑ کر انہوں نے اپنے منہ ہاتھ دھوئے تھے اور پھر محکم دین کے ڈانٹنے پر انہوں نے جوتیاں بھی پہن لی اور کرتے بھی۔۔۔ کھدر کے یہ کرتے انہیں بے حد کھردرے لگتے تھے

اور بدن کو آزار دیتے۔۔۔ بیشتر جاٹ اس عقیدے کے پیروکار تھے کہ ستر ڈھانپنا تو مجبوری ہے پر اس کے اوپر جو بدن ہے یہ بنایا ہے اس لیے گیا ہے کہ وہ موسموں کو سہار سکے اور سہہ سکے"(42)

اپنے آباؤاجداد سے ورثے میں ملے رسم ورواج ان جاٹوں کے لیے سب سے زیادہ ضروری تھا۔ شادی بیاہ ہو یا کوئی اور معاملہ مرگ وزیست کے معاملات میں نمٹانے کے لیے دنیاپور کے ان چودھریوں کے پاس سوائے زمینوں کو گروی رکھ کہ سود پہ پیسہ حاصل کرنے کے اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ اس کمزور معاشی صورتحال کے باوجود نہ تو وہ اپنے رسم ورواج کو چھوڑنے کو تیار ہیں اور نہ ہی اپنے طور طریقے تبدیل کرنے کے۔ وہ کاروبار و تعلیم کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ کمی کمین لوگوں کا کام ہے۔ مقامیت کے وفادار یہ جاٹ ہر طور پر اپنی نسلی برتری ثابت کرتے ہیں چاہے اس کے لیے ان کو بھی قیمت ادا کرنی پڑ جائے۔

"فصل کٹنے پر چند روز پیٹ بھر کے کھاتے خوب موج میلہ اور دنگا فساد کرتے پھر گندم کی دو روٹیاں اور کچی لسی ان کے نصیب میں ہوتی۔ کمی کمین وہیڑے میں داخل ہو کر سلام کرتا تو ان کی گردن مزید اکڑ جاتی۔ ان کی جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتے اور خود بھوکے سوئے رہتے۔۔۔ شادی بیاہ اور سوگ کے موقع پر ساہوکار کے دروازے پر جا دستک دیتے ہیں کہ لالہ زمین گروی رکھ لو۔۔۔ سود پہ کچھ رقم دے دو۔۔۔ دھی رانی کے لیے کچھ گہنے بنوانے ہیں اور شادی ایسی کرنی ہے کہ شریکوں کے کلیجے راکھ ہو جائیں۔۔۔ یا چاچے کی فوتگی ہو گئی ہے تو برادری کو زردے اور پلاؤں کی دیگیں کھلانی ہیں ورنہ ناک کٹ جائے گی۔"(43)

اس پیرا گراف کے بڑے درجے کے لوگوں کی مالی حالت اندازہ ہوتا ہے۔ وہاں عام آدمی کی حالت تو ضرور خراب ہو گی۔ اس مقامیت کا دائرہ کار زمین اور اس کی کاشت سے حاصل ہونی والی فصل کے گرد گھومتا ہے۔ اس فصل میں زمیندار کے ساتھ ساتھ باقی پیشوں کے لوگوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ سود کا یہ کاروبار محض دنیاپور ہی نہیں بلکہ تمام چھوٹے بڑے علاقوں میں رائج تھا۔ اکیسویں صدی کی دو دہائیاں گزرنے کے بعد بھی غلامی کے تصور موجود تھا۔ اس غلامی کی جیتی جاگتی تصویر بھٹہ مالکان کے مزدوروں کی صورت دیکھی جا سکتی ہے اور غربت میں دھنسے یہ غلام چند روپوں کی خاطر ایک سے دوسرے مالک کے پاس فروخت ہو جاتے۔ جہاں وہ اپنی تمام زندگی محض روٹی کے حصول کے لیے اور اپنے ادھار اور سود کی رقم کو پورا کرنے میں گزار دیتے۔ رام داس کے لیے نئے بھٹے کے قیام کے وقت مزدوروں کی خرید و فروخت کا معاملہ جہاں سود پہ پیسہ دینے والوں کے جبر کو عیاں کرتا ہے تو وہیں غلامی کی صدیوں پرانی تصویر میں بھی رنگ بقاڈالتا ہے؛ وہیں صدیوں پرانی غلامی کا یہ تصور شاید آئندہ بھی ایسا ہی رواں دواں رہے گا اور لوگ اسی طرح سبزی منڈی اور مویشی منڈیوں کی طرح انسانوں کی منڈیوں کو بھی یوں ہی آباد کرتے رہیں گے۔ جہاں مال کو دیکھ بحال کے اس سے حاصل ہونے والے فوائد کے مطابق گاہک اپنی بولی لگاتا ہے۔

"سود کی ماری ہوئی نسلیں عرصے سے بکی ہوئی ہیں نہ صرف وہ بلکہ ان کے بچے بھی اس کاروبار میں بری طرح پھنس چکے ہیں یہ نسلیں قرض کے بوجھ سے جھکی ہیں اور کبھی بھی گردن اونچی اٹھا کر نہیں چل سکتی۔"(44)

اکیسویں صدی میں آج بھی دیہاتوں، قصبوں اور نہروں سے متصل ان بھٹوں پہ مزدور اسی استحصال کا شکار ہیں۔ 75 سال قبل حاصل کیے گئے وہ ملک میں جس کو اسلام کے نام پہ قائم کیا گیا۔ آج اکیسویں صدی میں بھی مقامی مسلمان اپنے مسلمان مزدوروں کو اسی سود کی رقم کے عوض اس میں جکڑ کر غلامی کا طوق ان کے گلے میں ڈالا ہوا ہے؛ جیسے سو برس قبل رام داس نے بھٹے کے مزدوروں کو خریدا تھا۔ ناول نگار نے ان تمام احوال کے ساتھ مقامی معاشی نظام کی وضاحت کی ہے۔ ایک طرف تو دیہاتوں میں چودھری لوگ اپنے نام کو اونچا کرنے کے لیے سود سے رقم حاصل کر رہے ہیں تو دوسری طرف نسل در نسل سود چکاتے یہ مزدور ہیں جن کی ائندہ نسلیں غلامی میں ہی آنکھیں کھولتی ہیں؛ جہاں وہ ہوش سنبھالنے سے قبل کسی اور کے ہاتھوں فروخت ہو جاتے ہیں۔

مٹی کے سارے لوگ فروخت ہو گئے، پر ایک دس برس کا بچہ دھوپ میں لاوارث کھڑا رہ گیا۔۔۔
"اس کے صرف پانچ روپے رام داس"۔۔۔
نہیں میاں۔۔۔ میری خریداری تمام ہو چکی"۔۔۔"
رام داس بقول تمہارے یہ سب مٹی کے لوگ ہیں۔۔۔ تو پھر ہم بھی۔۔۔ مٹی کے لوگ ہیں۔۔۔ تم بھی اور میں بھی۔۔۔ تو اگر کوئی گاہگ مناسب خریداری کرتا ہے جو تم نے کی ہے تو اسے ایک جھونگا بھی دیتے ہیں۔۔۔ مفت میں۔۔ یہ لڑکا میں تمہیں جھونگے میں دیتا ہوں۔"(45)

ناول کے آغاز میں چودھری بخت جہاں کا زوال بھی دکھایا گیا ہے۔ چودھری کی زمین اس طرح اجڑ گئی جیسے زمانے کے اعتبار سے ایسے چودھریوں کی چودھراہٹ کبھی ختم ہو گئی۔ مقامی معاشی نظام میں تبدیلی آگئی۔ کمی کمین لوگوں کے بچوں نے تعلیم حاصل کر کے شہروں میں ملازمتیں اور کاروبار جما لیے جبکہ ایسے لوگ جو وقت کی رفتار کے ساتھ نہ چل سکے بے بسی کی تصویر بن گئے۔ مقامی طور پر لوگوں کی آنے والی نسلوں نے باہر کا رخ کیا جو رزق کی تلاش میں نہ صرف شہروں بلکہ بیرون ملک میں بھی جانے لگے۔ مقامیت کے اس زوال کے ساتھ ساتھ مقامی طرز معیشت میں بھی تبدیلی آگئی۔ چوہدری بخش جہاں ایک منگتا اور سوالی بن گیا جو کبھی خود دینے والا تھا۔ وہ خود مانگنے والا بن گیا ۔اس کے زوال کو بیان کرتے ہوئے مصنف نے اس کے زوال کا وہ مقام بھی دکھایا جہاں وہ مرے ہوئے مرغے کو بھی کھا جاتا ہے۔ اس کے حصول کے لیے منت سماجت کرتا دکھائی دیتا ہے۔

"بخت جہاں ایک مجبور اور بے بس انسان کی حیثیت سے بھتیجی نور بیگم سے مری ہوئی مرغی تک مانگتا ہے تاکہ اسے بھون کر کھا سکے۔ یہاں وہ ایک قسم کا سانسی نسل کا مردار خور بن چکا ہوتا ہے۔"(46)

اس مقامیت کا ایک اور طبقہ سانسی نسل ہے۔ ایسا طبقہ جو تمام درجوں کے انسانوں سے گرا ہوا ہے۔ جو صدیوں پرانا ہندوستان کے قبیلوں میں سے ہے۔ دنیا پور کے ایک کنارے پہ آباد سانسیوں کی بستی کی آبادی ہے۔ یہ لوگ جن کا معاشی نظام بہت ہی کمزور ہے اتنا کہ ان کی سرشت میں مردار کھانا بھی شامل ہے۔ ان سے ہاتھ ملانے کو بھی کوئی تیار نہیں مگر اس کے باوجود ان کے ہاتھوں سے بنی کیکر کی شراب کی دلدادہ ہیں۔ ان کے روزگار کا واحد ذریعہ یہ کیکر کی دیسی شراب ہے۔ اس بستی کی طرف تعفن کی وجہ سے کوئی باہر کا شخص نہیں آتا کیونکہ مردار کھانے والوں کے ہاں مردار کی باقیات ہی ہوتی ہیں۔ ایسی تعفن زدہ جگہوں پہ کوئی کیسے جا سکتا ہے۔ ان کی کمائی کا واحد ذریعہ شراب ہے۔ جس کے حصول کے بھی لوگ رقم کے بدلے اجناس دیتے ہیں۔ بارٹر سسٹم ہی رائج ہے کہ رقم تو دنیا پور والوں کے پاس بھی میسر نہیں تھی کہ وہ انہیں دیں۔

> "باہر کی دنیا سے صرف وہی لوگ اس کے اندر آتے تھے جو ان کی کشید کردہ زہری شراب کے شوقین ہوتے تھے اور وہ بھی شتابی سے ان کی جھولیوں میں گندم یا گڑ کی پھلیاں ڈال کر شراب کے کجے حاصل کر کے فوری طور پر بستی سے نکل جاتے کہ وہاں دیکھا جانا کچھ ایسا اچھا نہ تھا"۔(47)

بعد ازاں ان لوگوں کی دوسری نسل معاشی تنگدستی کے باعث کچھ تو شہروں میں جا بسے اور کچھ بیرون ملک چلے گئے۔ امیر بخش اور جہاں کا کردار اور سروہانسی ایسے کردار ہیں۔ جنہوں نے اس مقامیت کے معاشی نظام سے کٹ کر اپنے لیے ایک الگ جہاں تخلیق کر ڈالا تو دوسری طرف اکبر جہاں کینیڈا میں جا بسا۔ اس نے اپنی ایک بستی "جہاں آباد" قائم کر کے کینیڈا میں اپنے اس مقامی کلچر کو فروغ دیا بلکہ وہی پیشہ اختیار کیا جو اس کے آباواجداد کا تھا۔

خس و خاشاک زمانے ایک وسیع تاریخی تناظر کا ارتقاء ہے۔ ناول میں وسطی پنجاب کے دیہاتوں سے لاہور اور امریکہ اور کینیڈا تک کی دنیا کا احوال ہے۔ ناول میں مقامیت کے دوسرے عناصر کی طرح مقامی پیشوں اقوام اور عمومی طور پر مقامی لوگوں کے معاشی نظام کا تفصیلی بیان ہے۔ ان کا مقام بھی روایات کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

ناول میں مذہبی طبقے کا نمائندہ کردار مولوی کا کردار بھی شامل ہے۔ مقامیت کے بیان میں ناول نگار نے اس مقامی کردار کو بھی بیان کیا ہے۔ مقامی لوگوں کے پاس اسے دینے کو رقم تو نہیں ہے تاہم وہ ان کے نکاح پڑھاتا ہے، ان کے جنازے، ان کے مردوں کو کفن پہناتا ہے۔ ان کے گاؤں کی مسجد آباد کرتا ہے۔ تو اس کے بدلے اس کی خدمت بھی تو ان پہ لازم ہے لہذا روزانہ کی بنیاد پر ہر گھر سے ایک روٹی دینے کا پابند تھا۔ یوں اس معاشی نظام کا وہ امام مسجد بھی حصہ بن جاتا ہے۔ جس کا گزاوقات مقامی لوگوں کی طرف سے دی جانے والی روٹیوں پہ ہوتا ہے۔

2.2 بود و باش، رہن سہن

مقامیت کے عناصر میں کسی مقامیت کا مخصوص رہن سہن، بود و باش اس کا ظاہری حلیہ ہوتا ہے۔۔ مقامیت کی پہچان مختلف حوالوں سے ہوتی ہے۔ مخصوص جغرافیہ اس مقام کے ظاہری خد و خال کو بھی ایک الگ پہچان عطا کرتا ہے۔ جغرافیائی حالات کے مد نظر رہائش کے لیے مکانوں کی تعمیر اور طرز لباس کی شکل وضع ہوتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ مقامی ثقافت کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی آرائش کی جاتی ہے۔ مقامی روایت مذہب کے اثرات کے ساتھ مل کر مخصوص مقامی بود و باش وجود میں آتی ہے۔اسی نقطے کی تلاش ان ناولوں میں کی گئی ہے۔اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ مقامیت کی ذیل میں تمام عناصر کی وضاحت موجود ہے یا چند ناولوں میں ہی اس کی وضاحت ہے۔ان کی نوعیت کو دیکھا جائے گا کہ کس طرح سے ان کا بیان ملتا ہے۔ لباس، خوراک اور رہن سہن میں مخصوص موسمی حالات کا دخل ہے یا اس کے باوجود دوسرے علاقوں سے اس مقامیت کا فرق موجود ہے۔ مقامی حالات اور دوسری مقامیتوں سے جڑنے کے بعد بھی مقامی رنگ نمایاں ہوتے ہیں یا نہیں؟ عالمگیریت کے وبال نے کیا ان کی وضع تبدیل کی ہے یا وہ اپنی شناخت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ جدیدیت کے نعرے نے اس مقامیت کو خارجی اعتبار سے کس حد تک متاثر کیا۔ بود و باش میں کس حد تک مقامی رنگ قائم کیے ہیں۔ ناولوں میں ان کی نوعیت کا جائزہ لیا جائے گا۔

ناول جندر میں ہزاروی ثقافت کے عناصر کو بہت باریک بین مشاہدے کے ذریعے سے بیان کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے اس خطے کی زندگی شب و روز، ماضی و حال کے تناظر میں مکمل جزئیات کے سے بیان کی ہے۔ ناول میں اس خطے کے لوگوں کی بود و باش رہن سہن کا بیان یوں ملتا ہے کہ ثقافت کو قاری آسانی سے نہ محض سمجھ جاتا ہے بلکہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس ماحول کا پورا تصور واضح ہو جاتا ہے۔ پہاڑی علاقوں میں طرز زندگی بھی مخصوص انداز کا ہوتا ہے خصوصاً ایسے علاقوں میں جہاں سردی کا موسم بھی شدید ہوتا ہے۔ان لوگوں کا مخصوص طرز رہائش، محدود وسائل اور موسم کی سختیاں برداشت کرنا جہاں ان کی فطرت میں شامل ہو جاتا ہے وہیں وہ ان مشکلات کا مقابلہ بھی اپنے وسائل کے محدود دائرہ کار میں رہتے ہوئے کرتے ہیں۔ مارگلہ، گلیات اور ہزارہ کے پہاڑوں میں چیڑ کا درخت کثرت سے پایا جاتا ہے۔اس درخت کو ان کی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے وہ نہ صرف ان کی ایندھن کی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے بلکہ زندگی کے مختلف امور میں وہ ان کا مددگار ہوتا ہے۔ ناول کے آغاز میں اس مخصوص مقامی علاقے کی روایتی زندگی میں اس درخت کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ درخت کئی حوالوں سے مقامی تاریخ اور ان کے رسم و رواج میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

> "آج سے تقریباً پچاس برس پہلے تک، بستی والے، چیڑ کے درختوں کے بغیر، زندگی کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ بستی کے مکانوں کے ستون، کڑیاں، بالے، بلیاں چوکھٹیں، کھڑکیاں، دروازے اور فرنیچر سب کا سب چیڑ کا ہوتا

تھا۔۔۔ عورتیں گھر کے برتن مانجنے کے لیے چیڑ کی کوچیاں استعمال کرتیں۔ چلغوزے سے ملتا جلتا اس کا پھل سردیوں میں خاصے کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ علاقے کے قدیم حکما واطبا کا خیال تھا کہ تپ دق کے مریض کو اگر چیڑ کے درخت کے نیچے لٹایا جائے تو اسے ،اس کی سبز ٹہنیاں سونگھائی جائیں تو وہ جلد صحت یاب ہو جاتا ہے۔"(49)

ناول میں ہزارہ کے علاقے کی خاص طرز رہائش کا بیان بھی ناول میں ملتا ہے۔ ناول نگار کا اپنا تعلق بھی ہزارہ سے ہے تو اس لحاظ سے انہوں نے ناول کو تمام جزئیات ،ذاتی تجربے اور مشاہدے کے تناظر میں بیان کیا ہے۔ ناول نگار نے ان مخصوص پہاڑی علاقوں میں مکانات کی طرز تعمیر اور ثقافتی عناصر کی مقامی کرداروں کے ذریعے سے بھرپور وضاحت اور عکاسی کی ہے۔ ان لوگوں کے مکانات کا خاص انداز ہوتا ہے جو یہاں کے جغرافیائی حالات اور ان کی ثقافتی روایت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ ناول میں ناصرہ بیگم کے بیان میں اس علاقے کے طرز تعمیر کا ایک مرقع ملاحظہ ہو:

"باہر برآمدے میں دونوں طرف ایک آدمی کی قامت جتنی بلند اور دو فٹ چوڑی دیواریں تھیں۔ بائیں سمت والی دیوار میں چراغ جلانے کے لیے طاق بنا ہوا تھا اور اس کے عین نیچے مٹی کا چولہا؛ جس پر نقش نگار بنے ہوئے تھے۔ دیوار کے اوپر پانی کے گڑھے اور روزمرہ استعمال کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ دونوں کمروں کے جڑے ہوئے پسار کی چھت کو چار ستون سہارا دیے ہوئے تھے جبکہ آگے گارے سے لپائی کیا ہوا، کھلا صحن تھا۔ جو دراصل اس مکان کے عین آگے دس فٹ نیچے بنے ہوئے مکان کی چھت تھی۔"(50)

اس خطے میں طرز تعمیر بھی مختلف ہوتی ہے۔ عموماً ایک گھر کا صحن دوسرے کی چھت ہی ہوتی ہے۔ ان گھروں کی طرح یہ لوگ بھی ایک خاص سماجی نظام کے تحت جڑے ہوتے ہیں۔ پر فضا مقام کے ساتھ ساتھ زندگی کی مشکلات اور دشواریاں بھی ان کی زندگی کا لازمی جزو ہوتے ہیں۔ مصنف نے اس کے بیان میں مقامی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔" پسار " کا لفظ بھی مقامی نوعیت کا ہے جو دراصل ایک کچا مکان اور بیک وقت جھونپڑی بھی ہو سکتا ہے۔ لکڑیوں کے ڈھانچے کو (سر) مختلف جھاڑیوں، لمبی گھاس اور شاخوں سے اس پہ ڈال کے مٹی ڈال دی جاتی ہے۔ بسا اوقات محض اس کو مٹی کے بغیر ایسے بنایا جاتا ہے کہ پانی اس کے اندر جانے کے بجائے باآسانی نیچے آتا ہے۔ جانوروں کے لیے تو اب بھی اس طرح کے چھپر/پسار بنائے جاتے ہیں۔ تاہم ایک وقت میں ایسے مکان گرمیوں میں اپنے رہنے کے کام بھی آتے تھے۔ کچے نیم مکانوں کے لیے چھپر یا پسار کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چھوٹے سے باورچی خانے کو رسوئی کا نام دیا جاتا ہے۔ مصنف نے ان مقامی لفظوں کے ذریعے ہی ان کی بودوباش کو بیان کیا ہے۔ اسی طرح اس خطے میں دوسرے دیہاتوں کی طرح مویشی پالنا لازمی جزو تصور کیا جاتا ہے۔ ان دیہاتی لوگوں کی آمدنی کا دارومدار بھی انہی پالتو جانوروں پہ ہوتا ہے ان کا خیال رکھنا گھر کی خواتین کی ذمہ داریوں میں بھی شامل ہوتا ہے۔ جو مردوں کے ساتھ ساتھ ان کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ ناصرہ کی ماں اسے کہتی ہے کہ :

"توذرا بھینس کے آگے پانی تور کھ آ۔۔۔بے چاری پیاسی ہے صبح سے"(51)

موسمی اثرات کا بھی ان علاقوں کی زندگیوں پہ اثر ہوتا ہے۔ پہاڑی علاقوں میں برف باری اور شدید ٹھنڈ ہوتی ہے جس میں کاروبارِ حیات مفلوج ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں مکانوں کی تعمیر اور شادی بیاہ کی تقریبات موسم کو ملحوظ خاطر رکھ کے کی جاتی ہیں وقت اور حالات سے متاثر ہوئے بغیر کوئی بھی نہیں رہ سکتا تاہم اس کے باوجود بھی ان چھوٹے ثقافتی گروہوں کی اپنی اصل پہچان کسی نہ کسی طور پہ باقی رہتی ہے۔ جدیدیت نے زندگی کو جدید کرنے کے ساتھ ساتھ ان مقامی ثقافتوں کو بھی بہت حد تک نقصان پہنچایا۔ یہاں کے لوگ بھی ان بڑی ثقافتوں کے گرویدہ ہو گئے اور سہولتوں کے مد نظر انہوں نے اپنی روایتی زندگی کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ ان سہولتوں نے جہاں انسان کی زندگیوں کو سہل بنایا اور وہیں ان مقامیوں کی زندگی کو اپنے اصل سے بھی توڑ کے رکھ دیا۔

"گزشتہ برس آنے والے زلزلے کے بعد نور آباد میں نئے مکانوں کی تعداد پرانوں سے زیادہ ہو گئی تھی۔ بیشتر مکان منہدم ہو گئے تھے۔ اب گاؤں میں کچے مکان نہ ہونے کے برابر تھے جبکہ پکے مکانوں کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سخت ٹھنڈے۔ ٹھنڈا علاقہ ہونے کے باوجود گرمیوں میں دن کے وقت پکے مکانوں میں بغیر پنکھے کے گزارا مشکل تھا۔ البتہ رات حسب معمول ٹھنڈی ہوتی، مگر سردیوں میں یہاں کے باسیوں کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ شام ہوتے ہی مکانوں میں الاؤ جلنا شروع ہو جاتے اور خاندان کے تمام افراد اس کے گرد چادریں اور کمبل لپیٹ کر بیٹھ جاتے۔"(52)

ناول میں مقامی زندگی کو ماضی اور حال کے تقابل میں بیان کیا ہے۔ مصنف نہ صرف اس خاص مقامی روایت کا نمائندہ ہے بلکہ وہ اس علاقے میں نئے دور کی آنے والی تبدیلیوں سے بھی واقف ہے۔ جدید زندگی، رہائش کے طریقوں اور قدیم طرز تعمیر کا موازنہ کرتا ہے۔ موسمی اثرات کسی بھی خاص ثقافت کے پروان چڑھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ موسم کے اثرات نہ صرف انسانی ساخت بلکہ ان کے رویوں پہ بھی کسی حد تک اثر انداز ضرور ہوتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے ان تمام عناصر کی کسی نہ کسی طرح وضاحت ضرور کی ہے۔

"یہ ناول (جاگے ہیں خواب میں) اپنے اسلوب میں سرزمین ہزارہ کی تاریخ، ثقافت، تہذیب ورثہ، تمدنی رنگ، حسن فطرت، حسن سیرت انسان کی سخاوت اور شقاوت کا بیان۔ مسجع کلام، بے لاگ تنقید، منظر نگاری، جذبات کی ترجمانی اور سبق آموز باتوں کی ایسی مثال رکھتا ہے جس نے اپنے عہد کے معاصر ناولوں میں ایک قابل قدر حیثیت عطا کر دی ہے۔"(53)

ان پہاڑی اور سرسبز علاقوں میں عموماً پھلوں اور فصلوں کے لیے بھی موسم زیادہ موزوں اور معتدل ہوتا ہے۔ مقامی لوگوں کے باغات اور گھروں کے صحنوں میں بھی پھلدار پودے لگے ہوتے ہیں جو نہ صرف ان کی غذائی ضروریات بلکہ ان بچوں کے لیے بھی ایک پر لطف مشغلہ اور خوراک ہوتی ہے۔ ناول نگار نے زمان خان کے بچپن کے ایسے ہی مناظر کو بیان کیا ہے۔ مقامی نوعیت کی یہ جزئیات نگاری اس پوری تہذیب و ثقافت کو قاری کی نظروں کے

سامنے متحرک کر دیتی ہے۔ مابعد جدید نقطہ نظر کا حامل یا ناول ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ جہاں اس ہزار وی ثقافت کے مختلف پہلوؤں اور عناصر کی وضاحت کثرت سے ملتی ہے۔

> "کھیتوں کے درمیان بنے راستے سے گزرتا؛ پگ ڈنڈیاں عبور کرتا جنگلی اناروں کے جنگل میں گھس گیا۔ جہاں اناروں کے پھول اب ڈوڈیوں کا روپ دھار رہے تھے۔ یہ پھل لگنے کی نشانی تھی۔ اسے یاد آیا کہ بچپن میں وہ بستی کے دوسرے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ جہاں اکثر آیا کرتا تھا، خاص کر خزاں کے ابتدائی دنوں میں جب انار پکنا شروع ہوتے۔ وہ پہلے ہر درخت سے ایک ایک انار توڑتے، اسے چکھتے اگر وہ کھٹا ہوتا تو اسے پھینک دیتے اور اگلے درخت کی طرف نکل جاتے۔ جس درخت کا پھل میٹھا ہوتا اس کے دوست بھاگ کر اس پر چڑھ جاتے لیکن اس نے کبھی ان کی پیروی نہیں کی۔ وہ نیچے کھڑے کھڑے زمین کی طرف جھکی شاخوں سے انار چونڈتا، دانتوں سے چکی لگا کر اسے گھائل کرتا پھر دونوں ہاتھوں سے اسے برابر حصوں میں تقسیم کر کے اس کے دانے چنتا اور مزے لے کر کھاتا۔"(54)

جاگے ہیں خواب میں اختر رضا سلیمی کا پہلا ناول ہے۔ ناول نگار نے جہاں ہزارہ کی مقامیت کا تفصیل سے بیان کیا ہے وہیں اس کے مختلف پہلوؤں کی بھی وضاحت کی ہے۔ ناول کا کینوس اگرچہ خاصا وسیع اور کئی دہائیوں بلکہ کئی صدیوں پہ محیط ہے۔ ناول نگار نے مختلف حصوں میں اس کی بود و باش کی بھی وضاحت کی ہے۔ زندگی کے مختلف رنگوں کو ناول نگار نے مقامی کرداروں کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔ مقامی فصلوں کا بیان ہو یا مکانوں کی طرز تعمیر اور طرز رہائش میں مختلف مقامی ثقافت کے پہلوؤں اور عناصر کی وضاحت مقامی کرداروں کے ذریعے سے کی گئی ہے جس سے قاری کے سامنے اس مقامیت کا نقشہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔

"جندر" اختر رضا سلیمی کا دوسرا ناول اور ہزارہ کی مقامیت کا تسلسل ہے۔ جنہوں نے مہابیانیوں کو توڑتے ہوئے اپنے مقامی بیانیے کی طرف انحراف کیا۔ ناول میں ہزارہ کی مقامیت کو انہوں نے ایک بار پھر موضوع بحث بنایا ہے۔ تاہم "جاگے ہیں خواب میں" کی طرح اس میں تاریخی ارتقاء بھی ہے۔ دو تین نسلوں تک محدود اس ناول کا قصہ دراصل ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ بھی ہے۔ ناول میں مقامیت اپنے پورے رنگوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ناول میں ہزارہ کی مقامیت کی بود و باش، رہن سہن اور رسم و رواج کا بیان بھی ہے۔ جن اوصاف کی بنا پر اس مقامیت کے لوگ آپس میں جڑے ہیں۔ مقامیت کے یہ عناصر ہی دراصل کسی بھی مقامیت کا وصف ہیں جو اس کی انفرادیت کو برقرار اور زندہ رکھتے ہیں۔

ناول میں مقامیت کا مخصوص طرز رہائش رہن سہن بود و باش کا تذکرہ بھی تفصیلاً ملتا ہے۔ دراصل ولی خان کی مرکزیت کے گرد ہی پوری ثقافت عروج و زوال کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ ولی خان محض جندروئی ہی نہیں بلکہ وہ اپنے زمانے کا پڑھا لکھا شخص ہے۔ جو ادب کا قاری بھی ہے۔ نامسائد حالات کے باعث وہ اپنے ذوق کی تسکین ضرور کرتا

ہے۔اس مقامیت کے ساتھ اس کی جڑت دراصل اس مقامیت کاارتقاء کا باعث بنتی ہے۔ وہ ایسے کرداروں کے برعکس جو محض اپنے علاقے سے کوچ کا خیال دل میں لیے تعلیم حاصل کرتے ہیں، سے یکسر مختلف ہے۔ ناول میں مقامی رہن ،سہن، رسم ورواج، کھیل تماشے ہر سو دکھائی دیتے ہیں۔ مقامیت کی بود و باش کو بھی مصنف نے گہرے مشاہدے کے ساتھ بیان کیا ہے۔یوں گمان ہوتا ہے کہ ناول نگار خود بھی ساتھ ساتھ اس ثقافت کا شاہد بھی ہے اور نوحہ خواں بھی۔ مقامی زندگی کی ہر ایک رنگ ہر عمر کی ترجمانی ملتی ہے جو لوگ اس طرح کے تجربات سے ماضی میں گزر چکے ہیں اپنی مقامیت اس ناول کے بیان سے پھر سے اپنے اذہان میں زندہ کر لیتے ہیں۔ ولی خان اپنے بچپن کے دن یاد کرتے ہوئے اس پوری مقامیت کا نقشہ کھینچ دیتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اپنے ماضی کے بیان میں اس مقامیت کے رہن سہن کو مختلف یاداشتوں کے ذریعے زندہ کرتا ہے۔

> "میں صبح سویرے اٹھتا، جندر کے پچھواڑے جا کر کٹھے میں ہاتھ منہ دھوتا واپس آ کر ناشتہ کرتا اور سکول چلا جاتا واپس آتا تو میرا باپ کھانا تیار کر رہا ہوتا۔ میری یاداشت میں کوئی بھی دن ایسا دن محفوظ نہیں جس میں اس نے میری واپسی سے پہلے کھانا کھایا ہو۔ ہمیشہ اکٹھے کھانا کھاتے۔ میں کھانا کھا کر ،ندی کے کنارے گھروندوں سے کھیلتا رہتا یا پھر جندر کے صحن میں موجود کاہو کے ڈالے سے بندھی پینگ میں ہلارے لیتا رہتا۔"(55)

سلیمی نے نہ صرف اس علاقے کی بود و باش کو بیان کیا ہے بلکہ مقامی سطح کے معمولات کھیل تماشوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ دیہاتوں خصوصاً مضافات میں لوگوں کے رہن سہن، قدرتی ماحول کا بیان ملتا ہے۔ یہ لوگ تازہ آب و ہوا کے عادی ہوتے ہیں، قدرتی چشموں سے پانی پینا، مقامی بچوں کا (پینگ) جھولے جھولنا مقامی ثقافت کا اہم رخ ہے۔ مقامی زندگی کے یہ تمام رنگ ناول میں موجود ہیں۔ قدرتی نعمتوں سے مالامال اس خطے میں زندگی سادہ اور پر سکون تھی
۔

ہزارہ کی مقامیت کے بیان میں موسمی حالات و رہن سہن کا تذکرہ بھی ہے۔ ان پہاڑی علاقوں ، سرسبز وادیوں میں موسم کی شدت بھی قدرے زیادہ ہوتی ہے۔ سردیوں میں برفباری اور تند ہوا ان علاقوں کا معمول ہوا کرتی ہے۔ سادہ مکانوں میں یہ لوگ موسم کی شدت کا مقابلہ کرتے ہیں۔ موسم کی شدت میں ان گھروں میں چھپے بیٹھے لوگ ایک ایسی تہذیب کے نمائندے بھی ہیں جن کی سماجی زندگی آپس میں گہری جڑی ہوئی ہے۔ وہ ان تند ہواؤں کا مقابلہ کر کے بھی اس مقامی ثقافت کی آبیاری کرتے ہیں۔ سادہ مقامی طرزِ تعمیر اور رہائش بھی ناول کی احاطہ تحریر میں آتے ہیں۔

> "ان دنوں دروازوں کے صرف باہر کی جانب کنڈیاں یا آگلیں وغیرہ ہوا کرتی تھیں اندر کی جانب کنڈیاں لگانے کا رواج نہیں تھا بلکہ دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے لکڑی کا بالا مضبوطی سے ٹکا دیا جاتا تھا۔ اس کا اضافی فائدہ یہ بھی

تھا کہ دروازے کی درزیں مکمل طور پر بند ہو گئی تھیں اور جسموں کو چھیدنے والی سرد ہوا جو پہلے درزوں سے اندر آ رہی تھی مکمل طور پر رک گئی تھی۔(56)

ناول میں ایسے بیانات سے اس علاقے کے مقامی بود و باش کا اندازہ ہو سکتا ہے اور ان علاقوں کے رہنے والے لوگوں کی زندگیوں کی تکالیف کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ مقامیت کا دار و مدار مقامی درختوں، ان کی زندگیوں میں اہمیت جابجا دکھائی دیتی ہے۔ ہزارہ کی ان وادیوں میں طرزِ تعمیر بھی مخصوص انداز میں ملتا ہے۔ ان گھروں کی بناوٹ جہاں موسمی حالات کو مد نظر رکھ کر بنائی جاتی ہے وہیں ان مقامیت کا رنگ بھی مخصوص دکھائی دیتا ہے۔ لکڑی کی فراوانی ہوتی ہے اس لکڑی کا استعمال گھروں کی تعمیر میں بہت حد تک شامل ہوتا ہے۔ مقامی سطح پہ موجود ماہر ان درختوں کی لکڑیوں کو تراش کے ان کو خوبصورت نمونوں میں ڈھالتے ہیں۔ درختوں کی مقامی اقسام جو مقامیت کا اہم حوالہ اور پہچان ہیں۔ گھروں کی تعمیر میں بھی اس مقامی لکڑی کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ لکڑی کی باآسانی دستیابی کے ساتھ ساتھ پہاڑی علاقوں میں زمین کی ناہمواری سمیت جغرافیائی اور ثقافتی پہلو کارفرما ہوتے ہیں۔

"میں نے گاؤں میں موجود اپنا آبائی گھر جو میری ماں کے مرنے کے بعد سے بند پڑا تھا۔ جس کی کڑیوں بالوں اور بلیوں کو دیمک کھا چکی تھی نئے سرے سے تعمیر کرایا"(57)

مقامیت کا ایک خاص وصف ان لوگوں کی آپس میں جڑت تھی۔ وہ سماجی طور پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان خلوص کا رشتہ ہو یا ایک دوسرے پہ انحصار کا لوگوں کو آپس میں جوڑ رکھا تھا۔ مکان کی تعمیر ہو یا زندگی موت کا مسئلہ وہ سب ایک مخصوص نظام کے تحت ایک اخلاقی رشتے میں جڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں سماجی نظام متحرک اور مضبوط تھا۔ پیسے کی کمی کی تنگی اپنی جگہ لیکن باہمی ہمدردی اور تعلقات میں مضبوطی تھی۔ اسی وجہ سے وہ ایک دوسرے پہ انحصار کرتے تھے مکانوں کی تعمیر کے حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"ان دنوں گھروں کی تعمیر میں بھی لوگ رضاکارانہ طور پر حصہ لیتے۔ جب کوئی شخص نیا مکان بنانے کا منصوبہ بناتا گاؤں کے بیشتر لوگ اس میں بلا معاوضہ ہاتھ بٹانے آتے تھے۔ دیواروں کی چنائی کرنے والے مستری کے علاوہ کسی کو معاوضہ دینے کا رواج نہیں تھا چونکہ اس علاقے میں ہر سال سردیوں میں برف پڑتی ہے اس لیے یہاں بنائے گئے مکانوں کی چھتوں پر ٹنوں کے حساب سے مٹی ڈالی جاتی تھی تاکہ چھت ٹپکنے سے محفوظ رہے۔"(58)

سماجی بندھن کے ساتھ ساتھ مکانوں کی مخصوص تعمیر کا بھی ناول نگار نے تذکرہ کیا ہے۔ ان کے رسوم و رواج اور سماجی بندھن کی بھی وضاحت ملتی ہے۔ جندر میں ہزارہ کی مقامت اور بود و باش کے تناظر کو بھی وسیع مشاہدے سے بیان کیا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار نہ صرف اس مقامیت کا نمائندہ ہے بلکہ وہ ماضی و حال میں قاری کو اس مقامیت کی روایت اس کی تاریخ سے بھی روشناس کراتا ہے۔ عالمگیریت کے اثرات کے باوجود جہاں طرز تعمیر بھی یکساں ہوتا جا رہا ہے۔ شہروں اور دیہاتوں میں فن تعمیر یکساں ہونے لگے ہیں اس کے باوجود" جندر" میں مقامی

بودوباش کو وضاحت سے بیان کر کے اس مقامیت کی بازیافت کی گئی ہے۔ مقامیت اپنے تمام رنگوں کے ساتھ موجود ہے۔اس مقامیت کا رہن سہن بودوباش اور مقامی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کی ناول نگار نے منظر نگاری کے ذریعے بھرپور وضاحت بیان کی ہے۔

بہاولپور ایک خود مختار ریاست کی حیثیت سے قیام پاکستان تک موجود تھی۔ریاست کا نواب اس کا سربراہ تھا اور داخلی معاملات میں اس خطے کا مخصوص بودوباش، رہن سہن کا ایک اپنا روایتی نظام تھا۔لوگ مقامی بولی سمیت ہر مقامی عنصر کو اپنائے ہوئے تھے۔ریاست کا اپنا مخصوص لباس، فن تعمیر، معاشی نظام تھا۔بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایک مکمل ثقافتی نظام تھا جو اس کی مقامیت کو انفرادی پہچان دیتا تھا۔ایک مکمل ریاستی نظام کے تحت یہ لوگ زندگی گزار رہے تھے۔ بہاولپور کی ثقافت کے بیان میں ناول نگار نے یہاں کی مقامیت کے مختلف خدوخال کو مقامی کرداروں کے ذریعے سے واضح کیا ہے۔ ثقافتی بحران کا شکار بہاولپور کے مقامی ریاست کی بازیافت کرنا ہی ناول نگار کا مطمعِ نظر ہے۔ناول نگار نے مختلف ثقافتی عناصر کی بھرپور وضاحت کی ہے جس سے بہاولپور کی مقامی معاشرت بہت حد تک واضح ہو جاتی ہے۔ بہاولپور کی مقامی زندگی اپنی مخصوص بودوباش سے نمایاں ہوتی ہے۔ ناول کے کردار مقامیت کے ترجمان ہیں۔وادھو، دچھر، حکیم رام لال، تلسی، مہراں مقامی کردار ہیں جن کے بیان میں مقامیت کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے۔ان مقامی کرداروں کے نام ہی مقامیت سے تعلق رکھتے ہیں۔یہ ناول کے مرکزی کردار مقامیت کو بیان کرتے ہیں اور اس کے رہن سہن کو واضح کرتے ہیں۔ناول نگار نے کرداروں کی تخلیق بہت فنکارانہ انداز میں کی ہے کہ پورا ثقافتی ماحول متحرک دکھائی دیتا ہے۔ ان کرداروں کا تعلق زیادہ تر متوسط اور نچلے گھرانوں سے ہے۔یہ کردار جہاں ہمدردی کے لائق ہوتے ہیں وہیں ان کرداروں میں مقامی ثقافتی عناصر کا لحاظ و پاس اور قدر بھی دوسرے کرداروں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔وہ ہر صورت اپنی مقامی روایت کے امین ہوتے ہیں جو اس کے تسلسل کو جاری و ساری رکھتے ہیں۔رہن سہن کے طریقے ہوں یا کھانے، لباس کے ان کرداروں کے ذریعے سے بہاولپور کی مقامیت کی وضاحت مختلف موقعوں پہ ملتی ہے۔

> "فیاض نے چوکی گھسیٹی اور چولہے کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا اور اماں چولہے پر توا رکھ کر پھلکا سے کہنے لگی باجی والی کٹوری کو ادھ بجھے انگارے سے لال کرنے کے بعد ان کے اوپر دھر دیا۔اماں روٹی کھلانے لگی ہو تو میں ابا کو حقا تازہ کر کے نہیں دے سکوں گا۔"(59)

ناول نگار نے تمام ماحول کی عکاسی جزئیات نگاری سے کی ہے۔عام افراد کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا ہو یا مجموعی طور پہ شہر کی آبادی کا رہن سہن اور کاروبار زندگی ناول میں تمام کی تفصیل ملتی ہے۔ناول نگار نے جزئیات نگاری سے پورے ماحول کی عکاسی کی ہے۔مقامی کرداروں نے مقامی ماحول کو نمایاں کیا ہے۔یہ مقامی کردار اپنے روایتی طور طریقوں کے ذریعے سے زندہ ہیں اور وہی طریقے اپنائے ہوئے ہیں۔ناول نگار نے بہت سے موقعوں پہ ان کے یہ روایتی طور

طریقے بھی دکھائے ہیں۔ ناول کے ان کرداروں میں نہ تو بوسیدگی ہے اور نہ ہی زیادہ قدامت پسندانہ رویہ بلکہ یہ جدید دنیا سے ہم آہنگ بھی ہیں اور اپنے قدیم اور روایتی طریقوں پہ قائم بھی ہیں۔ وسیم شاہد اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

"ناول نگار کو منظر نگاری اور کردار سازی پر کمال حاصل ہے انھوں نے ریاست بہاولپور میں سڑک کنارے لگے لکڑی کے کھموں پر چلتی لالٹینوں سے محل کی عمارت تک جزئیات نگاری کو بڑی خوبصورتی سے تراشا ہے۔"(60)

دوسرے دیہاتوں کی طرح بہاولپور میں بھی گرمیوں کے دنوں میں لوگ صحنوں اور کھلی جگہوں پہ چارپائیاں بچھا کر سوتے ہیں۔ گرم علاقہ ہونے کے باعث گرمیوں میں لوگ کھلی فضا میں سانس لینے میں عافیت خیال کرتے ہیں ۔ متوسط طبقہ اس عہد میں ایسی ہی سادہ زندگی گزارتا تھا جب سہولیتں اور آسائشیں بھی محدود تھیں۔ گھر میں مائیں چولہے کے پاس بیٹھی روٹی پکاتیں جہاں ارد گرد ہی گھر کے دوسرے افراد چوکڑیوں پہ یا موڑوں پہ بیٹھ کے کھانا کھاتے ہیں۔ کھیس مقامی اوڑھنی جو تھوڑی سردیوں میں جسم کو ڈھانپنے رات کو اوڑھ کر سونے اور دن کو بھی کچھ لوگ چادر کی جگہ پہ اوڑھ لیتے ہیں۔ ناول نگار نے کمال مہارت سے ان مقامی کرداروں کے اٹھنے بیٹھنے کی منظر کشی کی ہے۔ ان کرداروں کے اٹھنے بیٹھنے ، بول چال ، رہن سہن اور لباس سے مقامیت جھلکتی نظر آتی ہے۔ ناول کے یہ کردار اس مقامیت کے امین بھی ہیں اور ساتھ ساتھ ناول میں اس مقامیت کے گمشدگی کا اس شناخت کے گم ہونے کا نوحہ بھی ناول نگار نے پڑا ہے۔ اشیاء کے نام بھی ناول نگار نے عموماً مقامی زبان میں ہی لئے ہیں۔

"نو تعمیر شدہ سہالہ اور سانجے کے درخت کے درمیان کھلی جگہ پر بچھے ہوئے ماچے پر جا گرا جہاں اس کی اماں نے تکیہ اور کھیس پہلے ہی رکھ چھوڑا تھا۔"(61)

ناول میں مقامی کھانوں اور ٹوٹکوں کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ مقامی عورتیں ناول میں ان کے بیان سے ناول میں اس پہلو کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ مقامی عورتوں کے بیان میں ناول نگار کی باریک بینی سے ان کھانوں کا بھی تذکرہ ملتا ہے کہ کرداروں کے بیان میں دیسی کھانے کا ذکر ہے۔ مہراں کی ساس اسے اولاد پیدا کرنے کے جتن کرتے ہوئے مختلف خوراکوں کے ذریعے تندرست کرنا چاہتی ہے۔ ان کرداروں کے بیان میں جہاں مقامی عورتوں کے خیالات وجذبات کے عکاسی ہوتی ہے۔ ان کی قدامت پسندی، ان کے ضعیف اعتقادیاں اور توہمات پرستیوں کا پتہ ملتا ہے وہیں ان کے رسم ورواج ان کے کھانوں ٹوٹکوں کا بھی تذکرہ ہو جاتا ہے۔ یہ مقامی عورتیں جن کی بساط محض گاؤں کے حکیم سے زیادہ دور تک کی نہیں ہے۔ جو شہر سے دور ہیں وہ کبھی شہر نہیں گئی۔ وہ تو حکیم تک بھی بہ مشکل رسائی حاصل کر پاتی ہیں۔ شہروں میں بھی اس عہد میں روایت پسندی کا پہلو نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے روایتی ٹونے ٹوٹکوں سے وہ بڑی سے بڑی بیماریوں کا علاج کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور اپنے مسئلوں کو حل کرنے کی متلاشی ہیں۔ ان کے ان ٹونوں ٹوٹکوں خوراکوں پر پہلو میں مقامیت کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔

"پنساری سے چھوہارے منگوا کر روزان کو گرم چولہے کی راکھ میں دبا کر بھوننے کے بعد تتے تتے مہراں کو کھلائے جانے لگے۔ صبح سویرے خالی پیٹ رس کٹ گڑ کو دیسی گھی میں تڑکا کر اس کی دھواں نکالتی پُر اور سورج غروب ہونے سے پہلے کر کناک مرغی کے انڈوں کا حلوہ چٹایا جاتا کہ اس طرح اس کے اندر کی سوئی ہوئی عورت کو جگایا جاسکے۔"(62)

ناول میں جہاں متوسط اور غریب گھرانوں کے گھر کا احوال اور نقشہ ملتا ہے وہی حکیم رال جیسے امیر ادمی کے گھر کے بیان میں فن تعمیر کا بیان بھی دکھائی دیتا ہے۔ ناول نگار نے اس گھر کے بیان میں مقامی فنِ تعمیر کی بھی عکاسی کی ہے۔ جو اس خاص جغرافیائی اور موسم کے حامل اس خطے کا خاصا ہے۔ ناول میں حکیم کا کردار امیر طبقے کے کردار کے طور پہ موجود ہے۔ تاہم ہندوؤں کے اکثر طبقے کاروباری لحاظ سے مسلمانوں سے زیادہ خوشحال تھے۔ اس عہد میں ان کے ہاں پکے کئی منزلہ مکان موجود تھے۔ حکیم رام لال کا طب خوب چلتا اور کمائی خوب ہوتی جو اس کے دوسرے مذہب کے دکانداروں کے لیے حسد و رشک کا باعث بھی تھی۔ امیر طبقے کے مکانات کی پر آسائش زندگی اور ان کے فن تعمیر کو ناول نے اس کے ضمن میں اجاگر کیا ہے۔ یہاں ہمیں اس جغرافیائی خطے کے ان خدو خال کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

"حکیم رام لال کا گھر احمد پور کے ہاتھی بازار والی گلی میں تھا۔ جو مڑھی کی طرف جاتی تھی۔ دو منزلہ مکان اور چھ کمرے کا چھوٹا سادالان اور دالان کے سامنے پوچالگائی چھوٹی سی رسوئی کہ جہاں نیلے، ہرے اور سرخ رنگوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکے لگے ہوئے تھے جن میں کچھ ٹکے دھوپ سندور کے بھی تھے برکت، بخت اور بہتری کے لیے۔۔۔"(63)

حکیم رام لال کئی دکانداروں اور کاروبار افراد کی نسبت زیادہ مالدار آدمی تھا۔ اس کے گھر کا موازنہ عام لوگوں سے کیا جائے تو اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ امیر ہو یا غریب دونوں طرز کے مکانوں میں مخصوص مقامی ثقافت کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ مکانوں میں اگرچہ حیثیت اور مذہب کے لحاظ سے کچھ تخصیص ضرور ہے لیکن اس کے باوجود تمام کی ثقافتی پہچان نمایاں ہے۔ بڑے طبقے کے ہندوؤں کے لحاظ سے آسودہ حال تھے۔ اس لیے ان کے مکانات باقی مکانوں کی نسبت پر آسائش تھے۔ متوسط طبقہ ہو یا امیر طبقہ دونوں کے طرز تعمیر میں مقامی ثقافت کے رنگ نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس خاص فن تعمیر میں مقامی ثقافتی عناصر کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ بہاولپور میں ہندوؤں کے مکانات کے بارے میں بہاولپور گزٹئیر میں ان الفاظ میں اس کی وضاحت ملتی ہے۔

"کراڑ طبقہ عموماً کئی منزلہ پکے مکانات میں رہتا ہے لیکن کمرے زیادہ ترنیچی چھت والے تنگ اور ہوا کے ناقص انتظام والے ہوتے ہیں۔"(64)

مقامی مسلمانوں کی معاشی حالت زیادہ تر بہتر نہ تھی۔ پھر بھی وہ لوگ مطمئن تھے۔ان کے اندر خدا کا احساس اور وہ کسی کمتری کے احساس کے بغیر اپنی زندگی مطمئن طریقے سے گزار رہے تھے۔ مقامیت کے رہن سہن کے طور طریقوں میں مقامی ثقافتی پہلو بھی دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ اپنے وسائل کے مطابق مکان بناتے تاہم کسی مذہبی طبقے یا گروہ کی تخصیص اس حوالے سے نہ تھی۔ مسلمانوں کے مکانات ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ پر آسائش نہ تھے۔اس کے باوجود دونوں مذاہب میں کوئی نفرت کارفرمانہ تھی۔ تمام لوگ ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کرتے ہیں ۔ مسلمانوں کے مکانوں کے بارے میں بہاولپور کے گزٹیئر میں ان الفاظ میں نقشہ ملتا ہے:

"خوش حال مسلمانوں کے مکانات بھی عموماً کچے ہیں۔ شاذ ہی پکا مکان ملتا ہے۔ نسبتاً بہتر طبقات کے مکانات کی عموماً ایک ڈیوڑھی یا داخلے کا کمرہ ہوتا۔ جو راہداری میں کھلتا ہے اور صحن تک براہ راست رسائی میں حائل ہوتا ہے تاکہ خانگی رازداری قائم رہے۔"(65)

لباس کی بات کی جائے تو مقامی عورتوں اور مردوں کا مخصوص مقامی لباس تھا۔ مسلمان عورتوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں میں بھی پردے کا انتظام ملحوظ خاطر رکھا جاتا تھا۔ گویا پردے کے حوالے سے مذہب سے زیادہ ثقافتی رنگ نمایاں تھا۔ پردے کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ جوان عورتیں برقع پہن کر باہر نکلتیں۔ حکیم رام لال کے مطلب میں بھی پردے کا خاص انتظام موجود تھا۔ جہاں خواتین باپردہ جاتیں۔ پردے کا انتظام مقامی ثقافت کا ایک اہم حصہ ہے اور مردوں کا آزادانہ گفتگو، میل جول معیوب سمجھا جاتا ہے۔اس کی آڑ میں خواہ مہراں ہو یا حکیم لال کی بیٹی تلسی دونوں کو مقامی ثقافت اپنے آپ کو چھپانے پہ آمادہ کرتی ہے۔

"تخت پوش پر براجمان حکیم کے ایک جانب مردوں کی قطار اور دوسری طرف خواتین کی اور ان کے درمیان کپڑے کا پردہ ٹنگا ہوا"(66)

ناول میں مقامی رہن سہن بود و باش اور خوراک کے مختلف بیانات سے مقامیت کا احوال ملتا ہے۔ادھ ادھورے لوگ بہاول پور کی مقامیت کا بیان ہے۔اس ناول میں ناول نگار نے ان عناصر کو بھی مقامی کرداروں کے ذریعے سے واضح کیا ہے کسی بھی علاقے کی خوراک پہ اس کے جغرافیائی حالات بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ رسم و رواج بھی مخصوص ہوتے ہیں اس حوالے سے اس مقامیت کا ایک قیمتی اور وسیع ورثہ ہے جس سے اس مقامیت کے ان پہلوؤں کی وضاحت ملتی ہے۔ بہاولپور کی مقامیت کی ذیل میں مقامی کردار اس عہد میں ایک مکمل ثقافتی اکائی کے طور پہ موجود ہیں جو اپنی انفرادیت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ناول نگار نے ان کی مقامیت کے اس عروج کے زمانے کو ناول کے ذریعے محفوظ کر دیا ہے۔

مقامیت کے بیان میں مقامی بستی آدم واہن کے لوگوں کا رہن سہن کچے مکان، سادہ خوراک اور لباس محض ایک بستی کا بیان نہیں بلکہ ناول نگار نے بہاول پور اور ملتان کے گردونواح کی مقامیت کو بیان کیا ہے۔ بستی آدم واہن

کے لوگ غریب اور تنگدستی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ان پہ حکومت کرنے والے لوگ ان کی فلاح و بہبود کی غرض سے ان پہ تسلط کو قائم کرتے ہوئے ان کے وسائل پہ قابض ہونے آتے ہیں۔ جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ دونوں نظاموں کا ایسا عہد ہے۔ جہاں مقامی جاگیرداروں نے ایک طرف عوام کا استحصال کر رکھا ہے تو دوسری طرف نو آباد کاروں نے بھی ان مقامی لوگوں کے حقوق کو سلب کرنے کا کوئی موقع گنوانا پاگل پن ہی سمجھا ہے۔ مقامیت کی ذیل میں ناول میں مقامی خوراک اور دیسی کھانوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ ان کے طرز زندگی سے ان لوگوں کے رہن سہن اور گھروں کی تعمیر کا بھی علم ہوتا ہے۔ معاشی خوشحالی تمام رسوم و رواج لباس اور خوراک اور دیسی کھانوں کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ جیسی کسی قوم کی معاشی حالت ہوتی ہے ان کی مقامی ثقافت بھی اس طور تبدیل اور متاثر ضرور ہوتی ہے۔ بستی آدم واہن دریا کنارے آباد ہے۔ یہاں کے لوگوں میں سے اکثر کا ذریعہ معاشروں مچھلی کا شکار بھی ہے۔ اگر پانی وافر مقدار میں ہو تو مچھلیاں بھی زیادہ ہوتیں۔ مقامی لوگوں کا پیشہ بھی، یہ مقامی لوگ اپنی مخصوص طرز معاشرت میں زندگی گزارے ہیں۔ ناول میں مقامی خوارک کا بھی بیان ہے۔

> "آگ دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی ان میں پھاوڑے سے پھاڑی گئی لکڑی کی تنومند چراٹھوں کو آگ دکھادی۔ خشک لکڑی جلی تو سردی ہوا ہوگئی۔ ایسے میں دریا کنارے کے باسیوں کے لیے مچھلی کے سواء کیا غذا ہو سکتی ہے۔ مگر ان کے لیے باجری کے ڈھوڈے اور اور سرسوں کا ساگ تڑکا کر لایا گیا تھا۔"(67)

ناول کا زمانی عرصہ انیسویں صدی کے آخری ربع کا ہے۔ ناول نگار نے اس عہد میں مقامی زندگی کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دریا کنارے آباد اس بستی کے باسیوں کی زندگی محدود معاشی مسائل کے ساتھ گزر رہی تھی۔ مقامی زندگی کے بیان میں جزئیات نگاری سے ناول نگار نے قاری کو اس عہد کے قریب کر دیا ہے۔ ان کے اندرونی معاملات، مقامی الفاظ اور مقامی رہن سہن کا اندازہ ہوتا ہے۔ اشیاء کے ناموں میں بھی مقامی چھاپ نمایاں ہے۔ ناول نگار نے مقامی الفاظ کے استعمال سے اس مقامی بیانیے کو مزید واضح کر دیا ہے۔ مقامی الفاظ نے ان کرداروں کو حقیقت کے قریب تر اور اس مقامیت کا اصل نمائندہ بنادیا ہے۔ مقامیت کے بیان کو ناول نگار نے اس طرح برت کے مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر کی نمائندگی ہے۔

> "سیدے نے کچھ نہ سمجھ سکنے کے انداز میں ماسی کی طرف دیکھا جو رسی سے لٹکے ہوئے چھکے سے دھلا ہوا گلاس نکال رہی تھی۔"(68)

مقامی بستی کے گرد گھومتی ناول کی کہانی اس پوری مقامیت کے مختلف ثقافتی عناصر کی وضاحت کرتی ہے۔ ناول میں لوگوں کی طرز رہائش کا بھی بیان ملتا ہے جو کسی بھی ثقافت اہم مظہر ہوتا ہے۔ مقامیت کا مخصوص طرز رہائش اور فن تعمیر بھی ہوتا ہے۔ اس کی تعمیر میں مقامی موسم اور جغرافیہ اور معاشی حالات کو بھی دخل ہوتا ہے۔ بہاولپور جغرافیائی لحاظ سے نسبتاً صحرائی اور گرم علاقہ ہے۔ یہاں بیان کردہ مقامی لوگوں کی معاشی حالت بھی زیادہ

اچھی نہیں ہے۔ مکانوں کی ساخت میں مقامی لکڑی اور مٹی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ سیدے کے بیان میں اس بستی کے مکانوں کا طرز رہائش کا ایک نمونہ ناول میں اس طرح سے بیان ہوا ہے:

"سہالہ کیا تھی، گرمی سردی سے محفوظ ایسی رہائش گاہ کہ جس کے اندرونی دیواریں چیکی مٹی سے اس طرح لیپ ہوئیں کہ آئینہ بن گئیں۔ چھت کے لیے بھی ٹاہلی کے بالے اور بالوں کے بیچ سجے سرکنڈے اِس طرح گندھے گئے کہ طوفانی بارشوں میں بھی پانی کے قطرے تک کو اندر ٹپکنے کا راستہ نہ ملے۔"(69)

مقامی رہن سہن میں معاشی اور جغرافیائی دونوں حالتوں کا بھی خاصا عمل دخل ہوتا ہے۔ آدم واہن کے باسیوں کی رہائش گاہیں تقریباً کچے یا نیم پختہ مکانوں پر مشتمل تھی۔ ان مکانوں کے باسی محدود وسائل کے ساتھ اپنی زندگیاں، اپنے مقامی روایتی رسم و رواج کے تحت گزار رہے تھے۔ مقامی لوگوں کے مکانوں اور رہن سہن کا ایک اور نمونہ ناول میں کچھ اس طرح بیان ہوا ہے:

"سیدا سیدھا اس کوٹھے میں گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس کوٹھے میں بان کے بنے ہوئے دو بڑے ماچے بچھے تھے جن کی سرہاندی کی طرف کپاس کے بھرے ہوئے سرہانے اور پاواندی کی طرف اونٹ کی اون اور سوتی دھاگے سے بنے ہوئے موٹے کھیس پھیلا کر بچھائے گئے تھے۔"(70)

انواسی میں آدم واہن کی بستی کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ ناول مقامیت کے ذیل میں ایک نمایاں تحریر ہے۔ ناول نگار نے ادھ ادھورے لوگ کی طرح اس ناول میں بھی مقامیت کے تسلسل کو برقرار رکھا ہے۔ ناول کا لوکیل بہاولپور کے گردونواح کا علاقہ ہے۔ سرائیکی وسیب کی نمائندگی جابجا ملتی ہے۔ ناول نگار نے مقامی بودوباش کو اس لوکیل کے ساتھ بول چال، مقامی لب و لہجہ اور ثقافتی مقامی ثقافت کے نمائندگی جابجا ملتی ہے۔ کچے مکانات یوں تو اس عہد میں ہر دیہات گاؤں میں موجود تھے۔ ان کی طرز تعمیر اور رہائش میں مقامی رنگ ان میں انفرادیت پیدا کرتا ہے۔ ناول نگار نے انہی مقامی رنگوں کی خوب وضاحت کی ہے۔ سنگری سیدا، مولوی جار اللہ مقامی کرداروں کے نمائندے ہیں۔ جن کی زندگیوں کے شب و روز میں مقامیت واضح ہوتی جاتی ہے۔

نیلی بار طاہرہ اقبال کا ناول جو وسطی پنجاب کے ایک علاقے کا بیان ہے۔ مقامیت کے تناظر میں یہ ناول کئی حوالوں سے اہم ہیں۔ عموماً ان پنجاب کی ذیل میں مختلف مقامیتوں کو بیان کر دیا جاتا ہے۔ پنجاب ایک وسیع و عریض علاقہ (صوبہ) ہے جہاں کئی ضمنی چھوٹی اور مقامی ثقافتیں موجود ہیں۔ طاہرہ اقبال نے اس ناول میں ایسے ہی ایک مخصوص علاقے کا بیان کیا ہے جو اپنے طور پر ایک مکمل سماجی نظام کا حامل ہے۔ ناول میں تین طبقوں کا بیان ملتا ہے۔ مقامی افراد جو رعایا کی صورت میں موجود ہیں اس کے علاوہ یہاں آباد ہونے والے مہاجروں کی آمد سے بھی مقامی ثقافت میں کچھ اہم اضافے ہوتے ہیں اور تیسرا حکمران طبقہ جو قدامت کے اصولوں پر کاربند ہے۔ ان اصولوں کے

تحت ہی ان کے اقتدار کو دوام ملتا ہے۔اس مقامیت کے تحفظ کے سب سے بڑے حامی جو ان قدیم قدروں کے فروغ سے ہی اپنے اقتدار کو طول دیتے ہیں۔

مقامی لوگوں کے بیان میں ناول نگار نے اس خطے کے سماجی نظام کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ معاشی نوعیت ہو یا بود و باش سب کی تفصیل ملتی ہے۔ نچلے طبقے کے ان افراد کا بھی تذکرہ ملتا ہے جو پکھی واس یا خانہ بدوش کہلاتے ہیں اور مقامی افراد جو مختلف نچلی ذاتوں کے نام سے منسوب ہیں جن کا منصب تبدیل ہونے کے لائق نہیں سمجھا جاتا۔ باہر کے قدیم کا طرز رہن سہن بھی قدامت پسند تھا۔ ناول نگار نے ان کے طرز رہائش کو بھی گہرے مشاہدے سے بیان کیا ہے۔اس مقامی طرز رہن سہن سے ان کی انفرادیت بھی جھلکتی ہے جو اس خطے کے ساتھ مخصوص ہے۔ مقامی لوگوں کے طرز رہائش کے ضمن میں ناول میں بیان ہے کہ :

> "جن کے لیے چار دیواری اور تخلیے کا کوئی تصور نہ تھا۔ جہاں مرد عورت کے ملاپ کے لیے جنگلی جھاڑیاں، خشک کھال اور اونچی فصلیں قدرتی پردہ گاہیں تھیں۔ سردیوں کی راتوں کو جھگیوں کے در میں سرکنڈوں کی سرکی اٹاری دی جاتی ، جس کی چھت کی ان کڑیوں میں گھر کا مختصر اسباب ٹھونسا ہوتا۔ بوریاں چرتے میل خوری چادریں ، کھیس، لحاف چھوٹی بڑی پوٹلیاں، لمبے لمبے جالوں اور چمگادڑوں کے گھونسلوں کے ہمراہ لٹکتی رہتیں۔ کلہاڑیاں اور درانتیاں بھی یہیں پھنسائی جاتی کوئی ٹوم چھلا ہوتا تو اس کی پوٹلی باندھ کر اناج کے کچے بھڑولوں میں دبا دی جاتی"(71)

ان مقامی لوگوں کی اس قدامت نے باہر سے آنے والوں کو بھی ان پہ حاکم بنا دیا۔ وہ اپنی حالات کو تبدیل نہ کر پاتے اور اسی قدامت کا شکار رہے جبکہ باہر سے آنے والے ان سے آگے نکل گئے۔ باہر کے قدیم باشندے سادہ طرز رہائش کے حامل تھے۔ان کی ضرورتیں محدود تھیں یا محدود کر دی گئیں۔ وہ اپنی قدیم حالت میں ہی خوش تھے۔اس لیے رہن سہن کے طریقے ہوں یا رسم و رواج وہ اسی قدامت کے قائل ہیں جبکہ بعد میں آنے والے بھی ان کے حاکم بن گئے اور وہ سدا کے غلام ہی رہے۔

> "ادھر پنڈی، چکوال، سیالکوٹ سے آباد کار اٹھائے۔ جو پہاڑوں جیسے قد آور اور چٹانوں سے مضبوط بدن والے تھے۔ان قراقلیوں، شلواروں اور اچکنوں والوں نے جنات کی طرح ٹبے ٹیلے ڈھا کر ہموار کھیت بنا دیئے۔ جن ٹیلوں پر ان جنگلات کی جھگیاں بہہ بھنیاں آباد تھیں۔ انھی کے گلوں میں غلامی کا سنگل ڈال کر انہی کی دھرتی پر ان ہی کی زمینوں پر انہیں مزرت میں جوت دیا گیا"(72)

ناول نگار نے مہاجروں کے طرز رہائش کو بیان کر کے ایک تقابلی فضا پیدا کر دی ہے۔ جس کا اصل مقصد ان کی تہذیب کے بیان سے زیادہ توجہ طلب امر یہ ہے کہ ان کے آنے سے مقامی لوگوں کے طرز زندگی میں کیا فرق پڑا ؟ کئی موقعوں پہ ناول میں دیکھا جا سکتا ہے کہ مہاجروں نے ان مقامی لوگوں میں جذبہ حریت سماج سے بغاوت اور اپنے

حق کے لیے کھڑا ہونے کی اگر تھوڑی بہت ہمت پیدا بھی کی ہے تو وہ جلد ہی ختم ہو گئی۔اس میں ان کی کوشش سے زیادہ ان کے عقائد کا دخل ہے جو موروثی طور پر ان میں راسخ ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی حالت کو تبدیل کرنے کو ایک گناہ یا بدعت تصور کر سکتے ہیں۔وہ تو مذہب سے بھی عاری ہیں ان کی تعلیمات ان کے سیاسی تصورات بھی ان سے کوسوں دور ہیں۔ ان کی اس جہالت کا مقصد ہی ان کے گلے میں غلامی کے طوق کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا ہے۔ وہ مذہبی معاملات سمیت دوسری زندگی کے معاملات کو ملاحظہ کرتے جو یہاں آنے والے اپنی زندگیوں میں برت رہے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی زندگیوں میں زیادہ فرق نہ پڑا۔اس وجہ سے بعد میں آنے والے ان سے ہر معاملے میں آگے نکل گئے۔ مصنفہ نے ان مہاجرین کے طرز رہائش کے بارے میں تفصیل سے بیان ناول میں بیان کیا ہے۔

"یہ چار دیواری, کھڑکیوں, دروازے اور بیٹھک والے گھر بنانے لگے۔ان کی عورتیں صفائی ستھرائی سجاوٹ سینہ پرونا کھانا پکانا جانتی تھیں۔کچے کوٹھوں کی لپائی میں ماہرانہ بیل بوٹے تراشتی اور لال نیلا رنگ ملا کر ٹھیکے سیڈول نقش و نگار بناتیں۔چکنی مٹی میں نیل ملا کر چولہا چوکا پوتتیں، کنگرے دار اوٹے، بھڑولے اور گھر کی چار دیواری اپنے ہاتھوں سے اسارتیں۔عورتیں رمضان کے روزے رکھتی ہیں اور بوڑھے مرد مسجد میں نماز پڑھتے جن کی اٹھک بیٹھک پر بار کے قدیمی وسینگ گھٹے گٹھے قہقے پگڑیوں میں انڈیلتے "(73)

ان مہاجروں نے ہی مقامی لوگوں کے ساتھ ہونے والے استحصال کے خلاف ان میں کسی قدر جرات پیدا کر دینے کی سعی کی لیکن وہ اس سے زیادہ تبدیلی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ان کا رہن سہن سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی سوچ بھی سادہ تھی۔ ان کی کل دنیا ان کا ذیلدار ان کا سربراہ جاگیر دار تھا۔ان کا ہیر وان کا مالک ان کی ہر چیز اس سے شروع ہو کر اس پہ ہی ختم ہوتی۔ان کا رہن سہن اس قدر سادہ تھا کہ جو ہوتا بھی تو کہیں شادی بیاہ کے موقعے پہ پہنا جاتا۔لباس پھٹ جاتا تو کئی کئی پیوند لگائے جاتے۔اچھا کھانا محض زمینداروں کے گھر پہ جشن، شادی بیاہ کے موقعوں پہ ہی ملتا۔یہ مقامی لوگ اپنی مقامی روایت کو کسی طور پر بھی فراموش کرنے کو تیار نہ تھے۔

"طاہرہ اقبال نے اس ناول میں سماج کی محض خارجی سطح کو ہی بیان نہیں کیا بلکہ اس کی روح میں اترنے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے نیلی بار کے سماج کا تجزیہ کرتے ہوئے مقامی لوگوں اور مہاجروں کے رہن سہن کے فرق کو واضح کیا ہے "(74)

ناول میں مقامی کھانوں اور ان کے کھانے کا انداز بھی ملتا ہے۔ یہاں مقامی لوگ اگرچہ معاشی بدحالی کا شکار تھے لیکن اس کے باوجود اتنے بھی تنگ حال نہ تھے کہ وہ دو وقت کی روٹی کو بھی محتاج ہوں۔ پنجاب کے دوسرے دیہاتوں کی طرح یہاں بھی وہی خوراک کے استعمال ہوتی تھیں جو دوسرے دیہاتوں کا خاصہ تھیں۔مائیں اپنے بیٹوں کو زیادہ لاڈ پیار سے وہ سب کچھ دیتی جو ان کے پاس میسر ہوتا۔بیٹوں کی نسبت اسے زیادہ آسائشیں دی جاتی۔ان کی بوڑھی ہڈیوں کا سہارا بنے گا؛ایک مقامی ماں کے جذبات کے عکاسی ناول میں اس طرح سے ملتی ہے۔

"جو ہر صبح سویرے گیہوں کی موٹی موٹی روٹیوں کے بیچ مکھن کا پیڑا رکھ کر چھوڑ تیں۔ جو روٹیوں کی حرارت سے پگھلتا سوندی خوشبو چھوڑتے یہ تنوری پراٹھے ان کے سامنے رکھ چولہے کے انگاروں پہ کڑکتے گھی کی رکابی میں کوٹے ہوئے گڑھ کی رکابی بھیلی ملاتیں اور اوڑھنی کے پلو سے تام چینی کی بھری پلیٹ چھابی میں رکھ دیتیں۔ لسی کے کجی میں میں نمک کی ڈلی دال ہاتھ سے اسے کھورتیں اور سورج ڈھلے بھینس پچھلا تھن چھوڑ آتی ہے اور آنکھ کے اشارے سے کہتی جادھاریں لے۔"(75)

ناول میں بار کے علاقے کے مقامی لوگوں کے رہن سہن کا بیان ناول کا آغاز میں بڑی صراحت سے ملتا ہے۔ ان مقامی لوگوں کے عقائد و نظریات کی طرح ان کا رہن سہن بھی سادہ ہے۔ جاگیرداروں کے جانوروں کے رہنے والے کمروں اور ان کے گھروں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ جو اس قدر تہذیب یافتہ نہیں ہے کہ ان کی زندگی گھر کی چار دیواری کے سکون سے آشنا ہو سکے۔ مہاجروں نے ان کو ایسے گھروں سے متعارف کرایا جن کا تصور بھی ان کے ،وجود نہ تھا۔ ان کی خوراک بھی اس مٹی کی پیداوار گندم ہے۔ مقامی فصلیں ہیں جن کی نگہداشت جن کی ذمہ داری لیکن اس کے مالک ان کے جاگیردار ہیں۔ لباس کے تناظر میں یہاں کی مقامی روایت کے مطابق عورتیں بھی لونگی باندھتی تھیں۔ شلوار کا رواج مہاجر اپنے ساتھ لائے۔ مرد و زن لونگی (تہ بند) باندھتے تھے۔ ستر کو ڈھانپنے کے لیے ایسے بوسیدہ لباس جو کئی پیوند لگے ہوتے ہیں۔ سردیوں میں مردوں زنگ کھڈی کے بنے مقامی نوعیت کے کھیس اور اوڑھتے تھے۔ جن کو رات کے وقت سردی میں اوپر کر کے سو جاتے۔ سادہ طرز رہائش لباس اس مقامیت کو واضح کرتا ہے۔

گراں میں پوٹھوہاری مقامیت کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول خطہ پوٹھوہار کی تہذیب کا بیان ہے۔ اس مقامیت کے ماضی و حال کے سفر تک مصنفہ نے مقامیت کو جزئیات نگاری سے یوں بیان کیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے پورا نقشہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ خطہ پوٹھوہار نیم پہاڑی اور میدانی علاقوں کا مجموعہ ہے۔ اس مقامیت میں لوگ اپنی مخصوص روایات کے ساتھ صدیوں سے آباد ہیں۔ ان کے درمیان مضبوط روایتی نظام ہے جس کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ خطہ پوٹھوہار میں موسم اور مخصوص آب وہوا ہے۔ سردیوں کی شدت عموماً میدانی علاقوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس خطے کی آب وہوا کی وجہ سے فصلیں بھی روایتی ہیں۔ مقامی سطح پہ بارشوں پہ انحصار کیا جاتا ہے۔ بارانی علاقوں کی یہ زمینیں اس قابل ضرور ہیں کہ اپنے باسیوں کا پیٹ پال سکیں۔ مکانوں کی تعمیر، رہن سہن، خوراک کا اپنا مقامی رنگ ہے۔ ناول کے آغاز میں اس مقامیت کے ان پہلوؤں کو بطور خاص دیکھا جا سکتا ہے۔

"گراں تہذیبی و ثقافتی عناصر کا مرکب ہے۔ تمام پہلوؤں کا احاطہ بڑی مہارت سے کیا گیا ہے۔ جغرافیائی عوامل، زبان، کھانے، رسومات، گیت، فصلیں، پیشے، خوشی و غم، مذہب عادات واتوار اور رہن سہن کے سارے انداز کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔"(76)

مقامیت کے اس محدود دائرے میں رہتے ہوئے ان لوگوں کا مخصوص طرز خوراک اور رہائش ہے۔ جو اپنے سماجی ماحول کے نمائندے اور ترجمان ہیں۔ ان لوگوں بالخصوص خواتین کا باہر کے علاقوں سے زیادہ سماجی میل جول نہیں ہے۔ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ کھیتی باڑی، مال مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ دن بھر کے کام کاج کے ساتھ گریلو معاملات دیکھنا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

> "تائی بختو نے بھوسا ملا کر پورے پچاس عدد یخ ٹھنڈے گوبر کے اُپلے تھاپے تھے۔ گوبر میں برف کا کانچ پھر گیا تھا جس کی بلیڈ سے سخت ہتھیلیوں میں چھد لگاتی تھی۔۔۔ نو، دس برس کی زینب نے مرغیوں کا ڈربہ کھول دیا کڑ کڑ کڑاں پھڑ پھڑاتی ہوئی مرغیاں زینب کے سر پر اڈاریاں مارنے لگیں۔ نو عمر یوسف نے بکریوں کے کوٹھے کی سر کی (سرکنڈوں کی بنی کھڑکی) ہٹا دی۔ پورے گراں کا ریوڑ بھلائیاں چونڈنے، پگڈنڈیاں چڑھتے اترتے چوٹیوں نشیبوں پر بکھر گیا۔" (77)

اس پوٹھوہاری مقامیت میں گھر کے بچے اور عورتیں بھی مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ ایسی عورتیں جن کے مرد سلسلہ روزگار کی غرض سے باہر ہوتے ہیں ان کی زندگی زیادہ مشکل ہو جاتی ہیں۔ ان کی ذمہ داریاں زیادہ ہو جاتی ہیں۔ کوئی جانوروں کو چارہ ڈال رہی ہے تو کوئی فصلوں میں کام کاج کر رہی ہے۔ یہ عورتیں مردوں کے باہر جا کر کمانے کے بعد پر سکون نہیں ہو جاتی بلکہ ان کی کمائی کو محفوظ رکھنے کے لئے ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے مویشی پالتی اور فصلیں اگاتی ہیں۔ پوٹھوہاری ثقافت میں ایسے کردار عموماً دکھائی دیتے ہیں۔ فصلوں کے بنوں پگڈنڈیوں پہ سر پہ سرسوں کا گھٹا رکھے چلی آ رہی ہیں تو کئی گندم میں لگے سرسوں کی فصل سے ساگ توڑ رہی ہیں۔ مرد بھی مال مویشی چرانے کسیوں اور پہاڑیوں میں صبح سے شام جانور چراتے اور ماہیے گاتے ہیں۔ ان عورتوں کی زندگیاں مسلسل جدوجہد سے عبارت ہیں۔ پانی کے حصول کے لیے ان کو کوسوں کسیوں، چشموں اور گاؤں کے مشترکہ کنویں کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ سروں پر تین تین گھڑے رکھے پگڈنڈیوں سے گزر رہی ہیں۔ کپڑے دھونے کو وافر پانی کی تلاش میں برساتی ندی نالوں کا رخ کرتی ہیں۔ ان کے پاس محدود وسائل ہیں لیکن اپنی مقامیت کی نمائندہ اور اس روایت کی امین لوگ ہیں۔ اس عہد میں پوٹھوہار کے گاؤں میں مشترکہ کنواں ہوتا تھا۔ جہاں سے پانی پینے کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔ گاؤں کے اکثر کام مشترکہ تھے۔ عورتیں کھلے پانی کے حصول کے لئے ندی نالوں کا رخ کرتیں جو ان نیم پہاڑی علاقوں میں کثرت سے موجود تھے۔ یہ اس مقامیت کے جڑت کے مقام بھی ہیں اور تہذیب کے خاص مقام بھی ہیں۔ سردیوں میں سردی کی شدت زیادہ ہوتی ہے۔ ایسے میں ان کے لیے خوش گوار دھوپ نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ یہ دھوپ محض لطف اندوز ہونے کے لیے نہیں بلکہ ان کی خواتین کو تو اس میں کئی کام نمٹانے ہوتے ہیں۔ اس سادہ طرز رہائش میں وہ اپنے روایتی اصولوں کو مدد رکھتی ہیں۔ ناول میں اس بود و باش کے حوالے سے ایک منظر ملاحظہ ہو:

"نیچے گہرائی میں برساتی نالہ اترتا چلا گیا جس کے کنارے بیٹھی عورتیں کپڑے دھوتی تھیں۔پنڈیں کپڑوں کی دھل کر جھاڑیوں اور پتھروں پر سوکھ رہی تھیں۔اب تن کے کپڑے اتار کر انہیں دھو رہی تھی۔ برہنہ جسموں کو باہوں کے شکنجے میں یوں جکڑے ہوئے کے سوائے کھلی کمر کے کوئی حصہ دکھائی نہ دیتا۔ پتہ نہیں دوبارہ ایسی روشن دھوپ کب کھلے۔"(78)

عورتیں رات کو اکٹھی بیٹھ کر اپنے پیاروں کے لیے سویٹر اور نالے (آزار بند) بنتی۔ان مقامی گھروں کی تزئین و آرائش میں بھی مقامی رنگوں میں رنگی ہوتی۔گھروں کی لپائی ہو یا برتن سب ہی میں خاص انداز میں سجائے جاتے۔ان مقامی عورتوں کے ہنر کے نمونے اس ثقافت کو بھی پیش کرتے ہیں۔ کچے اور نیم پختہ مکانوں میں رہنے والے انہی مکانوں میں رہتے ہوئے اپنی زندگی کا ارتقاء جاری رکھتے ہیں۔ پوٹھوہار کے یہ لوگ موسموں کی شدت سے بھی کھلے دل سے لڑتے ہیں۔ موسموں کے مطابق ان لوگوں کے تہوار بھی جڑے ہیں۔ سردیوں کے سخت موسم کے بعد مکانوں کی دوبارہ لپائی اور تزین و آرائش ہوتی ہے۔ ناول میں مقامی رہن سہن اور کھانوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ یہ مقامی لوگ خاص موقعوں پر اپنے خاص روایتی پکوان تیار کرتے ہیں۔گھروں کی تعمیر میں پتھر استعمال ہوتے ہیں جو اس خطے میں ملنا کوئی مشکل کام نہیں اور مخصوص انداز میں ان کو سجایا سنوارا جاتا ہے۔ سماجی کام عموماً گاؤں والے مشترکہ طور پر کرتے۔ اس کا کوئی معاوضہ نہ تھا بلکہ یہ تو رضاکارانہ کام ہے جو سب کے سانجھے ہوتے ہیں۔ کبھی کسی گھر کی لپائی ہو رہی ہے تو کبھی کسی کے گھر کے مکان کے چھت کے اوپر مشترکہ طور پہ مٹی ڈالی جا رہی ہے۔ برسات کے موقعے سے پہلے اور سردیوں سے پہلے اس طرح کا گاؤں میں ایک میلہ سا ہوتا تھا۔ جب لوگ اپنے مکانوں کی مرمت اور ان کی لپائی میں جتے ہوتے کہ بارشوں کے دنوں میں ان کو زیادہ مشکلات برداشت نہ کرنی پڑے اور اگر کسی کی چھت گر جاتی تو محدود وسائل کے باوجود دوسرے لوگ اس کی مدد کرتے کوئی لکڑی کے بالے دے رہا ہے تو کوئی مفت میں مزدوری کرتا دکھائی دیتا ہے۔

"کچے اور پتھریلی سلوں سے بنے مکانوں کو عورتیں چکنی مٹی میں گوبر ملا کر لیپنے لگیں، تنوروں کو نئے مٹھے لگے اور تپا کر مٹھیاں روٹی مٹھیاں پکائی گئی۔ میوے کھوپرے ڈال کر گڑ کے شربت میں گندے آٹے کی روٹیاں رات بھر انگاروں کی ہلکی آنچ پر تندور کے اندر پکتی۔ اگلی صبح اتار کر ہر گھر میں دو میٹھی روٹیاں تحفتاً بھیجی جاتی ہیں۔ بدلے میں ان گھرانوں سے بھی یہی سوغات آتی۔"(79)

ان مرقعوں سے مقامی زندگی کے رہن سہن کی وضاحت ملتی ہے۔ یہ مقامیت اپنے اندر اس پورے سماجی نظام کو سموئے ہوئے ہے۔ مکانوں کی تعمیر ان کی زیب و آرائش کا خاص مقامی رنگ نمایاں ہے۔ کھانے میں بھی اس خطے کے مخصوص مقامی انداز ملتے ہیں جن میں ان کی روایت اور ثقافت کا رنگ میں ناول میں مقامیت کن پہلوں کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ ناول اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ پوٹھوہاری ثقافت کو اردو ناول میں اتنی وضاحت اور

قریب سے اس سے قبل نہیں بیان کیا گیا۔ ناول نگار نے اس علاقے کی مخصوص تہذیب کو بھی نمایاں کیا ہے۔ عموماً پوٹھوہاری ثقافت اور بودوباش کو یا تو پہاڑی علاقوں کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے یا اسے پنجاب کا ہی حصہ خیال کیا جاتا ہے ۔ناول نگار نے ان لوگوں کے رہن سہن کو اپنے ایک الگ انداز میں بیان کیا ہے جو نہ تو پہاڑی علاقوں جیسا ہے اور نہ ہی میدانی علاقوں جیسا بلکہ سطح مرتفع پوٹھوہار کی خالص مقامی زندگی کا بیان ملتا ہے۔ جس میں لوگ اپنے محدود وسائل کے باوجود رسم و رواج کے ساتھ اپنی روایتی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ اس مقامیت کی معراج کا زمانہ ہے۔ جب لوگوں میں سماجی نظام گہرا تھا۔اس پہ جدیدیت کے اثرات اس طرح سے نہیں پڑے تھے۔ جو بعد زاں بہت سی مقامیت کے طرح پوٹھوہاری کی مقامیت پہ بھی ایک قہر بن کر ٹوٹے اور لوگ اپنی جڑوں سے جدا ہوتے چلے گئے۔ان کے اندر وہ مروت اور لحاظ اور سماجی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ مشینوں نے آتے ہی ان لوگوں کو ایک دوسروں سے دور کر دیا۔

شہر مرگ مختصر ناول ہے۔اس ناول کا کینوس نو آبادیاتی عہد کی مقامیت کا بیان ہے۔ ناول کا مرکزی کردار جمال اور روز مری ہیں۔ روز مری اور مقامی کردار کے پیرائے میں اس مقامیت کا بیان ملتا ہے۔اس ناول میں انسانیت کے گرد زیادہ بات چیت ہے۔ مقامیت کے دوسرے پہلوؤں کے متعلق زیادہ وضاحت تو نہیں ملتی تاہم چند ایک مقامات پہ ان مقامی پہلوؤں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ بودوباش کی بات کی جائے تو ناول میں اس ضمن میں جو شواہد ملتے ہیں۔اس سے مقامیت کی قدامت اور ان کے رہن سہن کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ استحصال کا شکار یہ لوگ اپنی زندگیوں کو اسی ڈھنگ میں گزار رہے ہیں۔ شہر کے بیان میں تنگ و تاریک گلیاں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کی معاشی حالت خراب ہونے کے باعث ان کے بازار بھی ویران پڑے تھے۔

> "تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا وہ بازار آ پہنچا۔۔۔ جہاں اکثر دکاندار دکانیں بند کر رہے تھے اور ان میں سے کچھ ویسے ہی بیزار بیزار سے دکانوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔۔۔ بازار میں بھیڑ نہ ہونے کے برابر تھی۔۔۔ کچھ دکاندار جن کی دکانیں بارش کی وجہ سے ٹپک پڑی تھی دکانوں کی چھتوں پر مٹی ڈال رہے تھے۔"(80)

کچے مکانات دکانوں سے اندازہ لگا جا سکتا ہے۔اس مقامیت میں ہندوستان کی کسی چھوٹے پسماندہ شہر کی تصویر کشی ہے۔ فنِ تعمیر میں ناول کو جیسے دو حصوں/طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دراصل ایک مشرقی خستہ حالی اور دوسری استعماری قوتوں کی خوشحالی ان کی جڑوں میں انہی خستہ حال لوگوں کا لہو شامل ہے۔ جس کی شادابی میں ان غریبوں کا ہی لہو شامل ہے۔ کچی گلیاں اور کیچڑ اس علاقے کے رہنے والوں کا حال بھی بیان دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر نو آبادیاتی عہد میں استعماری جبر کا شکار ایک ایسا معاشرہ ہے۔ جہاں مقامی لوگ تنگدستی اور قدیم روش پہ قائم زندگی گزار رہے ہیں ۔کسی طے شدہ مقامی علاقے کا تذکرہ کیے بغیر ناول نگار نے بہت سے پسماندہ علاقوں کا تذکرہ کر ڈالا ہے۔

مقامیت کا ایک خاص پہلو اس علاقے کا مخصوص طرز رہائش لباس اور بودوباش ہے۔ دائرہ میں لاہور کی مقامیت کا بیان ہے۔ ناول میں لاہور کی مقامیت کو گہرے مشاہدے اور جذبات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اندرون

لاہور کی زندگی جو اس شہر کی ثقافت کی بطور خاص آئینہ دار اور اس کی وجہ تسمیہ بھی ہے۔ ناول میں چلتی، پھرتی زندہ دکھائی دیتی ہے۔ اندرون لاہور کی تنگ و تاریخ گلیوں میں موجود رنگتی اور زندگی کی روشنی اس مقامیت کی کا خاص حوالہ ہے۔ ان تنگ تاریک گلیوں کے بیچ رہنے والے مخصوص طرز زندگی کے نمائندے ہیں جو ان کو اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے حوالے سے اہم حوالہ ہے۔ مخصوص طرز زندگی اس مقامیت کا خاصا ہے۔ لاہور کی مقامیت میں کھانوں، دکانوں، ڈھابوں ہوٹلوں کا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ یہاں کے مقامی لوگ اپنی زندگیوں کو ان تمام چیزوں سے آراستہ ضرور کرتے ہیں۔ رات گئے تک ہوٹلوں کی رونق ان کے مقامی رہن سہن کا ایک اہم حصہ ہے۔ ناول نگار نے اس مقامیت کی زندگی کو بہت قریب سے مشاہدے کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہاں تک کہ ویگنیں، رکشے، پر رونق چوراہے، سبھی کچھ رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔ مصنف نے اس مقامیت کی بود و باش کو گہرے مشاہدے سے اس طرح بیان کیا ہے۔ لاہور کے مقامیت آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔

> "ہمیشہ کی طرح اس نے دھوتی اور ململ کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ جس کے نیچے ابھری ہوئی جیبوں والی صدری دکھائی دے رہی تھی۔ باورچی خانے سے جو بیٹھک کے دروازے بالکل سامنے تھا، فرائی پان میں سالن گرم کرنے کی شر وشر رکی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ اس کی ماں پیاز کاٹ رہی ہو گی کہ یہ اس کے باپ کا من بھاتا کھانا تھا۔ اگر سالن نہ ہو تو وہ پیاز پر نمک چھڑک کر روٹی کے ساتھ بڑے شوق سے کھالیتا"(81)

لاہور کی زندگی تنگ و تاریک گلیوں میں بستی ہے۔ ان گلیوں کے مکین اکثر پارکوں، چوراہوں اور ہوٹلوں کا رخ کرتے ہیں۔ جہاں ان کی مجلسی زندگی کی پروان چڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے تفریح سامان بھی ہو جاتا ہے۔ اس مقامیت کا ایک خاص پہلو بن چکا ہے۔ بود و باش کا یہ طرز اور اس مقامیت کا خاص حوالہ بن جاتا ہے۔ یہاں لوگوں کے گٹھ جوڑ مختلف علمی و ادبی موضوعات پہ گفتگو کا بھی ایک سلسلہ ہے۔ لاہور کی ادبی تناظر میں ایسی ہی محفلوں کا ایک بڑا حصہ ہے۔ آصف کا کردار اس کا نمائندہ ہے۔ جو اس پہلو کو واضح کرتا ہے۔

> "دوپہر کے وقت وہ رشید ٹی سٹال پر جا بیٹھتا۔ جو ان کے گھر سے کوئی فرلانگ بھر دور بازار سے ملحق ایک گلی کی نکڑ پر واقع تھا۔ شام ہوتے ہوتے یہ اس جیسے بے روزگاروں، نوکریوں سے واپس لوٹے ہوئے کلرکوں، سیاسی مباحثوں کے شوقین عوامی دانشوروں اور انقلابیوں کی آجگاہ بن جاتا۔ دکان کے اگلے حصے میں تھڑے پر چولہے دھرے تھے جن پر دودھ کی بڑی پتیلی گرم ہوئی ہوتی۔۔۔ ان کو یہاں روز کے بیٹھنے والے گاگوں کا اتنا ہجوم ہوتا کہ اندر بڑے کمرے میں کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ بچتی لوگ بنچوں کو پرے سرکا کر چٹائیاں بچھا کر بیٹھ جاتے (82)"۔

تنگ گلیاں اور قدیم طرز کے مکانوں گنجان آباد علاقوں کے مکین ان طرح کے گٹھ جوڑ کرتے ہیں۔ انہی ہوٹلوں سے ادب فنون لطیفہ اور کئی دوسرے طبقے پروان چڑھے۔ انہی سے کئی نمایاں شخصیات منظر عام بھی آئیں۔ ان

مقامات کو اس مقامی ثقافت میں خاص مقام حاصل ہو گیا ہے۔ جو اس کی مقامیت کا ایک اہم جز بن گئی ہیں۔ لاہور کی مقامی زندگی کے رنگوں میں یہ رنگ بھی نمایاں ہے اے حمید اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"لاہور کی نفسیات ہوٹلوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اس شہر کا ہر ہوٹل اپنی جگہ ایک انسٹیٹیوشن ہے۔ ایک مکمل سکول آف ٹھاٹ ہے۔ ان ہوٹلوں میں ٹی ہاؤس ہے۔ کافی ہاؤس ہے۔۔۔ جو نئی تہذیب کے علمبردار ہیں اور پرانی تہذیب کو سہارا دیئے ہوئے ہیں۔"(83)

ناول میں مقامی گھروں کی بناوٹ، ساخت، سجاوٹ سب کے بارے میں سیر حاصل گفتگو ملتی ہے۔ ان متوسط گھرانوں کی تعمیر سے زیبائش تک تمام امور میں مقامی رنگ نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان روایتی علاقوں میں مخصوص رسوم لباس اور گھروں کی زیبائش کا انداز ملتا ہے۔ ان محلوں میں باہمی ہمدردی رکھ رکھاؤ، بے تکلفی کا ایک انوکھا انداز پایا جاتا ہے۔ ناول کے کردار نوید کے ذریعے بہت سی رسموں اور رکھ رکھا ہو گا بیان ملتا ہے جس سے مقامی کھانوں رہائش کو بھی ناول نگار نے وضاحت سے بیان کیا ہے۔

"اسی بیچ اس نے بتایا کہ پٹھ کا گوشت اس نے دونوں کے لیے بنوایا ہے۔ یہ اس کا من بھاتا ہے۔ وہ خود بھی ہمیشہ اسی دکان سے گوشت خریدتا ہے اور یہ کہ وہ چاچے کو کہہ دے گا کہ اسے بھی خاص طور پر گول بوٹی والے حصے سے گوشت کاٹ کر دے پھر یہ ذکر ہوا کہ اس کی ماں چانپیں خوب پکاتی ہے جبکہ اس کے ہاتھ کی پٹھ کے گوشت کے ساتھ پکی ہوئی پالک کا تو جواب ہی نہیں اور یہ کہ اگلی بار جب اس کی ماں ان دونوں میں سے کسی سے کوئی بھی شے پکائے گی تو وہ ضرور اسے دعوت دے گا کہ وہ اپنی بیوی کے کے ساتھ ان کے گھر کھانے پر آئے۔"(84)

اس طرح رکھ رکھاؤ مروت لحاظ ان علاقوں کے رہنے والوں کا خاصا ہیں۔ اندرون لاہور کی رونقیں بھی انہی رسوم و رواج بھائی چارے پہ مبنی ہیں۔ اس مقامیت کا خاص وصف یہ ہے کہ ان بڑے شہروں میں مختلف علاقوں کے لوگ کثرت سے آبسے ہیں جو مختلف علاقوں اور ثقافتوں کے نمائندے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود مقامی ثقافت نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ طرز تعمیر طرز رہائش سب میں اس کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ لاہور کے اندرون شہر میں موجود قدیم مکانات طرز رہائش بود و باش آج بھی لاہور کی ثقافت کا اصل رنگ نمایاں کیے ہوئے ہیں۔ ان تنگ مکانوں میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ ناول میں اندرون لاہور کے قدیم طرز رہائش کے حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو اس مقامی پہلو کو بہت حد تک واضح کرتا ہے:

"یہ ساڑھے تین چار مرحلے کا دو منزلہ مکان تھا۔ چھوٹے چھوٹے متعدد کمروں سے بھرا ہوا جیسے مکان عموماً اندرون شہر میں ہوتے ہیں۔ بالکل سیدھی سیڑھیاں جنہیں اس نے مکان میں داخل ہوتے ہی دیکھ لیا۔ بالائی منزل کو جاتی تھیں یہ اتنی تنگ تھی کہ ایک وقت میں ایک ہی شخص سے ان میں سے گزر سکتا تھا وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اس کی دیواروں پر سیلن سے قلعی جھڑی ہوئی تھی۔"(85)

ناول میں جابجالاہور کی مقامیت دکھائی دیتی ہے۔ناول نگار نے محض تذکرے کی حد تک اس مقامی ثقافت کو ناول کا حصہ نہیں بنایا بلکہ یہ مقامی عناصر کی وضاحت اور نمائندگی بھی ملتی ہے۔ کبھی گلیوں میں تو کبھی بازاروں اور چوراہوں میں مقامی رنگ دکھائی دیتے ہیں۔وہ شہر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو باریک بینی سے جانتا ہے۔وہ امیر غریب متوسط طبقے کے تمام حالات سے آگاہی کے ساتھ ساتھ نئے آنے والے مسائل سے بھی آگاہ ہے۔ جگہ جگہ مقامی مجسم تصویریں ابھرتی ہیں۔ جہاں زندگی رواں دواں ہے۔ناول میں محض ہوٹلوں کاتذکرہ نہیں بلکہ ان کے کھانوں تک کا بھی ذکر موجود ہے۔ کھانے کے حوالے سے لاہوریوں کا اپنا ایک انداز ہے۔ جو خوش خوراکی کے ساتھ ساتھ اچھے انتخاب میں بھی مشہور ہیں تو دوسری طرف اس بڑے شہر میں ہزاروں بے گھر لوگ بھی موجود ہیں۔ جو اپنا پیٹ پالنے اس شہر میں آجاتے ہیں۔ گلیوں بازاروں کے ایک ایک منظر سے اس کی وضاحت ہوتی جاتی ہے۔ناول نگار نے لاہور کی ثقافت کے ان پہلوؤں کو مجسم صورت میں ناول کے قالب میں ڈال دیا ہے۔

> "بہت سی تاریک گلیاں گزرنے اور موڑ مڑنے کے بعد وہ پھر سے خاصے چوڑے چوک نما بازار میں آگیا ایک بڑے حصے میں دکانیں بند تھیں۔ان کے آگے تھڑوں پر مزدور سو رہے تھے یا بیٹھے حقہ یا سگریٹ پی رہے تھے ۔یہ کوئی منڈی تھی زمین پر ہر طرف دالوں، چاولوں اور مختلف مصالوں کی تلچھٹ بکھری ہوئی تھی۔ بازار کا جو حصہ کھلا تھا اس میں زیادہ دکانیں کھانے پینے کی چیزوں کی تھیں۔ ہوٹل جہاں صرف چائے ملتی تھی اور سیخ کباب اور سری پائے اور فالودے اور لسی کی دکانیں، پان سگریٹ کے کھوکھے، ریڑھیوں پر چکڑ چھولے آلو چاٹ۔ وہ ان پر دوڑاتا نگاہ چلتا رہا۔"(86)

دائرہ میں رہن سہن بود وباش کے وسیع مناظر موجود ہیں۔ مقامیت اپنے تمام رنگوں کے ساتھ موجود ہیں۔ مابعد جدید نقطہ نظر کی وضاحت ناول میں موجود مقامیت کے مختلف پہلوؤں سے ہوتی ہے۔ لاہور شہر میں زندگی، طرز رہائش کا انداز ناول نے جابجا بیان کیا ہے۔ان لوگوں کے ہاں ہوٹلوں پہ سجنے والی محفلیں ان کی زندگی کا ایک اہم جز ہیں۔ جہاں محض تفریحی بات چیت نہیں ہوتی بلکہ زندگی کے مختلف موضوعات زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ یہ ان کی جرات کا مرکز بھی ہے۔اس مخصوص مقامیت کا جز بھی چھوٹے گھروں کمروں میں رہنے والے ان لوگوں نے اپنی زندگی کو کھلی فضا میں سانس لینے کا ایک بہانہ اختراع کرلیا ہے۔

بھید کا لوکیل بھی لاہور ہے۔ ناول نگار مقامیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ ان تنگ وتاریک، بھیڑ والی جگہوں، اڈوں، چوکوں اور شاہراؤں سے اچھی طرح واقف ہے۔اندرونِ لاہور کی مقامی زندگی خصوصاً متوسط گھرانوں کے پیرائے میں موجود ہے۔ان لوگوں کی مجلسی زندگی کا بیان بھی ملتا ہے۔ ناول میں ان کا تفصیلاً بیان موجود ہے۔ ڈھابوں ہوٹلوں پہ گفتگو کرتے ہوئے انقلابی فلسفی، لاہور کے مقامی فضا کا اہم جز گردانا جاتا ہے۔ ناول بھید میں ایسے

کردار موجود ہیں۔ ناول نگار ان کرداروں کے ذریعے مقامیت کے رہن سہن بود و باش کا جابجا تذکرہ کرتا ہے۔ ان کی تہذیب ہی اصل بھید ہے جس کو ناول نگار نے وضاحت سے بیان کیا ہے۔

بنات کالج، نیلا گنبد میں بانی پانی والی بڑی سبیل کے برابر، چوڑے اور اونچے دروازے والے کھنڈر نما ہیبت عمارت میں واقع جو کبھی کسی امیر زادے کی حویلی رہی ہو گی۔ دیوانِ عام اور دیوانِ خاص میں سٹاف بیٹھتا تھا۔ جن میں رنگ برنگے شیشوں کھڑکیوں روشن دانوں سے ست رنگی دھوپ اندر جھانکتی ہے۔"(87)

ناول میں طرز رہائش کے ساتھ ساتھ لاہور کی مقامی ثقافت جس میں مقامی خانوں کو خاص اہمیت حاصل ہے ان کا بیان بھی ملتا ہے۔ یہ کھابے اس مقامیت کی مخصوص شناخت کے طور پہ بھی موجود ہیں۔ لاہور شہر اور اس کے باسی خوش خوراکی کے حوالے سے پورے پاکستان میں مشہور ہیں۔ پورے پاکستان سے لوگ ان کے کھانوں کے ذریعے کھنچے چلے آتے ہیں۔ ناول میں ایسی جزئیات نگاری کے ذریعے ان ثقافتی عناصر کو بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

"کشمیری دال چاول والی بڑی ریڑی کے پیچھے تقریباً چھپی ہوئی چھوٹی سی دو موہنی دکان تھی۔ جسے اعظم ٹی سٹال کہتے تھے۔ دکان کے اندر اور باہر فٹ پاتھ پر کرسیاں دن رات بچھی رہتی ہیں۔ اکثر گاہکوں سے بھری ہوئیں۔ اگر آپ کا ناک بند نہیں ہے، زکام یا الرجی وغیرہ نہیں ہے تو ہاتھی چوک میں داخل ہوتے ہی آپ کو چائے کی خوشبو آنے لگی لگتی ہے۔ ملک اعظم کی الائچی اور دار چینی والی چائے۔ دور دور سے چاہے کے نشئی اس خوشبو کا سرا پکڑے کھنچے چلے آتے ہیں۔ گاہک گھیرو ہے یہ خوشبو۔"(88)

مقامی ہوٹلوں کھانوں کا تذکرہ بھی جابجا ملتا ہے۔ ناول نگار نے اس مقامیت کے پہلو کو وضاحت سے نہ صرف بیان کیا بلکہ اس میں مقامی زندگی میں اہمیت بھی واضح دکھائی ہے۔ لاہور کی مقامی زندگی میں یہ جگہیں تفریح کے ساتھ ساتھ لوگوں کی گٹھ، جوڑ کا بھی ایک وسیلہ ہیں۔ اپنی من پسند جگہوں پہ جانا وہاں کے کھانوں، مشروبات سے لطف اُٹھانا یہ اس زندگی کا ایک جز ہے۔ ناول نگار نے ایسے بہت سے مقامات کا بیان کیا ہے۔ جو ان کی مقامی فضا میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ لاہور کی مجلسی زندگی کا گٹھ جوڑ بھی انہی مقامات پہ ہوتا ہے۔

"کمرشل مارکیٹ کا ریفریشمنٹ سینٹر اپنے فالسے۔ مالٹے، اناس وغیرہ کے جوس کی وجہ سے سارے شہر میں مشہور ہے۔ یہ آپ کے ہونٹوں پہ جامنی رنگ کی مہین تہہ جما دیتا ہے۔ گرمی سے بچنے کی راہ سجھاتا ہے۔"(89)

ناول میں ایسے مقامات کی تعداد کم نہیں جو مقامی سطح پہ خاص پہچان رکھتے ہیں۔ دوسرے علاقوں کے لوگوں کے لئے بھی ان میں کشش موجود ہے۔ ناول میں لاہور کی مقامی زندگی کا رہن سہن کا بیان کثرت سے ملتا ہے۔ عاصم بٹ نے دائرہ کے بعد بھید میں بھی لاہور کی مقامیت کو تمام جزئیات کے ساتھ بیان کرنے کا تسلسل جاری رکھا ہے۔ امجد طفیل اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"محمد عاصم بٹ نے اس ناول میں مختلف کرداروں کی کہانیوں سے پلاٹ کو بنا ہے۔ ان میں سے کچھ تو لاہور شہر کے باسیوں اور پرانے شہر کے رہنے والوں کے لیے مانوس کردار ہیں۔ ناول نگار نے ان سب کو اپنے ناول کے بیانیے میں خوبصورتی سے سجایا ہے۔"(90)

عاصم بٹ کے پہلے ناول دائرہ کی طرح بھید میں بھی لاہور کی مقامیت کا بیان نمایاں ہے۔ لاہور کی مجلسی زندگی کا بیان ہو یا یہاں کی عمارتوں اور لوگوں کے رہن سہن کا طریقہ ہر ایک چیز میں لاہور کی مقامیت واضح طور پر دکھائی دی ہے۔ ناول نگار نے جزئیات نگاری کے ذریعے چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں ڈھابوں، مکانوں، گلیوں، چوراہوں اور چوکوں کا تذکرہ اس طرح سے کیا ہے کہ مقامیت کا بیان بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ مابعد جدید تناظر کے نقطہ نظر کا حامل یہ ناول بھی مقامیت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتا دکھائی دیتا ہے۔

نو لکھی کوٹھی ایک ایسی علامت کے طور پہ بیان ہوئی ہے۔ جو پنجاب کی عظمت رفتہ کا بیان ہے۔ ناول نگار نے اس تاریخی مقام کے گرد مشرقی اور وسطی پنجاب کی مقامیت کو بیان کیا ہے۔ مقامیت جو اپنے طور پر مکمل ثقافت ہے۔ اس مقامیت کی رونقیں بودوباش رہن سہن رسم ورواج گلیاں چوبارے ایک ایک رنگ اپنے مقامی رنگوں کے ساتھ موجود ہے۔ ناول نگار نے مقامی ثقافت کو زندہ جاوید قاری کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ پنجاب کے دیہاتوں کی بھرپور زندگی اس ناول میں موجود ہے۔ مقامیت کے تمام پہلوؤں کی ناول میں مقامی کرداروں کے ذریعے سے نمائندگی ملتی ہے۔ ایسی مقامیت جو ایک ایسے سانحے سے دوچار ہے کہ اس کے ٹکڑے الگ ہو گئے۔ ناول میں مقامی رسم ورواج معمولی جھگڑوں سے سیاست کے معاملات تک تمام پہلوؤں کی باریک مشاہدے کے تحت وضاحت ملتی ہے۔ مقامیت کی ہر لحاظ سے مکمل نمائندگی مقامی کرداروں کے ذریعے سے موجود ہے۔

ناطق نے مکمل پنجابی ثقافت اور علاقائی مناسبت سے ناول میں جزئیات بیان کی ہیں۔"(91)

ناول کے آغاز میں ہی مقامی نوابوں اور زمینداروں کے طور طریقوں کا احوال ملتا ہے جو ان کے مقامی ثقافتی عناصر بھی ہیں۔ ان نوابوں کا خاصا بھی ان تمام پہلوؤں کا تعلق مقامی نوعیت کا ہے۔ مقامیت کے مختلف امور کی وضاحت ان کرداروں کے ذریعے سے کی گئی ہے۔ انگریزوں نے بھی یہاں کے رنگوں کو اپنا لیا اور مقامی نوابوں کے طرز پہ زندگیاں گزارنے لگے۔ ولیم انگریزوں کا نمائندہ کردار ہے۔ ولیم کا دادا بھی نو لکھی کوٹھی تعمیر کر کے اور زمینیں اور باغات لگوا کر اس مقامی نوابی کلچر کا حصہ بن گیا۔ وہ مقامی زمینداروں اور نوابوں کے شوق بھی اپناتا ہے۔ یوں اس پہ مقامی رنگ اس قدر غالب آجاتا ہے کہ وہ خود کو اسی میں ڈھال لیتا ہے۔ مقامیت کے ان امور کی وضاحت ناول میں جا بجا ملتی ہے ولیم کے بیان میں ناول نگار رقم طراز ہے:

"باباہندوستان کو کسی قیمت چھوڑنے پر راضی نہ تھے۔خاص کر وسطی پنجاب کے سر سبز میدانوں کو جہاں ان کے نوابوں کے سے ٹھاٹ تھے۔ہزاروں مرغ بٹیر اور گھوڑے پال رکھے تھے۔بٹیر لڑانے کا شوق تو دادا کو بھی تھا ۔حقے کا لپکا بھی انہی سے لگا۔"(92)

مقامی پنجابی کھیل تماشوں کا ذکر کئی مقامات پہ آیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ناول میں رہن سہن کے مقامی انداز کو بھی ناول نگار نے وضاحت سے بیان کیا ہے۔اس شہر میں بڑے زمینداروں کی حویلیاں ہی مرکز ہوا کرتی تھی۔ بڑے زمینداروں جاگیرداروں کے سینکڑوں ملازمین ان حویلیوں میں کام کاج اور ضرورت کی غرض سے روزانہ آتے۔بعض خاص ملازمین،صلاح گو مستقل وہیں رہائش پذیر ہوتے۔یہ حویلیاں غریبوں کے لیے دادرسی کی جگہ بھی ہوتی۔مقامی لڑائی جھگڑوں کے فیصلوں کی عدالتیں بھی،سیاسی آماجگاہ بھی اور بہت سے مقاصدان حویلیوں کے ہوتے ۔ان کی مرکزیت کو مقامیت میں خاص الخاص حیثیت حاصل تھی۔ہر زمیندار کی اپنی رائے اور عوام اور اس حدود کا مالک تصور کیا جاتا تھا۔اس سب کے باوجود مقامی لوگوں کی زندگیاں بہتر ڈھنگ سے گزر رہی تھیں۔

"شیر حیدر کی عمومی مجلس زیادہ تر بیرونی احاطے میں رہتی۔پیپل کے دو بڑے پیڑ حویلی کے بڑے صحن میں موجود تھے۔ان کا سایہ احاطے کے صحن کی آدھی جگہ گھیر لیتا وہیں گرمیوں میں شیر حیدر کی پرانی چارپائی لگ جاتی۔سینکڑوں مونڈھے اور چارپائیاں سامنے پڑے رہتے جن پر بیسیوں لوگ ہمہ وقت موجود خوش گپیوں میں اپنا وقت کاٹتے۔"(93)

مقامی رہن سہن کا اپنا ایک انداز اور رنگ ہے۔ناول میں مقامیت کے پہلوؤں کو کئی مقامات پر دیکھا جا سکتا ہے۔پنجاب کی مقامی ثقافت میں ان ڈیروں حویلیوں کا خاص مقام ہے جہاں لوگ اپنے سرکردہ لوگوں کی مجلسوں میں بیٹھتے ہیں۔ان کے ہاں حقے کے دور چلتے اور لسی سے ان کی تواضع کی جاتی۔ان ڈیروں اور حویلیوں میں مختص جگہوں پہ خاص وعام کا آنا جانا ہوتا۔ناول نگار نے ان خاص ثقافتی امور کو بھی مقامیت کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔غلام حیدر کی حویلی پنجاب کی ثقافت کا انداز ہے۔جہاں صلاح مشورے بھی ہوتے ہیں اور فیصلے بھی اور ضرورت منداپنی ضرورتوں کی عرضی لے کر یہاں آتے ہیں۔حقہ پنجاب کی ثقافت کا ایک اہم جز ہے۔ڈیروں اور حویلیوں میں اس کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔اس کے بغیر محفلیں ادھوری خیال کی جاتی ہیں۔ڈیروں اور حویلیوں پر اس کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔اس کے بغیر محفلیں ادھوری خیال کی جاتی ہیں۔ناول نگار نے ان مجلسوں کو ادھورا نہیں ہونے دیا بلکہ مقامیت کے تمام ثقافتی رسم ورواج کے ساتھ ہر منظر کی بھرپور منظر نگاری کی ہے۔

"نیاز جی نے حقے کے دو تین کش لیے جس کا پانی کچھ ہی دیر پہلے تبدیل کیا گیا تھا اور چلم میں تمباکو ڈال کر اس میں تازہ کوئلے رکھے گئے تھے۔اسے تمباکو کی کڑواہٹ ایک سرور سا دے گئے۔"(94)

فن تعمیر کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ وہ عہد تھا۔ جب ہندوستان کے تمام دیہاتوں کی طرح پنجاب کے دیہات بھی لگان کی بھاری مقداریں ادا کر کر کے اور مقامی، ولایتی اشرافیہ کے پیٹ بھرتے بھرتے بے حال ہو چکے تھے۔ مکانات کی اکثریت کچے مکانوں کی تھی۔ شاذ و نادر ہی کوئی پختہ مکان ملتا۔ اور ہوتا بھی تو وہ کوئی بہت بڑا زمیندار ہوتا۔ جن علاقوں میں حالات قدرے بہتر تھے ان کی صورتحال بہتر تھی۔ باقی ماندہ بس دو وقت کی روٹی کے حصول کے لیے سرگرداں تھے۔ ایسے میں مکانات کی تعمیر کہاں سے ہو سکتی ہے۔ تاہم اس کے باوجود بھی بڑے ذمہ داروں کی پر آسائش حویلیاں موجود تھیں۔ بعد ازاں جن کو دو بڑے مقامی مذاہب مسلمان کی تخصیص بھی حاصل ہو گئی اس حوالے سے زیادہ آگے ہندو ہی تھے۔ ہندو نہ صرف تعلیم بلکہ مالی معاملات میں بھی باقی قوموں سے آگے تھے۔ ہندو بنیے سود کے کاروبار کے ذریعے دوسری قوموں کا استحصال کرتے۔ بیان کردہ علاقے میں بھی سودھا سنگھ اور غلام حیدر کی حیثیت کے مطابق حویلیاں تھیں۔ جو مقامی فن تعمیر کا شاہکار کا درجہ رکھتی تھی۔ اس ضمن میں غلام حیدر کی حویلی کا بیان ملاحظہ ہو جس میں مقامی فن تعمیر اور ثقافت کے پہلو کار فرما دکھائی دیتے ہیں:

"حویلی کیا تھی ایک چھوٹا سا قلعہ تھا جس کی چار دیواری پچیس فٹ اونچی ضرور ہو گی۔ جو چھوٹی سرخ اینٹوں سے تیار کی گئی تھی۔ اس پچیس فٹ اونچی اور تیس فٹ چوڑی دیوار پر جس پر گھوڑا بھی دوڑ سکتا تھا۔ جگہ جگہ برج بنے ہوئے تھے اور برجوں پر چھوٹی چھوٹی محرابیاں اور طاق تھے۔ جن میں رات کے وقت لالٹینیں روشن ہو جاتیں (95)"۔

ناول نگار مقامی رہن سہن کو اس مقامی پیرائے میں اس طرح سے بیان کیا ہے کہ پنجاب کی خالص دیہاتی زندگی متحرک دکھائی دیتی ہے۔ مقامی کھانوں لباس رہائش کا بیان جابجا ملتا ہے۔ ان منظر نگاریوں سے مقامیت کو ناول نگار نے قاری کے سامنے متحرک کر دیا ہے۔ پنجاب کی ثقافت راجندر سنگھ بیدی اور بلونت سنگھ کی طرح اکیسویں صدی عیسوی میں علی اکبر ناطق نے بھی بھرپور انداز میں بیان کی ہے۔ سیاسی اور تاریخ اعتبار سے اہم ناول مقامیت کے مختلف پہلوؤں کو بھی اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔

"وسطی پنجاب کی تہذیب و ثقافت بھرپور باریک بینی سے بیان کی گئی ہے۔"(96)

مختلف مقامات پر ناول نگار نے کئی موقعوں پہ گہرے مشاہدے اور تجربے سے مقامی سماج کو بیان کیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی امور کی منظر نگاری اس انداز میں ملتی ہے کہ پوری ثقافت آنکھوں کے سامنے سفر کرتی دکھائی دیتی ہے۔ رسم و رواج کے بیان میں پنجاب میں گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے مرقعوں کے ذریعے سے ناول نگار نے اس میں نہ صرف دلچسپی بلکہ مقامیت کے قریب لا کھڑا کیا ہے۔ کہیں عورتوں کا چولہے پہ روٹیاں پکانا اور کہیں اوپلوں پہ دودھ ابل رہا ہے تو کہیں مہمانوں کی لسی سے تواضع کی جا رہی ہے۔

"اجیت کور نے چولہے پر رکھے دودھ کے نیچے پاتھیوں کی ہلکی آنچ رکھ دی۔ پاتھیوں کی ہلکی آنچ سے ایک تو دودھ برتن سے ابل کر باہر نہیں گرتا دوسرا یہ کہ تھوڑی تھوڑی آگ کے دہکنے سے دودھ خوب کڑھ بھی جاتا ہے اور اس پر موٹی بالائی آجاتی ہے۔"(97)

ناول میں مقامی کرداروں کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ان کرداروں کی بول چال، رہن، سہن، لباس اور کردار کے افعال بھی مقامیت کے رنگ میں رنگے ہیں۔ مقامی کردار اپنے طرز ادا اور برتاؤ سے مقامیت کو واضح کرتے ہیں۔ ناول کے کردار پورے ماحول کے نمائندے بن کر ابھرتے ہیں۔ غلام حیدر کے بیان میں ناول نگار نے مقامی لباس سے بھی مقامیت کی نمائندگی ملتی ہے۔ پنجاب کے دیہاتوں میں عموماً صاحبِ حیثیت چودھری اور بڑے زمینداروں کا لباس کا انتخاب بھی اس طرح ہوتا کہ دوسروں سے اس کا فرق نمایاں ہو کر بھی عہدوں اور رتبوں کے لحاظ سے باندھی جاتی ہے۔ جس قدر اونچا شملہ ہوتا اسی قدر اس کا رتبہ اور درجہ بھی اس مقامیت میں زیادہ ہوتا۔

"غلام حیدر نے ماحول کے مطابق پورا پنجابی چوہدریوں کا لباس پہنا ہوا تھا۔ کھسا، لمبے بر والا سماپی کڑھائی کا لاچا، سر پر پف والی کلے دار پگڑی اور ہاتھ میں چھوٹا سا چاندی کا حقہ، جو غلام حیدر کو نواب افتخار کے ماموں سے تحفے میں ملا تھا۔"(98)

ناول میں مقامی لباس، خوراک، رہائش اور کئی دوسرے مقامی عناصر کا کثرت سے بیان ملتا ہے۔ ناول نگار نے مقامیت کے ان تمام عناصر کی مقامی کرداروں کے ذریعے وضاحت کی ہے۔ ناول نگار کا گہرا مشاہدہ/ذاتی تجربہ اس مقامیت کے بیان کو بہت واضح کر گیا ہے۔ جہاں پنجاب کی ثقافت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ متحرک دکھائی دیتی ہے۔ ناول میں بہت سے معاشرتی امور رسم و رواج کی وضاحت ملتی ہے۔ ناول نگار نے مقامی کرداروں کے ذریعے سے اس عہد کے نہ صرف سماجی معاشی اور سیاسی سیاسی مسائل بیان کیے ہیں بلکہ مقامیت کے بیان میں بھی ایسی منظر کشی کی ہے کہ اس مقامیت کو اردو ناول میں محفوظ کر کے رکھ دیا ہے۔

غلام باغ میں مختلف علاقوں قبیلوں کا تذکرہ ہے۔ ناول کا کینوس وسیع ہے۔ شہر میں ان تمام علاقوں قبیلوں کی نمائندے آبسے ہیں۔ ناول میں مقامی موضوعات کے علاوہ فلسفیانہ عناصر کی بہتات بھی ہے۔ شہر کے مرکز میں جمع یہ لوگ اصل میں اپنے اصل کی دریافت بھی کرتے ہیں اور بیک وقت اس کے نمائندے بھی ہیں۔ نئی نسل کے یہ نمائندہ کردار اپنی اصل کی بازیافت کرتے ہیں اور اس کی طرف لوٹتے بھی ہیں۔ کبیر مہدی اور زہرہ کا کردار اسی سوچ کے عکاسی کرتے ہیں۔ کبیر مہدی کا تعلق پوٹھوہار کے علاقے سے ہے جبکہ زہرہ یاور عطائی کی بیٹی جو مانگر جاتی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نسل کی نمائندگی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ناول کی ابتدائی حصے میں ناول نگار نے مانگر جاتی قبیلے کا تعارف کرایا ہے۔ مانگر جاتی قبیلے کے بیان کو زیادہ تفصیل سے اگرچہ زہرہ کے کردار کے ذریعے ہی بیان کیا جاتا ہے۔ جب وہ اپنے اصل کی تلاش میں اس قبیلے نسل کی کھوج میں نکلتی ہے۔ زہرہ کی کھوج تک یہ قبیلہ تباہ حال ہو چکا ہوتا

ہے۔یاور عطائی جس کا باپ خادم حسین ڈاکیا تھا جو اپنے اس قبیلے سے نکل کر انعام گڑھ میں آبسا۔ یہ لوگ نہر کے کنارے آباد تھے۔ان کے اپنے رسم ورواج تھے جن کو پنچ ترین خیال کیا جاتا۔وہ اس گراوٹ میں اس حد تک گر گئے کہ ناپاک جانوروں تک بھی کھا جاتے ہیں۔ان کے بارے میں بھی مختلف طرح کی اساطیر موجود مشہور ہیں،وہیں وقت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی خواتین لوگوں کے گھروں میں کام کرنے لگیں۔جو جسم فروشی تک بھی پھیل گئی۔مرد بھی پیسوں کے عوض غلیظ ترین کام کرنے پہ راضی ہو جاتے ہیں۔غلاظت کے منصب پہ فائض ان لوگوں سے کوئی بھی پنچ کام باآسانی کرالیا جاتا تھا۔زہرہ کی نسل،ان کا قبیلہ منتشر ہو گیا۔وہ مزید غلاظت کی علامت بن کر ابھرے۔ان کو ان کی رہائشوں سے بے دخل کر کے ان کی زمینوں کو ہموار کر دیا گیا۔زہرہ جب کبیر مہدی کے ساتھ اس قبیلے کے بارے میں معلومات کے لیے جاتی ہے تو مندری نامی شخص جو اس قبیلے کا فرد ہے۔اس قبیلے کی صورتحال کے بارے میں بتاتا ہے جو مٹی کے گھروں میں پنا لیے ہوئے ہیں۔ان کو خوراک کی قلت کا سامنا ہے۔ان کی سماجی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے اور نہ ہی ان کا کوئی مخصوص بود و باش قائم رہتا ہے۔ڈاکٹر اقبال آفاقی مندری کے کردار کے تناظر میں لکھتے ہیں کہ:

> "ساس نے قبیلے کی تباہی کی کہانی سنائی بہت سے مر کھپ گئے ہیں اور کچھ پگلوں اور کاچھروں کے ظلم سے تنگ آکر پناہ لیتے چلے گئے ہیں۔چند ایک گھرانے زمین کے اندر گھروندے بنا کر رہ رہے ہیں۔انہیں خوفناک کال،نسلی امتیاز اور بیماریوں کا سامنا ہے۔ان کو سماجی زندگی سے باہر نکال دیا گیا ہے۔"(99)

غلام باغ میں بود و باش کے ضمن میں کبیر مہدی کے آبائی گاؤں سنیمال کا بیان بھی ملتا ہے۔پوٹھوہار کا یہ گاؤں کسی دور دراز علاقے کا گاؤں معلوم ہوتا ہے۔کبیر مہدی کبھی ایک بار چند دنوں کے لیے پرسکون فطرتی ماحول میں دن گزارنے جاتا ہے۔اس کا باپ ایک چھوٹا سا کسان ہے۔یہاں کے لوگ اور روایتی طور پر کان کنی یا سرکاری ملازمتوں بالخصوص فوج میں بھرتی ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔خطہ پوٹھوہار میں نوجوانوں کی کثیر تعداد انگریزوں کے زمانے سے ہی فوج میں برتی ہونا شروع ہو گئی تھی۔قیامِ پاکستان کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری اور ساری رہا۔گاؤں کے یہ سادہ دیہاتی لوگ اپنے مخصوص قدیم انداز میں رہ رہے ہیں۔جن کی زندگیوں پر حوادثِ زمانہ کا اثر اس تیزی سے نہیں پڑتا جو آج بھی روایتی رہن سہن کو اپنائے ہوئے ہیں۔

ناول نگار کبھی انعام گڑھ کے مانگر جو قبیلے اور کبھی سنیمال کی پہاڑیوں میں بسی زندگی کے خدوخال بیان کرتا ہے۔جہاں زندگی اپنی سادگی پرسکون اور اپنے روایتی انداز میں موجود ہے۔کبیر کی ماں باپ کے بیانات سے ان لوگوں کے روایتی اور سادہ ہونے کے لیے شواہد کافی ہیں۔اس علاقے میں زیادہ پڑھے لکھنے کا رواج بھی نہیں ہے۔کبیر ان کے تصور میں افسر ہے جو شہری زندگی کی آسائشوں سے مزین زندگی گزار رہا ہے۔سنیال ایک پہاڑی علاقہ ہے۔یہاں کے لوگ ان وادیوں میں ہی اپنا روزگار کرتے ہیں۔لوگوں کے گھروں کی بناوٹ بھی سادہ ہے۔جو مخصوص فاصلے پر ہیں۔

زمین کے ہمواری کی وجہ سے مختلف ٹیلوں پر پھیلے ہوئے یوں ان دیہاتوں اور قصبوں کے بیچ راستے ہیں جو زیادہ تر پیدل چلنے والوں کی لیے ہی موزوں ہیں۔ گاڑیوں کے چلن تو ویسے بھی مفقود ہے۔ یہ آبادیاں زیادہ تر کچے گھروں پر مشتمل ہیں۔ کبیر کے گھر کے بیان میں لوگوں کی بودوباش کا علم ہوتا ہے۔ یہاں کی خوراک بھی زیادہ تر مقامی نوعیت کی ہے ۔پوٹھوہار کے دوسرے دیہاتوں کی طرح یہاں بھی کھانے کے لیے مخصوص جگہ رسوئی کہلاتی ہے۔ چھوٹا سا کمرہ جو کھانا بنانے کے کام آتا ہے۔اس کے علاوہ مکانوں کی بناوٹ جہاں موسمی حالات کے پیش نظر رکھی جاتی ہے وہیں مقامی ثقافتی پہلوؤں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔

"اس وقت جب وہ شروع رات میں گھر کے صحن کے کونے میں بنی رسوئی میں بیٹھے چولہے کی آگ تاپتے تھے تو وہ یہ پریشان سا خیال پھر اس کے جی کو چارٹ کر گیا۔ سنیمال نرم اور ملائم اندھیرے سے بھرا تھا اور آدھے سے زیادہ سو بھی گیا تھا۔ کہیں کہیں اونچے گھروں کے دروازوں کی جھریوں میں اکا دکا روشنی بس بھول چوک کر جھانکتی تھی مگر ستارے اتنے زیادہ تھے اور اتنے روشن تھے کہ جیسے آسمان میں آگ لگا رہے تھے۔اسی وقت صحن کے پیچھے بنے دو کمروں کے عقب میں بھنڈر کی جانب بنے چھوٹے سے کچے کمرے میں بیٹھے کبیر نے بھی ستاروں کے بارے میں ایسا ہی سوچا۔"(100)

پوٹھوہار کے اس گاؤں کے بیان میں مقامی زندگی کے بودوباش رہن سن کا اندازہ ہوتا ہے۔ ناول نگار نے بڑے شہر میں تمام کرداروں کا مرکز بنانے کے باوجود علاقائی مقامی ثقافتوں کو بھی بیان کیا ہے۔مقامی طرز کے رہائش کے یہ نمونے نیم پہاڑی علاقوں میں جا بجا ملتے ہیں۔غلام باغ مابعد جدیدیت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔اس میں کسی مہابیانیے کو حتمی نمائندگی نہیں ملتی بلکہ چھوٹے چھوٹے بیانیے بھی اس میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ناول کے کردار مختلف طبقاتی اور علاقائی نمائندوں کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ ان بیانیوں کے بھی امین ہیں۔

خس و خاشاک زمانے میں اکیسویں صدی کے زمانی تناظر تک مختلف ثقافتوں کے بیان سے مزین ہے۔ تمام عناصر کے ساتھ ساتھ ناول کا مقامی پہلو نمایاں ہے۔ ناول کا آغاز ان مقامی کرداروں کے ذریعے سے ہوتا ہے۔اس میں اس کا ارتقا اور اس میں اس کا انجام ہوتا ہے۔ ناول کہ تمام مقامی کردار تین نسلوں کے تسلسل سے ناول میں موجود اور متحرک رہنے کے بعد اپنی زندگی کے انجام کی طرف بڑھ گئے مگر باقی رہ جانے والے کردار ان مقامی کرداروں ہی کا تسلسل ہیں۔ شباہت اور انعام اللہ اس تہذیب کے نمائندے اور اس کو قائم رکھنے والے ثابت ہوتے ہیں جو اس مٹتی ہوئی تہذیب نسل کو مٹنے سے بچانے کی تگ ودو میں زندگی کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔

گجرات اور گجرانوالہ کے گردونواح میں جنم لینے والی یہ کہانی ان مقامی لوگوں کی ہے جو اس دھرتی کے وارث ،اس کے بیٹے اور اس مٹی کی شناخت ہیں۔ یہ کردار اپنی مقامی ثقافت کے نمائندے ہیں۔ تقسیمِ برصغیر سے قبل کا زمانہ ہے جہاں بین المذاہب ہم آہنگی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہیں۔ان کا رہن سہن خوراک لباس اور

رہائش بھی تھوڑے بہت طبقاتی فرق کے ساتھ یکساں ہیں جس میں مقامیت کا پہلو نمایاں ہے۔ناول نگار نے اس مقامیت بودوباش اور رہن سہن کو بھی خوب نمایاں کیا ہے۔پنجاب کی دھرتی کی یہ مقامیت اپنے خاص مقامی رنگ بکھیرے نظر آتی ہے۔جاٹ قوم کی برتری ہے۔سردار اور چوہدری ان علاقوں کے بڑے زمیندار اور اعلی طبقے کے لوگ ہیں۔ان کے گرد مقامیت قائم ہے۔1929ء کے زمانے میں ان علاقوں میں قدیم زمانوں سے رسم و رواج موجود ہیں۔رہن سہن سادہ ہے۔خوشی اور غمی کے موقعوں پہ یہ لوگ اپنا دل وسیع کرتے ہیں اور مختلف انواع واقسام کے کھانوں سے مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں اور برادری میں اپنا نام اونچا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس زمانے میں کچے مکانات زیادہ تھے۔تاہم چوہدریوں اور سرداروں کے گھروں کا انداز اور سجاوٹ دوسرے گھروں سے انہیں ممتاز کرتی ہے۔ناول میں مقامی بودوباش کی تفصیل سے مرقعے ملتے ہیں۔ان لوگوں کی طرز زندگی کا ہر رنگ مصنف نے گہرے شعور سے واضح کیا ہے۔

"ان زمانوں میں شیشے کی ایسی بہتات نہ تھی۔چینی کے برتن بھی کم ہوا کرتے تھے۔کچے مٹی کے برتنوں میں کھانے پینے کا رواج تھا۔محلہ مغربی کے جٹوں کے پاس بھی کچے پیالوں اور رکابیوں،ہانڈیوں اور تالیوں کے سوا کچھ شے نام کو نہ ہوتی تھی۔لالٹین بھی شاذ ہی کسی گھر میں ہوتی تھی اور وہ بھی خوشی یا غمی کے موقع پر روشن کی جاتی۔دیے جلتے تھے جو کچے ہوتے تھے۔"(101)

سادہ رہن سہن اور طرز زندگی کی جھلک یہاں کی مقامیت میں دیکھی جا سکتی ہے۔اس عہد میں پنجاب کے دیہات بنیادی سہولتوں سے محروم تھے۔دیہاتوں کا سادہ طرز زندگی شہروں تک رسائی کم تھی۔لوگ مقامی مصنوعات پہ ہی گزارا کرتے تھے۔باہر کی دنیا سے لوگوں کا تعلق کم ہی تھا اور عورتیں مقامی بنے ہوئے برتنوں سے گھروں کو سنوارتی ہیں۔پھیری والے خوانچہ فروش مقامی خواتین کی دلچسپی کا ذریعہ ہوتے۔ان کے لائے کپڑے اور دیگر اشیاء ان کے لیے کشش کا سامان رکھتی۔پیسے کی ریل پیل بھی نہ ہونے کے برابر تھی اور اکثر ان چیزوں کی خریداری کسی اناج یا فصل کے بدلے ہی ہوتی اور اگر مقامی برتن ساز ہے تو اسے فصل آنے پہ اس کا ادھار چکا دیا جاتا یوں بارڈر سسٹم کے ذریعے یہ مقامی زندگی چل رہی تھی۔مرد باہر کمانے کے لیے بہت کم ہی لوگ جاتے تھے۔

"کمہار دین دنیا سے بے خبر اس جوڑ کی مٹی کو چاک پر چڑھا کر بھانڈے برتن ڈالتا رہتا۔جو اس کے رزق کا سبب بنتے تھے۔وہ اس کے کوٹھے کے سامنے قطار اندر قطار سجے ہوتے اور دنیا پور کی عورتیں ان میں سے اپنے گھر کے لیے گھڑے،ہانڈیاں،چھنیاں،رکابیاں پسند کرتیں اور لے جاتیں۔ان کی قیمت ادا کیے بغیر۔۔۔کی ادائیگی ہمیشہ فصل آنے پر گندم یا گڑ کی صورت میں ہی ہوتی تھی۔"(102)

ناول نگار نے مقامیت کے بیان میں لوگوں کے طرز رہن سہن کو مقامی کرداروں کے ذریعے سے خوب واضح کیا ہے۔پنجاب کے دیہاتوں کی طرح لوگ چوپالوں،ڈیروں، تھڑوں اور داروں میں بیٹھے یہ لوگ حقے کے کش

لگاتے، اپنی زندگی کے فیصلے کرتے اور اس مٹی کے رنگوں میں اپنی پر امن زندگیوں میں خوش دکھائی دیتے ہیں۔ ناول نگار نے مختلف واقعات کے بیان میں ان تمام جگہوں/مقامات کا تذکرہ ان مقامی زندگی میں اس کی اہمیت کا تذکرہ ضرور کیا ہے۔ یہ لوگ اپنی سادہ طرز زندگی میں خوش ہیں اور اپنی روایات کو تھامے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں اپنا ایک سماجی نظام ہے۔ جس کے تحت وہ اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں۔ اس سماجی نظام سے کٹ کر اور ہٹ کر کوئی بھی اپنی زندگی کا تصور نہیں کر سکتا۔ ان کی زندگیوں کا محور اور مرکز اپنا ہی گاؤں یا مخصوص علاقہ ہوتا۔ کبھی فصلوں کی باتیں ہیں تو کبھی رسم و رواج اور کسی شادی بیاہ کے موقع پہ سب کا ایک جگہ جمع ہو جانا۔ ان لوگوں کی زندگی کے شب و روز کا قصہ تھا۔

"دن بھر اپنی زمینوں پر جانوروں کی طرح کی ماند مشقت کرنے، چارہ کاٹنے ہل چلانے، سہاگا پھرنے کے بعد تھک ٹوٹ کر زمیندار دارے یا چوپال کے صحن میں جوہڑ کے کنارے درمیان میں رکھے حقے کی نال گھماتے نتھنوں میں سے کڑوے دیسی تمباکو کا دھواں خارج کرتے اپنے مویشیوں کی صحت، فصلوں کی بڑھوتری اور پانی کی کمی کی تذکرے کرتے تو ان میں کہیں نہ کہیں بخت جہاں کی بات چھڑ جاتی۔"(103)

ایسی جگہیں اجتماعیت کا مقام ہوتی جہاں یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ دکھ سکھ کی باتیں کرتے اور ان کا غالب موضوع عموماً گاؤں میں پیش آنے والا کوئی اہم واقعہ، کسی بہادر نوجوان کے قصے یا کسی چوہدری کا متاثر کن واقعہ ہی ہوتا۔ مقامی دیسی خوراکوں کو جوان زمینداروں اور مقامی لوگوں کی صحت کی علامت سمجھی جاتی ہیں کہیں چاٹی کی لسی کا تذکرہ ہے تو کہیں تندور کی روٹیاں پکتی دکھائی دے رہی ہیں۔ پنجاب کے دیہاتوں کا خالص مقامی منظر ہر سو دکھائی دیتا ہے۔ کھیتوں میں ہل چلاتے، فصلوں کو پانی لگاتے، ہل چلاتے ان کسانوں کو تر و تازہ، ان کو تندرست کرنے کے لیے یعنی کہ مقامی دیسی خوراکیں کارگر ثابت ہوتی ہیں جس پہ بھی یہ نازاں اور فخر بھی کرتے ہیں۔ اس مقامیت کا خاصا یہ ہے کہ یہاں آج جدید طرز کے شہروں میں کسی احساس کمتری کا انداز نہیں ملتا بلکہ یہ مقامی لوگ اپنی ان چیزوں پہ خوش اور صابر ہیں۔ کھیتوں میں ہل چلاتے یا فصلیں کاٹتے ان کے جسموں سے بہتے ہوئے خون و پسینے کو طاقت بخشنے کے لیے دیسی خوراکیں ہی استعمال کی جاتیں۔

"اس نے چاٹی کا ڈھکن اٹھا کر کہا۔۔۔ چاچا ذرا جھانک لو۔۔۔ لسی کی سطح پر تازہ مکھن کا جو پیڑا تیرتا ہے وہ بے بے نے تمہارے لیے رکھا تھا۔۔۔ گندم کی چار موٹی روٹیاں جس آٹے سے گوندھی گئی تھیں اس کا ایک ایک ذرا خوب پکا ہوا اور نیم سرخ رنگت کا تھا۔"(104)

یہ وہ عہد تھا جب دیہاتوں میں کسانوں کے ہاں پیداوار بھی محدود ہوتی تھی۔ جدید طرز آلات مشینری وغیرہ وہاں تک نہیں پہنچی تھی اور نہ ہی کھادوں کا رواج تھا، ہر چیز خالص تھی اور ان کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی تھی۔ پنجاب کے دیہاتوں کی غذا، فصلوں، اناج کا بیان ناول میں مختلف موقعوں اور کرداروں کی نسبت ہوا ہے۔ دنیا پور، نت کلاں اور دوسرے دیہاتوں میں لوگوں کے رہن سہن، لباس، خوراک کا انداز یکساں ہے۔ لوگ اپنی مقامی

روایات کو ہر عنصر میں نمایاں رکھتے ہیں۔ پنجاب کے دیہاتوں میں لسی اہم غذا اور مشروب بھی، خالص گندم کی روٹی ان لوگوں کی خوراک ہے۔ ان مقامی لوگوں کا واسطہ باہر کی دنیا سے کم ہی بہت تھا کہ باہر سے کوئی نئی چیز ان کے لیے کم ہی آتی یہ لوگ اپنے مقامی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

ناول میں سانسی قبیلہ بھی موجود ہے۔ دنیا پور کے ساتھ ملحقہ آبادی بستی سانسی قبیلے کے افراد کی ہے۔ ان افراد کا بیان جہاں اس قبیلے کا اس مقامیت میں موجود ہونا بتاتا ہے وہیں اس مقامی قبیلے کے رہن سہن چال چلن کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ قبیلہ صدیوں پرانی روایتی اور قدیم زندگی گزار رہا ہے۔ ان کا لباس، خوراک، رہن سہن اور اپنا ایک روایتی نظام ہے۔ وہ جدید دنیا کے اثرات قبول کرنے کو تیار نہیں ہے بلکہ اسے بدلنے کو وہ معیوب سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی اس فطرت اور جبلت کو بدلنے پہ قادر نہیں سروہانسی کا بیٹا موتی کینیڈا جا کر پڑھا لکھا ہونے کے باوجود اپنی نسلی فطرت کو نہ بدل سکا اور اپنی قدیمی نسلی فطرت پہ قائم رہا۔ دنیا پور کی اس ہانسی بستی کے لوگ نہ کسی مذہب کے پاسداری کرتے ہیں اور نہ ہی وہ کسی چیز کو کھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر جاندار چیز کھانے کے لیے ہے۔ حلال و حرام کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔

> "دیگر کمی کمینوں کی مانند جثے کے لاغر اور لاچار نہ ہوتے تھے۔ نہایت تنومند اور مضبوط قد کاٹ کے ہوتے تھے اور وہ اس صحت کی توجیہہ یہ بیان کرتے تھے کہ قدرت نے جتنے بھی جانور اور چرند پرند پیدا کیے ہیں وہ سب کے سب کھانے کے لیے پیدا کیے ہیں اور جو لوگ دین دھرم کی قید میں رہ کر ان سے صرف چند جانور جائز سمجھتے ہیں تو ان کے بدنوں میں ان جانوروں کے ماسک کی کمی رہ جاتی تھی جنہیں وہ حرام یا مقدس سمجھتے ہیں انہیں کسی بھی جانور سے پرہیز نہ تھی۔۔۔کتے۔۔۔ جنگلی بلے۔۔۔ کچھوے۔۔۔ کھیتوں کے موٹے چوہے۔۔۔سانپ۔۔۔ گلہریاں اور خاص طور پر نیولے ان کی مرغوب غذا تھے۔"(105)

مقامیت کو بیان کرتے ہوئے ناول نگار نے مقامی طرز تعمیر کا بھی ناول میں بارہا بیان کیا ہے۔ مقامیت میں سرداروں چودھریوں کی پنچایتیں ان کے ڈیرے ادارے جہاں وہ بیٹھ کر پنچایتیں کرتے تھے۔ مقامی لوگوں کے فیصلے کرتے ہیں تو کبھی ڈیروں کا مقصد علاقائی سیاسی معاملات بھی ہوتا ہے۔ ناول نگار نے اس مقامیت کے بیان میں مقامی درختوں ان کی چھاؤں تلے بیٹھے حقہ پیتے چوہدھریوں، زمینداروں کے سانوں کی محفلوں کو بھی خوبصورت مرقع نگاری کے ذریعے سے پیش کیا ہے جو اس مقامی زندگی میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

> "جاٹوں کے دارے یا چوپال کے صحن میں شیشم کے بلند اور گھنے شجر کی ٹہنیوں سے بندھ جھولا بھی جس کا مارا ہوا یوں ساکت تھا جیسے اس کی رسی پٹ سن سے گندھی ہوئی نہ ہو پتھر کی ہو۔"(106)

مقامی چودھری کے کردار میں مقامی لوگوں کے لباس وضع قطع کا بیان بھی ملتا ہے۔ مقامی طور پر معاشی آسودگی کے باعث مقامی چودھریوں کا لباس، رہائش بھی باقی لوگوں سے نمایاں ہوتی۔ بخت جہاں کا کردار میں اس

مقامی امیر طبقے کے افراد کی نمائندگی ملتی ہے۔چودھری بخت جہاں اپنے علاقے کا چودھری ہے۔اس لیے لباس کے انتخاب میں بھی دوسروں کے لیے مثالی ہے۔اس کا لباس اس کے عہدے کی پہچان ہے جس کا روعب ودبدبہ صرف اس کے مقامی گاؤں میں بلکہ کئی گاؤں تک قائم ہے اور وہ اپنے اس نسلی تفاخر کو قائم رکھنے کے لیے اس روایتی لباس کا استعمال کرتا ہے۔

"بوسکی کے سفید کرتے اور تہبند میں، گلے میں گیندے کے ہار ڈالے عطر پھلیل کی خوشبو میں مہکتا بخت جہاں اور پاؤں میں چکوال کے موچی خدا بخش کا خالص سونے کی تاروں سے کاڑھا ہوا نازک کھسہ اور ہاتھ میں بہاول پوری مٹی کا کاغذ سے بھی ہلکا مٹی کا پیالہ جس میں سے پہلے توڑ کی شراب جھلکتی تھی وہ بھی دودھیا دکھائی دے رہی تھی۔"(107)

مجموعی طور پر ناول کا پھیلاؤ تین نسلوں تک ہونے کے باوجود بھی مقامیت کا بیان ہر عہد میں ملتا ہے۔زمانے کے بدلنے کے باوجود مقامی کردار ناول کے اختتام تک موجود رہتے ہیں۔ناولوں کے متحرک کرداروں کے ذریعے ناول میں مقامیت کو واضح کیا گیا ہے۔مقامی لوگ اپنے مقامی رنگوں کے ساتھ متحرک دکھائی دیتے ہیں۔لوگوں کے باہمی تعلقات رسموں،رواجوں یا مقامی زندگی کے شب و روز تمام پہلو مقامیت کو نمایاں کرتے ناول میں موجود ہیں ڈاکٹر شاہد نواز لکھتے ہیں کہ :

"اس ناول میں خطے کی جغرافیائی فطری اور مصنوعی مقامیت کے تال میل نے اس خطے کا وہ رنگ روپ دکھایا ہے جو قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔"(108)

پنجاب کی مقامیت کو بیان کرتے ہوئے ناول میں دنیا پور کی پوری آب وتاب کے ساتھ مقامیت موجود ہے۔جہاں کے لوگ اپنی اس مقامیت کے وفادار بھی ہیں اور اپنے ثقافتی ورثے کے امین بھی۔مابعد جدید نقطہ نظر کے حامل اس مقامیت میں ان تمام مقامی عناصر کی وضاحت ملتی ہے جو کسی بھی مقامیت کا خاصا ہوتی ہیں۔وسیع زمانی تناظر کے باوجود چوہدری بخت جہان کے پوتے کا واپس اپنے اصل کی طرف لوٹنا مابعد جدیدیت کے اس نقطہ نظر کی تائید ہے کہ فرد جدید دنیا سے دوبارہ اپنے اصل کی جانب لوٹ رہا ہے۔مقامی ثقافتیں مٹتی ضرور رہی ہیں مگر ان کے نمائندے اپنے ہی اصل کی جانب لوٹ کے ان کی بازیافت بھی کر رہے ہیں۔

شہر خالی کوچہ خالی ایک ایسے زمانے کی کتھا ہے،جب چین کے صوبے وہان سے اٹھنے والی وباءنے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ایسی خوفناک صورتحال جس میں انسان انسان سے ڈرنے لگا۔خوف کی فضا ایسی پھیلی کہ انسان سمٹ کر رہ گیا۔وباء کی احتیاط کے طور پر سماجی فاصلہ لازم قرار دیا گیا۔لوگ اپنے گھروں بلکہ گھروں میں بھی اپنے اپنے کمروں میں سے سمٹ کر رہ گئے۔لوگ ایک دوسرے سے خوفزدہ تھے۔چیزوں کو ہاتھ لگانے سے قبل اور بعد میں کئی بار ہاتھوں نے سینیٹائزر لگانے کے مرحلے سے گزرنا پڑتا۔ناول نگار نے اس زمانے کی عکاسی کرتے ہوئے ایک ایسی

کردار کی کہانی بیان کی ہے جو اس کی ذات کی گرد گھومتی ہے۔ ناول میں ایک شخص کے کرونا میں گزرے روز وشب کا قصہ ہے۔ ناول میں مقامی حوالے سے خاص نمائندگی ماسوائے چند عناصر کے زیادہ نہیں ملتی۔ ناول کا کردار واحد متکلم ہے۔ ناول کے کردار کی تنہائی دراصل اس ساری صورتحال سے دوچار کرتی ہے جب انسان قید تنہائی جیسی صورتحال سے دوچار تھا۔ یا یہ یوں کہا جائے تو بے جا نا ہوگا کہ اپنے سائے سے بھی خوفزدہ تھا۔ انسان ایک سماجی مخلوق ہے جو بہر حال ہر صورت اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ رہ کر عافیت محسوس کرتا ہے۔ اس تنہائی میں اس کے شریک پرندے ہیں جو انسانوں کی بستیاں ویران ہونے پر کسی قدر آسانی سے گھومتے پھرتے ہیں۔ ناول کے کردار کا زیادہ وقت اس تنہائی کے وقت کو گزارتے گزرتا ہے۔ اکیسویں صدی کی جدید دنیا کا فرد جو کمرے میں قید ہونے کے باوجود بھی دنیا کے حالات سے واقف ہے۔ وباء کی ہولناکی اس کی آنکھوں کے سامنے ہے جس سے اس کی بے چینی اور تشویش میں مزید اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ناول کا کردار ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ جو صاحب حیثیت ہے۔ دنیاوی آسائشوں کی فراوانی ہے۔ اس کے باوجود ایک مشکل دور سے گزر رہا ہے تو ایسے میں عام آدمی کے مسائل تو اس سے بھی بڑھ کر تھے۔ اس تنہائی کا مداوا نہ اس کے پاس ہے اور نہ ہی غریب آدمی کے پاس بلکہ وہ تو بوجہ مجبوری جراثیم سے کسی قدر کم کم خوفزدہ ہے بلکہ بھوک سے اس سے زیادہ خوفزدہ ہے۔

"ارسطو کا یہ قول man is a social animal ایک بیانیہ کے طور پر سامنے آتا ہے۔ انسانوں رشتوں ناطوں اور سماجی ضرورتوں کے پیش نظر سماجی جانور کا روپ دھار چکا ہے۔ کرونا وائرس نے اس بیانیہ کی رد تشکیل کر دی ہے۔ کرونائی صورتحال نے اس فلسفیانہ بیانیے کی ایسی ردِ تشکیل کی ہے کہ اب انسان ایک دوسرے کے سائے سے بھی ڈرتا ہے۔"(109)

ناول نگار ایک امیر طبقے کا نمائندہ ہے۔ لاہور کی مقامیت کا یہ کردار ایسی ہی کسی پر آسائش کالونی کا مکین ہے۔ جہاں مخصوص لوگ ہی رہائش پذیر ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک دولت، شہرت اور عہدے میں ایک دوسرے سے اپنی برتری ثابت کرنے والا، متکبر، اپنے حال تک محدود ایسی جگہ پر عموماً ایک دوسرے سے تعلق واسطہ کم ہی ہوتا ہے۔ مختلف علاقوں سے آکر بسنے والے یہ لوگ اپنے الگ شناخت قائم کر کے اپنی پرانی وضع داریوں کو اپنے آبائی علاقوں میں دفن کر آتے ہیں۔ آسائشوں کی فراوانی انسان کو ویسے بھی دوسرے انسانوں سے لاتعلق بنا دیتی ہے اور یہاں تو ہر کوئی اپنی الگ شناخت پہچان کا متمنی ہے تو ایسے میں کوئی پرانی وضع داریاں کو کیوں قائم رکھتا۔

"ان نئی بستیوں میں آپ کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ آپ کے ہمسائے میں کون رہائش پذیر ہے۔ عید بقر پر کوئی ملازم گوشت دے جاتا تھا کہ شیخ صاحب یا میاں صاحب نے بھیجا ہے اور خیر خبر تب ہوتی جب گھر کے باہر کاروں کا ہجوم نظر آتا ہے۔ بنے ٹھنے کلف لگے سفید کرتے شلواروں میں ملبوس لوگ افسوس زدہ شکلیں بنائے برآمد ہوتے جاتے۔"(110)

ان ویران اور تنہائیوں کے مکین زیادہ تنہائی کا شکار ہو گئے۔ وباء کے دنوں میں جب سماجی فاصلہ ضروری تھا تو ان میں رہنے والے لوگ زیادہ احتیاط برتنے لگے۔ ناول میں لاہور کی مقامیت کا بیان ضرور ملتا ہے۔ ناول محض واحد متکلم کے گرد گھومنے والی اس کہانی میں اس فرد کے شب وروز کا تذکرہ ہی ہے۔ ناول کے اس کردار کے ذریعے کرونا وباء کے عرصے میں اس وبا کی ہولناکی کا کسی حد تک اندازہ تو کر سکتے ہیں۔ تاہم عمومی صورتحال اور اس کی ہولناکی کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ ناول کا کردار تو پہلے ہی ایک ایسی جگہ رہائش پذیر ہے جہاں سماجی میل جول کی روایتی شکل موجود نہیں۔ محض واک کرنے یا پارکوں یا کسی اتفاقی ملاقات کے لوگوں کا میل جول روایتی نہ تھا۔ تاہم ناول میں بودوباش کے ضمن میں وبا کے دنوں کی تنہائی اور عمومی مسائل کا کسی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اکیسویں صدی کے منتخب ناولوں کو مقامیت کی ذیل میں دیکھا گیا ہے۔ ان ناولوں میں مختلف علاقوں کی مقامیت کا بیان ہے۔ جاگے ہیں خواب میں اور جندر میں ہزارہ کی ثقافت کا بیان ہے۔ اس کا طرز رہن سہن ناول نگار نے بیان کیا ہے۔ ناول میں زندگی کے مختلف رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ پوٹھوہار کی زندگی کے خدوخال کو گراں میں واضح کیا گیا ہے۔ نیلی بار کے لوگوں کی زندگی کا ثقافتی رہن سہن ناول نگار نے بیان کیا ہے۔ ان لوگوں کی خستہ خالی کے تناظر میں ان کا رہن سہن بیان ہوا ہے۔ مکانوں کی طرز سجاوٹ تمام امور کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ نیلی بار میں مقامی لوگ بے بیرونی لوگوں کے اثرات کا بھی بیان ہے۔ اس مقامیت پہ باہر سے آنے والوں نے بہت گہرے اثرات ڈالے۔ خس و خاشاک زمانے میں پنجاب کی ثقافت کو مختلف ادوار میں دکھایا ہے۔ مقامی رنگ بہر حال موجود رہتے ہیں۔ ناول نگار نے پنجاب کی خالص ثقافتی زندگی کو کرداروں کے تناظر میں بیان کیا ہے۔ غلام باغ میں مانگر جو قبیلے کے بیان میں ناول نگار نے ایک معدوم ہوتی نسل کی وضاحت کی ہے۔ ان کے خدوخال کو بیان کیا ہے۔ اس بیان میں مکمل جزیات سے ان کے رہائش، لباس ان مقامی باشندوں کی طرز زندگی کا احوال ملتا ہے۔ بھید اور دائرہ میں مقامی زندگی کے خدوخال نمایاں ہیں۔ لاہور کی زندگی، لاہوریوں کی خوراک، رہن سہن کو بیان کیا گیا ہے بعض ناول نگاروں کے ہاں محض لفظی بیان ہے جبکہ کچھ میں جزیات نگاری سے ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ ناول نگاروں نے مقامیت کو قریب سے بیان کیا ہے۔ بودوباش کے تناظر میں دیکھا جائے تو ان مختلف مقامی ثقافتوں کا خارجی پہلو بہتر انداز میں قاری کے سامنے آتا ہے۔ مقامیت کے عناصر مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر کی بھرپور وضاحت کرتے ہیں جس میں مابعد جدیدیت مقامی ثقافتوں اور ان کے بیانیے کو بڑی اہمیت دیتی ہے۔

2.3 مقامیت کا خارجی پہلو:

مقامیت کا ایک خارجی پہلو بھی ہوتا ہے۔ مقامیت کا اپنا خاص جغرافیہ، اس ماحول کے اندر رہتے ہوئے خاص رسم ورواج، زبان وبیان خوراک اور لباس مخصوص ہوتے ہیں۔ مقامیت کے یہ خارجی پہلو اس کو دوسری ثقافتوں سے

الگ پہچان عطا کرتے ہیں۔ ہر مقامیت کی زبان لازم نہیں کہ وہ کسی بھی ثقافت یا کسی بڑے ثقافتی گروہ سے یکسر مختلف ہو۔ تاہم اس میں مقامی نوعیت کے خاص الفاظ اور اصطلاحات ضرور موجود ہوتی ہیں۔ بسا اوقات محض لہجے کا فرق بھی اس کو ایک الگ شناخت عطا کر دیتا ہے۔

"جاگے ہیں خواب میں" کالو کیل ہزارہ کی ثقافت ہے۔ اس پہاڑی سرسبز و شاداب علاقے میں بسنے والوں کا اپنا خاص طرز رہائش، لباس، رسم و رواج ہیں۔ ان کی ایک الگ پہچان اور شناخت ہے۔ خاص رسوم و رواج ان کے مد نظر ہوتی ہیں۔ ناول میں کئی جگہوں پہ ان کی وضاحت ہے۔ ناول میں مقامی رسومات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ جو اس علاقے کی خاص روایت کا حصہ ہیں۔ ان کا تعلق جغرافیہ سے ہے۔ نور آباد کی بستی کے قیام کے بعد پہلے شخص کی موت کے وقت کئی ایسی مقامی رسومات کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان مقامی رسومات میں علاقائی ثقافت نمایاں ہے۔ جو اس خاص جغرافیہ میں رہنے والے لوگوں کی مخصوص پہچان ہیں۔

> "علی احمد اس بستی کا بزرگ ترین آدمی ہے۔ وہ میرے باپ کی جگہ ہے۔ خدا کرے اس کا سایہ تادیر ہمارے سروں پہ رہے۔ لیکن اس کی موت کی صورت میں وہ اس کی قبر کے تختے اس وادی کے بزرگ ترین کاہو کے تنے سے ہی نکالے جائیں گے۔ یہی ہماری صدیوں سے روایت رہی ہے اور میرے جیتے جی یہ روایت نہیں ٹوٹ سکتی۔ ویسے بھی علی احمد کے بعد عمر کے لحاظ سے میں تم سب سے بڑا ہوں لہذا میرا حکم ماننا تم پر فرض ہے۔ یہ سنتے ہی تینوں نے تعظیماً سر جھکا لیے۔"(111)

محض بزرگوں کا احترام ہی نہیں بلکہ دوسرے بھی پہلو یہاں پوشیدہ ہیں۔ کاہو کے پرانے درخت کے تنے سے تختے تیار کرنا ایک مقامی روایت ہے کاہو کا درخت اس مقامیت میں خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ جو ایک مقامی درخت کی حیثیت سے مختلف حوالوں سے ان کے کام آتا ہے۔ ان کی روزمرہ زندگی میں اس کی خاصی اہمیت ہے۔ نور آباد ایک نئی بستی جس کی بنیاد رکھی گئی۔ اس بستی کو پرانی روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے چلایا گیا۔ نور خان اور اس کا قبیلہ اس بستی میں آبسا لیکن ان کے اپنے آبائی رسم و رواج کی تقلید ملتی ہے۔ نور آباد میں بارشوں کی تباہی کے دوران ایسے کئی واقعات دیکھے جا سکتے ہیں وہاں ان کی مقامی رسم و رواج کا بیان صراحت سے ملتا ہے۔ اس مقامی فضا میں گھریلو خواتین کا اندرون خانہ کے علاوہ بھی دوسرے امور میں ہاتھ بٹانا شامل ہے۔ گھر کی خواتین مال مویشیوں کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ کھیتی باڑی میں بھی مردوں کی مدد کرتی ہیں۔ صابرہ ایک نوجوان لڑکی ہے جو گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح والدین کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ جو اس علاقے کے رسم و رواج کے عین مطابق ہے۔ جہاں پڑھنے لکھنے کا اتنا رواج نہیں ہے۔ تاہم گھرداری کے معاملات میں بچیوں کو مہارت سکھائی جاتی ہے۔ خصوصاً لڑکیوں کے معاملے میں کہ وہ اپنے علاقائی، سلائی کڑھائی کے ساتھ ساتھ اپنی ماؤں کے روزمرہ کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔

"اس نے دونوں گھڑے پانی سے بھر سر کا دوپٹہ درست کر کے اس پر انوں جمایا۔ دونوں گھڑے اوپر نیچے رکھے انہیں اٹھایا سر پر رکھا اور گھر کی طرف چل پڑی۔"(112)

ناول میں مقامی رسم رواج کے ساتھ ساتھ مقامی الفاظ کو بھی برتا گیا ہے۔ ناول میں ہزارہ کی مقامیت کو بیان کرتے ہوئے ناول نگار نے مقامی الفاظ کے ذریعے ان کرداروں کے بیان میں مزید نکھار پیدا کیا ہے۔ جسے وہ اپنے ماحول کے قریب تر دکھائی دیتے ہیں۔ ہر علاقائی ثقافت کے کچھ مقامی الفاظ ضرور ہوتے ہیں کبھی بولیوں کے لہجے کبھی الفاظ اور کبھی اکثر مختلف بولی ان کی ثقافت کا حصہ ہوتی ہے۔ ناول نگار نے ہزارہ کی ثقافت کو بیان کرتے ہوئے ان کرداروں کی بول چال میں مقامی الفاظ استعمال کیے ہیں جو اس مقامیت کو قاری کے تخیل کے مزید قریب ترین کر دیتے ہیں۔

"کروں گی بیٹا میں ذرا کٹوی تو رکھ لوں تمہارے ابا آنے والے ہوں گے۔"(113)

مقامی الفاظ کے استعمال سے ناول نگار کا گہرا مشاہدہ اور ہزارہ کی روایت و ثقافت سے تعلق کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ ناول میں ایسے الفاظ کی کثرت ملتی ہے جو مقامی زبان کا اہم حصہ ہیں۔ ان الفاظ کی اس قدر بھرمار بھی نہیں کہ اردو ادب کا قاری ان کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ تاہم ان کے متوازن معتدل بیان سے ہزارہ کی ثقافت کو اس کے قریب کر کے دکھایا گیا ہے جس سے ان کی معاشرت کو سمجھنے میں کافی حد تک آسانی ہو جاتی ہے۔ ان الفاظ کو اردو کا اس طرح سے حصہ بنایا ہے کہ وہ اس کا عیب شمار نہیں ہوتے بلکہ اردو کا قاری بھی کسی طرح سے ان کے مطالب اور مفاہیم تک پہنچ جاتا ہے۔

"اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے اس ناول کی زبان موجودہ دور کی زبان اردو ہے جس میں کوئی تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ مصنف نے علاقائی زبان ہندکو کے ان الفاظ کو جو اس ماحول کا حصہ ہیں اپنے بیانیے میں سمویا ہے۔" (114)

ناول میں مقامیت کے خارجی پہلوؤں رسوم و رواج، زبان کو بیان کو دیکھا جائے تو ناول میں تینوں عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ ناول میں مقامی الفاظ بھی ملتے ہیں۔ مقامی لوگوں کے باہمی تعلقات کے رسم و رواج ہو یا ان کی معاشی اور سماجی تعلقات سب ناول کا حصہ ہے۔ ناول میں مقامی سرداروں کی اطاعت، ان کی فرمانبرداری کا روایتی پہلو بھی دکھائی دیتا ہے۔ لوگ ان کی تعظیم کو اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ ان کے معاشی معاملات بھی ان کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی تعظیم ان کے لیے بالامر مجبوری بن جاتا ہے۔ صدیوں پرانی روایات کا تسلسل ہی کسی حد تک تہذیب کا ارتقاء بھی ہوتا ہے۔ ان روایات کے تسلسل سے ہی ان کی تہذیب چلتی رہتی ہے۔

"یہ ناول جاگے ہیں خواب میں اپنے اسلوب میں سرزمین ہزارہ کے کی تاریخ، ثقافت، تہذیب ورثہ، تمدنی رنگ، حسن فطرت حسن پر سیرت انسان کی سخاوت و شفاوت کا بیان، سچا کلام، بے لاگ تنقید، منظر نگاری، جذبات کی

ترجمانی اور سبق آموز باتوں کی ایسی امثال رکھتا ہے۔ جس نے اپنے عہد کے معاصر ناولوں میں ایک ذکر حیثیت عطا کردی ہے۔"(115)

"جاگے ہیں خواب میں" ہزارہ کی مقامی ثقافت کے بیان میں اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت ملتی ہے۔ مقامی رسم و رواج ہوں زبان و بیان یا بود و باش تمام کے ضمن میں مقامی کرداروں کے تناظر میں بیان ملتا ہے اور مقامی کرداروں کے ذریعے سے اس کی وضاحت بھی ملتی ہے۔ ناول نگار نے ہزاروی ثقافت کو عمدہ طریقے سے نہ صرف اردو ادب میں شامل کیا ہے بلکہ تاریخ میں اس کو محفوظ کرنے کا وسیلہ بھی بنے ہیں۔ ہزارہ کی ثقافت اردو ادب کے قاری پہ اس طرح منکشف نہ تھی جس طرح سے اختر رضا سلیمی نے اس کو آشکار کر دیا ہے۔ زندگی اور موت کے معاملات ہوں یا مقامی سرداروں کے معاملات ہر جگہ مقامیت کا بول بالا نظر آتا ہے۔

جندر میں بھی ہزارہ کی مقامیت کو بیان کرنے کا سلسلہ اختر رضا سلیمی نے جاری و ساری رکھا ہے۔ مخصوص سماجی نظام جو رسم و رواج کے تحت جڑے ہوئے ہیں۔ مقامیت کا خارجی پہلو جو اپنی اساطیر روایات اور رسم رواج کے ساتھ موجود ہے۔ یہ لوگ اپنی رسوم و رواج کے پابند اور پاسدار ہیں۔ انہی کے ساتھ کچھ مقامی اساطیر بھی شامل ہیں۔ ان مقامی اساطیر کو روایت کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ناول میں ایسی اساطیر کا بیان بھی ملتا ہے۔ جن کا اس مقامی زندگی میں اہم حصہ ہے۔ لوگ اسے یقین کی حد تک مانتے ہیں۔ جو نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ ان مقامی اساطیر کے لیے ان کو کسی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کی روایت ہی اس کے لیے کافی ہے۔ ہر علاقے کی طرح اس علاقے کی بھی مخصوص اساطیر اور روایات ہیں۔ جو اس مقامیت میں چل رہی ہیں بجو (جانور) کے بارے میں بھی ان کے ہاں کچھ اساطیری کہانیاں موجود ہیں جن کا بیان ناول میں کچھ اس طرح سے ہوتا ہے۔

"بجو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کائنات کی واحد مخلوق ہے جسے انسانی ٹخنوں میں دھڑکتی اس رگ کا پتہ ہوتا ہے جسے پکڑنے سے وہ مردہ اٹھ کر چلنا شروع کر دیتا ہے۔"(116)

مقامیت کی ان اساطیر کو روایت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کی تقلید لوگ روایت سمجھ کر کرتے ہیں۔ ان کو روایت کی سند حاصل ہوتی ہے۔ رسم و رواج ہو یا روایت ان کی تقلید بھی کی جاتی ہے۔ جو مقامیت کا انفرادی پن اور مابعد جدید عہد کی ایک آواز ہے۔ لوگ جدید دور کے ساتھ ساتھ اپنی مقامیت کے ساتھ مربوط دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ہاں ان کی رسم و رواج کی اہمیت بھی موجود ہے۔ ان کا معاشرتی نظام انہی رسم و رواج کے تحت چل رہا ہوتا ہے۔ قانون تحریری صورت میں بہت بعد میں یہاں آئے۔ ان کے اپنے روایتی قوانین ہی ان کی معاشرتی زندگی کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔ صدیوں سے چلنے والی اساطیر بھی یقین کی حد تک مانی جاتی ہیں۔ لوگ کسی خوف میں مبتلا ہوں یا کسی توہم پرستی میں، ایسی اساطیر کو بھی روایت کا حصہ تسلیم کر کے جاری اور ساری رکھا جاتا ہے۔ اس کے انحراف کی کسی کو مجال نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بزرگوں کی روایت کو توڑ کر ضعیف کہانیوں کی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس سے انکار کر

دے۔ بجو ایک جانور ہے۔اس کا نام بھی مقامی نوعیت کا ہے۔ یہ طاقت کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔اس کے بارے میں ان لوگوں کے مخصوص نظریات ہیں۔ بجو کے حوالے سے مشہور اساطیر کے حوالے سے ناول میں مزید کچھ اس طرح سے بیان ہوتا ہے:

"میرے علاقے کے بہت سے لوگ اب بھی اس کہانی کی صحت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو نہیں بھی رکھتے وہ بھی صدیوں سے چلے آنے رواج کے مطابق اپنے عزیزوں کی قبروں کو اس کی دست برد سے بچانے کے لیے اس پر کانٹے دار درختوں خاص کر جھنڈی کی پھینگیں رکھتے ہیں۔"(117)

مقامیت کے اصول و ضوابط کے تحت جہاں کھیتی باڑی ذریعہ معاش تھی وہیں اس مقامیت میں اس کو ایک رسم و رواج اور روایت کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ گاؤں کے تمام لوگ اگرچہ وہ زمین کے مالک ہیں یا کم اور نہ ہونے کے باوجود بھی ان کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔وہ ایک باقاعدہ رسم کی صورت میں مل کر فصل بوتے اور کاٹتے ہیں۔اس سماجی نظام نے ان کو آپس میں جوڑا ہوا ہے۔وہ ایک دوسرے کے لیے مددگار بھی ہیں۔زمین سے وفاداری کا تقاضا ہر صورت نبھایا جاتا ہے۔ اس تعلق کو توڑنے والا دراصل اس نظام کا مخالف یا اس سے الگ سمجھا جاتا ہے۔ان اصولوں اور رسم و رواج کی ہر صورت پاسداری کی جاتی۔ اگر کوئی اس کا انکار کر دیتا ہے تو معاشرہ اس شخص کا انکار کر دیتا ہے۔ مختلف امور میں اجتماعیت کے نظام کی جڑت بھی اسی وجہ سے قائم ہے۔ یہ رسم و رواج ان کو اپنی دھرتی اپنی ثقافت سے پاسداری سکھاتے ہیں۔

"ان دنوں گاؤں والوں میں سے اکثر کی گزر اوقات کا واحد ذریعہ کھیتی باڑی ہوتا تھا اور اگر کسی سال کوئی بھی شخص کسی وجہ سے بوائی نہ کر سکتا تو اسے زمین سے بے وفائی کا طعنہ دیا جاتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان دنوں وہ لوگ بھی جن کا ذریعہ معاش کچھ اور ہوتا سال میں دو مرتبہ اپنی زمین پر حل ضرور چلاتے تھے تاکہ زمین سے بے وفائی کے مرتکب نہ ہو سکیں۔"(118)

ناول میں مقامیت کو جہاں باقی جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہاں اختر رضا سلیمی نے ناول میں مقامی الفاظ کو بھی برتا ہے۔ان مقامی الفاظ کے استعمال سے اگرچہ اردو کے اسلوب پہ کوئی منفی اثر نہیں پڑتا لیکن اس مقامیت کی وضاحت ضرور ہوتی ہے۔مقامی الفاظ کو فن کارانہ انداز میں سمویا ہے۔مابعد جدید نقطہ نظر کے حامل اس ناول میں ان الفاظ کے استعمال سے مہابیانیے سے انحراف کا نقطہ نظر بھی مزید واضح ہوتا ہے۔ مقامیت اپنے الفاظ کے ساتھ نمایاں دکھائی دیتی ہے۔

"اس ناول کے لفظ لفظ سے اس علاقے کی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔اس ناول میں ہمیں پہاڑی گاؤں جیتا جاگتا دکھائی دیتا ہے۔ قاری ان علاقوں کے موسم اور وہاں کی پر مشقت زندگی کو محسوس کر سکتا ہے۔اس ناول کو پڑھ کر لگتا ہے جیسے ہم کوئی تحریر نہیں پڑھ رہے بلکہ کوئی ڈاکو منٹری دیکھ رہے ہیں۔ "(119)

ناول میں مقامیت کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے ۔رسم و رواج بود و باش ناول کے ذریعے دکھائی دیتے ہیں۔یوں اردو ادب کا قاری نہ صرف اس مقامیت سے روشناس ہوا بلکہ اس علاقے کی سماجی زندگی کا مشاہدہ بھی اس کی آنکھوں کے سامنے سفر کرنے لگا۔زبان کی چاشنی سے اس مقامیت کو سمجھنے میں مزید مدد ملتی ہے۔ناول نگار نے مقامی زبان کے الفاظ استعمال سے مقامیت کو مزید واضح کر دیا ہے۔ان الفاظ کی اس قدر کثرت بھی نہیں کہ کوئی گنجلک پن پیدا ہو اور اردو ادب کا قاری اس کو سمجھنے میں دقت محسوس کرے ۔

> "زبان میں بتدریج اور غیر محسوس انداز میں صوتی قواعد اور معنوی سطح پر تغیرات ہوتے رہتے ہیں ان سے زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور وہ بدلتے ہوئے سماجی، معاشرتی اور اقتصادی تقاضوں کو پورا کرنے کا وسیلہ بنتی ہے۔"(120)

زبان نہ صرف ابلاغ کا ذریعہ بلکہ کسی بھی علاقے کی ثقافت اس کی تہذیب اس کی معاشرت کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ اور وسیلہ ہے۔زبان کے الفاظ نہ صرف کسی خاص اصطلاح کے طور پہ استعمال ہوتے ہیں بلکہ ان کی معنوی وسعت ایک پورے ثقافتی اور تاریخی سلسلے کو بھی سموئے ہوئے ہوتی ہے۔ بعض اصطلاحات اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہیں۔اس لیے کسی بھی زبان سے واقفیت اس علاقے کے مقامیت کے دوسرے عناصر کی وضاحت کے لیے بھی ضروری ہے۔

> "دونوں ناولوں کے لوکیل کے طور پر ہزارہ کے دیہی علاقوں کا انتخاب اور پھر یہاں کی تہذیب و ثقافتی زندگی کی تمام رنگا رنگی اور نیرنگی کو جزئیات کے ساتھ تخلیقی عمل کا حصہ بنانا بھی سلیمی کے رد استعماری رویوں کا عکاس ہے۔"(121)

مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر کے حامل اس ناول میں مقامیت کے عناصر تمام وضاحت سے موجود ہیں ۔ مقامیت کے خارجی پہلو، زبان، اساطیر، رسم و رواج، روایت ناول میں مختلف مقامات پہ موجود ہیں جس کے ذریعے مقامیت کی وضاحت ملتی ہے ۔مابعد جدید نقطہ نظر کا حامل یہ ناول اپنے اندر ہزارہ کی مقامیت کے مختلف پہلوؤں کو سموئے ہوئے ہے۔ مقامیت کے پہلوؤں سے اس مقامیت کا پورا نظام واضح ہوتا ہے۔ناول نگار نے بیانیے کے اظہار میں بھی مقامی لفظوں کی آمیزش کی ہے۔مہابیانیوں کے تصور کے برعکس مقامی ثقافت کے مختلف پہلو نمایاں ہیں۔اس کے بیان میں خالصتاً مقامیت موجود ہے۔ جدیدیت کے اثر کے باوجود مقامیت کا رنگ نمایاں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جدیدیت کے اثرات کی وجہ سے ناول کے مرکزی کردار کا نوحہ بھی شامل ہے۔جو پرانی قدروں کے زوال پہ نوحہ کناں ہیں۔ نئی روایات کے باوجود وہ پرانی قدروں کو بیان کرتا ہے۔ایک ایسے نظام میں جہاں لوگ اپنے مخصوص نظام کے تحت زندگی گزار رہے ہیں، یہ مقامیت اپنے طور پر خود مختار مقامیت ہے جو اپنے مخصوص سماجی نظام کے تحت اپنی مخصوص شناخت کسی بھی طور پہ برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ناول میں اسی بات کا نوحہ پڑھا گیا ہے کہ آنے والے وقت /

جدیدیت نے اس مقامیت کو اس کی جڑوں سے الگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہاں کے لوگ خود بھی اس مقامیت کو اپنانے میں عار محسوس کر رہے ہیں۔ یہ اس اجتماعیت سے کٹ کے ایک ایسے نظام کا حصہ بن رہے ہیں جس کے ساتھ جڑنے سے اس مقامیت کے معدوم ہونے کے خدشات موجود ہیں۔ ناول میں مقامی بیانیے سے مقامیت کو شناخت ملنے کے ساتھ ساتھ مہابیانیے کو بات کا نوحہ پڑھا گیا ہے۔ جدیدیت نے اس مقامیت کو اس کی جڑوں سے الگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہاں کے لوگ خود بھی اس مقامیت کو اپنانے میں عار محسوس کر رہے ہیں اور اس اجتماعیت سے کٹ کے ایک ایسے نظام کا حصہ بن رہے ہیں جس کے ساتھ جڑنے سے اس مقامیت کے معدوم ہونے کے خدشات موجود ہیں۔ ناول میں مقامی بیانیے سے مقامیت کو شناخت ملنے کے ساتھ ساتھ مہابیانیے کے رد کا تصور بھی واضح ہوتا ہے۔ مقامی بیانیوں کی حمایت کے تصور کو تقویت ملتی ہے۔ جہاں مہابیانیوں کے تصور کے جمود کو بھی توڑتے ہوئے اہم کردار ادا کیا گیا ہے وہیں اس ثقافت اس کے رسم و رواج کے ذریعے سے بیان کر کے تاریخ کا ایک اہم حصہ بھی بنا دیا گیا ہے۔

ادھ ادھورے لوگ بہاولپور کے لوگوں کی گم شدہ شناخت کا نوحہ ہے۔ ناول میں مقامی شناخت کا مسئلہ اصل موضوع ہے۔ اس کے بیان میں ناول میں مقامی ثقافت کا بیان تفصیل سے ملتا ہے۔ ثقافت کے مختلف عناصر کی اس ناول میں کارفرمائی دیتے ہیں۔ ناول نگار نے ان تمام عناصر کی طرف توجہ دلائی ہے جو کسی بھی ثقافت کا اہم عناصر ہوتے ہیں۔ ناول میں مقامی رسم و رواج کے ساتھ ساتھ توہمات پرستیاں بھی بیان ہوئی ہیں۔ ایسے توہمات جو لوگوں نے اپنے اوپر لازم کر لیے ہیں یا ان کی مجبوریوں کی وجہ سے ان کی ثقافت کا حصہ بن گئے ہیں۔ ناول میں ایسی کئی رسومات کا تذکرہ ملتا ہے جو مقامی اعتبار سے اس نظام کا حصہ بن چکی ہیں۔ ناول میں مقامیت کے اعتبار سے کئی رسوم و رواج کا بیان ہے کچھ رسومات تو مقامی لوگوں کی یکساں ہیں۔ کچھ کا تعلق مذہبی حوالے سے سے بھی ہے۔ بنیادی طور پر سوم و رواج مقامی نوعیت کی ہیں جن کی پاسداری تمام ہی لوگ کرتے ہیں۔ تلسی کے بیان میں مقامی رسم و رواج ملاحظہ ہوں؛ جہاں عورتوں کا غیر مردوں کے سامنے بولنا اور سامنے آنا بھی معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ پردے کے رسم و رواج محض کسی خاص مذہب تک محدود نہیں بلکہ ان کا تعلق مقامی نوعیت کے رسم و رواج سے ہے۔

> "دروازے کی کنڈی کھول کر اس کی اوٹ میں ہو گئی مگر باہر سے کوئی اندر نہ آیا نہ ہی کوئی آواز۔ تلسی سمجھ گئی کہ کوئی اجنبی ہے۔ اس لیے ریاستی رواج کے مطابق تین بار ہولے ہولے تالی بجائی یہ بتانے کے لیے کہ اس وقت گھر میں کوئی مرد موجود نہیں۔"(122)

ناول میں شادی بیاہ کی مقامی رسم و رواج کا بھی بیان ہے۔ ان رسم و رواج کا تعلق مقامی نوعیت کا ہے۔ ان رسم و رواج میں مقامیت کے پہلو نمایاں ہیں۔ تلسی کی شادی کے موقع پہ جہاں مذہب کی تخصیص ہے وہیں ان کے ہاں بھی مقامی رسم و رواج کارفرما ہیں۔ لڑکی کو کئی روز تک زیادہ بننے سنورنے سے روکا جاتا ہے۔ اس کو خاص پردے میں

رکھا جاتا کہ اس پہ دلہن بننے کے بعد خوب روپ چڑھے۔اس کے علاوہ اس کو پردے میں خصوصی طور پہ رکھا جاتا ہے تاکہ اس پہ کسی آفت کا سایہ نہ پڑھے۔ان تمام رسم ورواج کا تعلق بلا تخصیص مذہب کے مقامی نوعیت سے ہے۔

"ان سب کا بہاولپور جانا بھی ضروری اور رات کو وہاں رہنا بھی۔ تلسی اس لیے نہیں جاسکتی تھی کہ اس کی رسمِ زلف کشائی ہو جانے کے سبب وہ سونتڑوں کی رکھ میں تھی۔۔۔ سبھی کا خیال تھا کہ کل نہ جانے کیا ہو لہذا بہتری اسی میں ہے کہ بنا کسی ڈھول ڈھمکے کے سادگی کے ساتھ پھیرے کرادیے جائیں۔"(123)

ناول میں خوشی و غمی کی مقامی رسومات کے ذریعے اس مقامیت کا یہ رنگ بھی نمایاں ہوتا ہے ناول نگار نے خوشی و غمی کی مختلف رسومات کی وضاحت کی ہے۔خوشی ہو یا کوئی خاص تہوار یا موقع مقامی ثقافت کا رنگ نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ناول میں مقامیت کا بیان مختلف زاویوں سے کیا گیا ہے۔وادھو کی ماں کی اولاد کی خوشی جہاں مقامی عورتوں کے جذبات کی عکاسی کی ہے وہیں اس کی خوشی کے اظہار میں مقامیت کی رسم ورواج کا بیان بھی ہوا ہے۔

"بچہ جیویں ہوویں۔۔۔ شریکوں کو کبھی نہ بتائیں تو پتہ لگ ہی جائے گا۔ویسے خوشی کا موقع ہے ہم کیوں چھپائیں۔میں تو تھال تقسیم کروں گی بتاشوں کا،لاچی دانوں کا اور جلیبیوں کا۔مگر جوڑا کپڑوں کا اور سو روپے کی موکھ۔۔۔وہ تو دے گا۔"(124)

ناول میں وادھو کی بیوی اور ماں کے کردار کے ضمن میں چند فرسودہ رسومات کا تذکرہ ملتا ہے۔ان مقامی عورتوں کو اپنے جذبات کی تسکین کے ساتھ ساتھ نسل کی بقاء کی بھی فکر ہے۔وادھو کی ماں اس سبب کہ اس کا بیٹا اور اولاد کے قابل نہیں اپنی نسل کو ختم ہونے سے بچانے اور بیٹے کو شرمندگی سے بچانے کے لیے ایسے جتن کرتی ہے جو نہ تو معاشرتی لحاظ سے قابل قبول ہیں اور نہ ہی مذہبی۔اس کے باوجود وہ ان فرسودہ رسومات کو اپنے ہاتھوں طے کرنا چاہتی ہے۔اس مقامیت میں ایسا ہوتا بھی آیا ہے۔ناول نگار نے ان فرسودہ دقیانوسی خیالات کو بھی ان کرداروں کے ضمن میں بیان کیا ہے۔اس اہم مسئلے کو بھی ناول نے ان کرداروں کے ذریعے بیان کر کے اس فرسودہ رسم بد کا پردہ چاک کیا ہے۔ مرد ہمیشہ اس معاملے میں عورت کو غلط ثابت کرتا ہے تو اسے بھی اپنی بقاء کی خاطر اس حد تک جانا پڑ جاتا ہے۔وادھو کی ماں اس کی بیوی کو خود کسی اور سے تعلقات قائم کرنے پہ آمادہ کرتی ہے۔ محض اس لیے کہ اس کی اولاد ہو جائے۔

"پتر کیسے سمجھاؤں تڈی بدلنا۔۔۔ادھیڑ عمر عورت سر پکڑ کر بیٹھ گئی بہت پرانی ریت ہے۔صدیوں پرانی ریت ہے صدیوں پرانی ہے تو نرا زہر کا گھونٹ مگر کیا کروں وادھو کی نسل کو بھی آگے چلانا ہے۔بیٹا یہ کوئی انوکھی بات نہیں جو کمی قصور اس میں ہے پھر بھی اپنے پیروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہا۔"(125)

دیہاتی عورتیں اس معاملے میں زیادہ جلد باز ہوتی ہیں کہ ان کی اولاد کی جلد اولاد ہو۔مگر یہاں سماج میں عورت کا یہ روپ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ سماجی بندھن کو بظاہر توڑنے کو تیار نہیں ہے۔مرد اپنی کمزوری کے باوجود بھی ہار ماننے کو تیار نہیں بلکہ اس کا بوجھ عورت کے سر تھوپنا چاہتا ہے۔اس بندھن کو نبھانے کے واسطے دونوں فریقین اپنے

جتن کر رہے ہیں۔ وادھو کی ماں کا کردار بھی ایک عورت کا کردار ہے۔ جو عورت کی مجبوری سمجھنے کے باوجود اپنے بیٹے کی ناکامی کو چھپانے کی غرض سے اپنی بہو کو بظاہر ہم دردی کے بہانے اس کا استحصال کرانا چاہتی ہے۔ ناول میں یہ توہمات پرستیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جو لوگوں کے خود ساختہ اور اکثر حقیقت کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔ بوپھے کے دربار کا بیان لوگوں کی مجبوری کا استحصال بھی ہے اور مہراں جیسی دکھی عورتوں کے درد کا علاج بھی ہے۔ بظاہر چلے کے نام پہ آبروریزی اور اس کے صلے میں الٹا نذرانے وصول کرنا فرسودہ رسم ورواج سے زیادہ کچھ نہیں۔ تاہم اس کے باوجود ایسے لوگ مقامی لوگوں کی عزت افزائی کے سبب لوگوں کا مالی وجسمانی استحصال کرتے ہیں۔

"مبارک ہو بھوپے سائیں نے تمہاری سن لی ہے فیصلہ ہوا ہے کہ آج رات بوپھا سائیں تمہاری لڑکی کے جن نکالنے کا چلا کرے گا اور ہاں جن ایک نہیں، پورا خاندان ہے جنات کا۔ اب موھ رکھ ناں میری ہتھیلی پر سوا روپے کی اور لڑکی پہنچا دے سامنے جنات والے حجرے میں۔"(126)

ناول میں مقامی زبان وبیان کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ناول نگار کا تعلق بھی سرائیکی علاقے سے ہے۔ اس لیے وہ یہاں کے مقامی زبان رسم ورواج کو بخوبی جانتے ہیں۔ زبان کسی بھی ثقافت کا نہ صرف بنیادی جز ہوتی ہے بلکہ اس کے ذریعے سے مقامیت کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ ناول میں مقامی کرداروں کی باہمی گفتگو کے دوران مقامی زبان کے مکالمے اور الفاظ کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ یہ مقامی الفاظ اس مقامیت کے ساتھ مخصوص ہیں جن کا مطلب اس تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔ ناول میں مقامی الفاظ جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً سنجوگ، مکلاوا، ادھ موئے، پکھی، کدھت وغیرہ خالص مقامی الفاظ ہیں۔ ناول کے کرداروں کے درمیان باہمی مقام مکالمے میں بھی مقامی لب ولہجہ دکھائی دیتا ہے۔

"ناسائیں ناں، ناراض نہیں ہو نا میرا سوہنا میں دیتی ہوں موکھ اور ہاتھ جوڑ کر دیتی ہوں، آج میری چھوہر کا چلہ ہو گیا تو سوائی بھی دوں گی۔"(127)

"وادھو نے دچھڑ کی دکان کی تھلی سے چھلانگ لگائی اور گھر کی طرف زیٹ ہو گیا۔"

ناول میں مقامی الفاظ کا استعمال مختلف موقعوں پہ ملتا ہے۔ زبان کے مخصوص الفاظ کسی بھی مقامیت کی پہچان ہوتے ہیں۔ مقامی کردار ان الفاظ اور جملوں کے ذریعے اپنا مافی الضمیر بہتر انداز میں بیان کر سکتے ہیں۔ ناول نگار نے اس پہلو کو بھی تو بطور خاص ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ ریاست بہاول کے بیان میں ناول نگار نے اس مقامیت کی بازیافت کر کے اردو ناول میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔

"محمد حفیظ خان کا قلم تحقیقی بھی ہے اور ہر بار ان کا موضوع تحقیق تلخ اور معاشرے کے شرمناک پہلو اُجاگر کرتا ہے۔ وہ ہر علاقے کی تہذیب رسم ورواج کو بھی بخوبی سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے ہر علاقے کی زبان بول چال بھی آپ کو ناول میں پڑھنے کو ملے گی۔"(128)

ناول میں رسم و رواج کا بیان ان کرداروں کے ذریعے سے ملتا ہے اور فرسودہ ذہنیت کے حامل افراد کا قدیم فرسودہ رسم و رواج کا بھی۔ زبان و بیان سے کرداروں کو اس مقامیت کی حقیقی نمائندہ بنا یا دیا ہے۔ ان کی بول چال نہ صرف ان کے ذاتی بلکہ معاشرتی ماحول کی بھی عکاسی کی ہے۔ ناول نگار نے مقامیت کے ان تمام پہلوؤں کو بھی بھرپور انداز میں اجاگر کیا ہے۔ بڑے ثقافتی گروہوں کے برعکس اس ناول کے کردار مقامی ہیں اور مقامی الفاظ کو ہی اپنی بول چال میں استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو ان کی انفرادیت بھی ہے اور ثقافتی شناخت بھی۔ "ادھ ادھورے لوگ" اس حوالے سے ایک اہم تحریر ہے۔ ناول میں مقامی بیانیے کی بھرپور وضاحت و نمائندگی ملتی ہے جو اس ناول کو مابعد جدید ناول کی فہرست میں لا کھڑا کرتا ہے۔

ناول میں ایک چھوٹی سی بستی بہاولپور سے چند کلو میٹر دور دریائے ستلج کے کنارے آباد ہے۔ ناول نگار نے اس چھوٹی بستی کے گرد پوری ریاست بہاولپور کی مقامی ثقافت اور تاج برطانیہ کا نوآبادیاتی عہد بیان کر دیا ہے۔ اس بستی کے مکین مقامی لوگوں کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ جو نوآبادیاتی حربوں میں بار بار استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ مقامی لوگ ہر لحاظ سے ان سے کمزور ہیں۔ ان میں موجود ضعیف اعتقادیاں ہی ان کے خلاف استعمال کی جاتی ہیں۔ 1875ء کے قریب کا زمانہ جب ہندوستان پہ کمپنی کی حکومت چل رہی تھی۔ وہ اپنے اقتدار کو مستحکم کر چکی تھی اور مقامی آبادی بھی ان کے ملک کی طرح ان کی ملکیت تھی۔ ناول میں بستی آدم واہن کے بیان میں ناول نگار نے بہاولپور اس کے ارد گرد کی مقامیت کو بیان کیا ہے۔ ان لوگوں کے رہن سہن رسم و رواج کے بیان میں مقامی ثقافت نمایاں ہیں۔ مقامی رسم و رواج کسی بھی مقامیت کے حالات کے تناظر میں ہی پروان چڑھتے ہیں۔ رسم و رواج کا تعلق ان کی زندگیوں کا ان کے حالات پہ منحصر ہوتا ہے۔ "انواسی" کا عنوان ہی مقامی لفظ ماخوذ ہے۔ ناول میں اس علاقے کی ایک مقامی رسم کا بیان ملتا ہے۔ لوگوں کے معاشی حالات اچھے نہ ہونے روزگار کے مواقع کم ملنے اور کم علمی کی وجہ سے معاشی حالات کی خرابی کے باعث ان لوگوں کا دارومدار مویشی اور لڑکیوں کے اغواء کرنا پیشہ کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے مقامی سطح پر لڑکی کی پیدائش ان کے خاندان کے کسی مشکلات کا باعث بن جاتی ہیں۔ بستی آدم واہن میں بھی اس پریشانی کے باعث لڑکی کا بچپن میں ہی کسی لڑکے کے ساتھ نکاح کر دیا جاتا تاکہ وہ اپنی منکوحہ کی حفاظت کر سکے۔ اس مقامی رسم کا تعلق جہاں فرسودہ نظام کی نشاندہی ہے وہیں مقامی لوگوں کی بے بسی بھی ظاہر کرتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار سنگری بھی اس رسم کا شکار ہے۔ سیدے سے اس کا بچپن میں نکاح کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس کی ملکیت تصور کی جاتی ہے اور "سیدا" بھی اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کا پابند ہے۔ مقامی لوگوں نے اپنی لڑکیوں کی عزت بچانے کا یہی ایک راستہ اختیار کر لیا۔

"جب کوئی معاشرہ احساس کمتری کا شکار ہو جائے تو اس کے اندر اس طرح کی چیزوں کا ہونا عام سی بات ہے اور یہی کچھ بہاولپور کے عوام کے ساتھ ہوا جو کہ انگریزی تسلط کا نتیجہ تھا۔"(129)

ناول میں مقامی رسم "مکلاوا" رخصتی کے متبادل کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ بچپن میں کئے گئے نکاح کی تکمیل کے لیے مکلاوا کیا جاتا ہے۔ لڑکا اپنے رشتہ داروں کے ہمراہ بارات کی صورت میں آتا اور اپنی منکوحہ کو رخصت کر کے لے جاتا ہے۔ ناول میں مقامی رسم ورواج کے ساتھ ساتھ مقامی لب ولہجہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہیں مقامی زبان کے الفاظ کا استعمال اور لہجوں کی صورت میں ملتا ہے۔ زبان کسی بھی مقامیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ زبان کے ذریعے مقامی کردار اپنے موقف کو بہتر انداز میں قاری تک پہنچا سکتے ہیں۔ مقامی زبان کے الفاظ ناول میں کئی جگہ موجود ہیں۔ ناول نگار نے مکمل جملوں سے تو گریز کیا تاہم لب ولہجہ اور الفاظ موجود ہیں۔

"توکل اکیلا مکلاوا کرے گا کیا نہ کوئی جنج ،نہ بارات، نہ کوئی وڈا، نہ ہمسایہ! ماسی حیران ہونے کے بجائے اب پریشان ہونے لگی تھی لہذا وہیں پیڑھی پر بیٹھ گئی۔"

"نہ پتر آنداں خمیس نہ۔۔۔"۔(130)

کرداروں کے بول چال میں مقامی زبان کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے مقامی کرداروں کے بول چال میں سرائیکی الفاظ کا بہترین استعمال کیا ہے۔ بول چال میں سرائیکی الفاظ اور اسم اور چیزوں کے نام بھی مقامی استعمال ہوئے ہیں۔ زبان کے ذریعے کسی بھی علاقے کی ثقافت اور تہذیب کو بہتر انداز میں بیان اور سمجھا جا سکتا ہے۔ زبان کے اعتبار سے سرائیکی الفاظ ناول میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں ان مقامی الفاظ کے ساتھ اسلوب رواں رہتا ہے۔ اس میں کسی طرح کا بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا بلکہ اردو کے ساتھ مل کر یہ الفاظ اس مقامیت کے تعارف کا باعث بنتے ہیں۔ ناول نگار نے زبان کے استعمال سے اردو ادب کے قاری کو سرائیکی زبان کے الفاظ سے بھی روشناس کرا دیا ہے۔

بستی آدم واہن کے لوگوں میں مقامی اساطیر بھی مشہور تھے۔ ان کے عقیدوں میں بزرگ درویش لوگوں کا خاص تصور موجود تھا۔ ان کے عقیدوں میں مذہبی رہنما اور ایسے بزرگان سے عقیدت کی مثال ملتی ہے۔ ان کے عقیدے اس قدر پختہ ہیں کہ ان بزرگوں سے منسوب جگہیں ان کے لیے مقدس جگہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی نسلوں کی عزت و تکریم بھی گویا ان کے ایمان کا حصہ ہے۔ آدم واہن بستی کے لوگ بھی ایسی کئی مقامی اساطیر پر یقین رکھتے ہیں۔ نسل در نسل چلنے والی اساطیر اس قدر مضبوط ہو جاتی ہیں کہ ان کی سچائی حقیقت تک پہچانی جانے لگی۔ کوئی کوشش نہیں کرتا اور نہ ہی اس نازک معاملے میں کوئی پڑھنا چاہتا ہے۔ ان چیزوں کی تکریم وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ان اساطیر کا مذہب، رنگ، زبان، قبیلے سے زیادہ مقامی ثقافت کا اثر ہوتا ہے۔ ثقافت کے اثرات گہرے ہوتے ہیں پھر اسے چاہے کسی بھی طرح موڑ لیا جائے۔ اس میں مذہب سے زیادہ تقدس کا پیرایہ کوئی اور ہو نہیں سکتا۔

"رت بدلی تو زندہ پیر کا نام بھی زندہ کرامت ہو گیا اور پھر ہر سال ان کا عرس اس دن کی مناسبت سے منایا جانے لگا۔ جس روز انہوں نے پتن سے اپنا پڑاؤ کسی نہ معلوم مسافت کی جانب اٹھا لیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کب کا واقعہ تھا مگر نسل در نسل ہر کوئی اسے اپنے باپ دادا سے سنتا چلا رہا تھا۔ جس طرح زندہ پیر کرامت کی اصل پہچان کے بارے میں کوئی بھی یقین سے کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسی طرح ان کا عرصہ پڑاؤ بھی اصرار کے پردے میں پوشیدہ تھا۔ مسلمان انہیں اللہ کا ولی، ہندو انہیں رام کا اوتا اور بدھ مت والے بدھ پیشوا جان کر ان کے میلے میں شریک ہوتے۔"(131)

انواسی میں مقامی ثقافت کے مختلف پہلوں کا بیان ہے۔ مقامی اساطیر سے زبان اور رسم و رواج تک تمام میں مقامی پہلو نمایاں ہیں۔ ناول میں بہاولپور کی مقامی ثقافت کے مختلف عناصر سے تفہیم ملتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے تصورِ مقامیت کا حامل ناول، بستی آدم واہن کے پیرائے میں اس پورے علاقے کے ماحول کے عکاسی کرتا ہے۔ انسان کی زندگی کی بقاء دراصل جنگ ہے۔ وہ اس کی بقاء کے لیے روز اول سے جدوجہد کرتا آیا ہے اور ہنوز یہ کوشش جاری ہے ۔ طاقتور کا خوف ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ کمزور انسان ہمیشہ طاقتور کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ ان دیکھی طاقتوں پر یقین کرتا ہے اور سامنے آنے والی طاقتوں کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے۔ مذہبی کردار ہو یا سیاسی دونوں کے ہاتھوں یہ کمزور انسان استحصال کا شکار ہوتے چلے آئے ہیں۔

نیلی بار کے قدیم لوگوں کے طرز زندگی مقامیت کے مختلف پہلوں کا ترجمان ناول ہے۔ طاہرہ اقبال نے اس علاقے کی مقامیت سے قاری کو روشناس کرایا ہے۔ اکیسویں صدی کے ناولوں میں مقامی بیانیے کی روایت کا تسلسل ہے، جو ان سے قبل بھی ناول نگاروں نے اپنایا ہے۔ بار کے رہتل میں رہنے والے لوگوں کی رسم و رواج، زبان، اساطیر کا بیان بھی ملتا ہے۔ یہ مقامی لوگ مخصوص معاشرت کے حامل ہیں۔ ان کی رسم و رواج مقامی نوعیت کی ہیں۔ جن میں ان کی قدامت یا فرسودگی کے ساتھ ساتھ ان کی مقامیت کا خاص رنگ موجود ہے۔ جو اس قطع زمین کے ساتھ جڑا ہے ۔ باہر سے آنے والوں نے مقامی ثقافت کو متاثر ضرور کیا لیکن اس کے باوجود تبدیلی کا عنصر بہت سست رفتار رہا۔ جس سے یہاں بہت سے بدعتوں کا وجود قائم رہا اور مقامیت کا رنگ بھی باقی رہا۔ ناول نگار کا خاندان بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو یہاں کی زمینوں میں آ بسے، ان لوگوں نے بھی مقامی اشرافیہ کے ساتھ مل کے مقامی لوگ جو پہلے سے محکوم تھے ان کو محکوم بنایا۔ مصنفہ نے ان مقامی لوگوں کا بیان کرتے ہوئے باوجود اس کے کہ وہ بھی اشرافیہ کے طبقے سے ہیں اس کے باوجود ان کی قدامت اور ان کے استحصال کو بیان کیا ہے۔

مقامی لوگوں کا خاص رسم و رواج تھا جن کے ہاں شادی بیاہ کے مخصوص رسم و رواج کے ساتھ ساتھ لباس رہائش کا طرز بھی مقامی رنگ کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ لوگ مخصوص سماجی نظام کے تحت آپس میں جڑے ہوتے

ہیں۔ان کا بیان ناول میں کثرت سے ملتا ہے۔ناول کا کینوس اگرچہ خاصا وسیع ہے۔تاہم اس کا مقامی بیانیہ اس کا اصل حوالہ ہے ڈاکٹر شاہد نواز اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

"مقامیت کی دل پذیر تشکیل میں نیلی بار بھی اہم کردار ادا کرتا نظر آتا ہے۔نیلی بار کا موضوع تو سیاسی اور سماجی صورتحال کے عکاسی ہے مگر بعض کرداروں، جزئیات جغرافیائی منظر نامے رسوماتی اور تفریحاتی واقعات اور خصوصاً اسلوب کے ذریعے مقامیت کا خوش کن اظہار ملتا ہے۔"(132)

اس مقامی علاقے کے ہاں خوشی غمی کے موقع پہ مخصوص رسم و رواج ہیں ۔مقامی افراد کا خاص طرز معاشرت ہے جو اس مقامیت کو واضح کرتا ہے۔ناول میں ایک شادی کی تقریب کے بیان میں ان مقامی افراد کے رسم و رواج کا اندازہ لگایا جا سکتا۔ناول نگار نے ان واقعات کو گہرے مشاہدے سے بیان کر کے ان مقامی رسم و رواج کو بیان کیا ہے۔مقامیت کے ان مخصوص رسوم و رواج کی وجہ سے ان کا مخصوص رنگ برقرار رہتا ہے جو دوسرے علاقوں سے ان کو مختلف بناتا ہے۔دلہن کو شادی کے موقع پر مخصوص مقامی رسومات کے مرحلے سے گزارا جاتا ہے۔یہ رسومات خالصتاً مقامی نوعیت کی ہیں۔" بار "کے قدیمی لوگ ان روایات کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان رسم و رواج کی پاسداری کرتے ہیں۔

"اب چار پائیوں کی اوٹ بنا کر ست بھرائی کو کھارے چڑھایا جا رہا تھا۔ہلدی ملے جو کے آٹے کی وٹیاں ململ عمر بھر کی میل سکھیاں سہلیاں اتارنے لگیں۔ سات پانیوں سے بھری رنگلی گھڑولی میں سے سات سہاگنیں پانی کے چلو بھر بھر نہلانے لگیں۔چار پائیوں کے چار اطراف دیوار بنائے کھڑی عورتیں کھارے کے گیت گا گا کر آنسوؤں میں بہتے چلی جا رہی تھیں۔ گویا جتنا ہنسی تھی اب اتنا ہی رونا تھا۔"(133)

شادی کی تقریبات کئی کئی دنوں تک چلتی رہتی تھیں ۔جن میں مقامی لوگ جوش و خروش سے حصہ لیتے۔جس گاؤں کی دلہن ہوتی تمام گاؤں والے اس کو اپنی بیٹی سمجھتے اور باراتیوں کو اپنا مہمان خیال کیا جاتا ہے۔یہ مقامی لوگ اپنی استطاعت کے مطابق جہیز کی رسم بھی ادا کرتے ہیں۔اس مخصوص سامان میں ان کی عمر بھر کی جمع پونجی اور جسمانی محنتوں کا صلہ ہوتا جو بیٹی کو رخصت کرتے دیتے۔ان مقامیوں کے نزدیک مذہب بھی ایک ماورائی شے تھی جس کے بارے میں ان کو زیادہ علم نہ تھا۔ وہ ان ثقافتی رسومات اور رواج کی پابندی ضرور ملحوظ خاطر رکھتے۔اسی طرح غم کے موقع پر بھی تمام گاؤں اکٹھا ہو جاتا عورتیں بین کرتی اور مرد باقی معاملات سنبھالتے۔

مقامی رسم و رواج کی ذیل میں دوسرا طبقہ جاگیر دار اور ذیلداروں کا تھا۔جن کی رسم و رواج بھی ان کی روایت کی پاسداری بھی،ان کے لیے ضروری تھی۔وہ جدید ہوتے ہوئے بھی ان قدیم رسم و رواج کو زندہ کرنے کے قائل تھے۔اس کی وجہ روایت کی پاسداری نہیں بلکہ ذاتی مفادات تھے۔ان رسموں کی قیمت چکانے والے دوسرے لوگ

تھے جبکہ ان کا فائدہ نسلوں سے ان کو ہی پہنچ رہا تھا۔وہ ہر رسم ورواج کی پابندی کے قائل تھے جس کا نظریہ کسی دوسرے کے استحصال پہ ہو۔

جاگیرداروں کے استحصال کا شکار ان کی اپنی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ناول میں ایسی ہی وضع کردہ فرسودہ رسومات دیکھنے کو ملتی ہیں۔مقامی نوعیت کی ان فرسودہ رسومات کا شکار ان جاگیرداروں کی اپنی عورتیں ہوتی ہیں۔ان عورتوں کو شادی کا حق حاصل نہیں ہوتا۔بیٹی ہو یا بہن وہ گھٹ گھٹ کر ہی مر جاتی ہے اگر وہ ان کی حدود کو توڑنے کی کوشش کرے تو اسے موت سے کم سزا نہیں دی جاتی۔اس کو کسی صورت بھی خاندان کی عزت وناموس خراب کرنے نہیں دے سکتے۔اس کی اصل وجہ ان کی جاگیریں اور زمینیں ہیں۔وہ لڑکیوں کی شادی اس لیے نہیں کرتے کیونکہ وہ اپنی جاگیروں کو تقسیم ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔ناول میں مصنفہ نے ان کے اس مکروہ کردار کو واضح کیا ہے۔وقت اور مفادات کی غرض سے بعد ازاں بعض کی بہو، بیٹیاں سیاست اور دوسرے سماجی معاملات میں دکھائی دیتی ہیں۔لیکن انہی جاگیردارانہ سوچ کے مطابق ان کے رویوں میں وہی روایتی جاگیردارنہ سوچ کی آبیاری ملتی ہے۔مقامیت کی ان فرسودہ رسوم کی بھینٹ نچلے طبقے کی عورتوں کے ساتھ ساتھ خود ان بڑے گھرانوں کی عورتیں بھی ہوتی ہیں جن کو حویلیوں تک محدود اور مقید کر لیا جاتا ہے۔ان کا اس حویلی سے جنازہ اٹھنے کا انتظار کیا جاتا ہے تاکہ ان کی جاگیروں کی ملکیت میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ناول میں پاکیزہ کا کردار انہی رسومات کی بھینٹ چڑھتا ہے۔ناول کے انجام تک موجود رہتا ہے۔منصورہ کا کردار ان فرسودہ رسومات کا شکار ہو جاتا ہے۔جو فطرتی جذبات کی رو میں بہہ کر ان رسوم کو توڑ ڈالتی ہے۔جس کے بدلے میں وہ مجرم قرار پا کر انہیں سوم کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔جو ان جاگیرداروں کے مقامی روایت کا مستند حوالہ ہیں۔

"نہیں کرماں سڑی دھیے نی تو جہنمی توماں کا سر لیا۔قدم قدم چلی تو باپ کی کھا گئی بھائی تیر اڈولا کیوں اٹھاتاری، بختا ل سڑی دھئیے ڈولے کے ساتھ مربعے جو اٹھتے تھے۔۔۔"(134)

ناول میں مقامی جاگیرداروں ذیلداروں کے وضع کردہ رسم ورواج اور قوانین کا جابجا تذکرہ ملتا ہے۔مقامی تصورات کے حامل اس ناول میں ان رسوم کا تذکرہ ملتا ہے جو ان کے احترام وعزت کے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے بن جاتے ہیں۔وہ اپنے احترام کو ہر صورت قائم رکھنے پر مصر ہیں کہ ان خدمت گاروں کو ان کا جائز حق بھی نہ دیا جاتا بلکہ حق جتانا تو صرف ان کا کام تھا۔وہ حق زندگی پر بھی ہو سکتا ہے عزت پر بھی وہ جس طرح چاہیں اپنے حق کو جتلا سکتے ہیں۔

"ماسی ستو چارخانہ کیس میں لپٹی رونگٹے کھڑے کر رہی تھی۔پاکیزہ کا دل رقت کے مارے کئی بار بھر آیا کہ وہ اسے کہہ دے کہ سامنے پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔لیکن اس گھرانے میں ایسا کیوں کوئی رواج نہ تھا کہ نوکر چاکر چارپائیوں پر بیٹھ سکیں۔بھاپ مارتی گرم دھول ہو کر کہرا جمی فرش زمین انھیں فرش نشین ہی رہنا تھا۔"(135)

مقامیت کے بیان میں ناول نگار نے مقامی زبان کے الفاظ کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے۔ مقامی الفاظ جا بجا ملتے ہیں جس سے اس مقامیت کا بیان زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ اردو میں اس مقامی بیانیہ کے ساتھ ساتھ مقامی الفاظ کا بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ناول میں مقامی دوہے، ٹپے گیت ناول کا حصہ ہیں جو ان کی ثقافت کی پہچان بھی ہے اور اپنے جذبات کی عکاسی کا ذریعہ بھی۔ ناول نگار اس مقامی پہلو کو کامیابی سے برتتی دکھائی دیتی ہیں۔ مقامی لوگوں کے بیان میں کئی الفاظ مقامی نوعیت کے بھی استعمال ہوتے ہیں اگرچہ یہ علاقہ بھی پنجاب کی حدود میں شامل ہے لیکن مقامی سطح پہ لہجے اور الفاظ کا فرق واضح ہے جو اس مقامی دھرتی کی شناخت کا اہم حوالہ بھی ہے۔ ڈاکٹر محمد ہارون عثمانی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> "اردو میں پنجابی کی آمیزش اس ناول کا رشتہ دھرتی کے ساتھ جوڑتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست ہو گا کہ ناول کا کینوس افقی نہیں بلکہ عمودی ہے اور زمین کے سینے میں اترا ہوا ہے۔ اس کی جڑیں زمین کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ کسی انجان دیس اور بے گانی فضاؤں میں سانس نہیں لیتی کہانی کا بیان نہیں ہماری دھرتی کا باس ہے۔" (136)

ناول کے آغاز میں مقامی دوہے اور ماہیے ناول کا حصہ بنائے گئے ہیں۔ مقامی رسم و رواج شادی بیاہ کے موقعوں پر ان اشعار کا پڑھنا مقامی ثقافت کا اہم تصور کیا جاتا تھا۔ یہ شعر نوجوانوں کے جذبات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ مقامی ثقافت کا پرچار بھی کرتے ہیں۔ خوشی کے موقعے کے علاوہ چرواہے ان کو اپنی تنہائی کا مداوا بھی بناتے ہیں۔ اس حوالے سے ناول سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بازار وکادیاں توریاں
تینوں عاشقاں دیندیاں لوریاں
پھل چاہیے ڈیرے تو
کس سمجھایا ای من چایا ای میرے توں
بازار وہ کاندیاں سوتاں
مینوں رہندیاں تیریاں سوچاں
چوہے تے بتیاں دویاں دیاں
کوئی نہ سندا عرضاں دکھی انساناں دیاں(137)

کسی بھی مقامیت کی بولی یا زبان اس کا خاصا ہوتی ہے۔ اسی مقامی زبان/بولی میں مقامی فنون لطیفہ کا میڈیم بھی اسی مقامی زبان میں ہوتا ہے۔ موسیقی کے ان بولوں میں مقامیت کا بیان ہوتا ہے۔ مقامی ثقافت کے رنگ اس میں ہی نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ ماہیے مقامی ثقافت کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں مقامی بولی کے الفاظ بھی شامل ہیں، ناول میں مقامی

بولی کے الفاظ سے ناول میں مقامی بیانی زیادہ واضح ہو گیا ہے۔ مقامیت کے بیان میں مقامی الفاظ کا استعمال شاعری کا استعمال ہو یا رسم و رواج کا بیان ناول نگار نے مہارت کے ساتھ اس بیانیے کا مقدمہ پیش کیا ہے۔ان اشعار میں ثقافت کی جھلک بھی نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ جو روزمرہ کی اس مقامی زندگی کا بہترین مرقع ہے۔

"پنجاب کے روایتی لوک گیتوں، ڈھولے ،ماہیے کو ناول کا حصہ بنا کر پنجاب کی سیدھی اور کھری تصویر پیش کی ہے۔"(138)

ناول میں مقامیت کے بیان میں مقامی رسم و رواج کا بیان ہو یا مقامی الفاظ کا استعمال ناول نگار نے اس کو گہرے مشاہدے اور فن سے اس کا حصہ بنایا ہے۔ ناول میں اس کے بیان سے مقامی بیانی مزید مستحکم انداز میں قاری کے سامنے آتا ہے۔ مقامی ثقافت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور وہ اپنی مقامی شناخت برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتی ہے۔مقامی رسم و رواج کے محض ایک تصویر نہیں بلکہ منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کا بیان ناول میں ملتا ہے۔ جسے اس مقامیت کے سمجھنے میں بہت حد تک مدد ملتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ خالص مقامی الفاظ کے استعمال سے ناول نگار نے اردو ادب کے قاری کو نہ صرف روشناس کرایا بلکہ ان متروک ہوتے الفاظ کو بھی تحریری صورت میں محفوظ کر دیا ہے۔

ہر مقامیت کی ایک ثقافت اور سماجی نظام ہوتا ہے ۔ گراں خطہ پوٹھوہار کی مقامی ثقافت کا نمائندہ ناول ہے۔اس ناول میں کے پوٹھوہار کی مقامی ثقافت کو بھرپور انداز میں بیان کیا ہے۔ ناول میں مقامی ثقافت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ خارجی عوامل میں زبان کو ناول کے کرداروں کے ضمن میں دیکھا جا سکتا ہے۔"گراں " میں مقامی ثقافت کے زیر اثر رسم و رواج بھی ناول میں ملتے ہیں۔ مقامیت کے بنیادی سماجی رسم و رواج میں جن کے تحت یہ لوگ آپس میں جڑے ہیں۔ان کی نسلیں ان کی پاسداری کرتی ہیں مصنفہ نے اس مقامیت کو ناول کے کرداروں کے ذریعے سے اجاگر کیا ہے

"گراں کا نمایاں وصف یہ ہے کہ پوٹھوہاری ثقافت رسم و رواج اور بول چال کا اصل رنگ پیش کیا گیا ہے۔"(139)

ناول گراں پوٹھوہار کی ثقافت اپنے دوسرے عناصر کے ساتھ متحرک دکھائی دیتی ہے۔ان مقامی لوگوں کی رسم و رواج خوشی غم کے معاملات ناول کے کینوس پہ نظر آتے ہیں۔ان مقامی لوگوں کی رسم و رواج کے مطابق عورتوں کی شادیاں مقامی گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ ہی ہوتی تھیں۔ان کی رسم و رواج کے مطابق پیدائشی طور پہ ہی لڑکیاں اپنے ہم عمر لڑکوں سے منسوب ہو جاتی تھیں۔ گاؤں کی کسی لڑکی کی شادی کبھی گاؤں سے باہر نہ ہوئی تھی۔ اگر اس کا منگیتر واپس نہ لوٹے تب بھی وہ اسی کے نام پر ساری زندگی گزار دیتی۔ اس مقامیت کا یہ رسم و رواج ایسا تھا کہ کوئی اسے توڑنے ہے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بزرگوں کا فیصلہ مرد عورت دونوں کو ماننا پڑتا وہ کسی طور اس سے منحرف نہ ہو سکتے تھے۔ عورتیں انہی ناموں پہ اپنی زندگی گزار دیتی۔ ناول میں ایسے مقامی کردار شامل ہیں جو عورتیں اس رسم کو

نبھاتے نبھاتے اپنی زندگی گزار دیتی ہیں چاہے ان کے نام لگے مرد عمر بھر ان کو اس تنہائی کے کرب میں ہی مبتلا ہو کے گزارنی پڑے۔ وہ ان کو چھوڑ کے دوسری عورت کی طرف چلے جائیں۔ یہاں پہ بھی مقامیت کے اس رسم میں عورت کا کردار ہی مظلوم دکھائی دیتا ہے کہ مرد تو پھر بھی روزگار کے سلسلے میں یا کسی وجہ سے باہر گئے اور واپس پلٹنے کی جسارت نہ کی۔

"ایک بار جو نام ساتھ جڑ گیا، بس جڑ گیا۔ یہ تو پوٹھوہار کی ریت نہیں توبہ توبہ ایک واری جھٹری منگی گئی مرد دیکھا نہ دیکھا بس اسی نام کے ٹرلگ عمر گزار دی۔" (140)

پوٹھوہار کی رسم رواج کے بیان میں ناول میں موت اور خوشی کی رسم و رواج کا بیان بھی ہے۔ ان مقامی روایات میں خوشی کا موقع ہو یا غم کا دونوں صورتوں میں اس کے اثرات کئی دنوں تک آس پاس کے دیہاتوں پہ بھی موجود رہتے۔ موت کی وقت مختلف علاقوں کے قریبی شہروں اور دیہاتوں سے تعزیتیں آتیں اور ماتم ہوتے ان کی تواضع کے لیے روزانہ دیگیں پکائی جاتیں۔ بکرے ذبح ہوتے عورتیں کھانے کا سارا انتظام بھی کرتی ہیں اور ماتم میں بھی شامل ہوتیں۔ اس مقامیت میں کسی کے مرنے کا غم بھی پورا علاقہ نہ صرف محسوس کرتا بلکہ اس میں عملی طور پر شریک ہوتا۔ عورتوں کا 40 دن تک ماتمی گھر میں آنا اور بین و گریہ زاری کرنا یہاں کے رسم و رواج کا ایک اہم حصہ تھا۔ ان رسوم سے اس مقامیت میں انسان کی وقعت اور وقار کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کس قدر اہم تھا کہ اس کی موت کا دکھ کئی گاؤں مناتے۔ اس کے ورثا کا غم بانٹتے ہیں۔ خوشی کے موقع پر بھی یہ لوگ آپس میں مل جل کر اس خوشی کو مناتے یہ دکھ سکھ ان کا سانجھا ہے۔ غم اور خوشی دونوں کو مل کر بانٹ کر گزارا جاتا۔ شادی والے گھر کئی روز کا جشن ہوتا لوگ اس کی خوشیوں میں شریک ہوتے۔ شادی کے موقع پر دو شالے کی خاص رسم ادا کی جاتی جتنے زیادہ دوشالے ہوتے اتنا ہی زیادہ شادی کا بڑا جشن ہوتا۔ جو ان تمام گھروں میں برپا ہوتا۔ ان کی سماجی جڑت میں یہ رسم اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔

"اصغر خان کے گیارہ دوشالے پڑے تھے پوٹھوہار میں دوشالہ کسی بھی خاندان کے لیے بڑا اعزاز ہے۔ جو عمر بھر کا پکا اور گوڑا رشتہ بن جاتا ہے۔ دوشالے بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے کی شاہ مات کے ساتھ شادی میں شریک ہوا ۔ جیسے ان گیارہ گھروں میں سے ہر ایک میں شادی کا ہنگامہ برپا ہو۔"(141)

ناول میں مقامی اساطیر کا بیان بھی ان کرداروں کے ضمن میں ملتا ہے۔ مقامی لوگ بعض اساطیر کے قائل ہیں جو نسل در نسل ان کے چلتے رہتے ہیں۔ بلاشبہ پوٹھوہار کا جغرافیہ ایسا ہے کہ اس میں ویرانے، پہاڑیاں اور جنگلات بھی ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ چند اساطیر جوڑ دی گئی ہیں۔ جیسا کہ وہ واقعی اصل کہانی کا رنگ ہو جنات کی کہانیاں اور کچھ درویشوں اور پیروں کی کرامات اور کرشمات بھی ان علاقوں میں بہ نسبت دوسرے علاقوں کے زیادہ پائی جاتی ہیں ایسی چند مثالیں اس مقامیت کے بیان میں ملتی ہیں:

"جنات انسانوں سے بڑھ کر مرے ساری رات کسوں سے بینوں اور چیخوں کی جنوں کے رونے پیٹنے کی آوازیں آتی رہیں جنوں اور انسان کی لاشیں سڑ گئیں۔ گند چھوڑے ماس کی بو سے درندے جو ان کہیں کو منہ کر گئے۔"(142)

مقامیت کے خارجی پہلو میں سب سے نمایاں عنصر زبان ہے۔ زبان کسی بھی کلچر کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ بلکہ زبان ہی کلچر کا حصہ ہے۔ زبان سے ثقافت کے اصل نمائندگی ہوتی ہے۔ زبان میں اس کی پوری ثقافت روایات کا بیان بھی ملتا ہے۔ ناول گراں میں زبان کی بات کی جائے تو ناول میں پوٹھوہاری زبان کے الفاظ کی کثرت ملتی ہے۔ ناول نگار کا اپنا تعلق بھی اسی مقامیت کے خمیر سے ہے۔ اس ناول کو مقامیت کے رنگ میں زبان کے ذریعے بھرپور رنگا ہے۔ پوٹھوہاری الفاظ کے استعمال سے اس کے جملوں نے اس ثقافت کے بیان کو واضح اور نمایاں کیا ہے۔ زبان کے مقامی الفاظ کے ذریعے سے مقامیت کے کردار اپنا ماضمیر بہتر انداز میں بیان کر سکتے ہیں۔ ناول میں مصنفہ محض پوٹھوہاری الفاظ کا استعمال نہیں کرتی بلکہ پورے پورے جملے اس میں لکھ جاتی ہیں۔ اس حوالے سے چند جملے ملاحظہ ہوں:

"ہو کولوٹی ہائے لوٹی! پورے اٹھ دیہاڑے وج وج کے باجا گاجا ہوا ہائے ہائے"

"کدمڑ سو کڑی گڈی تو لہسواڈیک اُڈیک اکھیاں رتی تھیاں ہاریاں"(143)

"ہائے مری کچھیں پھٹرے اُٹھ تہاڑا نکاح اے"(144)

زبان سے جذبات واحساسات کی صحیح انداز میں ترجمانی ہو سکتی ہے۔ ناول کے کردار زبان کے استعمال کے الفاظ کے ذریعے سے ثقافت کے مزید قریب ہو جاتے ہیں۔ گراں میں پوٹھوہاری الفاظ نے اس مقامیت کو مزید ثقافت کو واضح کر دیا ہے۔ گاؤں کی گلیوں، چوباروں، چوراہوں، کھیتوں کی پگڈنڈیوں پہ چلتے پھرتے یہ کردار اس ثقافت کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔ ناول نگار کا آبائی علاقہ ہونے کے ناطے وہ زبان سے مکمل طور پر آگاہ ہیں۔ پوٹھوہاری زبان سے ثقافت کی ایسی مثال اُردو ادب میں اس سے قبل نادار ہے۔ تاہم جملوں کی کثرت اور مقامی الفاظ کی کثرت سے کسی جگہ یہ الفاظ اس کا عیب بھی بن جاتے ہیں کیونکہ اردو ادب کا قاری اس قدر ثقیل الفاظ سے ناواقف ہے۔ اس قدر زیادہ الفاظ میں مقامی زبان کا استعمال اور جملوں کے استعمال سے کسی جگہ عبارت میں بوجھل پن بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس تمام کے باوجود یہ اس مقامی ثقافت ایک اہم حوالہ بن جاتا ہے۔

"ناول نگار کا لسانی شور مقامی زبان کو پوری صحت کے ساتھ تازگی بخش رہا ہے۔ ناول نگار بڑی مہارت سے سلینگ کو معیاری زبان کے پہلو پہلو جگہ دی ہے۔ جس سے مصنف کے لسانی شعور کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے طاہرہ اقبال نے مقامی زبان کو ایک زندہ کائی سمجھ کر لکھا ہے۔"(145)

عالمگیریت کی یلغار میں جہاں گلوبل ولج کے تصور نے گلوبل لینگوئج (زبان) کو بھی رائج کر دیا ہے۔ دیہاتوں میں انگریزی میڈیم سکول طالب علموں کو انگریزی میں تعلیم دے رہے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی بھرمار نے مقامی زبانوں کو بھی تہس نہس کر دیا ہے۔ لوگ مقامی زبانوں کے دائرے سے نکل کر تیزی سے بڑے رابطے کی زبانوں کی طرف جا رہے ہیں۔ اپنی ثقافت کو آنے والی نسلیں اپنانے سے گریزاں ہیں۔ ایسے حبس زدہ ماحول میں ناول نگار کا یہ علمی کارنامہ ہے کہ اس نے اپنی مقامی زبان کو ناول کے ذریعے روشناس کرادیا ہے۔ مابعد جدید دور میں مقامی ماں بولی کو ایک نئے سرے سے ناول کا حصہ بنا کر اردو زبان کے قاری تک بھی اس کو پہنچانے اور اس کی بازیافت کرنے کا اہم کام کیا ہے۔

گرا ں کے مقامی زبان ناول میں بوجھل پن پیدا نہیں کرتی۔ پنجابی زبان سے تعلق رکھنے والے قاری تو اسے سمجھ جاتے ہیں جبکہ ان جملوں کا ترجمہ لکھ کر اس زبان سے ناواقفوں کے لیے بھی آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔ مابعد جدید تصور کا حامل یہ ناول مقامی زبان کے حوالے سے بھی ایک اہم تحریر ثابت ہوتا ہے۔ جہاں اس میں بہت سارے پہلو موجود ہیں وہیں لسانی حوالے سے بھی اس کی خصوصیات نمایاں ہیں کہ نسبتاً غیر معروف خطہ جو ایک مکمل مقامی ثقافت اور مقامیت کا حامل ہے اس کی ترجمانی کرنا اردو ناول کے لیے ایک اہم اضافہ ثابت ہوا ہے۔

دائرہ میں لاہور کی مقامیت کو ناول نگار نے موضوع بنایا ہے۔ لاہور کا قدیم ثقافتی ورثہ ہے۔ جو صدیوں سے اپنے دامن میں مختلف سیاسی، سماجی، ثقافتی عناصر، تصوف، مذہب، ثقافت، زبان، رسم و رواج کے ذریعے سموئے ہوئے ہے۔ اس خطے میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ لاہور کے ثقافتی رنگ نظر آتے ہیں۔ لاہور کی مقامیت کے بیان میں ناول نگار یہاں مختلف پہلوؤں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ اس کا خارجی پہلو بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ لاہور کی مقامیت کے پیرائے میں رکھ رکھاؤ رسم و رواج کا تذکرہ بھی ہے۔ مقامی زبان کے الفاظ کا استعمال اس مقامیت کو قاری کو مزید قریب سے دیکھنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ مقامی زبان کے الفاظ و لہجہ بھی ان کرداروں میں دکھائی دیتا ہے۔

"اس نے پھر سے نوجوان کی طرف دیکھا اور اس کے عقب میں دروازے کی اوٹ میں کھڑے اس کے باپ کو وہ اسے کمر میں ٹھوکے دے کر اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ پتر اے میاں آصف دا نا بچھڑے ہون۔ اونہاں دی نو دا پیکا ملتان ہے اے۔ اودھے بیکیوں نہ آئے ہون پیر و ہنے" (146)

ناول کے کرداروں کی مقامی زبان پنجابی ہے۔ اس کے کرداروں کے لب و لہجے میں نہ صرف پنجابی الفاظ بلکہ پورے پورے جملے موجود ہیں۔ ان مقامی کرداروں کے ہاں مقامی زبان کا بھی عنصر نمایاں ہے۔ قدیم محلوں کے رہنے والے ایک دوسرے سے شناسا ہوتے ہیں۔ ان کے مہمانوں کو اپنا مہمان سمجھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا ان کی سرشت میں شامل ہے۔ یہ ان کی مقامیت کا خاصا ہے۔ مقامی زبان کے الفاظ اور اسلوب کا حصہ ہیں۔

"ناول میں پنجابی الفاظ کا خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔ عاصم بٹ کے ہاں ماحول کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ عاصم بٹ کے ناول اندرونی شہر لاہور کا منظر نامہ اور کلچر اپنے اصل رنگ کے ساتھ جلوہ گھر ہے۔" (147)

ناول میں نوید اور نورین کے کردار کے ارتقاء کے وقت لاہور شہر کی زندگی بطور خاص نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ان کرداروں کے ضمن میں مقامی رسوم ورواج بھی بیان ہوئے ہیں چند ایک مقامات پہ ان کا بیان ملتا ہے۔نوید جب بھی نورین کے گھر جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ پھل وغیرہ لے کر جاتا ہے یہ رسم خلوص کی علامت سمجھی جاتی ہے کہ مہمان میزبان کے ہاتھ خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ناول کے مقامی کرادروں کے ان چھوٹے اعمال میں رسموں کی وضاحت ملتی ہے۔

"وہ ڈیڑھ کلو سیب اور ایک کلو انگور خرید کر ساتھ لایا تھا۔یہ موسم کا نیا پھل تھا اور تازہ تازہ بازار میں آیا تھا۔"(148)

ناول میں امتیاز علی خان موسیقار کا کردار بھی ایسا کردار ہے۔جو اس خاص طبقے کا نمائندہ ہے۔لاہور کی مقامیت میں ثقافت،ادب،آرٹ،فنون لطیفہ بھی اہم عناصر ہیں۔امتیاز علی خان موسیقار کے بیان میں اس طبقے کے رسم ورواج اور رکھ رکھاؤ کا بیان بھی ملتا ہے۔وہ اپنے طبقے میں استاد کے منصب پہ فائز ہے تو اس کے شاگرد اسے وہی احترام دیتے ہیں جو ایک استاد کا ہونا چاہیے۔

"گھر پر آنے والے قریب قریب سبھی لوگ اس بازار سے ہوتے اور ان کی گفتگو کا موضوع ہمیشہ ایک ہی رہتا موسیقی۔یہ گویے بھی تھے۔سازندے بھی اور کن رس بھی۔علاقے کی طوائفیں بھی خان صاحب سے ،،سیکھنے آتی اور ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگائیں لگاتی خوشبو میں معطر عمدہ لباس پہنے ہوتی اور امتیاز علی خان کا ہاتھ چوم کر ان کے برابر بیٹھ جاتی تھی۔(149)

ناول میں ناول نگار نے رشتوں کا پاس ولحاظ ان کا احترام بھی بیان کیا ہے۔مقامیت کا وصف لوگوں کے درمیان سماجی رابطہ بھی ہوتا ہے۔سماجی تعلق ہی کسی معاشرے کی بنیاد ہوتی ہے۔ناول نگار نے ان رکھ رکھاؤ کے عناصر کو بھی بیان کیا ہے۔راشد،امتیاز علی خان کے گھر میں رہتے ہوئے اس کی بیوی کو جو اسے سمجھنا نہیں چاہتی،اس سے احتراز کرتی ہیں۔اس کے لئے دل میں ماں کے جذبات رکھتا ہے۔وہ اس کو اس احترام سے نوازتا ہے۔جو ایک ماں اور امتیاز کو باپ کا پیار دینے کے بعد بدلے میں وہ بھی باپ کی طرح چاہتا ہے۔اس کا اظہار وہ اس وقت ہی کر دیتا ہے جب اس کے اپنے وسائل نہیں ہیں اور نہ ہی وہ اپنے قدموں پہ کھڑا ہوا ہے اس کے باوجود وہ ممتا کے احترام سے واقف ہے۔

"ایک بڑھیا شال،چھ نمبر سائز کے زنانہ جوتوں کا ایک جوڑا اور دو چاندی کے بندے خریدے لیے۔امتیاز علی خان کی بیوی نے بڑی خاموشی سے یہ سامان وصول کیا۔شال اسے بہت جچی۔جوتے پیروں میں پوری آئے۔عورت نے لڑکے کی سر پر شفقت اور محبت سے ہاتھ رکھ کر دعا دی"(150)

دائرہ میں لاہور کی مقامیت کے پیرائے میں مختلف رسم ورواج کا بیان ان مقامی کرداروں کے ذریعے سے ہوتا ہے۔یہ رسم ورواج خالصتاً مقامی نوعیت کے ہیں۔جس سے لاہور کی اس مقامیت کی وضاحت بھرپور طریقے سے

ملتی ہے۔ رشتوں کے مابین تعلق لحاظ مروت خلوص کے جذبات اس دھرتی کا خاصا ہے۔ جن کا اظہار اس ناول کے کرداروں کے ذریعے سے ہوتا ہے

ناول بھید میں لاہور کی مقامی زندگی کا بیان ہے۔ مابعد جدید نقطہ نظر کا حامل یہ ناول مقامیت کے مختلف پہلوؤں کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ لاہور قدیم ثقافتی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی اعتبار سے بھی اس خطے کا اہم علاقہ رہا ہے۔ لاہور کے قدیم علاقوں میں تنگ گلیاں بازاروں موجود زندگی رسم ورواج، مخصوص مقامی زبان، روایت اور زندگی کے تمام رنگوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ناول میں مقامی زندگی بیان میں ایسی رسم ورواج اور عقیدت کے پیرائے میں ڈوبی اساطیر بھی ناول کا حصہ ہیں۔ جن کا تعلق خالصتاً مقامی ثقافت سے ہے۔بھید میں ایسے تصورات کا بیان کم ملتا ہے۔ تاہم عاصم بٹ کے دوسرے ناول دائرہ میں ایسی رسومات کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ ناول میں کرداروں کے تناسب معاشرتی حیثیت کے مطابق مقامی زبان کے الفاظ کا بھی استعمال ملتا ہے۔ اس کی مقدار اس قدر نہیں کہ اسلوب پہ کوئی واضح اثر پڑے۔ ناول کے ان کرداروں کا لب ولہجہ بھی مقامی نوعیت کا ہے۔ ان کے لہجے میں مقامیت کی چھاپ نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ مقامیت میں رکھ رکھاؤ رشتوں کا پاس ولحاظ جیسی خصوصیات بھی اس کا خاصہ ہیں۔ رشتوں کا تقدس جس میں احترام اور لحاظ اہم وصف ہیں کہ کسی بھی سماج کی بنیاد اور اس کی مضبوطی اور کامیابی ہوتی ہے۔ ناول میں اس مقامیت کے ایسے اوصاف بھی شامل ہیں۔ ایک کردار کے حوالے سے ناول میں مصنف لکھتے ہیں:

> "امجد کی پرواہ کون کرتا ہے۔ وہ تھا بھی انٹرنس ابھی تو تھوڑا سا پہلے تو اس کی شادی ہوئی تھی۔ جیسا کم عمر خود تھا۔ اس سے بھی کم عمر اس کی بیوی تھی۔ ایک دن اسے اپنے دفتر لایا تھا تو میں نے پانچ سو روپے اس کی بیوی کو دیے نہ نہ کرتا رہا۔ میں نے کہا یہ رسم ہے۔ دی دھیانی کو لے کر آئے ہو خالی ہاتھ نہ جانے دوں گا اچھا نہ لگے گا۔"(151)

بھید کی مقامیت بھی لاہور کی ہے۔ بھید میں دائرہ کی نسبت مقامی عناصر کی ضمن رسم وراج کا بیان اس قدر تو نہیں ہے۔ اس کے باوجود اشارہ ضرور ملتا ہے۔ دفتر میں ہونے والے اس واقعے میں اس طرح کے لحاظ بیان ہے۔

غلام باغ میں مختلف مقامی ثقافتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ناول کے نمایاں کردار ہی اس کے قصے کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ مختلف ثقافتی گروہوں کی نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ناول میں مقامی کرداروں یاور عطائی، زہرہ ،کبیر مہدی، ڈاکٹر ناصر سمیت ہاف مین کا کردار بھی موجود ہے۔ اس کردار کے ذریعے ناول نگار نے مغربی لوگوں کی مشرق میں موجود تا حال دلچسپی اور تحقیق کے پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ کئی ایک مقامات پر وہ اپنی نسلی برتری اور تفاخر کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔ ہاف مین مقامی لوگوں کے اساطیر تاریخ پر ہی کام کرتا ہے۔

زبان کے حوالے سے مانگر جاتی قبیلہ ہو یا پوٹھوہار کا بیان ناول میں مقامی زبان کے الفاظ تو موجود ہیں تاہم زیادہ گہرا لسانی تاثر نہیں ابھرتا۔ ناول نگار نے مقامی علاقوں، جگہوں کے نام مقامی نوعیت کے رکھے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کے نام بھی مقامی نوعیت کے ہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ناول نگار نے مقامی درختوں مثلاًشرنہیہ، بیری، بیکڑ، سنتھا کے الفاظ استعمال کر کے مقامیت کی نمائندگی کی ہے۔ مقامیت کے کرداروں کے نمائندوں کے مکالموں میں اس مقامی لب ولہجے کا عکس بھی ملتا ہے۔ تاہم اس میں الفاظ کی کثرت اور بہتات نہیں ہے ۔جس سے اسلوب میں کوئی الجھن یا گنجلک کا گمان گزرے۔

ناول میں اساطیری حوالے سے بہت کچھ موجود ہے۔ پوٹھوہار کی مقامیت کے بیان میں ان کی مقامیت جن کی بنیاد مذہبی اور ثقافتی ہے، ناول نگار نے اسے بیان کیا ہے۔ چٹے سائیں کے بیان میں ایسی ہی اساطیر کا بیان ملتا ہے جو مقامی لوگوں میں نسل در نسل چلتی ہیں۔ جن کی صحت کا اعتبار بغیر کسی تحقیق نسل در نسل چلتا ہے۔ لوگ کم علمی کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے غیر معمولی واقعات کو کسی معجزے کے طور پہ اپنا لیتے ہیں۔ ان معجزوں کے مجاور اگرچہ اصل حقیقت سے آگاہ تو ہوتے ہیں تاہم اس حقیقت کے پردے کو چاک کرنے کے کبھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ وہ ان لوگوں کی عقیدوں کا بھرم رکھتے ہوئے اپنے وسائل کو کیوں کر خراب کر دیں۔ یہ مذہبی اساطیریوں ہی چلتی رہتی ہیں بلکہ بعض اوقات پڑھا لکھا طبقہ بھی ان کا ہی ہمنوا ہو جاتا ہے۔ اپنی مجبوری اور بے کسی کی تلاش میں ان اساطیر کو ماننے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر کبھی ان کے رد کا کوئی تصور قائم کر لے یا جرات کر لے تو اسے کفر سے تعبیر کر کے اس کا ہی رد کر دیا جاتا ہے۔

> "وہ اس غار میں کیسے آیا ہے۔ اس نے لوگوں کی منتیں مرادیں کب سے پوری کرنی شروع کی ہیں۔ سنمیال کے لوگ یہ سوال نہیں پوچھتے۔ انہیں یہ سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ بس چٹے سائیں کی گالیوں کی ضرورت ہے ۔انہیں چٹے سائیں کی تھوک کی ضرورت ہے۔ جو وہ پانی کے پیالے میں تھوکتا ہے اور پانی پینے والے کو کوئی بھی مسئلہ ہو تو وہ حل ہو جاتا ہے۔"(152)

ناول میں اس حوالے سے مذہبی اساطیر بھی موجود ہیں جن کی صحت کا کوئی اعتبار تو نہیں کیا جا سکتا، تاہم وہ ناول نگار نے اس تناظر میں دکھایا ہے کہ وہاں کے مقامی لوگ ان کی صحت پہ ہر لحاظ سے یقین رکھتے ہیں۔ ایسی اساطیر آج بھی بڑے شہروں سے لے کے چھوٹی مقامی ثقافتوں میں موجود ہیں۔ اگرچہ آنے والی نسل میں جہاں جدیدیت کے پیرائے میں بہت ساری تبدیلیاں ہوئی ہیں وہیں کچھ تحقیقی پہلوؤں کے باوجود بھی ایسے لوگوں کو ماننے کو کوئی تیار نہیں ہے، جو ان مقامی یا ثقافتی اساطیر کی صحت پہ سوال اٹھائے۔

خس و خاشاک زمانے ناول میں مقامیت کے خارجی داخلی تمام پہلوں کی وضاحت ملتی ہے۔ یہ مقامیت محض بیان کی حد تک نہیں بلکہ یہ لوگ اپنی مٹی کے خمیر کو آنے والی نسلوں میں بھی شامل کرتے ہیں۔ ان کی آنے والی نسلوں میں جدیدیت کی معراج پہ پہنچنے کے باوجود اپنی اصل کی جانب لوٹ جانے کی تمنا موجود رہتی ہے۔ وہ تمام تر کامیابیوں،

ماحول کی تبدیلی کے بغیر بھی اسی شناخت کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں۔ تین نسلیں بعد بھی اس دھرتی سے تعلق رکھنے والے لوگ مٹی کی کشش رکھتے ہیں۔ ان کی روح کی تسکین اپنی مٹی کے بغیر نہیں ہوتی۔ ناول میں۔ 1930ء کے لگ بھگ کے زمانے کا بیان ہے جہاں ایک گاؤں دنیا پور اور نت کلاں اور ارد گرد کے دیہاتوں کی مقامی زندگی ناول کا موضوع ہے۔ ناول نگار نے ان لوگوں کی زندگیوں کے شب و روز کا بیان تفصیل سے کیا ہے۔ ان لوگوں میں مقامیت کے تمام پہلو نمایاں دکھائی ہیں۔ سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان مقامی نوعیت کا رشتہ واضح ہے۔ مذہبی رواداری کا دور دورہ ہے۔ لوگ اپنے مقامی رسم و رواج کے پابند ہیں۔ ان کو وہ تمام دوسرے امور پر ترجیح دیتے ہیں۔ مقامیت کے ان لوگوں کے مختلف موقعوں خوشی یا غم کے رسم و رواج کی وجہ کے ساتھ ساتھ رسم و رواج کا بیان بھی ملتا ہے۔ ان لوگوں کے رسم و رواج میں سماجی میل جول اہمیت کا حامل ہے۔ ان مقامی لوگوں میں مہر و محبت اس درجے کا ہوتا ہے کہ تمام معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ضرور ہوتے ہیں۔ اپنی حیثیت کے مطابق تمام لوگ ہی اس میں شامل ہوتے ہیں۔ گاؤں میں بارات کے آنے کا مطلب یہ ہوتا کہ تمام لوگ ہی اس کے میزبان ہیں ۔ گاؤں کے تمام لوگ اپنی حیثیت کے مطابق ان کی خاطر مدارت کرتے تھے۔

> "جب گاؤں میں کوئی بارات اترتی تھی جس کی پچھلی کوٹھڑی میں اس دلہن کو سنگھار کیا جا رہا ہوتا تھا۔ اس روز پوری برادری کی بھینسوں کا دودھ گھر نہیں جاتا تھا۔ چوپال یا دارے میں اترے ہوئے باراتیوں کی مدارت کے لیے جاتا تھا۔ کئی روز بیشتر دلہن والے برادری کے گھروں سے چارپائی اور بستر اکٹھے کرنے لگتے تھے۔"(153)

مقامی جاٹوں کے بیان میں ناول نگار نے جہاں ان کی فطرت میں زمین سے محبت کو بیان کیا ہے وہیں ان کی اس رسم و رواج کو بھی بیان کیا ہے کہ وہ اپنی اس مقامی حالت کو کسی طور پہ بھی بدلنے کو تیار نہیں۔ وہ اپنی حالت کو ہر صورت اس طرح رکھنے پہ بہ ضد ہیں چاہے ان کی اپنی بھلائی کا ہی راستہ کیوں نہ ہو۔ وہ تعلیم حاصل کرنے کو اپنی عزت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ کسی طور بھی اپنے مقامی تاثر کو تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں جاٹوں کا تعلیم حاصل کرنا ان کے شایان شان نہیں ہے۔ ان کا یہ رویہ جہاں ایک فرسودہ خیالی کے تصور کو ابھارتا ہے تو وہیں ان کی مقامیت سے محبت کے جذبے کو بھی بیان کرتا ہے۔ اس رسم و رواج کو وہ توڑنے کا تصور بھی فرسودہ خیال کرتے ہیں کہ کوئی جاٹ بچہ تعلیم کی طرف راغب ہو۔

> "جاٹوں کے ہاں اولاد کو پڑھانے کا رواج نہ تھا۔ ان کے نظریے کے مطابق پڑھ لکھ جانے والے ہل کی ہتھی پر بوجھ ڈال کر اس کے پھالے کو زمین کے اندر تک اتارنے کے قابل نہیں رہتا۔ تعلیم اسے نامرد بنا دیتی ہے۔ یہ پڑھائی، لکھائی برہمنوں یا مولویوں کے بکھیڑے تھے۔ جاٹوں کے بچوں کے لیے یہی بہت ہے۔ چار برس میں اگر پڑھ سکے تو دو چار سپارے پڑھ لیں۔"(154)

اس مقامیت میں دونوں مذاہب ہندو اور سکھوں کی مذہبی ہم آہنگی بھی اس مقامیت کو ایک خاص رنگ عطا کرتی ہے۔اس مقامیت میں دونوں مذاہب کے لوگ مذہب سے زیادہ مقامی ذات پات کے تصور اور رسم و رواج کے پابند ہیں۔ان کے نزدیک مقامی رسم و رواج زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ مسلمان اور سکھ دونوں کے ایک دوسرے کی خوشی غمی کے معاملات میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے، شادی بیاہ کے موقع پر ایک دوسرے کے ساتھ لین دین رسم و رواج ایک برادری کی صورت میں کرتے ۔ مسلمانوں کی شادیوں میں سکھ بھی شریک ہوتے۔ مقامیت کے اصل خوبصورت رنگ یہی ہم آہنگی ہے۔اس مقامی زندگی میں مقامیت کو ہی مرکزیت حاصل ہے جو تمام عناصر کو یکجا کیے ہوئے ہے۔

"مسلمانوں چاٹوں کے شادی بیاہ کے موقع پر برادری کے سکھ بھی پورے اہتمام سے شریک ہوتے۔داڑھیاں سنوارتے، مونچھوں کوتاؤدیتے اپنی کرپانوں پر ہاتھ رکھے شریک ہوتے۔ جہاں بارات اترتی دلہن کے گھر والے ان کے لیے سوکھے راشن کا بندوبست کرتے جسے اس کا خصوصی باورچی دیگوں پر چڑھاتا تھا۔ وہ نیویندرا بھی ڈالتے۔ یہ ایک نہایت کارآمد رسم تھی۔ جس کے تحت آپ شادی بیاہ کے موقعوں پر دولہا کو سلامی کے طور پر کچھ رقم دیتے ہیں اور اس جمع شدہ رقم سے اخراجات پورے کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ پھر اس شخص کو جس نے وہ نیوندرا ڈالا ہو اتنی ہی یا روپیہ زیادہ اس کے ہاں ہونے والی شادی کے موقع پر وہی رقم واپس کر دی جاتی ہے۔"(155)

شادی کے موقعوں پر خصوصی رسم و رواج کا اہتمام تھا۔ مقامی لوگوں کے دلوں کی جڑت ان کے مابین رسم و رواج کو مضبوط کرتی تھی۔ اس مقامیت کے اصل مضبوطی ہی ان کی مرکزیت تھی۔ان مقامی لوگوں کے درمیان مضبوط رسم و رواج سے شادی کے موقع پر پورے گاؤں میں ہی خوشی کا سماں ہوتا۔ باہر سے آنے والی بارات کا استقبال مخصوص انداز سے کیا جاتا۔ مقامی عورتیں گیت گا کر چھتوں سے بلند آواز میں ان گیتوں کی گونج میں باراتیوں کا استقبال کرتیں۔ یہ گیت /ماہیے بھی مقامی زبان میں مقامی لب و لہجے میں ادا کیے جاتے۔ باراتیوں پہ اپلے، چھوٹے کنکر،اور درے کی گٹلیاں برسائی جاتی۔اس کا تعلق مقامی رسم و روایت سے تھا جس کا برا نہ منایا جاتا۔ گیتوں کی گونج میں ہی گلیاں گزرتے گزرتے یہ لوگ دلہن کے گھر پہنچتے۔

طوطے طوطے طوطے
چڑھیاں دیگاں سُکھ راسی۔۔۔
کھا گئے ساہورے 1 ورے کھوتے۔۔۔
ویہڑے آن کھلوتے کنجر۔۔۔
کنجراں دی آئی اے بارات۔۔۔
نلجیو لج تہانوں نئیں۔۔۔ (156)

مقامیت کے رسم و رواج کے ذیل میں بہت سی مقامی رسموں میں مذہبی رسومات کا بھی بطور خاص اہتمام کیا جاتا۔ مقامی لوگوں میں رسم و رواج جس قدر مضبوط تھے کہ ان کے پاسداری اس طرح تھی کہ یہ مقامی رسم و رواج بھی قانون کی حیثیت رکھتے تھے۔ لوگوں کے درمیان باہمی محبت، الفت اس قدر تھی کہ جس کی وجہ سے رشتوں کا پاس لحاظ بہت زیادہ تھا۔ تمام لوگوں کی عزت، غیرت مشترک تھی۔ یوں ان کے ہاں پردے کا تکلف بھی نہ تھا۔ مقامی عورتیں ہوں یا مردان کے درمیان ایک فرضی رشتہ قائم ہو جاتا اور اس کا لحاظ و پاس رکھا جاتا۔

"گاؤں کی عورتیں پردے اور برقعے جیسے نخریلے جھمیلوں میں نہ پڑتی تھیں اور نہ ہی پڑ سکتی تھیں۔۔۔ان کے ذمے گھر کے کام کاج کے سوا بھی لاکھ بکھیڑے تھے۔ کنویں پر بھتہ لے کر جانا، کبھی چارے کا گٹھا کمر پر اٹھا کر مویشیوں کے آگے ڈالنا۔ ضرورت پڑنے پر بھینسوں کے تھنوں کو پسما کر دوہنا۔ کھیتوں میں مشقت کرنا، کپاس کی فصل کے دوران کپاس کے پھول چننا۔ یہ پردہ شردہ صرف ان لوگوں کی نخرے تھے۔ جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے تنکا بھی نہیں توڑنا تھا۔"(157)

مقامی رسم و رواج اور ثقافت کو مختلف تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مختلف تہواروں میں مقامی ثقافت دکھائی گئی ہے۔ اس مقامی ثقافت میں ایک رسم مختلف پیشوں کی حیثیت اور ان کا اس مقامی معاشی زندگی میں کردار بھی واضح کیا گیا ہے۔ ان کی قدیم مقامی زندگی میں نئی ٹیکنالوجی کی آمد سے قبل صدیوں پرانے نظام جس کے تمام محرکات انسان ہیں۔ انسان ایک ایسے سماجی رشتے میں بندھے ہوتے تھے جہاں وہ ایک دوسرے کے بغیر زندگی کا تصور نہیں چاہے اس کا مرتبہ اور حیثیت جیسی بھی ہو۔ خبر گیری، مزاج پرسی، فصل کی کٹائی کھیتوں میں، ہل اوزاروں کی تیاری سے لے کر مکانوں کی لپائی تک تمام امور مل جل کر کیے جاتے تھے۔ ان کا سماجی ڈھانچہ ہی ایسے تشکیل دیا تھا کہ سبھی کسی نہ کسی طرح سے اس نظام کے ساتھ جڑے تھے۔

نظر مراثی کے ہاتھ لہناں سنگھ کا سندیسہ آیا تھا کہ جہانیاں اگر پہنچ سکتا ہے تو پہنچ۔۔۔ میری عقل مت جواب دے گئی ہے۔ میں تیرے ساتھ صلاح چاہتا ہوں۔ بخت جہان ذرا بھر تامل کیا۔۔۔ نظرے کو دو ٹوپے گندم دے کر فارغ کیا۔"(158)

مقامی رسم و رواج کے مطابق جب کوئی پیغام کسی دوسرے گاؤں تک پہنچانے کے لیے کسی کمی کو بھیجا جاتا خود نہ جایا جاتا۔ خوشی غمی کی اطلاع بھی اسی طرح دی جاتی، میزبان اپنی حیثیت کے مطابق پیغام رساں کی خاطر مدارت کرتا ہے۔ اس مقامیت کے کئی رسم و رواج پوری وضاحت کے ساتھ ناول میں موجود ہیں-خس و خاشا ک زمانے **مقامیت** کا بہترین نمونہ ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول میں جہاں دنیا اکیسویں صدی کے ٹیکنالوجی کے سحر میں جکڑ کر ایک مصنوعی طرز زندگی میں داخل ہو چکی ہے، مقامی ثقافتوں کی جڑت کو بہترین واضح کیا ہے۔ مقامت کا تصور واضح

کرتا ہے۔ مقامی ثقافتوں کو اجاگر کرنے میں اپنا کردار ادا کیا بلکہ اس کا موازنہ اس مقامی زندگی کی نئ طرز زندگی سے کر کے اس ثقافت کی کم طریقے احساس کمتری کے بجائے ایک مثبت رجحان کو بھی واضح کیا ہے۔

"شہر خالی کوچہ خالی" ناول کرونا وبا کی صورتحال کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول ایک فرد واحد کے گرد گھومتا ہے۔ موت کا خوف ہر چیز پہ حاوی ہو جاتا ہے۔ وباء میں ہر طرف خوف و خیرات سے لوگ وباء کے خوف سے چھپے بیٹھے ہیں۔ حکومت ٹی وی اخبارات اور دوسرے ذرائع سے بار ہا یہ باور کرا رہی ہے کہ سماجی فاصلہ ضروری ہے۔ یہ خطرناک وائرس ہے جو ایک انسان سے دوسرے انسان میں منتقل ہوتا ہے۔ سانس کے ذریعے یہ وائرس تیزی سے پھیلتا ہے ۔ایسی صورتحال میں ہر شخص اس مخمصے کا شکار ہے کہ نہ جانے کب وہ بھی اس کا شکار ہو جائے یا نہ جانے ہو چکا ہو۔ موت کا خوف تمام قدروں کو شکست دے دی ہے۔

رسم و رواج کی بات کی جائے تو انسان کی تہذیب یافتہ زندگی ان کے بغیر نا مکمل یا ناممکن ہے۔انسان کے سماجی نظام کی بنیادی اکائیاں یہی رسم و رواج ہیں جنہوں نے لوگوں کو منظم گروہوں کی صورت میں باندھ رکھا ہے۔ ان کے نظم و نسق میں یہی رسم و رواج تھے۔ جنہوں نے ان کی جرات میں کردار ادا کیا۔ علاقائی ثقافتوں میں ان رسم و رواج کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ان کا پاس کسی ڈر یا خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ فرض سمجھ کر کرنا لوگوں کے باہمی تعلق کو مضبوط کرتا ہے۔ جدید شہری آبادیوں میں پرانے رسم و رواج کا خاتمہ ہوتا جا رہا ہے۔ جدید طرز رہائش میں رہنے والے لوگ اپنے ثقافتی ورثے سے یکسر عاری اور گریزاں ہیں۔ان کی نئ نسلیں تو اپنے اصل سے بھی واقف نہیں ہیں گویا ایک نئ تہذیب وجود میں آچکی ہے۔ جو مغرب سے متاثر زیادہ ہے۔ ناول میں مرکزی کردار اسی طبقے کا نمائندہ ہے تاہم اس کے باوجود بنیادی مشرقی قدریں اب بھی کسی نہ کسی ضرورت موجود ہیں۔ سماجی میل جول کی پابندیوں نے ان قدروں کو بھی مٹا دیا ہے۔ان نئ آبادیوں میں ابھی اس قدر ظرف تو باقی ہے کہ خوشی میں بھلے اپنے درجے رتبے کے لوگوں کو شریک کرتے ہیں تاہم موت کی صورت میں مشکل کی صورتحال میں دوسرے کے غم میں رسماً ہی سہی شریک ضرور ہو جاتے ہیں۔ کبھی ان معاشروں میں بھی دوسرے کا احترام اور لحاظ رکھا جاتا ہے۔ مشرقی معاشرے میں بڑوں کے احترام و لحاظ ان کی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ نئ نسلوں میں بھی روایتی گھرانوں میں اس سلسلے کو دوام حاصل ہے۔ جو اپنے بزرگوں کی ضرورت احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ بزرگوں سے مغرب کے طرز کے کنارہ کشی نہیں بلکہ عزت و احترام کا اعلی درجہ دیا جاتا ہے۔ کرونا کی وبا کی صورتحال میں خصوصاً بوڑھوں کا زیادہ خیال رکھا جاتا کہ وائرس ان میں جلدی سے اثر کرتا ہے۔ وباء کی صورت میں لوگ ان رسم و رواج، ادب و احترام اور لحاظ کو بوجہ مجبوری پس پشت ڈالنے پہ مجبور ہوئے۔

"بچے یعنی میرے پوتے پوتیاں دن میں صرف دو بار میرے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ایک بار صبح بخیر کہنے کے لیے اور پھر شب بخیر کا فرض ادا کرنے کی خاطر۔۔۔پہلے کی طرح میں ان سے لپٹ کر ان کی رخساروں پر بوسے ثبت نہیں کر سکتا۔۔۔وہ سماجی فاصلے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مجھ سے کچھ دور کھڑے ہو جاتے ہیں۔اپنے دونوں کو رخ میری جانب کر کے گویا سلام کرتے ہیں اور پھر اس ورزش کے بعد وہ اپنے بازو سمیٹ کر اپنے گلے سے لگائے ہوئے منہ سے پچ پچ کرتے ہیں اور دادا کو ایک کرونا بوسہ دور سے پچکار کر چلے جاتے ہیں۔"(159)

وباء کی لپیٹ میں آئی دنیا اپنی زندگی کے تمام گزشتہ دنوں کے اطوار کو بھلا بیٹھی تھی۔زندگی کی بقاء کے لیے اس نے اپنے سماجی ڈھانچے میں مکمل طور پر تبدیلی کر لی اور کرتے بھی کیوں نہ زندگی کا ارتقاء سب سے ضروری ہے۔وبا ءمیں تمام سماجی ڈھانچوں کو تبدیل کر کے زندگی اگرچہ مشکل تھی۔اشرف المخلوقات میں وقت اور حالات کے ساتھ تبدیلی کا جو مادہ پایا جاتا ہے اسے بروئے کار لاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اس نئے ماحول میں اپنی بقاء کی خاطر اپنے ارتقاء کے سلسلے کو جاری کر لیا۔

مشرقی اقدار چاہے جس قدر بھی تبدیل ہو جائیں اپنی انفرادیت اور اہمیت کو بہر حال کسی نہ کسی طرح ضرور قائم رکھتی ہیں ۔ہمارے سماجی ماحول میں گٹھ جوڑ کے بغیر رسمِ زندگی مکمل نہیں ہو سکتی ؛خوشی ہو یا غم اہل علاقہ ،محلہ ،برادری بلکہ آس پاس کے تمام لوگوں کو شامل کرنا اس مقامی روایت کا خاصا ہے۔اگر موقع غم کا ہو تو اس ایسی صورتحال میں ناراضگی ،دشمنی بھی بالائے طاق رکھ دی جاتی ہیں۔کرونا سے قبل کے زمانے میں ایسے موقع پر شریک نہ ہونا کسی کے غم وخواری نہ کرنا اور دادرسی کے کلمات نہ کہنا تصور سے باہر تھا۔مگر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ لوگ اپنے پیاروں کے آخری دیدار سے بھی محروم ہونے لگے۔

"یہ کوئی نارمل روٹین کی موت تھوڑی ہو گی کہ چار پائی گھر پر پڑی ہے اور آپ اس پر بڑے پڑے ہیں۔نتھنوں میں روئی ٹھونسے منہ کھولے چہرے پر سرسوں کے کھیت کی زردی کا میک اپ کیے آپ کے گرد آہ وبکا کرتے رو رو کر نڈھال ہوتے لوگوں کا ہجوم اور بیٹھے ہوئے گلوں میں سے برآمد ہوتی آوازیں ہیں کہ۔۔۔بیٹے چہرہ دیکھ لو...دادا کو آخری بار دیکھ لو...۔"(160)

وباء سے احتیاط کی تدابیر کی خاطر متاثرہ شخص کو دوسرے اشخاص سے الگ رکھا جاتا تھا۔وباء کی احتیاط والے مریضوں کے بارے میں عالمی اور مقامی ہدایات کا سلسلہ جاری تھا۔صورتحال اس وقت مزید گمبھیر ہوئی جب بین الاقوامی میڈیا کی خبروں کو کمرے میں بند شخص بھی سن رہا تھا ایسی صورتحال میں فرد ذہنی اذیت کا شکار ہوا۔موت کے بعد بھی احتیاطی تدابیر لے ساتھ شرکت ضروری قرار دی گئی حتی کہ اس شخص کے جنازے میں چند قریبی اقارب کی احتیاطی تدابیر کے ساتھ شرکت کی اجازت اور ترقی یافتہ ملکوں میں تو مشینوں کے ذریعے سے دفنانے کا کام شروع ہوا۔اٹلی بھارت اور کئی دوسرے ممالک میں تو لاشیں ٹھکانے لگانا بھی مشکل ہو گیا۔ایسی صورتحال میں مقامی اور مذہبی

رسومات اپنا وجود کیسے برقرار رکھ سکتی تھیں۔ کرونا نے انسان کے یہی قائم کردہ تصورات بیانیے تہذیبی خصوصیات سب کے سب توڑ ڈالے۔

> "کرونا نے مسرت، فوت پر ہماری سماجی، تہذیبی رسومات و روایات کو توڑ کر بدل دیا ہے۔ اب کسی پیارے کی موت پر لوگوں کا جم غفیر نہیں ہوتا اور نہ ہی رسمی طور پر غسل و کفن کا انتظام ہوتا ہے۔ میت کو چارپائی پر کندھا دینے کے بجائے بند تابوتوں کرین یا رسیوں سے کھینچ تان کر قبر نما گڑھے میں پھینک کر اوپر سے مشینری چلاتے ہوئے برابر کر دیا جاتا ہے۔"(161)

کرونا کی وباء گذشتہ صدی میں آنے والی طاؤن کی بیماری کے بعد آنے والی ایک بڑی وباء تھی۔ اس کا پھیلاؤ پوری دنیا میں ہوا کوئی محلہ کوئی علاقہ ملک اس سے بچ نہ سکا۔ انسان کو زندگی کا خوف لاحق ہوا۔ مشرق و مغرب کا انسان محض اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا اور سب ہی اس کے ہاتھوں عاجز تھے۔ ناول میں ایک کردار کے ذریعے اس عرصہ کی ہولناکی کی منظر کشی کرنے کی سعی کی ہے۔ مقامی ہو یا بین الاقوامی کوئی بھی بیانیہ رسم و رواج اس میں قائم نہ رہا حتیٰ کہ مذہبی حوالے سے بھی ایک عالمی تبدیلی رونما ہوئی اور احتیاط کے ضمن میں حالات کے مطابق مذہبی امور بھی تبدیل کی گئی۔ رسم و رواج انسان کی زندگی کا حصہ اور ایک نظام کی تشکیل کے لیے ضروری خیال کیے جاتے ہیں جب نظام ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے تو ایسے میں ان کی اہمیت کچھ نہیں رہتی اصل بات یہ ہے کہ یہاں کسی خاص رسم و رواج جبکہ کی بلکہ عالمگیریت یا گلوبل ولیج کی تصویر نہیں بلکہ ایک نئی ثقافت کی آبیاری ہے جسے بقاء سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس باب میں مقامیت کے تین اہم پہلوؤں معاشی، بود و باش اور خارجی پہلو جس میں لباس، خوراک، زبان وغیرہ شامل ہیں کو مابعد جدیدیت کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ اکیسویں صدی کے منتخب اردو ناولوں میں مقامیت کے عناصر کی تلاش کی گئی ہے۔ ناولوں میں سب سے پہلے معاشی پہلو کو دیکھا گیا ہے۔ ہر مقامی علاقے کے جغرافیائی حالات اس پہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ناولوں میں دیکھا گیا ہے کہ ہری پور، ہزارہ کے پہاڑی علاقوں میں معاشی نوعیت مختلف تھی جو اپنی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے۔ دور دراز کے علاقوں میں راستوں کی دشواریاں، تعلیم عام نہ ہو نا زمانہ قدیم سے اس خطے کا مسئلہ رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی حالات میں تبدیلی ہوئی۔ ادھ ادھورے لوگ میں بہاولپور کی مقامی سیاست سے متاثر اس مقامیت کا اپنا معاشی نظام تھا۔ اس ناول میں مقامیت کی ذیل میں معاشی نظام کی زیادہ وضاحت نہیں ہے۔ انواسی میں لودھراں اور ملتان کے مضافاتی علاقوں کا بیان ہے۔ یہاں کے باسی اپنے کمزور معاشی مسائل کے ساتھ ناول کے کینوس پہ جلوہ گر ہیں۔ ان کی معاشی حالت ہی ان کے مسائل کی وجہ بنتی ہے۔ اس ناول میں ناول نگار نے مقامیت کے اس معاشی پہلو کی بھرپور وضاحت کی ہے۔ ناول گراں میں پوٹھوہار کے علاقے کی معاشی صورتحال اور اس پر اثر انداز ہونے والے نوآبادیاتی عہد کا تفصیلی بیان ہے۔ نیلی بار کے معاشی حالات زمین کے ساتھ جڑے ہیں۔ نسل در نسل مزارعے کھیتوں میں کام کرتے زندگی بسر کرتے ہیں جبکہ جاگیردار امیر سے امیر تر ہوتے ہوئے ملکی

سیاست تک جا پہنچے۔دائرہ اور بھید میں لاہور کی مقامیت کو بیان کیا ہے۔ایک بڑے صنعتی شہر کی معاشی نوعیت صنعتوں اور کاروبار سے جڑی ہے۔ناول میں دکانوں، بازاروں،ڈھابوں اور ایسے کئی دوسرے کاروباری مراکز کا تذکرہ ملتا ہے ۔غلام باغ میں مانگر جو اور پوٹھوہار کے علاقے کی معاشی حالت ناول کے کرداروں کے ذیل میں بیان ہوئی ہے ۔پوٹھوہار کے لوگ مقامی صنعتوں (کان کنی) سے منسلک ہیں۔نولکھی کوٹھی اورخس وخاشاک زمانے جیسے ناولوں کا مرکز پنجاب ہے۔لہٰذا پنجاب کی روایتی زندگی جس کی جڑت زمین سے ہے دکھائی دیتی ہے۔معاشی نوعیت اور بیانیہ کو دیکھا جائے تو مقامیت کا مخصوص انفرادی پن موجود ہے۔

بودوباش اور خارجی پہلو کے تناظر میں ناولوں میں یہ عناصر تلاش کیے گئے ہیں۔ان میں مختلف مقامیتیں اپنی انفرادیت کو مختلف طریقوں سے ظاہر کرتی ہیں۔جندر اور جاگے ہیں خواب میں ہزارہ کی مقامیت کے بیان میں ناول نگار نے ان کرداروں کے رہن سہن رسم ورواج بھی بیان کیا ہے۔انواسی اورادھ ادھورے لوگ میں سرائیکی علاقے کی نمائندگی ملتی ہے۔بہاولپور کی مقامی سیاست سے متاثر اس مقامیت کا اپنا معاشی نظام تھا۔مقامیت کا بیانیہ ادھ ادھورے لوگ میں وضاحت سے ہے تو دوسری طرف انواسی بھی مقامی اور لوگوں کی زندگی کے مختلف امور رسم ورواج بچپن میں شادیوں جیسی رسم وغیرہ مقامیت کو واضح کرتی ہیں۔گراں کے مقامی رسم ورواج جنازہ میں رشتوں کا پاس ولحاظ عورتوں کا مرد کے نام سے منسوب ہو کر زندگی گزار دینا،جنات جیسی اساطیر سب کچھ بیان ہوا ہے۔لوگوں کے درمیان جڑت، مخصوص جغرافیائی لحاظ سے خوراک کے بھی بیان ہیں۔پوٹھوہار کے مقامیت کو واضح کرتے ہوئے مصنف نے ناول کے کرداروں کو باہمی مکالموں میں مقامی زبان کو بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔یہی صورتحال نیلی بار میں ہے۔مقامی رسم ورواج بیان کرنے کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان کے گیت اور ماہیے بھی مقامیت کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔عاصم بٹ نے بھید اور دائرہ میں لاہور کی مقامیت کو بیان کرتے ہوئے مقامی رسم ورواج رہن سہن کے طریقے اور زبان کا استعمال بھی کیا ہے۔لاہور پنجاب کا مرکز ہے۔لاہوریوں کا خاص لب ولہجہ ناول میں دکھائی دیتا ہے۔اس کے علاوہ اندرونی لاہور کے اندر رہنے والے لوگوں کے باہمی لین دین رکھ رکھاؤ سبھی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔لاہوری کھانوں کا تذکرہ بطور خاص ناول میں موجود ہے۔غلام باغ میں مانگر جو قبیلے اور پوٹھوہار کے بیان میں علاقائی ثقافتوں کا بیان ملتا ہے جس میں لوگوں کے رہن سہن مکانوں کی سجاوٹ پوٹھوہار کے پہاڑی علاقوں کے مکانات ندی نالوں چشموں کا تذکرہ ملتا ہے۔اسی طرح سے مگر جو قبیلے کے بیان میں مقامی اشرافیہ کے ساتھ جڑی رسم ورواج کا بیان بھی ناول میں ہوا ہے۔خس و خاشاک زمانے اور نو لکھی کوٹھی دونوں میں پنجاب کی مقامیت کا بیان ہے۔پنجابی علاقوں کے علاقائی رسومات رکھ پنجابی لب ولہجے رسم ورواج سبھی کچھ دکھائی دیتا ہے کہ ہمیں پاکستان سے قبل کا پنجاب ہو یا بعد کا پنجاب کی ثقافتی علامت سے لے کر لباس، رہائش اور خوراک سبھی میں مقامیت کا رنگ نمایاں دکھائی دیتا ہے

۔بحیثیت مجموعی اس باب میں مقامیت کے جن عناصر کی تلاش کی گئی ہے ناولوں میں ان کی وضاحت ملتی ہے۔ان میں سے بہت حد تک ناولوں کے اندر صورتحال واضح دکھائی دیتی ہے۔ جس سے مقامیت کا بیان واضح ہوتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ اختر رضا سلیمی۔ جاگے ہیں خواب میں (راولپنڈی: رومیل پبلشرز، نومبر 2022ء) ص57

2۔ اختر رضا سلیمی۔جاگے ہیں خواب میں۔2022ء، ص58

3۔ ایضاً۔ص91

4۔ ایضاً، ص63

5۔ ایضاً۔ص110

6۔ ایضاً۔ص111

7۔ اختر رضا سلیمی۔ جندر۔ (راولپنڈی: رومیل پبلشرز، فروری 2020ء) ص32

8۔ اختر رضا سلیمی۔ جندر ۔2020ء۔ص80

9۔ ڈاکٹر شیر بہادر پنی۔تاریخ ہزارہ (لاہور کتبہ جمال، 2006ء) ص259، 260

10۔ اختر رضا سلیمی۔ جندر ۔2020ء۔ص58

11۔ ایضاً۔ص، 115

12۔ محمد حفیظ خان۔ ادھ ادھورے لوگ (جہلم: بک کارنر شوروم، اشاعت دوم 2019ء) ص9

13۔ ایضاً۔ص63

14۔ ایضاً۔ص162

15۔ محمد حفیظ خان۔ انواسی (جہلم: بک کارنر شوروم، اشاعت دوم دسمبر، 2019ء) ص25

16۔ ایضاً۔ص320

17۔ وقار احمد۔ ارشد محمود آصف۔ اختر رضا سلیمی کے ناولوں میں اسلامی تہذیب اور ہزارہ ثقافت کا عکس جاگے ہیں خواب میں اور جندر کا اختصاصی مطالعہ: مشمولہ: القمر جلد ششم، شمارا 1 جنوری تا مارچ 2023ء ص 239

18۔ طاہرہ اقبال۔ نیلی بار (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، اشاعتِ دوم 2020ء) ص18

19۔ ایضاً۔ص221

20۔ طاہرہ اقبال۔ گراں (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 2019ء) ص35

21۔ طاہر نواز۔شہر مرگ (روالپنڈی: اوزونک پبلشرز، 2020ء) ص36، 35

22۔ طاہر نواز۔ شہر مرگ ۔ 2020ء۔ص89

23۔ محمد عاصم بٹ۔دائرہ ۔(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2014ء)ص49

24۔ ایضاً۔ص71

25۔ ایضاً۔ص11

26۔ محمد عاصم بٹ۔ بھید۔(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز۔2018ء)ص60

27۔ ایضاً۔ص247

28۔ شہزاد قریشی،ثاقب۔ محمد عاصم بٹ کا فکشن فلسفہ وجودیت۔ معیار(اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی)ص256

29۔ علی اکبر ناطق۔نو لکھی کوٹھی(جہلم: بک کارنر شوروم۔اشاعت ہفتم2021ء)ص15

30۔ ایضاً۔ص54

31۔ مرزااطہر بیگ۔غلام باغ(لاہور:الحمد پبلی کیشنز۔اشاعت ہفتم۔2021ء)ص676

32۔ ایضاً۔ص74

33۔ ایضاً۔ص75

34۔ راحیلہ الطاف ۔ اردو ناول میں ماں باالطبیاتی عناصر۔ 1947ء کے بعد(لاہور : مجلس ترقی ادب ، 2018ء)ص287

35۔ ڈاکٹر شاہد نواز۔اکیسویں صدی کے اردو ناول میں مقامیت کی دل آویز تشکیل۔ مشمولہ اکادمی ادبیات خصوصی ناول نمبر(اسلام آباد:،جولائی تا دسمبر جلد دوم۔2020ء)ص308

36۔ مرزااطہر بیگ۔غلام باغ(لاہور:الحمد پبلی کیشنز۔اشاعت ہفتم۔2021ء)ص769،768

37۔ ایضاً۔ص796

38۔ ایضاً۔ص785

39۔ ایضاً۔ص128،127

40۔ ایضاً۔ص158

41۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خاشاک زمانے(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز۔2014ء)ص50

42۔ ایضاً۔ص229،228

43۔ ایضاً۔ص57

44۔ رانی صابر علی، روبینہ ترین، ڈاکٹر۔ اکیسویں صدی کا سماجی سیاسی سماجی منظر نامہ اور خس وخاشاک زمانے میں اس کا اظہار (ملتان: جنرل آف ریسرچ اردو بہاؤدین زکریا یونیورسٹی جون۔2014ء) ص243

45۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خا شاک زمانے ۔2014ء۔ص199

46۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان۔اردو ناول کے چند اہم زاویے(اضافوں کے ساتھ) ۔کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان 2016ءص269

47۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خا شاک زمانے ۔2014ء۔ص169

49۔ اختر رضا سلیمی۔جاگے ہیں خواب میں ۔2022ء،ص13،12

50۔ ایضاً۔ص50

51۔ ایضاً۔ص91

52۔ ایضاً۔ص209

53۔ وقار احمد۔ارشد محمود آصف۔اختر رضا سلیمی کے ناولوں میں اسلامی تہذیب اور ہزارہ ثقافت کا عکس جاگے ہیں خواب میں اور جندر کا اختصاصی مطالعہ: مشمولہ: القمر جلد ششم، شمار1 جنوری تا مارچ 2023ء ص 182

54۔ اختر رضا سلیمی۔جاگے ہیں خواب میں ۔2022ء،ص226،225

55۔ اختر رضا سلیمی۔جاگے ہیں خواب میں ۔2022ء،ص65

56۔ ایضاً۔ص82

57۔ ایضاً۔ص89

58۔ ایضاً۔ص100

59۔ محمد حفیظ خان۔ ادھ ادھورے لوگ۔2019ء۔ص37

60۔ محمد وسیم شاہد ناول ادھ ادھورے لوگ وقت ملاحظہ 13 نومبر 2023 Ham sab.com.pk

61۔ محمد حفیظ خان۔ادھ ادھورے لوگ ۔2019ء۔ص38

62۔ ایضاً۔ص88

63۔ ایضاً۔ص14

64۔ ملک محمد دین مترجم، یاسر جواد۔بہاولپور گزٹیر (لاہور: الفیصل، ریاست بہاولپور گسٹیر 1904ء) ص220

65۔ ایضاً۔ ص220

66۔ محمد حفیظ خان۔ ادھ ادھورے لوگ ۔2019ء۔ ص14

67۔ محمد حفیظ خان۔ انواسی ۔2019ء۔ ص35،36

68۔ ایضاً۔ ص59

69۔ ایضاً۔ ص129

70۔ ایضاً۔ ص58

71۔ طاہرہ اقبال۔ نیلی بار (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز۔اشاعت دوم2020ء)ص14

72۔ ایضاً۔ ص13

73۔ ایضاً۔ ص13،14

74۔ ساجدہ سلطانہ۔طاہرہ اقبال کے ناول نیلی بارگاہ فکری وفنی جائزہ(اسلام آباد: مقالہ برائے ایم فل اردو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز2019ء)ص68

75۔ طاہرہ اقبال- نیلی بار -2020ء۔ ص430

76۔ کلثوم بی بی۔طاہرہ اقبال کے ناوک گرادخیل و مستعار الفاظ کا تجزیاتی مطالعہ ۔مقالہ ایم فل اردو(اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد)ص36

77۔ طاہرہ اقبال۔گراں(اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز۔2019ء)ص14

78۔ ایضاً۔ ص24

79۔ ایضاً۔ ص49

80۔ طاہر نواز۔شہر مرگ۔2020ء۔ ص25

81۔ محمد عاصم بٹ۔ دائرہ ۔2014ء ص47

82۔ ایضاً۔ ص51

83۔ اے حمید۔ لاہور کی باتیں کچھ نئی کچھ پرانی-(لاہور: خورشید مقبول پریس،2008ء)ص17

84۔ محمد عاصم بٹ۔دائرہ ۔2014ء ص113

85۔ ایضاً۔ ص114

86۔ ایضاً۔ ص238

87۔ ایضاً۔ ص41

88۔ ایضاً۔ص109

89۔ ایضاً۔ص115

90۔ ڈاکٹرامجد طفیل۔اردوناول اکیسویں صدی میں۔مشمولہ:سہ ماہی ادبیات ناول نمبر(اسلام آباد: 2020ء)ص98

91۔ صباحت عروج،علی اکبر ناطق کی ادبی جہات۔،2019ء۔ص116

92۔ علی اکبر ناطق۔نو لکھی کو ٹھی ۔2020ء،ص12

93۔ ایضاً۔ص39

94۔ ایضاً۔ص94

95۔ ایضاً۔ص38،39

96۔ نعیم اشرف۔علی اکبر ناطق کا ناول نو لکھی کوٹھی 49 5 00 36 www.hump.com.pk naeam– ashraf –

97۔ علی اکبر ناطق۔نو لکھی کو ٹھی ۔ 2020ء،ص132

98۔ ایضاً۔ص388

99۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی۔اردو ناول توجیہات و تعبیرات ۔2020ء۔ص191

100۔ علی اکبر ناطق۔نو لکھی کو ٹھی۔2020ء،ص158

101۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خا شاک زمانے۔2014ء۔ص90

102۔ ایضاً۔ص63

103۔ ایضاً۔ص16،17

104۔ ایضاً۔ص97

105۔ ایضاً۔ص161

106۔ ایضاً۔ص137

107۔ ایضاً۔ص136

108۔ طاہر نواز۔اکیسویں صدی کے اردو میں مقامیت کی دل آویز تشکیل۔سہ ماہی ادبیات ناول نمبر(اسلام آباد :2020ء)ص111

109۔ یوسف نون۔ماخذ ۔ص90

110۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خا شاک زمانے ۔2014ء۔ص25،24

111۔ اختر رضا سلیمی۔ جاگے ہیں خواب میں ۔2022ء،ص59

112۔ ایضاً۔ ص89

113۔ ایضاً۔ ص91

114۔ محمد طارق انصاری،ڈاکٹر۔"حفیظ خان کے اردو ناول میں مقامیت کی تشکیل اور پیشکش"۔ مشمولہ: متن (بہاولپور: جلد تین شمارہ دو شعبہ اردو اسلامیہ یونیورسٹی جولائی تا دسمبر2022ء)ص121

115۔ اختر رضا سلیمی کے ناولوں میں اسلامی تہذیب اور ہزارہ ثقافت کا عکس جاگے ہیں خواب میں اور جندر کا اختصاصی مطالعہ: مشمولہ:القمر جلد ششم، شمارا1 جنوری تا مارچ2023ء ص182

116۔ سلیمی رضا اختر۔ جندر۔2018ء۔ص19

117۔ ایضاً۔ ص19

118۔ ایضاً۔ ص26

119۔ محمد طارق انصاری۔ حفیظ خان کے اردو ناول میں مقامیت کی تشکیل اور پیشکش۔ مشمولہ:متن۔ بہاولپور۔ جلد تین شمارہ دو شعبہ اردو اسلامیہ یونیورسٹی جولائی تا دسمبر2022ء ص110

120۔ فائزہ بٹ -انحراف زبان: نوعیت اور اسالیب، مشمولہ:معیار (اسلام آباد: شعبہ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی جون2021ء)جلد15، ص271

121۔ خالد محمود سامٹیہ۔ اختر رضا سلیمی کے ناول : ما بعد نو آبادیاتی مطالعہ۔2020ء۔ص52

122۔ محمد حفیظ خان۔ادھ ادھورے لوگ ء۔ص24

123۔ ایضاً۔ ص109

124۔ ایضاً۔ ص121

125۔ ایضاً۔ ص80

126۔ ایضاً،ص104

127۔ ایضاً۔ ص104

128۔ ناول ادھ ادورے لوگ۔ تبصرہ ملک فہیم ارشاد؛وقت ملاحظہ 13 دسمبر2023
Www.facebook.com/groupslashbook corner fans / p e r m a l i n k /

129۔ عقیل حیدر۔ انواسی کی کھوج میں (ملتان: انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ ملتان، 2022ء)ص48

130۔ محمد حفیظ خان۔ ادھ ادھورے لوگ ء۔ ص145،59

131۔ ایضاً۔ ص52،51

132۔ طاہر نواز۔اکیسویں صدی کے اردو میں مقامیت کی دل آویز تشکیل۔سہ ماہی ادبیات ناول نمبر2020ء۔ ص112

133۔ طاہرہ اقبال۔ نیلی بار ۔2020ء۔ص24

134۔ ایضاً۔ ص62

135۔ ایضاً۔ ص139

136۔ Hum sub. Com.pk

محمد ہارون عثمانی،ڈاکٹر۔طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار-وقت ملاحظہ:7نومبر2023

137۔ طاہرہ اقبال۔ نیلی بار ۔2020ء۔ص31

138۔ عمران شاہد، میاں۔ نیلی بار کا تجزیاتی مطالعہ۔ مشمولہ: اردو ناول کی روایت تنقید اور تجزیہ و تلخیص۔ مولف نثار دان۔لاہور: ورلڈ ویو پبلشر2022ء ص660

139۔ web.facebook.com/p/Nazia parveeen۔وقت ملاحظہ:7نومبر2023ء

140۔ طاہرہ اقبال۔ گراں ۔2019ء۔ص46

141۔ ایضاً۔ ص60

142۔ ایضاً۔ ص21

143۔ ایضاً۔ ص29

144۔ ایضاً۔ ص38

145۔ نازیہ پروین،ڈاکٹر۔صدف فاطمہ ،ڈاکٹر۔سعید نو شیبا۔ ناول گراں کی تفہیم ما تخیل باختن کے لسانی فلسفے کی روشنی میں: مشمولہ: جہاں تحقیق۔جلد2،2021ء

146۔ محمد عاصم بٹ۔دائر ہ ۔2014ء ص84

147۔ کومل شہزادی، ڈاکٹر نصیر احمد، ڈاکٹر، عبدالمنان چیمہ ۔ محمد عاصم بٹ بحیثیت ناول نگار تحقیقی جائزہ۔ مشمولہ: ذوق تحقیق ۔ جنوری تامارچ2022ء ص

148۔ محمد عاصم بٹ۔دائر ہ ۔2014ء ص113

149۔ ایضاً۔ ص173

150۔ ایضاً۔ ص188

151۔ ایضاً۔ ص122

152۔ مرزااطہربیگ۔ غلام باغ۔ 2021ء۔ ص169

153۔ مستنصرحسین تارڑ۔خس و خا شاک زمانے۔2014ء۔ ص17

154۔ ایضاً۔ ص85،86

155۔ ایضاً۔ ص223

156۔ ایضاً۔ ص23

157۔ ایضاً۔ ص240

158۔ ایضاً۔ ص294،295

159۔ مستنصرحسین تارڑ۔ شہر خالی کوچہ خالی۔2020ء۔ ص30

160۔ ایضاً۔ ص79

161۔ یوسف نون۔ غلام اصغر، ڈاکٹر۔ طاہر عباس، ڈاکٹر۔شہر خالی کوچہ خالی ایک کرونائی ناول کا مابعد جدید تناظر: مشمولہ: ماخذ۔اپریل تاجون2023ءجلد3شمارہ2ص93،94

باب سوم:

اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں بیاناتی پہلو:

اس باب میں مقامیت کے ذیل میں مقامیت کے اہم پہلو مثلاً مذہبی سیاسی اور ثقافتی کا جائزہ لیا جائے گا۔ کسی بھی مقامیت میں مقامی عناصر کا عمل دخل بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ثقافت اور مذہب کے حوالے سے دو بڑے نظریات موجود ہیں اول تو یہ کہ ثقافت مذہب کے پیرائے میں آجاتی ہے اور دوم یہ کہ ہر ثقافت اپنے مذہبی تصورات پہ حاوی ہو جاتی ہے۔ ان دونوں کے ساتھ اور نظریات سے برعکس عمومی طور پر دیکھا جائے تو ثقافت کے عناصر عموماً مذہب پر غالب آجاتے ہیں۔ ثقافت عالمگیری نہیں مقامی ہوتی ہے جبکہ مذہب عالمگیری تصور ہے۔ مقامی عناصر اس تصور پر غالب آجاتے ہیں۔ اسلام کی بات کی جائے تو اسلام ایک آفاقی مذہب ہے۔ اس کے اثرات بلاشبہ مقامی علاقوں پہ پڑے تمام جہاں کے مسلمانوں کے مذہبی تصورات یکساں ہیں۔ تاہم ان کے نفاذ میں ہمیں فرق ضرور محسوس ہوتا ہے ۔ بعض علاقوں میں ان کی نوعیت مقامی اثرات کے تحت بدل جاتی ہے مثلاً تصوف کے بارے میں نظریات کو پرکھا جائے تو عربی اور عجمی تصوف میں واضح فرق محسوس ہوگا۔ علاقائی مقامی ثقافت مذہب کی رسومات کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ برصغیر پاک وہند کی بات کی جائے تو ہماری ہند اسلامی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ بعد از قیام پاکستان ہندو اور مسلمان برصغیر کے دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔ ان 70 دہائیوں میں الگ رہنے کے باوجود بھی ہماری ثقافتوں میں بہت سے پہلو مشترک ہیں۔ مذہبی رسومات ہوں یا مقامی رسم ورواج ان میں ثقافت کو دخل زیادہ حاصل ہے۔ ان پہلوؤں میں مقامی ثقافتی ورثے کی تقلید زیادہ کی جاتی ہے۔ یہاں کا کلچر عرس بیساکھی میلے، شادی بیاہ کی رسومات اسلامی نہیں بلکہ ہند اسلامی ثقافت کی نمائندہ ہیں۔ لہذا اس بحث سے یہ ثابت ہوا کہ مقامی ثقافت مذہبی تصورات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ہر مقامیت کا ایک الگ مذہبی بیانیہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں ایک سوال ایسا جنم ضرور لے گا۔ جس کا جواب دے دینا ضروری ہے کہ پاکستانی معاشرے کی بات کی جائے تو ہمارے ہاں تو آبادی کی اکثریت کا تعلق مذہب اسلام سے ہے۔ ہمارے ملک کی اکثر آبادی کا تعلق اسلام مذہب سے ہے۔ پھر یہ مقامی مذہبی بیانیہ سے کیا مراد ہے۔ کیا مذہب کے بیانیے بھی مختلف ہوتے ہیں تو اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ مقامی ثقافت دوسرے عناصر پہ بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ مذہب بھی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ مذہب کی چھاپ ثقافت پہ بلاشبہ پڑتی ہے۔ وہیں مذہبی بیانیے بھی ثقافت سے متاثر ضرور ہوتے ہیں۔ ایک ہی طرح کے مذہبی رسومات ایک علاقے میں مختلف انداز میں سرانجام دی جارہی ہوتی ہے تو دوسرے اس کا طریقہ نفاذ مختلف ہو جاتا ہے مثلاً قبروں میں تدفین اور قبروں کا اندرونی اور بیرونی حصہ ہر علاقے میں مختلف ہوتا ہے۔ تدفین کے لیے رسومات میں بھی فرق نمایاں

ہے۔ کہیں قبر کچی اور کسی قدر بہت پختہ بنانے کا رواج ہو گا، شادی کے موقع پر بھی بہت سی ثقافتی رسومات علاقے کی نسبت سے تبدیل ہوتی ہیں۔ آفاقی مذہب کے پیروکار بھی طریقہ کار میں تبدیلی ضرور کرتے ہیں۔ بہت سی رسومات ثقافت سے نکل کر مذہب کے دائرہ کار میں داخل ہو جاتی ہیں۔ ثقافت کی روایت اس کو مذہب کی سند عطا کر دیتی ہیں۔ دلوں سے اسے شرف قبولیت عطا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات بیرونی حملوں کے نتیجوں میں بھی مقامی مذہبی بیانیے متاثر ہوتے ہیں۔ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر فاتحین کے اثرات قبول کرنے سے بھی بیانیوں میں فرق آجاتا ہے۔ اس طرح ایک خاص مقامی مذہبی بیانیت تشکیل پاتے ہیں جن کا تعلق مقامی مذہبی ثقافت سے ہوتا ہے جو اس مقامی ثقافت کے نمائندے کے طور پر وجود میں آتے ہیں۔

جب سے انسان نے معاشرتی نظام میں رہنا شروع کیا ہے تو اس نے اس معاشرے کے قیام کے اصول اور اس کا نظم و نسق چلانے کے لیے کچھ خاص اصول و ضوابط بھی وضع کیے ہیں۔ ان خاص اصول و ضوابط کو وضع کر کے ہی وہ ایک بہترین یا مثالی معاشرے کی تشکیل کا خواب شرمندہ تعبیر کر سکتا ہے۔ انسان نے جب سے معاشرے کی صورت اختیار کی ہے تو اس نے یقیناً کچھ نہ کچھ اصول تصورات اختیار کیے ہیں۔ کہیں ان کی صورت روایت کی سی ہے اور کہیں کو باقاعدہ تحریری صورت میں بھی محفوظ کیا گیا ہے۔ اسی طرح سے ہر علاقے میں وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی معاملات بھی تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ ہر مخصوص ثقافت کا اپنا ایک سیاسی بیانیہ بھی ہوتا ہے۔ ہر ثقافت ہر مقامیت کا انداز بود و باش اس کا رہن سہن جس طرح سے مختلف ہوتا ہے اسی طرح سے جغرافیائی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے دفاع یا دوسروں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا اور اپنے دفاع کی خاطر دوسروں پہ حملہ کرنا، یہ بھی انسان کی زندگی کا اور معاشروں کا اہم حصہ رہا ہے۔ اس حوالے سے مختلف سیاسی نظریات بھی موجود ہوتے ہیں۔ اگر اس بات کو یوں کہا جائے کہ ہر مقامیت اپنے اندر مخصوص سیاسی بیانیے بھی سموئے ہوئے ہوتی ہے تو بے جانہ ہو گا۔ ہر مقامی ثقافت کا جہاں مختلف پہلو ہوتے ہیں وہیں اس کے مخصوص سیاسی بیانیہ بھی ہوتے ہیں۔ ان بیانیوں پہ مقامی اثرات کے ساتھ ساتھ بیرونی حملہ آوروں کے اثرات بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی مثال برصغیر پاک و ہند ہے جہاں پہ بادشاہت کا نظام رائج تھا۔ مقامی بیانیوں نے خود کو قائم رکھنے کی ہر صورت کوشش کے باوجود بھی بیرونی طور پہ آنے والے لوگوں کے اثرات کو قبول کیا ہندوستان کی تاریخ پہ نگاہ دوڑائی جائے تو بادشاہت کی جگہ انگریزوں نے جمہوریت کو رائج یا نافذ کیا یوں بادشاہت کا صدیوں پرانا نظام ختم ہو کر ایک جمہوری سیاسی منظر نامے میں تبدیل ہو گیا۔ اسی طرح برصغیر کے گرد و نواح میں مختلف سینکڑوں مقامی چھوٹی ریاستیں موجود تھیں جن کا اپنا ایک سیاسی نظام اپنا ایک سیاسی حوالہ اور سیاسی نظریات تھے۔ تاہم وہ ایک بڑے مرکز سے متاثر ہو کر اپنے اپ کو اس میں ضم کر بیٹھے یوں مقامی علاقوں میں مخصوص سیاسی نظریات بھی ہوتے ہیں۔ بعض علاقوں میں آج بھی جدید پولیس کے نظام اور عدل و

انصاف کے نظام کے برعکس جرگوں اور مقامی پنچائتیوں کا نظام رائج ہے۔ جہاں پہ سیاسی فیصلے بھی انہی پنچائیتوں میں ہوتے ہیں۔اس طرح سے ہر علاقے کی ایک اپنی سیاسی شناخت بھی ہوتی ہے۔اس باب میں مقامیت کے مذہبی اور سیاسی پہلو کو تفصیل سے دیکھا جائے گا۔ناولوں میں موجود ان عناصر کی وضاحت اور نشاندہی کی جائے گی۔

3.1 مذہبی بیانیے

ہزارہ کی مقامی آبادی زیادہ تر مذہب اسلام سے تعلق رکھتی ہے۔ناول نگار نے جس عہد سے ناول کا آغاز کیا ہے اور جن ادوار کی پیشکش کی ہے مقامی سطح پہ لوگوں کے مختلف مذہبی خیالات اور تصورات کا اظہار بھی اس تناظر میں ملتا ہے۔جاگے ہیں خواب میں ایسا ناول ہے جو اپنے تہذیبی ورثے کا مکمل بیان ہے۔اس مقامیت کے بیان میں مصنف نے مقامی مذہبی تصورات بیان کیے ہیں۔ مذہبی تصورات بھی بعض اوقات علاقائی ثقافت کے اثرات سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات اور رائج تصورات مذہب کی تبدیلی کے باوجود مقامی نوعیت کے ہونے کے باعث نئے آنے والے مذہب یا قوم کا بھی حصہ بن جاتے ہیں۔ناول میں تاریخی پس منظر ہو یا نئے دور کا زمانہ مذہبی تصورات کو بھی ناول نگار نے ان مقامی کرداروں کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔

ہزارہ کے مقامی تصورات کے ساتھ ساتھ تاریخ اعتبار سے دیکھا جائے تو خلیفہ سید احمد بریلوی کی مذہبی تعلیمات کا اثر بھی ان پہ موجود ہے۔اس کا تذکرہ ناول میں بھی ملتا ہے۔ ناول نگار کے ہاں تاریخی شعور کے ساتھ ساتھ مقامیت کے تصورات سے آگاہی بھی ملتی ہے۔ناول میں ان تاریخی حوالوں کے تناظر میں مقامی مذہبی تصورات کو بھی بیان کیا ہے۔ مقامی نوعیت کے بعض تصورات مذہبی تصورات کے متضاد دکھائی دیتے ہیں۔ان پہ مقامی روایت کا زیادہ اثر ہے۔ ہزارہ کی مقامی تاریخ میں مذہبی اعتبار سے ایک اہم موڑ سید احمد بریلوی کی خطے میں آمد تھا۔ مقامی لوگوں نے مذہبی وابستگی کے تحت نہ صرف ان کو کھلے دل سے تسلیم کیا بلکہ ان کی عزت وعقیدت میں رائج تصورات کو بھی قربان کر دیا جو ان کی مقامی روایت میں خاص اہمیت کے حامل تھے۔

> "یہاں تک ان کے آباؤاجداد صدیوں سے جس طریقے سے نماز ادا کرتے چلے آرہے تھے۔اس میں بھی تبدیلی لا کر انہوں نے اپنے آپ کو سید احمد بریلوی کے مسلک سے ہم آہنگ کر لیا۔البتہ شادی بیاہ اور مرگ وموت کی رسومات جنہیں سید احمد بریلوی غیر اسلامی قرار دیتے تھے انہوں نے برقرار رکھیں شاید اس معاملے میں عقائد نے ثقافت اور رسوم ورواج کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔"(1)

مقامی ثقافت میں مذہبی حوالوں سے خاص تصورات تھے۔ پیر و مرید کا تعلق یہ تھا کہ وہ دنیاوی اور اخروی لحاظ سے ان کی رہنمائی کرے گا۔ سر سید احمد بریلوی کے حلقہ ارادت میں شامل ہونا ان کے ہاں مذہبی تصورات کی اہمیت اور حرمت کا ثبوت ہے۔ان کی خاطر انہوں نے کئی معاملات پہ نظر ثانی کی۔اس کے علاوہ بعض معاملات ایسے

تھے جن کا مذہب سے تعلق نہیں تھا۔ وہ مقامی رسوم و رواج کی بنیاد پر چل رہے تھے۔ ان کا تعلق محض مقامی سطح کے لوگوں سے تھا۔ جو ایک مخصوص مقامی علاقے تک محدود تھیں۔

اسی طرح مقامی سطح پہ نکاح شادی کے لیے شیر بہا کی رقم تھی۔ اس رسم کے مطابق لڑکا جب تک 180 روپے لڑکی والوں کو کما کر نہ دیتا اس کا (نکاح نہ کرتے) رخصتی نہ کرتے۔ سید احمد بریلوی نے اس کو غیر شرعی قرار دیا لیکن انہوں نے اس کو نہ مانا مقامی رسوم اور رواج سے یہ رسم چلتی رہی جس کا تعلق ان مقامی قبائل کے روایت اور عقائد سے تھا۔ اس کے علاوہ نور آباد میں پہلی موت کے موقع پہ ہونے والی رسوم کو دیکھا جائے تو مقامی مذہبی تصورات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کے ہاں مذہب سے زیادہ اساطیری کہاوتوں تصورات کی کثرت ہے جو غیر منطقی ہونے کے باوجود ان کے مذہبی تصورات کا حصہ ہیں۔ بنیادی طور پہ ان لوگوں کے ذہنوں میں پنپنے والے وہ تصورات ہیں جو نسل در نسل آگے چلتے رہتے ہیں۔ خواہ ان کی دلیل ہو یا نہ ہو ان کو روایت میں اتنی پختگی حاصل ہو جاتی ہے کہ کسی صورت میں بھی اس کا رد کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ناول میں اس حوالے سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"بہن! میں تو پرسوں شام کو ہی سمجھ گئی تھی کہ لالا جی اب نہیں بچیں گے۔ جیسے ہی مغرب کی آواز بلند ہوتی تھی ۔ گیدڑوں نے منحوس آواز میں چلانا شروع کر دیا۔"(2)

"میں نے تو کل دو بلیوں کو بھی سر جوڑ کر روتے ہوئے دیکھا خدا خیر کرے۔"(3)

"ابھی صبح سویرے جب میں ادھر کو آ رہی تھی۔ میرا کتا آسمان کی طرف دیکھ کر رو رہا تھا۔"(4)

قومی نوعیت کی ان توہمات پرستیوں نے ان کے مذہب کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ خدا کے بھروسے کے باوجود ان چیزوں کو کسی نہ کسی تصور کے ساتھ جوڑ دیتے۔ کسی بھی مصیبت کا پیش خیمہ کسی چیز کے ساتھ منسلک کر دیا جاتا۔ ان تصورات کا تعلق ضروری نہیں کہ دوسرے علاقوں سے بھی ہو۔ ان کا تعلق مقامی افراد کے ساتھ ہے۔ جو ان عقیدوں کا حصہ ہیں صدیوں سے موجود ضعیف اعتقادیاں ان کی تہذیب کا حصہ بن جاتی ہیں۔ ان لوگوں کے ہاں صدیوں پرانی روایت اساطیر اسی طرح سے موجود ہیں۔ مذاہب کی تبدیلی مقامی رویوں پہ زیادہ اثر انداز نہیں رہتی اور ایسی اساطیر خدا پہ توکل کے باوجود بھی کسی نہ کسی صورت پہ قائم رہتی ہیں۔ لوگ ان کے سحر سے نہیں نکل سکتے اور اس کی ایک وجہ کم علمی یا کم فہمی بھی ہو سکتی ہے۔ جو بھی کہا جائے یہ اس مقامی ثقافت کا ایک اہم حصہ ہوتی ہے۔ جس سے روح گردانی کرنا کوئی بھی نہیں چاہتا بلکہ ان کی آبیاری نسل در نسل کی جاتی ہے۔ یہ روایات اسی طرح مستحکم ہو جاتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ بزرگان دین کے ساتھ ان کا لگاؤ بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ہزارہ کی مقامی روایت و ثقافت میں اسے بزرگان دین کے عقیدت کا پہلو بھی غالب ہے۔" بری امام سرکار "اسلام آباد کے علاوہ ہری پور ہزارہ اور اس کے ملحقہ خطے کی ایک اہم بزرگ ہستی ہیں۔ ناول نگار نے ان کا مختصر تذکرہ بھی ناول میں کیا ہے۔ اس کے ذریعے مقامی روایات میں ان کا تقدس اور مذہبی لگاؤ کی جھلک بھی دکھائی ہے۔ ہری پور میں کئی جگہیں ایسی مشہور ہیں

جن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ بری سرکار کی چلاگاہ تھیں۔ ایسی ہی چلاگاہ کا تذکرہ ناول میں بھی ملتا ہے۔ ایسی جگہوں پہ آج بھی لوگ عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں اور اپنی مشکلات کے حل کے لیے وہاں پہ منتیں اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔

"سردار ظفر علی خان کے بارے میں ایک روایت یہ بھی تھی کہ دراصل وہ وہاں چلا کاٹنے جاتے تھے۔ انہیں کئی لوگوں نے غار سے تقریباً پانچ کلومیٹر دور نیلاں ندی میں اس چھوٹی سی جھیل کے کنارے بیٹھا ہوا دیکھا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ بری سرکار نے مسلسل چلا کاٹا تھا۔ یہاں تک کہ مچھلیوں نے ان کے جسم کا سارا ماس نگل لیا۔"(5)

ایسی روایات میں عقیدت اور تقدس کا وہ پہلو شامل ہو جاتا ہے جس کے تحت کسی بھی محترم شخصیت سے والہانہ محبت کا اظہار اس حد تک کیا جاتا ہے۔ اس کے پیرائے میں ان کے ساتھ غیر منطقی حکایات و کرامات جوڑ دی جاتی ہیں۔ علم کی کمی اور سادگی جیسی کئی ایسی وجوہات ہو سکتی ہیں جن کی وجہ سے ایسی روایات کو تقویت ملتی ہے۔ مقامی رسم و رواج ثقافتی عناصر ہی بسا اوقات مذہبی تہوار، رسومات کا اس قدر گہرا روپ دھار لیتی ہیں کہ ان کو ہی مذہب کا لازمی جزو سمجھا جانے لگتا ہے۔ ان بزرگوں سے جڑی عقیدت بہت ساری غلط فہمیوں کو بھی جنم دیتی ہے۔ جو محض ان کے پیروکاروں کی خوش اعتقادی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

ظفر علی خان کی وفات کے بعد لوگ ان کی عقیدت دل میں لیے ہوئے تھے۔ ان کی کرامات کا سلسلہ لوگ ان کے مرنے کے بعد بھی مانتے تھے۔ ظفر علی خان کی ذہنی کیفیت کے بارے میں لوگوں نے ان کے ساتھ کرامات و کرشمات کا ایسا سلسلہ جوڑا کہ ان کو ایک ولی بزرگ کے طور پر جانا پہچانا جانے لگا۔ دور دراز کے مقامی علاقوں میں یہ سادہ لوح انسان کسی بھی غیر معمولی چیز پہ عقیدہ اور ایمان بہت جلد لے آتے جو بعض اوقات ان کے استحصال کا باعث بھی بن جاتی ہے۔

"کاظم خان کی وفات کے بعد ان کے بھائی سردار جعفر خان نے نہ صرف یہ کہ اپنے باپ کا مزار بنانے کی اجازت دے دی بلکہ خود بھی اس میں خاطر خواہ حصہ ڈالا تھا۔ سردار جعفر خان کی اولاد اب بھی مزار کی دیکھ بھال کر رہی اور ہر سال ان کا عرس بھی منعقد کرواتی ہے جن میں دور دراز سے لوگ ڈالیاں لے کر حاضر ہوتے ہیں۔"(6)

دور دراز موجود ان لوگوں کی ضعیف الاعتقادیوں کی ایک وجہ ان کی مالی اور معاشی مسائل بھی ہیں۔ ان لوگوں میں تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی جس کی وجہ سے ان کی ضعیف اعتقادیاں نسل در نسل چلتی رہتی ہیں۔ ان کی پڑھی لکھی اولادیں اصل بات کو سمجھتے ہوئے صرف نظر کرنے لگیں۔ بعض ان میں سے ایسے نکلے جنہوں نے اس کو اپنے لیے باعث شرف سمجھا اور اس سے اپنے مالی فوائد کا ذریعہ بھی بنا لیا ان کی اولادوں نے انتظام کو سوچتے سمجھتے کے باوجود بھی جاری و ساری رکھا۔ مقامی لوگ اسی عقیدت اور احترام سے ان بزرگوں کی درگاہوں پر حاضری دینے کے

لیے آتے ہیں۔ وہ اپنے تزکیہ نفس کی خاطر اپنی ضروریات کی عرضی لے کے آتے ہیں۔ وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ اب وہاں بیٹھے مجاور محض اپنے مالی معاملات کا سوچتے ہیں جن کو نہ تو تصوف سے کچھ سروکار ہے اور نہ ہی طریقت اور پیری مریدی سے۔

ناول میں موجود پہلے حصے کے ہیرو ظفر علی خان، جن کے اوصاف بعد ازاں زمان میں بھی ملتے ہیں، ان کی کرامات کا چرچا چار سو پھیل جاتا ہے اور لوگ ان کی تعظیم کرتے ہیں بعد زاں ان کے مرنے کے بعد بھی اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور لوگ ان کو پیر کے منصب پر فائض کرتے ہیں۔ کئی ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں مقامی مذہبی بیانیہ موجود ہے۔ ان تصورات کا تعلق اس مخصوص تہذیب سے ہے۔ یہاں کی مقامیت کو بیان کرتے ہوئے اختر رضا سلیمی نے ان کی تصویر واضح کی ہے۔ مذہبی رہنماؤں کی عزت و تکریم کا پہلو ان کے مقامی ثقافت اور روایات کا حصہ ہے جو تہذیب کو سمجھنے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔ ناول نگار نے مقامی اساطیر کو بھی بیان کیا ہے۔ اختر رضا سلیمی کے دونوں ناولوں میں یہ عناصر دکھائی دیتے ہیں۔

"قبلوں میں تہذیبی و ثقافتی زندگی کے ساتھ ساتھ ان علاقوں میں صدیوں سے رائج لوک قصوں کہانی اور اساطیر کو بھی اجاگر کیا ہے۔"(7)

مابعد جدیدیت مقامی ثقافتوں بیانیوں کو ان کی پوری جزئیات کے ساتھ بیان کرنے والا اور ان کی حوصلہ افزائی پہ زور دیتی ہے۔ مابعد جدید تصور کا حامل یہ ناول اپنے اندر مقامی ثقافتوں کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ مخصوص مقامی مذہبی بیانیوں کی بھی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ناول میں تاریخ کے مختلف ادوار کے تناظر میں ان کی وضاحت کی ہے۔ ناول نگار کا وصف ہے کہ اس نے مذہبی نوعیت کے بیانیے کو بھی اپنے وسیع مشاہدے کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔

جندر میں کسی مخصوص مذہبی تصور کا پتہ نہیں ملتا جو اس مقامیت کا خاصہ ہو۔ جندر میں مذہبی بیانیے بہت کم ہیں۔ ان بیانیوں میں سے ماسوائے چند ایک کے جو ان لوگوں کے اساطیر اور مقامی تصورات کا مذہب کے جڑت کا بیان ہے یہ محض رسم و رواج کی حد تک قائم ہے۔ ان کو مذہب کے ساتھ جوڑ کر اس کا حصہ تصور کر لیا جاتا ہے۔ ان تصورات کا مذہب کے ساتھ مخصوص تعلق تو نہیں لیکن مقامی روایت کے تحت ان کو ایک ہی سمجھا جاتا ہے۔ پرانی اساطیر کو مذہب کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ آئندہ آنے والے مذہب کے ساتھ بھی جاری رکھا جاتا ہے۔ روایتی اساطیر کو مذہب کی تبدیلی کے بعد بھی جاری رکھا جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ مذہب کا حصہ ہوں بلکہ وہ تو مقامی روایت کا خاصا ہوتے ہیں۔ جندر میں کسی مخصوص مذہبی بیانیے کا تصور ناپائید ہے۔ ایک جگہ ایک اساطیر کا بیان ملتا ہے جو بجو نامی جانور کے ساتھ مخصوص ہے کہ وہ مردوں کو قبر سے نکال کر لے جاتا ہے۔ خوشی یا غم کی مخصوص رسومات مقامی تناظر

میں ملتی ہیں۔اس مقامی مذہبی بیانیے میں مردوں کی تدفین ہو یا موت کا منظر مقامی ثقافت کے زیر اثر ہیں۔ مقامی مذہبی بیان کچھ اس طرح ہوتا ہے:

"میرے علاقے کے بہت سے لوگ اب بھی اس کہانی کی صحت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے وہ بھی صدیوں سے چلے آتے رواج کے مطابق اپنے عزیزوں کی قبروں کو اس کی دست برد سے بچانے کے لیے ان پر کانٹے دار درختوں، خاص کر جھنڈی کی پھینگیں رکھتے ہیں اور یہ پھینگیں اس وقت تک قبر پر موجود رہتی ہیں جب تک اسے باقاعدہ پکا کرنے کا بندوبست نہیں کر لیا جاتا، یہ یقین نہیں کر لیا جاتا کہ اب مردہ مکمل طور پر گل سڑ چکا ہے۔"(8)

مسجد کو اسلامی تہذیب اور معاشروں میں ہمیشہ مرکزیت حاصل رہی ہے۔ بڑے جرگے، اجلاس، صلاح مشورے بھی یہیں ہوا کرتے تھے۔ کسی بھی مشکل کے وقت نفلی عبادتوں کا اہتمام نہ صرف عاجزی بلکہ اجتماعیت کا ایک رنگ ہے۔ لوگ فصلوں کی بوائی اور کٹائی کے وقت اس کا خاص اہتمام کیا کرتے تھے اس کے علاوہ دیہاتوں میں تو اکثر مہمان خانے کے طور پر بھی مسجد سے کام لیا جاتا تھا۔ جب کسی کے گھر کوئی مہمان آتا اس کے پاس اسے ٹھہرانے کی استطاعت نہ ہوتی تو وہ بھی اسے مسجد میں مہمان کے طور پہ ٹھہرا دیتا۔ بہت سے دیہاتوں کی طرح یہاں بھی مسجد کا مخصوص تصور اور تقدس موجود ہے۔

"کٹائی دن کے آغاز سے ایک دن پہلے تمام لوگ مسجد میں جمع ہوتے اور جو موجود نہ ہوتے انہیں وہاں موجود افراد کے ذریعے کٹائی کے آغاز والے دن اور مقام کے بارے میں مطلع کر دیا جاتا۔ مقررہ دن فجر کے بعد تمام لوگ مقررہ مقام پر دو صفیں بنا کر کھڑے ہو جاتے۔ اگلی صف درانتی بردار لوگوں کی ہوتی جبکہ اس سے پچھلی صف جو نسبتاً چھوٹی ہوتی، درانتیوں سے تہی مولوی صاحب برکت کے لیے دعا کراتے۔"(9)

مذہبی رسومات کے ساتھ علاقائی تصورات بھی جڑے ہیں۔ جن میں بعض اوقات مذہبی عقیدت سے زیادہ مقامی رسم و رواج کو دخل ہوتا ہے۔ ناول نگار نے اس کی چند مقامات پہ وضاحت کی ہے۔ مقامی روایات توڑنے والے کو اس نظام کا حصہ تصور نہیں کیا جاتا۔ خوشی ہو یا غم کا موقع فصلوں کی کٹائی کا موقع پہ ایک اجتماعیت قائم تھی۔ اس کو توڑنے سے انحراف کرنے والوں کو اس نظام سے بھی باہر کر دیا جاتا۔ جو ان کے ساتھ جڑتا وہی اس نظام کا حصہ بننے کا لائق ٹھہرتا۔ ایسی چند مثالیں ہیں جو ناول میں موجود ہیں۔ حتیٰ کہ مذہبی رسومات میں بھی اسی معاملے کو برتا جاتا اس سے قطع نظر کہ ان کے مذہب میں اس کی کیا اہمیت ہے یا اس کا کوئی اجر و ثواب ہے۔ یہاں اجر و ثواب سے زیادہ مقامی رسم و رواج کو دخل ہوتا کہ ایک دوسرے کے خوشی غمی کے موقع پر ضرور شامل ہوا جاتا۔ بطور خاص غمی کے موقع پہ تو شامل ہونا لازم تھا تا کہ دوسرے کے غم میں برابر کا شریک ہوا جا سکے۔ یہ غم کا موقع محض موت تک کی محدود نہیں تھا بلکہ کسی کی فصل کا نقصان ہو یا کسی کے جانور کا مر جانا ہر لحاظ سے دوسرے لوگ اس کے دکھ درد میں شریک ضرور ہوتے

ہیں۔اس کے پاس افسوس کے لیے حاضر ہوتے۔اس کے لیے اگر کچھ کر سکتے ہیں تو عملی طور پر بھی کرنے سے گریز نہ کرتے اس مقامیت میں اجتماعیت کو ہی مرکزیت حاصل ہے۔

"اس نے اپنی زمین کسی کو ٹھیکے پر دے دی جو اس کے حصے کے دانے ہر سال شہر پہنچا دیا کرتا تھا۔جب وہ مرا تو اس کے بیٹے اس کی میت لے کر گاؤں آئے تو اس کی قبر مجھے اور اس کے بیٹوں کو تنہا کھودنی پڑی تھی کہ گاؤں کا کوئی بھی آدمی اس کی قبر کھودنے نہیں آیا تھا۔تاہم جنازے میں پورا گاؤں شریک ہوا تھا کہ اس نے کسی کا جنازہ نہیں چھوڑا تھا اور اگر کسی وجہ سے نہیں آ سکا تو اپنی بیوی یا بیٹے کو ضرور بھجوا دیا تھا۔"(10)

جندر میں مقامی نوعیت کے مذہبی تصورات کی باقاعدہ شکل موجود نہیں ہے۔محض چند مقامات پہ مقامی رسموں اساطیر کا شعور ملتا ہے جو مذہب سے متعلقہ ہیں۔مذہبی لحاظ سے ان کے ہاں وہی تصورات ہیں جو عموماً مسلم معاشرے کی پہچان ہوتے ہیں۔ان کے ہاں بھی مسجد کا تقدس اس کی مرکزیت قائم ہے۔وہ کسی بھی بڑے کام کے آغاز سے پہلے دعا اور رب کی خوشنودی کے طالب ہیں اور یہی تصور ان کو مسجد میں اکٹھا کر دیتا ہے۔بعض مقامی رسوم و رواج نے مذہب کا رنگ ضرور دھار لیا ہے جو ان کی خالصتاً مقامی روایت ہیں۔مذہب کا حصہ تو نہیں مگر اس کے ساتھ اس طرح سے جوڑ دیا ہے کہ وہ بھی مذہب کا حصہ ہی معلوم ہوتے ہیں۔البتہ مابعد جدیدیت کے تناظر میں مقامی بیانیے کے حوالے سے چند بیانات ضرور ملتے ہیں۔

ناول ادھ ادھورے لوگ کا اصل موضوع مقامی شناخت اور ثقافت کا بیان ہے۔ناول کا مرکزی کردار تمام عمر اپنی شناخت کے بحران کا شکار رہا اور اس تلاش میں مٹی میں جا ملا۔ریاست بہاولپور کی مقامیت کا بیان ناول کا اصل موضوع ہے ریاست خود مختار حیثیت سے قائم تھی جس کا انتظام "نواب صادق" کے ہاتھ میں تھا۔ریاست کی اکثریتی آبادی کا مذہب، مسلمان جبکہ دوسری اقوام و مذاہب کے لوگ بھی اس میں رہتے تھے۔ناول میں اس مقامیت کو بیان کرتے ہوئے محض مسلمانوں کی بات ہی نہیں ہوئی بلکہ ہندو مذہب کی بھی نمائندگی ملتی ہے۔تقسیم سے قبل تمام مذاہب کے افراد اپنی مذہبی آزادی کے ساتھ معاشرے کا فرد ہونے کی حیثیت سے یکساں حقوق کے حامل تھے۔ہندوؤں کو تو مسلمانوں سے مالی لحاظ میں برتری حاصل تھی۔اس صورتحال کے باوجود ریاست میں مذہبی رواداری تھی۔تمام مذاہب کے لوگ محض بہاولپوری تھے۔ان کے اتفاق و اتحاد کے لیے یہی پہچان بہت تھی تمام اپنی مٹی کے وفادار اور اس کے بیٹے تھے۔ناول میں رواداری کے تناظر میں کچھ اس طرح سے نمائندگی ملتی ہے۔

"مذہبی رواداری کے ہوتے ہوئے بھی ریاست کی مجموعی شناخت اسلامی تھی اور خود نواب صاحب اسلامی تعلیمات اور روایات کے سب سے بڑے امن سے رہ رہے تھے۔ریاست کی آبادی میں مسلمان اگرچہ 81 فیصد اور ہندو سکھ عیسائی وغیرہ 19 فیصد مگر پھر بھی ہندوؤں کے سمیت سبھی غیر مسلموں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل تھی۔"(11)

ناول میں حکیم رام لال ہندو مذہب کا نمائندہ کردار ہے۔اگرچہ ناول میں کوئی بھی کردار مذہبی حوالے سے مخصوص نہیں۔ حکیم رام لال کے کردار کا مقصد بھی اس طبقے کی نمائندگی کرنا ہے جو قیام پاکستان کے بعد علاقہ چھوڑنے پہ مجبور ہوئے۔ تقسیم سے قبل ہندوستان کے کئی دوسرے علاقوں کی طرح ریاست بہاولپور میں بھی مذہبی رواداری قائم تھی۔ حکیم رام لال جیسے کئی افراد ایسے تھے جو مسلمانوں سے مال و دولت میں آگے تھے۔اس کے باوجود لوگوں کے درمیان کسی بھی چیز کا اختلاف نہ تھا۔مذہبی رواداری قائم کی تقسیم کے بعد فسادات کی گرد یہاں تک بھی پہنچ گئی۔ناول میں حکیم رام لال کے بیان میں ہندوانہ رسم و رواج کا بیان بھی ملتا ہے۔مجموعی طور پہ ناول میں مذہبی بیانیے بہت کم ہیں۔ناول کا غالب موضوع ریاست بہاولپور کی شناخت کا مسئلہ ہے۔جس کے ساتھ ساتھ ثقافت کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔

ناول "انواسی "میں مقامیت کا بیان نمایاں ہے۔ایک ایسی بستی جو دریا کنارے آباد ہے۔ان کے مخصوص رسم و رواج، مذہبی عقیدت اور اساطیر ہیں۔برصغیر کا ایک ایسا عہد جہاں مخلوط مذاہب اور تہذیب ہے۔ان لوگوں کے درمیان مذہبی رواداری کا یہ عالم ہے کہ بسا اوقات کسی بزرگ صوفی سے عقیدت بھی مشترکہ طور پہ ہوتی ہے۔بستی آدم واہن کے گرد ناول کا قصہ چلتا ہے۔اس ناول میں بیان کردہ بستی کی عوام کا مذہب اسلام ہے۔ان کی مقامی زندگی میں نمایاں کردار بھی مذہبی طبقے کا ہے۔اس مقامیت میں لوگوں کی زیادہ تعداد ان پڑھ ہے۔مولوی اس کا مرکزی کردار ہے۔اس کردار کی خاص عزت و تکریم ان کے دلوں میں ہے۔مذہبی حیثیت کا حامل یہ مولوی ان میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔اس کی برتری کے باعث اس کا علاقے میں اثر و رسوخ زیادہ ہے۔بیرونی طور پر بھی اس کو معتبر سمجھا جاتا ہے۔اسی کے ساتھ بات چیت کی جاتی ہے۔ان لوگوں کے اندر مذہبی جذبات کی شدت ہے۔مذہبی تقدس کے جذبات اور عقیدت میں جنون کی حد تک ہیں۔جس کے لیے وہ مر مٹنے کو تیار ہیں۔انہی جذبات کو مذہبی رہنما اور دوسرے مخالفین اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ان مقامی لوگوں کا نوآبادکاروں کے ساتھ تنازعہ بھی مذہبی نوعیت کا تھا ۔انگریزوں نے ریلوے لائن بچھانے کے لیے ان کے آبائی قبرستان کو اجاڑنا چاہا۔انگریزوں نے اپنے نقشے کے مطابق کام کرنے اور اضافی خرچ کو بچانے کے لیے اپنے منصوبے کو جاری رکھنے پر اکتفا کیا تو دوسری طرف ان مقامی لوگوں کے مذہبی جذبات کو بری طرح سے ٹھیس پہنچائی گئی۔ مقامی لوگ اپنے عقیدے اور مذہب کی اس طرح آبروریزی کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔نوآبادیاتی عہد میں مقامی لوگوں کی حیثیت اور نوآبادکاروں کی طرف سے بے بس اور محکوم لوگوں پہ طاقت کے بے جا استعمال کا بیان بھی اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے۔مقامی لوگ اپنے آباواجداد کی ہڈیوں/ قبروں کی بے حرمتی کا سانحہ آسانی سے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔بستی کے نوجوان اپنے بزرگوں کی باقیات اور قبروں کی بے حرمتی ہوتے دیکھنے کو کسی صورت تیار نہ تھے۔اس میں سے کچھ مصلحت پسند بھی تھے۔جن کی تعداد

بہت کم تھی۔نوجوان اپنے بزرگوں کی نشانیوں کی خاطر مر مٹنے کو تیار تھے۔ان کے ان جذبات کو اُبھارنے میں مولوی کے فتویٰ نے بھی کلیدی کردار ادا کیا جو بعدازاں اپنے فتویٰ سے رجوع کرلیتا ہے تاہم یہ نوجوان کسی صورت بھی سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں ہیں۔مذہب کا تقدس ان کے لئے اہمیت کا حامل ہے۔مقامیت کے پیرائے میں ان تصورات کی وضاحت ہے۔

"اس سے پہلے کہ گورے تمہارے وڈکوں کی ہڈیاں ان کی قبروں سے نکال کر باہر پھینکیں، کیوں نہ ہم اسے اپنی تقدیر مان کر خود ہی نکال لیں اور خود ہی کسی اور جگہ عزت اور احترام سے دفنا دیں۔"

"اس سے بہتر ہے کہ ہم خود نہ مر جائیں" سیدے کی آواز میں اب بپھراؤ نہیں رہا تھا۔"(12)

مولوی جاراللہ نے فتوی دیا کہ کوئی بھی اپنے بزرگوں کی قبر کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔قبر کھودنا اور ان کی باقیات کو دوسری جگہ منتقل کرنا جائز نہیں ہے نمایاں حیثیت کے مالک مولوی کی بات کے بعد کوئی بھی ایسا کرنے کو تیار نہیں تھا۔بعدازاں وہی مولوی اپنے فتوے سے پھر جاتا ہے۔ناول میں اس کے کردار کے ذریعے ناول نگار نے مقامی سطح پہ ان مذہبی نمائندوں کے بے جا اثر ورسوخ اور اس کے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کو بے نقاب کیا ہے۔مولوی کا کردار ایسی ہی مصلحت کا شکار ہے جو محض اپنے ذاتی مفادات کی خاطر دوسروں کو ان کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔گاؤں والے بھی کم علمی کے باعث عقیدت میں ڈوبے ایسے کرداروں کا آلہ کار بنتے رہتے ہیں۔اپنی آخرت کا سامان ایسے کرداروں سے جوڑ لیتے ہیں۔استحصالی قوتیں انہی جذبات کو اپنے حق میں استعمال کر کے ان لوگوں کا استحصال کرتی ہیں ۔اس کے باوجود بھی یہ لوگ اسے اپنے خوش بختی قرار دیتے ہوئے سب کچھ سہہ لیتے ہیں۔قبروں کی منتقلی کا معاملہ بستی آدم واہن کے لوگوں پہ بھی قہر بن کر ٹوٹا ایسا عمل جس کا تصور بھی محال تھا حاکم وقت کے آگے بے بس و مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ان قوتوں کے آگے ان کے مذہبی جذبات بری طرح مجروح ہوتے ہیں۔

"مٹھل ماچھی نے اپنی لرزتی ہوئی آواز میں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ گوروں سے متھا مت لگایا جائے۔۔۔نیلو سانسی کی سانس بے شک پھول چکی تھی مگر اس نے ٹوٹتے ہوئے لفظوں میں کانپتے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا کہ گوروں کی حکم عدولی نہیں۔بہت ہی بھیڑیے لوگ ہیں جو سوچ لیں اس سے ٹلتے نہیں ۔۔۔مگر مٹھل ماچھی کے مشورے پر مولوی جاراللہ نے یہ کہہ کر رندہ پھیر دیا کہ ایسا کرنا میت کی توہین، صریحاً کفر اور گناہ کبیرہ ہے۔"(13)

مولوی کے فتوے کے بعد کسی میں بھی انکار کی جرات باقی نہ رہی۔سیدے کا کردار مقامی کرداروں کا ایسا نمائندہ کردار ہے۔جو اپنے حقوق کے لئے آواز اٹھانے کے جرم میں باغی قرار دیے جاتے ہیں۔انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں ایسے کئی بہادر کرداروں کو اپنی طاقت کے نشے میں غدار کہہ کر کچل ڈالا۔جو اپنی مقامیت کی بقاء کے لیے کھڑے ہوئے۔تاریخ پہ نگاہ دوڑائیں تو ان کی شکست میں اپنے کردار ہی ان کے دشمن ثابت ہوئے۔جو دشمنوں کے

ساتھ سمجھوتہ کر کے ذاتی مفادات کو ترجیح دیتے ہوئے اپنی دھرتی اور اپنے لوگوں کی قربانیوں پہ بھی آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ جس طرح سیدا اس جنگ میں تنہارہ گیا۔ نوآبادیاتی عہد میں ان لوگوں نے مقامی لوگوں کے حقوق کو بری طرح سے روندا۔ ان کے مذاہب کی توہین سے بھی باز نہ آئے جبکہ اپنے مفادات کی خاطر مقامی لوگوں کی مخصوص تعداد ان کے ارادوں کی تکمیل میں ان کے سامنے صف بستہ کھڑی تھی۔ جدیدیت اور ترقی کا نعرہ لگاتی قومیں معاشی مقامی ثقافتوں کو مٹانے کی ہر کوشش کرتی ہیں۔ نوآبادکاروں نے ترقی اور خوشحالی کے نام پر مقامی لوگوں کو جہاں کچھ فوائد دیے، وہیں اپنے مقاصد کے حصول اور ان کے تحفظ کو بھی یقینی بنایا۔ ان کے مد نظر محض اپنے ذاتی مفادات تھے مذہبی جذبات تک کو ٹھیس پہنچاتے رہے۔ لوگوں کو باقی مظالم کے ساتھ اس ظلم کو بھی برداشت کرنا پڑا جو ان کے مذہبی عقیدے سے متعلق تھے۔

"وہ کہا کرتی تھی نہ کہ مرنے کے بعد مجھے اپنے باپ کے قدموں میں دفنانا!۔۔۔ اور ابھی دو سال پہلے وہ وہیں اپنے سئیں کے قدموں میں دفن ہوئی تھی۔۔۔ تو کیا کروں ان کی میتیں نکال کر کہاں لے جاؤں کیا کوئی اپنی ماں کے ادھ گلے وجود کو دیکھ سکتا ہے؟ کیسے اکٹھا کرتا پھروں ان کے وجود کے چھوٹے چھوٹے ٹوٹے محض اس لیے کہ گوراصاحب نے ان قبروں میں سے لوہے کے شہتیر گزارنے ہیں۔ کیسا حاکم ہے یہ کہ اپنی رعایا کو مرنے کے بعد بھی عزت و آبرو کے ساتھ مٹی ہونے کا حق تک دینے کا روادار نہیں۔"(14)

مولوی جار اللہ بعد میں انگریز سرکار کی ایما پر اپنے فتوے سے رجوع کر لیتا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی مذہبی حیثیت کا احترام اور معاشی حیثیت کا رعب ہر صورت میں اس کی تائید کرنے پہ مجبور کرتا ہے۔ مولوی جار اللہ کی رسائی داروغہ اور انگریز سرکار تک ہے۔ اسی لیے تمام بستی کے لوگ اس کی ہوشیاریوں کے باوجود بھی اس کی حمایت کرتے ہیں۔

مولوی جار اللہ کا کردار مقامی مذہبی تصور کو بھی واضح کرتا ہے۔ مقامی مذہبی بیانیے کو اسی کردار کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ مولوی بچپن میں ہی لڑکیوں کے نکاح نو عمر لڑکوں کے ساتھ پڑھا دیتا۔ اس عمل میں بھی وہ مذہب سے زیادہ مقامی رسم و رواج کی پاسداری کرتا رہا۔ لوگ اس کے فتوے کے حکم کے تابعدار تھے۔ قبرستان والے واقعے میں بھی مولوی کا کردار کسی مذہبی رہنما سے زیادہ نوآبادیاتی نمائندے کا سا ہے۔ جو مقامی لوگوں پہ اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے انگریزوں کے ساتھ اپنی تابعداری بھی ثابت کرتا اور اپنے تعلقات انگریزوں کے ساتھ استوار کر کے مالی و معاشی فائدے بھی حاصل کرتا ہے۔ مولوی کی اس معاملے میں خاموشی اور علیحدگی سے بستی کے کئی نوجوان اپنی جان گنوا دیتے ہیں۔ مولوی لوگوں کو ان نوجوانوں کے اپنے ورثا کی لاشوں کی بے حرمتی کی خاطر دی جانے والی قربانی کو بھی باطل قرار دیتا ہے۔

"بستی کے نوجوانوں کے مرنے کا مجھے بھی اتنا ہی دکھ ہے جتنا اور کسی کو ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک انہوں نے خودکشی کی ہے اس لیے ان کا جنازہ بھی جائز نہیں۔ انگریزوں کی طاقت سے ٹکر لینا کہاں کی عقلمندی ہے خودکشی ہی تو ہے۔ تم لوگ بھی کوئی عقل کرو، خودکشی نہ کرو۔۔۔ میں ان گورے سے کہا کہ سارے مرنے والے نوجوانوں کی لاشیں نئے قبرستان کے پاس رکھ دیں تاکہ ان کے ورثا ان کی شناخت کریں اور تدفین ہو سکے ۔ہاں جیسے ہی پو پھوٹی اور دن نکلتا ہے تو تمام بالغ مرد پرانے قبرستان پہنچ کر اپنے وڈکوں کی قبروں سے ان کے نشانیاں نکال کر نئے قبرستان میں عزت و آبرو کے ساتھ دفنا دیں۔"(15)

مذہبی رہنما کی حیثیت سے بستی کے لوگ اسے احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خواندگی کے اعتبار سے بھی مولوی کی ان مقامی لوگوں کی نسبت حیثیت نمایاں ہے۔ وہ اپنی اس حیثیت کا استعمال کرتا ہے۔ بچپن میں نکاح کی رسم بھی مولوی اپنے فتوے سے جائز قرار دیتا ہے۔ لوگ اپنی بچیوں کا اغوا کے خوف سے کسی لڑکے سے نام منسوب کر دیتے ہیں تاکہ کوئی ان کی طرف نگاہ نہ دوڑائے، نہ وہ اغوا اور زنا کا شکار ہوں۔ مولوی ان کے اس مقامی نوعیت کے کام کو شرعی جواز فراہم کرتا ہے۔

سنگری ناول کا مرکزی نسوانی کردار ہے۔ سنگری اپنے منگیتر کے ہاتھوں بے آبرو ہو جاتی ہے۔ اپنے مستقبل کی فکر اور اپنے بچے کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے مولوی جاراللہ کا انتخاب کرتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اسے تحفظ محض مولوی ہی فراہم کر سکتا ہے۔ جو صاحب حیثیت اور صاحب اختیار بھی ہے۔ سنگری مولوی سے نکاح کرنے کو کہتی ہے جبکہ سیدہ اس کا منگیتر جو گمشدہ ہے۔ اس کی موت کی بھی کوئی اطلاع نہیں۔ مولوی کے بقول ان کے بچپن میں خود سنگری اور سیدے کا نکاح پڑھوایا۔ سیدا ہی کیا بستی کے سارے نوجوانوں کا بچپن میں نکاح خواں مولوی ہی تھا۔ سنگری کی دعوت نکاح پہ اول تو وہ انکار کر دیتا ہے۔ اس کے اور سنگری کے مکالمے میں اس مذہبی کردار کی منافقت واضح ہوتی ہے۔ ایسے لوگ محض اپنے مفادات کے گرد گھومتے ہیں۔ مذہب تو ان کا وہ لبادہ ہے جسے اوڑھ کر ان کو تحفظ ملتا ہے۔

آپ مجھ سے نکاح کر لیں ابھی اسی وقت۔۔۔ اور کیا؟

میں کیوں کروں نکاح تمہارے ساتھ؟ تمہاری عمر کی تو میری دوتڑیاں پوتریاں ہیں مجھے لحاظ آتا ہے؛

آہا۔۔۔ اس وقت کیوں نہیں آتا لحاظ جب آتے جاتے میرے بت کی ایک ایک بوٹی اتارتے رہتے ہو کہ کہاں کہاں ماس زیادہ ہے اور کہاں کم یہ کیوں نہیں کہتے کہ حرام کرنے میں لحاظ نہیں آتا اور حق حلال کرنے میں خوف بھی آنے لگتا ہے اور لحاظ بھی۔"(16)

سنگری جیسی خوبصورت جوان لڑکی سے شادی کی غرض سے مولوی اپنے پڑھوائے گئے نکاح سے بھی دستبردار ہو جاتا ہے۔ شریعت گویا اصل نہیں بلکہ مولوی کی خواہشات کے مطابق تبدیل ہو رہی ہے۔ مذہبی لبادہ اوڑھے شخص نو آبادکاروں کا آلہ کار بھی ہے اور مقامی لوگوں کے استحصال کا شریک کار بھی ہے۔ ناول میں اس کے کردار کے ذریعے مقامی مذہبی تصورات کی وضاحت ملتی ہے۔ مولوی تمام لوگوں کے سامنے اپنے پڑھوائے ہوئے

نکاحوں کو باطل قرار دیتا ہے۔ شریعت میں ایسے نکاح جو وہ خود پڑھواتا آیا تھا۔ سنگری سے شادی کی گھر سے اس کو غیر شرعی قرار دینے لگا۔ مولوی کے فتوے میں تغیر مقصد کے مطابق آتا ہے۔ جب اور جہاں اس کو اپنا فائدہ نظر آتا ہے وہ اپنے فتووں سے رجوع کر لیتا ہے۔ ایسی مقامیت جہاں جہالت کے اندھیرے زیادہ گہرے ہوں وہاں ایسے نام نہاد مذہبی رہنما اپنی من مانی زیادہ کرتے ہیں۔ انیسویں صدی ہو یا آج اکیسویں صدی ایسے کردار آج بھی موجود ہیں جو مقامی لوگوں کا استحصال کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ مولوی جار اللہ نہ صرف سنگری کے نکاح کو باطل قرار دیتا ہے بلکہ وہ بستی کے لوگوں پہ بھی ملامت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جو ایسے نکاحوں کی پاسداری کر رہے تھے۔ مولوی اپنی باتوں سے خود انحراف کر لیتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس مقامیت میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں مذہب کا ہتھیار اور دوسروں کی نسبت بہتر معاشی حالت ہے۔

> اوبے شرمو شرم نہیں آتی مجھ پر الزام لگاتے جس سے بات کرتے ہوئے انگریز بھی ڈرتا ہے، کئی بار سوچتا ہے کہ مولوی صاحب سے بات کرے یا نہ کرے عقل کے اندھو بھلا نکاح کوئی ٹکے لا کا بھی ہوتا ہے؟ میں کیوں کرتا بھلا یہ شریعت کے خلاف کام۔ مجھے بلایا گیا تھا دعائے خیر کے لیے لہذا سنگری اور سیدے کی دعائے خیر کے بعد واپس آ گیا اب اگر تم دعائے خیر کو بھی نکاح بنا لو تو تمہاری مرضی۔۔۔ یہ چھوٹا موٹا ناواں تم لوگوں کی بکواس سے نکاح نہیں بن جائے گا۔"(17)

مذہبی تصورات کے ضمن میں زندہ پیر کی کرامات ان کے تقدس بھی اس مقامیت کا ایک اہم حصہ ہیں۔ دریائے ستلج کے کنارے بسی اس بستی آدم واہن میں ایک پیر کا تصور اور اس کی کرامات کے نظریات موجود ہیں۔ جو ان لوگوں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھے ہیں۔ برصغیر کے طول و عرض میں ایسی روحانی شخصیات موجود ہیں۔ جو اپنے عہد میں تبلیغ اسلام کا کام کرتی رہی ہیں۔ بعد ازاں مخلوط ثقافتی نظام نے ان کو پیچیدہ بنا دیا اور بہت سی کرامات ان کے ساتھ جوڑ لی جاتی ہیں۔ زِیر مطالعہ ناول میں بھی ایسا کردار موجود ہے جو مقامی اعتبار سے مذہبی حوالے سے تقدس کی علامت ہے۔ ایک بزرگ جو ان کے بقول دریا میں روپوش ہو گئے ان کا باقاعدہ ہر سال عرس منایا جاتا ہے۔ لوگ عقیدت کا اظہار کرتے آتے ہیں۔ یہ ثقافتی میلے برصغیر کے ہر علاقے میں منائے جاتے ہیں۔ مذہبی حوالے سے درباروں پر عرس اور میلے لگانا بھی ثقافتی پہلو ہیں تاہم وقت کے ساتھ ساتھ ان تصورات کو اس قدر پختہ کر لیا گیا ہے کہ مذہب کا ہی حصہ تصور کیے جانے لگے۔ زندہ پیر کرامت کے تصورات بھی مبہم ہیں۔ جن کی عقیدت اس مقامیت میں ہر مذہب کے عقیدت مند ہر مذہب کے لوگ ہیں۔ جو ان کے عقیدت میں یہاں آتے ہیں۔ تاہم درگاہ کا انتظام و انصرام مجاور خاندان کرتا ہے۔ جن کو اس سے غرض نہیں کہ کون آتا ہے اور کیا دیتا ہے۔ ان کے لیے بس یہ مسئلہ اہم ہے کہ کون کیا دیتا ہے۔ کئی مذاہب کے لوگ ان کو اپنا مانتے تھے۔ اس لیے مجاور خاندان بھی تین مذاہب کے تھے

۔ جنہوں نے مفاہمت سے مشترکہ عرس کی تاریخ مقرر کر رکھی تھی۔ جس پہ عرس منعقد ہوتا تھا۔ بکرمی تاریخ اور دن جمعہ کا یعنی ایسا دن جو تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لیے عقیدت کا حامل ہو۔

"جس طرح زندہ پیر کرامت کے اصل پہچان کے بارے میں کوئی بھی یقین سے کچھ نہیں جانتا تھا۔اسی طرح ان کا عرصہ پڑاؤ بھی اسرار کے پردے میں پوشیدہ تھا۔ مسلمان انہیں اللہ کا ولی، ہندو انہیں رام کا اوتار اور بدھ مت والے بدھ پیشواجان کے ان کے ملے میں شریک ہوتے۔"(18)

مذہبی حوالے سے قبرستان میں سے قبروں کو مسمار کرنے کے واقعے کے ساتھ ایک اور اہم واقعہ بھی پیش آیا کہ سات قبریں ایسے شہیدوں کی منسوب تھیں جن پہ ہر سال درویش آتے تھے۔ انگریزوں کی قبریں اجاڑنے کے بعد آنے والے عرس میں ان قبروں کو نہ دیکھ کر درویش روتے پیٹتے اور سر پیٹنے لگے کہیں پہ بھی ان قبروں کا نشان نہ ملا۔ مفاد پرست لوگوں نے اس مذہبی عقیدے میں ڈوبے ہوئے ہجوم کو مشتعل کیا۔ ایسے لوگ جو ان کے اپنے نہ تھے۔ جو ان کو سمجھ نہ سکے اور ان کی راہ پہ چلنے لگے وہ لوگ اس ہجوم میں سب سے آگے تھے جو لوگوں کو مسلسل اشتعال دلا رہے تھے یہاں تک کہ وہ مولوی جار اللہ کی طرف لپکے کہ اس سارے عمل میں اس کا ہاتھ ہے۔ مولوی جار اللہ تو اس بستی کا سب سے طاقتور آدمی تھا۔اس کی طرف ہجوم مارچ کرنے لگا مذہبی جنون میں ڈوبے ہوئے شخص اس قدر طاقتور ہو چکے تھے کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے۔ یہاں تک کہ انہوں نے مولوی جار اللہ کے گھر کا محاصرہ کر ڈالا اور مولوی سمیت اس کے کئی طالب علموں کو زندہ جلا دیا۔اس کے باوجود ان کے غصے اور انتقام کی آگ ٹھنڈی ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔

وہ حیران تھا کہ جو لوگ اتنے بڑے مجمع کی قیادت کر رہے ہیں۔ قتل پہ قتل کیے جا رہے ہیں اور املاک کو آگ لگا رہے ہیں، لوگوں کو اشتعال دلا رہے ہیں وہ تو اس بستی کے قطعی اجنبی ہیں۔ نہ وہ یہاں کے رہنے والے اور نا ہی کسی کے رشتے دار۔۔۔اس بستی میں تو کلہاڑی بھی شاید کسی چرواہے کے پاس ہو یہاں خنجر بھی کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ یہ تلوار اور تلوار نما برچھیاں اٹھائے لوگوں کو کون یہاں پر لایا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔"(19)

بستی کے لوگوں کے ہمراہ جب درویش دریا کی طرف آئے تو انگریزوں نے سمجھا کہ وہ لوگ دریا میں بنائے گئے ریلوے کے پل کو توڑنے آئے ہیں۔انہوں نے اپنی فوجوں کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور ان لوگوں کو گھیر کر مار دیا لیکن ان مرنے والوں میں گاؤں کے لوگ اور سبز کرتوں میں ملبوس درویش تھے جبکہ دوسرے لوگوں کا کوئی نام و نشان نہ رہا جو دن بھر ان بستی والوں اور درویشوں کو اشتعال دلا رہے تھے۔ بعد ازاں مزید درویش آئے اور گریہ زاری کرتے رہے۔ وہ سات درویشوں کی بجائے بس شہیدوں کا ماتم کرتے اور ستلج کو بد دعائیں دیتے کہ جس کے پانی میں ان شہیدوں کا لہو اور قبریں بھی مٹ گئی۔ یہاں بھی مقامیت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے کہ یہ کمزور مذہبی لوگ بھی دریا ہی کو برا بھلا کہتے ہیں۔ انگریزوں کے سامنے وہ بے بس دکھائی دیتے ہیں۔ان کی بے بسی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ان

لوگوں کی سازشوں کا شکار ہو کر قبروں سے اور کبھی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

"ناول کے بیانیے کے مطابق جدید ثقافت کی فراست کے سامنے محکوم اور جمود کا شکار ثقافت کے لوگ حاکم وقت (انگریز) کو بددعائیں دینے کے بجائے ستلج کی بربادی کی تمنا کرتے ہیں۔"(20)

ناول میں مذہبی بیانیے کے تناظر میں مختلف مذہبی نظریات کا احوال ملتا ہے۔ مقامی مذہبی تصورات کو مقامی کرداروں کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول میں مقامی مذہبی تصورات خواہ وہ تصوف کے ہوں یا ایک عام مذہبی مولوی اور ملا کے دونوں کی عکاسی ناول میں ملتی ہے۔ کم علمی کے باوجود جو لوگ اپنے مذہبی تصورات میں اس قدر راسخ عقیدہ کے حامل ہیں کہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ان کے لیے سب سے زیادہ اہم ہے جبکہ ان کے مذہبی پیشوا اور رہنما اپنے حالات اور مفادات کے تحت اپنی وفاداریاں اور نظریات تبدیل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ناول میں مقامی مذہبی بیانیے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس سے مقامی مذہبی بیانیہ کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ مابعد جدید نقطہ نظر سے بستی آدم واہن کا قبرستان کے ساتھ جڑے جذبات ہوں یا بچپن کی نکاح کی رسم ان سے مقامیت کی وضاحت ملتی ہے۔ یہ مقامیت کے نمایاں مذہبی عناصر کی نمائندگی کرتے ہیں۔

نیلی بار میں مذہبی بیانیے بھی مقامیت کے تناظر میں ملتے ہیں۔ ناول کے آغاز میں مقامی لوگوں کے بیان میں اس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ مقامی لوگوں کی اکثریت ان پڑھ اور جاہل ہیں۔ ان لوگوں کا مذہب اسلام تو ہے لیکن وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ان کو تو نماز پڑھنا بھی نہیں آتا۔ تاہم وہ خدا کے ماننے والے اور مسلمان ہیں۔ ان کے دل میں مذہب کی عقیدت اور محبت شاید پڑھے لکھے روشن خیال نوجوانوں سے بھی زیادہ ہیں۔ دوسرا اہم پہلوان کی کمزور معاشی حیثیت ہے۔ یہی دو عناصر ان کے مزید استحصال کا باعث بنتے ہیں۔ مذہبی رہنما اور اجارہ دار ان کی اسی سادہ لوح زندگی، ان کے خوش عقیدہ کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ مقامی لوگ کچھ نہ جانتے سمجھتے ہوئے بھی مولوی کی عزت کرتے ہیں۔ ان کے علم پہ بھروسہ کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کا رہنما ان کا پیشوا ان کے ساتھ کیسا کھلواڑ کر رہا ہے۔ مذہب کی جو تصویر وہ دکھا رہا ہے وہ محض اس کے ذاتی مفادات سے جڑی ہے۔ اس میں اس کا ذاتی فائدہ ہے تو وہ ان کو خدا کا نمائندہ سمجھ بیٹھتے ہیں جبکہ دوسری طرف بیٹھا شخص سب کچھ جانتا ہے اس لیے مکاری سے ان کے اس عقیدے کی مزید آبیاری کرتا ہے۔ ان کو خوف خدا دلاتا ہے اور خدا کا نمائندہ بن کر ان کے لیے جنت کی راہ ہموار کرنا چاہتا ہے۔

ناول میں کئی دہائیوں پہ مشتمل اس ارتقائی عمل میں مذہبی بیانیوں کو مقامی کرداروں کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف سادہ لوح مقامی لوگ ہیں جن کو غلامی کی زنجیروں میں اس قدر جکڑ رکھا ہے کہ وہ علم کی سطح سے دور

ہیں۔ دوسری طرف جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ مذہبی ملاء بھی ان کا استحصال کرنے کو ہر وقت موجود ہیں۔ عالمی صورتحال کے اثرت بھی ان مقامی سادہ لوگوں نے قبول کیے۔ جب جہاد کی غرض سے نوجوانوں کو بھرتی کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو ان علاقوں میں بھی مدرسے تیزی سے بنے مذہبی اجارہ داروں نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے دیہاتوں میں مدرسے کھولے اور جہادِ افغانستان کے لیے لوگوں کو بخشش اور جنت کا ٹکٹ بانٹتے ہوئے ان سادہ لوگوں کے بچوں کو بھینٹ چڑھایا جوان کو اپنے گناہوں، اپنی لاعلمی اور اپنے آباواجداد کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا ذریعہ سمجھ کر اپنی اولادوں کو ان مدرسوں کے حوالے کرنے لگے۔ علی جواد، زارا جاگیردارنی سے لی گئی زمین پر ہی ایک مدرسہ بنا کر ایک علامہ کی شہرت سے آبیٹھتا ہے۔ جہاں پہ سادہ لوح مقامی والدین کی ایماء اور خود شہادت سے سرشار ہو کر ان لوگوں کا آلہ کار بنے۔ ناول میں ایک تو عالمی تناظر میں مقامی لوگوں پہ پڑنے والے اثرات کا ہے جس کے باعث ہزاروں مائیں اور اپنے بچوں سے محروم ہو گئیں۔ بیوہ غریب اور اپنے بچوں کو جنت کے حصول کے لیے ان چال بازوں کے سپرد کر جاتی ہیں۔ جو بیرون ملکوں سے ڈالر وصول کر کے ان کو کسی دوسرے کی آگ میں جھونک رہے تھے۔

> بڑی محبتوں بڑی محنت سے پالا ہے۔ ساری حیاتی کا پھل ہے۔ میرا جواب میرے جوگا نہیں رہا۔ اللہ کے نام کر دیا ہے اسے میں نے یہ اب رب اور تیری امانت ہے۔ اپنی امانت قبول کر مولی جی! کہ میں سرخرو واپس مڑوں میں کملی نمانی میری عمروں کی کمائی کاں کتے نہ کر مولی جی!۔"(21)

دوسرا پہلو روایتی استحصالی انتظام میں موجود پیروں کا کردار ہے۔ اس مقامی مذہبی بیانیہ میں جاہل مقامیوں کو نسل در نسل ایسے نظام میں جکڑ کر رکھا ہے۔ وہ ان کی غلامی کو اپنے لیے باعث شرف اور جنت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انہی پیروں نے بعد ازاں بدلتے نظام کے تحت سیاست میں بھی اپنی جڑیں گاڑھ لیں جن کے لیے ان کو کسی دقت کا سامنا کبھی نہ ہوا۔ کیوں کہ جو لوگ ان پہ مال و جان عزت و آبرو لٹانے کو تیار ہوں۔ ووٹ دینا ان کے لیے بہت معمولی بات ہے۔ ناول نگار نے اسے استحصالی طبقہ کا بیان بھی مقامیت کے ذیل میں بھرپور کیا ہے۔

> "پیر سائیں آپ کے کتوں کے کتے ہم باندھے مرید انھی کتوں کے تلوے چاٹ چاٹ کر بارگاہ کو چوم سکتے ہیں سائیں۔۔"
>
> ہم پر ایک نگاہ ڈالو اور دونوں جہانوں ہم سرخرو۔ ہم تیرے کتے بلوں کو اپنے خاص بچھونوں پر سلائیں تیرے نوکر بردوں کو سرآنکھوں پر بٹھائیں۔۔۔"(22)

ان مذہبی اجارہ داروں کے اثر و رسوخ سے متاثر ہونے والوں میں محض غریب لوگ ہی شامل نہ تھے بلکہ ان میں اچھے خاصے پڑھے لکھے زمیندار بھی شامل تھے، جو ان پیروں سے تعلقات ان کی خوشی کی خاطر ہر طرح کی قربانی کو تیار تھے۔ اس روایت کو مستحکم سے مستحکم تر کیا جا رہا تھا۔ ایک طرف جاگیردار جس چیز پہ ہاتھ رکھتا اس کی ہو جاتی تو دوسری طرف یہ عالم ہیں کہ چڑھاوے چڑھانے کے لیے لوگ قطاروں میں لگے ہیں۔ ان چڑھاوں میں محض

مال ودولت ہی نہیں بلکہ جوان خوبصورت لڑکیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔جو جنت کے حصول اور ماں باپ کے گناہوں کی تلافی کے لیے پیروں کی خدمت کے لیے وقف کر دی جاتی ہیں۔ پیر صاحب کی نگاہِ الفت میں بھا جانے والی ہی بطور نذرانہ قبول ہوتی۔ان لوگوں کی ضعیف اعتقادیاں ان کے اپنے ہی استحصال کا باعث بن رہی ہیں۔

"مزار کی گوٹا کناری جڑی چادروں کی طرح اپنی کنواری نو عمر لڑکیاں بھی پیر خانوں کو "نذر" کر جاتے تھے۔یہ نو خیز اور حسین لڑکیاں ہر وہ کام کرتیں جوان کے گھروں میں کی کمنیاں کیا کرتی تھیں لیکن یہ لڑکیاں اچھی طرح جانتی ہیں کہ پیر خانے کا ذلیل ترین کام بھی کہ قیامت کے روز نامہ اعمال میں سب سے اتم لکھا جائے گا۔۔۔پیر صاحب کے علاوہ چاروں صاحب زادے بھی جوان ہو چکے تھے۔یہ خوشحال گھرانوں کی مریدنیاں، کنیزیں اور لونڈیاں بن کر اعلی وپاکیزہ خدمات پر خود کو فائز کو کتنا ارفع اور جنتی تصور کرتی تھیں۔"(23)

ان گدی نشینوں جن کی اپنی زندگیاں اسلام کی روح سے خالی ہیں یہ عوام کو محکوم بنانے کا حربہ بھی استعمال کیے ہوئے ہیں۔ان کا مالی اور جسمانی استحصال نسل در نسل کر رہے ہیں۔جو لوگوں کی بیٹیوں کو اپنے اور اپنے بیٹوں کے لیے باعث راحت تسلیم کرتے ہوئے لوگوں میں جنت کے پروانے جاری کرتے ہیں۔لوگوں کی جھولیاں بھرنے والے خود لوگوں کی جھولیاں خالی کرتے ہیں۔لوگوں کا تزکیہ نفس کرنے والے خود نفس کے پجاری بنے لوگوں کی عزتوں سے کھیلتے ہیں۔

"پیروں کی خدمت میں نذرانے کے طور پر صرف نوٹ ہی پیش نہیں کیے جاتے بلکہ بیٹیاں بھی نذر ہو جاتی ہیں۔نذرانے دینے والے ہر طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔صرف غریب اور کم پڑھے لکھے لوگ ہی نہیں بلکہ پڑھے لکھے لوگ بھی ان آستانوں پر حاضری دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کے بقول وہ انہی پیروں کی جوتیوں کے صدقے خوشحال تھے۔"(24)

مقامی پیروں کا اثر ورسوخ ایک بڑے تناظر میں دکھایا گیا ہے۔جہاں علاقائی حلقے سے باہر یہ لوگ ملکی سطح پر بھی اپنے اختیارات کو مضبوط کرتے ہیں۔ان کی اصل طاقت ان کے آبائی علاقے کے مرید ہی ہوتے ہیں جو ان کی اس طاقت کا سرچشمہ ہیں۔جو اپنا استحصال ان سے کرواتے ہیں مقامیت کے ذہن میں لوگوں کی ضعف اعتقادیاں ان کے اقدار کا قصہ طویل کرتی ہیں۔مفادات کی آڑ میں پڑھے لکھے لوگ بھی ان کی حلقہ ارادت میں شامل ہو جاتے ہیں۔جدید معاشرے میں سیاست اور ان لوگوں کا گٹھ جوڑ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ناول میں مقامیت کی ذیل میں مذہبی حوالے سے ان اساطیر کی نقاب کشائی مہارت سے کی ہے۔

گراں میں پوٹھوہار کی مقامیت کو ناول نگار نے مختلف ثقافتی عناصر کی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ناول کے کردار اور زبان مقامی ثقافت کو بھرپور انداز میں اجاگر کرتے ہیں۔تاہم مذہبی حوالے سے زیادہ وضاحت نظر نہیں آتی ۔تقسیم ہند سے قبل پنجاب کے دوسرے علاقوں کی طرح پوٹھوہار میں بھی مسلمانوں اور سکھوں کی اکثریت

تھی۔دونوں مذاہب ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرتے ہوئے بطور مقامی پر امن طریقے سے رہ رہے تھے۔ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مسلمانوں کا سینکڑوں سالہ تہذیبی سفر ہے۔ان مذاہب نے کئی صدیاں ساتھ گزاری ہیں۔ایک ساتھ رہتے ہوئے بہت سے مشترکہ ثقافتی قدریں مشترک ہیں۔اسی طرح مذہبی رسومات بھی بعض اوقات ثقافتی عناصر کی زد میں آجاتی ہیں۔یوں وہ ثقافتی پہلو مذہب کا جزو خیال کیے جانے لگتے ہیں۔اساطیر اور ضعیف الاعتقادیاں برصغیر کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے انسانوں کی زندگیوں کا ایک اہم جزو رہی ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں تاحال موجود ہیں۔

گراں میں بھی ایسے تصورات کا شعور ملتا ہے جو بظاہر ہر مذہب کے پیرائے میں ہیں لیکن مذہب کے حقیقی رویے سے یکسر مختلف ہیں۔البتہ ان میں مقامی رسم ورواج اور ثقافتی پہلوں کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔لوگ ایسی ضعیف ہے اعتقادیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں جن کے کرنے سے وہ اپنی مرادوں کو پورا ہونے کا یقین رکھتے ہوں۔بعض رسومات کو مذہبی رنگ اس طرح سے چڑھادیا گیا ہے۔وہ مذہب کا ہی حصہ معلوم ہوتے ہیں اور دیکھا دیکھی ان کی صحت کا اعتبار بہت حد تک ہونے لگتا ہے۔ناول میں کچھ ایسی ہی رسومات کا تذکرہ کچھ اس طرح سے ملتا ہے۔

> "قبرستان میں امیر حسن کی قبر کے ساتھ زرینہ جان کی کچی قبر بنی تھی۔لڑکیاں اپنے پڑھے لکھے منگیتروں کے نام سے منت کے دھاگوں میں بے تحاشہ اضافہ کرنے لگیں۔چوے پر سیاہ سایہ کیے کھڑی پھلاہی منتوں کی سیاہ ٹاکیوں اور پرندوں کے داغوں سے لد گئی۔ فاطمہ نے اظہار الحق کے پاس ہونے کی منت مانی تھی۔ صنوبر نے اصغر خان کے لیے پراندے کے دھاگے کئی بار باندھے تھے۔"(25)

خطہ پوٹھوہار میں اولیاء کرام سے عقیدت کا جذبہ بے انتہا پایا جاتا ہے۔مزارات کی کثرت ہے۔لوگ ان کے ساتھ گہری روحانی وابستگی رکھتے ہیں۔ان کی عقیدت کے پیرائے میں بعض اوقات کچھ فرضی کرامات کو بھی ان کے ساتھ وابستہ کرلیا جاتا ہے۔ان کی خوش اعتقادیاں بہت سی اساطیر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتی ہیں۔یہ مقامی لوگ ان کی صحت میں من وعن یقین کرلیتے ہیں۔پانی کا مسئلہ پوٹھوہار میں موجود ہے۔گرمیوں میں اکثر دیہاتوں میں پانی کی کمی ہوجاتی ہے۔برساتی ندی نالوں میں خواتین کپڑے دھوتی،جہاں جانور بھی ادھر سے ہی پانی پیتے ہیں۔پینے کے پانی کے حصول کے لیے دور کی مسافتیں طے کرنا پڑتی ہیں۔کنوؤں میں پانی کم ہوجاتا ہے۔اس لیے اس پانی کے حصول اور چشموں کے جاری رہنے کے لیے روایتی منتیں مانی جاتی ہیں۔مقامی تصورات کی اس تناظر میں ایک اور جھلک کچھ اس انداز میں بیان ہوئی ہے۔

> آنحضر تغوث اعظم کا گزر ایک بار ان کسوں میں سے ہوا۔ گرمی اتنی کہ سارے کنویں چشمے سوکھ نمک ہوگئے۔ پتھر چقاق بن کر آگ اگلنے لگے۔ کھڑاؤں کے اندر تلوؤں میں چھالے پڑ گئے۔پیاس لگی دور دور تک نہ پانی نہ آبادی،عصا پتھروں پر جو مارا ہے تو یہ چوہا ابل پڑا۔پانی پیا پھر ادھر نیچے عصا پھینکا تو یہ جھیل بہ نکلی۔وضو کیا،ان

جلتے ہوئے پتھروں پر نماز ادا کی تو یہ بقائن اُگ آئی۔ لو وہ دن اور آج کا دن چاہے سارے پوٹھوہار کے پانی خشک ہو جائیں۔۔۔ یہ چوا جھیل کبھی نہ سوکھے۔"(26)

ناول میں اس کے علاوہ مرنے کے موقع پہ مخصوص مذہبی رسومات دکھائی دیتے ہیں۔اس مقامیت میں کسی کے مرنے کے بعد اس کے سوگ اور غم منانے کا بھی روایتی مقامی مذہبی انداز ہے کہ لوگ 40دن تک اس کے گھر افسوس اور غم کے اظہار کے لیے جمع ہوتے رہتے ہیں اس کا غم و بانٹتے ہیں جو جمعرات اور چالیسویں کے ختم ہوتے ہیں اوران موقعوں پر پر تکلف کھانوں سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے۔ یہ تمام مقامی بیانیے اس ثقافت کا خاصا اور اس کا اہم عنصر ہیں۔ بکرے ذبح کیے جاتے ہیں اور حلوے پکا کر مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے۔ان مہمانوں کا آنا اور ان کی خاطر داری بھی اس طرح ہی کی جاتی ہے جیسے کسی خوشی کا موقع ہو۔ برادریوں کے بیچ عزت و بڑائی ثابت کرنے کے جتن کئے جاتے۔

دوسری طرف عورتیں اپنے پیاروں کے ملنے اور لوٹنے کے لیے منتیں مانگتی ہیں۔ان میں ان عورتوں کی ضعیف اعتقادیوں کے ساتھ ساتھ ان کی کمزوری اور بے بسی بھی ہے جو اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتیں۔ کوئی بھی وجہ ہو مقامی، روایتی اساطیر کو تبدیل نہیں کیا جاتا نسل در نسل نے اس کی آبیاری کی۔ اکیسویں صدی میں اس مقامیت کے زوال کے ساتھ ساتھ ناول نگار ان تمام رسومات، بدعتوں اور کہانیوں کے خاتمے کا احوال بھی بتایا ہے۔ ناول میں مذہبی بیانیے کے تناظر میں بھی کچھ بیانیہ ناول کا حصہ ہیں۔ان مذہبی رسومات میں بھی مقامیت کا رنگ نمایاں ہے ۔اس مقامیت میں مذہبی بیانیے کی کسی حد تک عکاسی کی گئی ہے۔

ناول شہر مرگ میں برطانوی سامراج کی عملداریوں کا بیان کئی حوالوں سے ملتا ہے۔"روزمری" کا کردار تو نوآبادیاتی عہد کے ایسے کرداروں میں سے ہے جو مقامی لوگوں کے لیے نرم گوشہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنا وطن بھی سمجھتی ہے۔ روزمری کے کردار میں اس مٹی سے محبت کا پہلو ملتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد بھی اس علاقے کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہے۔ ناول میں مقامی مذہبی تصورات بھی ملتے ہیں جو اس مقامی ثقافت کے آئینہ دار ہیں جن میں مقامی مذہبی رنگ نمایاں ہے۔ برصغیر کا تصوف خاص رنگ کا حامل ہے۔ یہاں کے ایسے مذہبی رسم ورواج اور تصورات ہیں۔ جن میں مقامی ثقافت کا رنگ نمایاں ہے۔درباروں، درگاہوں اور مزارات سے عقیدت ان پہ جانا برصغیر کے طول و عرض میں پھیلی مختلف ثقافتی رسومات ملتی ہیں۔ یہ عقیدت سے بھری رسومات مذہب کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ مقامی ثقافت کی بھی نمائندگی کرتی ہیں۔ روشن آرا کے بیان میں ایسا ہی ایک منظر ناول میں دیکھا جا سکتا ہے:

"حضرت جی کے دربار پر وہ ضرور حاضر ہوا کرتی تھی۔۔۔خاص طور پر جو میلہ لگتا تھا تو وہاں نہ صرف حاضر ہوتی بلکہ چادر بھی چڑھاتی تھی۔۔۔ان میں سے اکثر جن کا دھندا مندا پڑ جاتا تھا وہ وہاں منتیں بھی مانتی تھیں۔۔۔ان کے طبقے میں خاص طور پر روایت تھی کہ کوئی بھی لڑکی کوٹھے بیٹھنے سے پہلے حضرت جی کے دربار پر ضرور حاضری دیتی۔۔۔چراغوں میں ڈالے گئے تیل کو تبرکاً تھوڑا سا اپنے سر میں لگاتی۔ دربار کے ساتھ لگی جالی میں دھاگہ باندھتی اس وعدے کے ساتھ کہ اگر اس کا کام چل پڑا تو اگلے سال چڑھاوے کے ساتھ ضرور حاضر ہوگی (27)"۔

ناول میں مقامی تصورات بھی موجود ہیں۔ایسے تصورات جو خالصتاً اس خطے کی مقامیت کا خاصا ہے۔ عقیدت کے جذبات میں گوندھے یہ جذبات نسل در نسل چلتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ ایک چیز قابل غور یہ بھی ہے کہ ان رسوم میں ہر خاص وعام شریک ہوتا۔ طوائفیں کوٹھے پہ بیٹھنے سے قبل بھی ان درگاہوں پہ حاضری دیتی اور منتیں مانگتی ہیں۔ برصغیر میں یہ مقامی ثقافت جابجاد کھائی دیتی ہے۔ جہاں اولیاء، بزرگان دین کی درگاہیں لوگوں کے لیے اجتماعت کا مقام بھی ہیں۔ درباروں پہ لگنے والے میلے ثقافتی مذہبی اجتماعات دراصل لوگوں کے گھ جوڑ کا اہم وسیلہ بھی ہیں مقامیت کے اس خاص رنگ کو بھی ناول میں مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

ناول میں مذہبی تناظر میں دوسرا اہم رخ نوآبادیاتی حربوں میں سے ایک حربہ تھا۔ بعض قوموں کی طرف سے اپنے مذاہب کی ترویج بھی کی گئی۔ اس عہد میں عیسائیت مذہب کی ترویج کا کام بھی بڑی تیزی سے کیا گیا۔عام چرچوں کے پادری بھی بڑی تعداد میں ان کاروائیوں میں مصروف تھے۔ عیسائی مشتری اس کام کے لیے باقاعدہ برطانیہ سے لائے جاتے جو مقامی لوگوں کو تبدیلی مذہب پر آمادہ کرتے۔ یوں ہندوستان کے ان پڑھ اور خصوصاً نچلے طبقے کے لوگ بڑی تعداد میں اس سازش کا حصہ بن جاتے۔ ناول میں پادری کا پراسرار کردار اسی کہانی کا ایک کردار دکھائی دیتا ہے کہ وہ روز مری سے جمال کے تبدیلی مذہب کا مطالبہ کرتا ہے۔ روز مری اس سے انکار کر دیتی ہے اور بالآخر روز مری پہ بھی اس کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ کس طرح سے وہ اپنے مذہب کی ترویج کے لیے مقامی لوگوں کو آلہ کار بناتے ہیں۔

ناول دائرہ   لاہور کی مقامیت سے مزین ہے۔ لاہور زمانہ قدیم سے ہی صوفیاء کی آماجگاہ بنا ہے۔ علم و فضل اور تصوف کے حوالے سے اہم مرکز رہا ہے۔ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے تذکرے کے بغیر لاہور کا ذکر مکمل نہیں ہوتا۔ لاہور کی ثقافت میں ان صوفیانہ کا کردار بھی نمایاں ہے۔ ان صوفیاء کی خانقاہیں آج بھی لوگوں کے لیے روحانیت کی آماجگاہیں ہیں۔ لاہور میں صوفیاء کے مزارات بھی کثرت سے موجود ہیں۔ ان کی درگاہوں پہ آنا بھی اس ثقافت کا ایک اہم اور نمایاں وصف ہے۔ مقامی مذہبی تصورات کے اختلاط سے ایسے تصورات نے جنم لے لیا ہے جو

مذہب سے ہٹ کر ہیں۔ان مزارات کو جو علم وادب کی آماجگاہیں تھیں۔وہ شعبدہ بازوں اور نشے بازوں کے اڈے بن گئے ہیں۔لوگوں نے تصوف کے مطالب اپنے تئیں نکال لیے ہیں۔لاہور کے قبرستان اور مزارات منشیات فروشوں اور ان کے خریداروں کے مرکز بنے نظر آتے ہیں۔ایسی جگہ جہاں مصیبت کے مارے لوگ اپنی دادرسی کے لیے جاتے ہیں وہیں پہ کچھ ایسے لوگ بھی اپنے ڈیرے جمائے بیٹھے ہیں جو نشوں کا کاروبار کرتے ہیں یا ان درگاہوں پہ مجاور بنے بیٹھے ان سادہ لوح لوگوں کی سادگی سے ان کا استحصال کرتے ہیں۔جن کا روحانیت اور تصوف سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔

> "پھر شاہ جمال کے مزار پر گیا تو وہیں کا ہو رہا۔دن میں کچھ کام وام کر کے تھوڑے بہت پیسے چرس خریدنے کے لیے کما لیتا۔کھانا لنگر سے کھاتا اور رات کو مزار کے پچھواڑے شہر بھر کے چرسیوں کے سب سے بڑے اڈے یعنی قبرستان میں پڑا رہتا۔"(28)

لاہور کی مقامیت میں ان مزارات کا بہر حال خاص کردار رہا ہے۔تصوف کی روایت کو ان اولیاء نے آگے بڑھایا۔تصوف کی روایت میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا اور یہاں کے مقامی لوگوں کو مذہب کے حوالے سے اہم تعلیمات سے روشناس کرایا۔ان کی خانقاہیں اور حجرے مقامی ثقافت کے اہم مراکز بنتے گئے۔ناول نگار نے بطور خاص چیدہ چیدہ مقامات پہ مزارات کا تذکرہ بہر حال ضرور کیا ہے۔لاہور کی ثقافت ہو یا اس کے مضافاتی علاقے ان اولیاء کے مزارات کا ایک خاص عقیدت کا جذبہ ہر جگہ موجود رہتا ہے۔تو دوسری طرف مقامی ثقافت کے عناصر بھی مذہب کے اس سلسلے کے ساتھ مدغم نظر آتے ہیں۔مخلوط تہذیبوں اور مختلف مذاہب کے نمائندوں کے اختلاط سے بہت ساری دوسرے مذاہب کی چیزیں بھی اسلام کے غلبے کے بعد بھی اس کا ایک حصہ تصور کی جاتی ہیں۔ان صوفیاء کے بعد یہ درگاہیں محض علم و ادب کے تصور تک محدود نہ رہیں بلکہ ثقافتی سرگرمیوں کا بھی مرکز بن گئیں۔مزارات میں عرسوں، میلوں کا انعقاد لوگوں کے لیے ایک اجتماع اور تفریح کا باعث بھی بن گیا۔یہ تہوار مذہب سے زیادہ ثقافت کے آئینہ دار ہیں جہاں لوگ مختلف علاقوں سے جمع ہو کر ان موقعوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ناول میں ایسے ہی ایک مزار پہ میلے کا احوال کچھ اس طرح سے ملتا ہے:

> "کوئی دو گاؤں چھوڑ کر پیر ہزارے شاہ کا مزار تھا۔وہاں سال کے سال بڑا میلہ لگتا۔لوگ دور دور سے مٹی کے بنے چھوٹے چھوٹے گھوڑے لے کر مزار پر آتے، منتیں مانتے ہیں اور کھلونے نذر چڑھاتے۔میلے کے آخر میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے مٹی کے گھوڑوں سے مزار اٹ جاتا۔ہر کھلونا کسی نے کسی منت کے ساتھ بھینٹ چڑھایا جاتا۔سو ہزاروں منتیں ہزاروں گھوڑے۔"(29)

ناول کے اس اقتباس سے مخلوط تہذیبوں کے تصورات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ہندوؤں اور مسلمانوں نے مخلوط تہذیب کی بنیاد رکھی، پہلے سے موجود ہندوانہ اور غیر اسلامی تصورات بعد ازاں مسلمانوں نے بھی اپنا لیے اور

تاحال ان کی پاسداری جاری وساری ہے۔اکیسویں صدی کی جدیدیت کے باوجود آج بھی ایسے لوگوں کی بہتات ہیں جو ایسے فرسودہ نظام کو نہ صرف مانتے ہیں بلکہ اس کو جاری وساری رکھے ہوئے ہیں۔

مذہب کے ساتھ ساتھ ثقافت میں بھی والدین کا احترام ملحوظ خاطر رکھنا یہاں کے مقامی روایت کا حصہ ہے۔مقامیت کے عناصر میں سے ایک مذہبی پہلو سمجھ کر لوگ اپنے بزرگوں بالخصوص والدین کی دعائے مغفرت کے لیے ان کی قبروں پہ جانا بھی ایک اہم فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ قبرستان جمعرات کے دن زیادہ پر رونق دکھائی دیتے ہیں۔مزارات پہ جہاں چادریں چڑھائی جاتی ہیں تو والدین کی قبروں پہ پھول چڑھانا مذہب کے ساتھ ثقافتی سر گرمی کے طور پہ بھی کیا جاتا ہے۔ناول میں اندرون شہر کے لوگوں کے ہاں اس تصور کا بیان کچھ اس طرح سے ملتا ہے۔

"مسعود جمعرات کے جمعرات اپنے ماں باپ کی قبروں پہ فاتحہ خوانی کرنے اور پھول چڑھانے جاتا ہے۔"(30)

مزارات لاہور کی ثقافت کا ایک اہم جزو بن گئے ہیں۔مزارات کے ساتھ ایک دنیا وابستہ ہے اور یہاں کی اپنی ہی ایک دنیا ہے کوئی پھول بیچ رہا ہے تو کوئی چادر چڑھا رہا ہے۔ کہیں لنگر چل رہے ہیں تو کہیں قطاروں میں لگے لوگ نیازیں لے رہے ہیں۔معاشی اور ثقافتی سر گرمیاں بھی ان سے جڑ گئی ہیں۔اندرونِ لاہور میں مساجد میں نعتیں پڑھنا ، کہیں چندے جمع کرنا اور کہیں چندے سے نذرو نیاز کا سلسلہ بھی چل رہا ہے۔اندرون لاہور میں آج بھی پرانی وضع داریاں، پرانے رسم ورواج چل رہے ہیں۔ یہاں کے رہنے والے اپنے ثقافتی ورثے کے امین ہیں۔یہاں کی گلیاں آج بھی پر رونق ہیں اور دوسرے عناصر کے ساتھ ساتھ مقامی مذہبی بیانیے بھی اپنی مخصوص ہیت میں موجود ہیں۔آج بھی مذہبی رسومات کی پابندی اسی طرح سے کی جاتی ہے جیسے ان کی آباؤاجداد کرتے تھے۔

"ایک مسجد کے بلند آہنگ لوڈ سپیکروں سے نعتیں سنائی دے رہی تھیں۔ کہیں گیارہویں شریف کی مجلس ہو رہی تھیں۔"(31)

مذہبی تصورات کے پیرائے میں اس مقامیت میں مذہبی سربراہوں، عالموں کا احترام بھی کیا جاتا ہے۔ان کی باتیں اور واعظ کا اثر قبول کریں نہ کریں لیکن ان کا احترام لازم کیا جاتا ہے۔ مولوی کے کردار کو عموماً ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے لیکن اس میں کسی حد تک معاشرے کا بھی قصور ہے کہ اس کی ذات کی محرومیاں ان کا مداوا بھی تو معاشرہ کر سکتا ہے۔تاہم ان محرومیوں کو دور کرنے کے بجائے ان محرومیوں کی مزید آبیاری کی جاتی ہے۔اس مقامیت میں بھی اس کردار کا مختصر بیان موجود ہے تو ہم اس مختصر سے جملوں میں مولوی کی عزت اور مالی حیثیت دونوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ناول نے مقامی مولوی کے کردار میں اس کی قسم پرسی کا حال بیان کیا ہے تو وہیں اس کی معاشرے میں خاص عزت اور احترام کا بیان بھی کیا ہے۔اس کو مقامی معاشرے میں کس طرح سے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اس کی مالی حالات سے در کنار اس کا ایک خاص احترام ملحوظ خاطر بہر حال رکھا جاتا ہے۔

"دونوں مودب ہو گئے جھک کر ان سے مصافحہ کیا اور پھر احترام ہاتھوں کو دبا کر چھاتی پہ جما لیا۔ مولوی شفیع نے ان کے والدین کی خیریت دریافت کی اور دعا دیتے ہوئے آگے چل دیے۔ ان کے لباس سے سستے قسم کے عطر کی تیز مہک آ رہی تھی۔ ان کے ہاتھ بہت نرم اور کپڑے اجلے تھے۔ ان دونوں نے بچپن میں انھی مولوی جی سے چیزیں قرآن پاک ناظرہ پڑھا تھا۔ جمعرات کے جمعرات کھانے کا بہترین حصہ ان کے لیے بھیجا جاتا۔"(32)

ناول نگار نے اس کردار کے بیان میں مقامی مذہبی تصورات اور ان مذہبی کرداروں کا عزت و احترام دکھایا ہے۔ جو اندرون لاہور کے باسی ابھی بھی ملحوظ خاطر رکھے ہوئے ہیں۔ ناول میں مقامی مذہبی بیانیے یا تصورات کے ضمن میں تصوف کی چاشنی بھی ملتی ہے اور عجمی تصوف کے ثقافتی عناصر بھی اس میں ملتے ہیں۔ مقامیت کا رنگ تصوف کو بھی بعض اوقات اپنی لپیٹ میں لیتا دکھائی دیتا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں درباروں کی عقیدت بھی ہے اور ان کے ہاتھوں سے باہر الگ دنیا بھی جو ثقافت کا حصہ بن گئے ہیں۔ خانقاہوں کے باہر ایک الگ دنیا قائم ہے۔ ناول نگار نے اگرچہ مختصراً لیکن مقامیت کے مذہبی پہلوؤں کو بھی کسی حد تک موضوع بحث بنایا ہے۔ جن سے مقامیت کے مذہبی بیانیوں کو سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملتی ہے۔ مابعد جدید کے تصورات مقامیت کے حوالے سے ان مقامی مذہبی بیانیوں کو اس مقامیت کے حوالے سے مخصوص کیا جا سکتا ہے جو اس کی ثقافت کا ایک اہم جز ہیں۔

لاہور صدیوں پرانا ثقافتی تاریخی شہر ہے جہاں تصوف کی قدیم روایت موجود ہے۔ ناول نگار نے مقامیت کے باقی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ لاہور میں موجود مقامی مذہبی نظریات اور بیانیے بھی ناول کے کرداروں کے ذریعے سے بیان کیے ہیں۔ مذہبی حوالے سے کوئی بھی معاشرہ مخصوص عقیدت کے ساتھ ساتھ مخصوص ثقافت کو بھی مذہب کا حصہ بنا لیتا ہے یا اس معاشرے میں مخصوص رسومات کا مذہب پہ اثر پڑ جاتا ہے۔ دائرہ میں بھی عاصم بٹ نے لاہور میں مزارات خانقاہوں کا تذکرہ کیا ہے تو یہاں بھی وہ ان کے تذکرے کے بغیر لاہور کا ذکر ادھورا خیال کرتے ہیں۔ ناول میں مقامی مذہبی تصورات کا ان کے ہاں گہرا شعور ملتا ہے۔

ناول میں مولوی صاحب کے نام خط کے باب میں مسجد کو عبادت گاہ اور مقدس مقامات سے ہٹ کر بھی معاشرے میں سماج میں مولوی اور مسجد کے کردار پر بات ملتی ہے۔ مسجد کو مسلم معاشرے میں مرکزیت حاصل ہے تو وہیں وہ لوگوں کے اجتماع کی جگہ بھی ہے۔ مولوی کا ہمارے معاشرے کے باعزت کرداروں میں شمار ہوتا ہے۔ مذہبی محفل ہوں یا کوئی اہم ضروری ہے اعلان ان مقاصد کے لیے مسجد کا سپیکر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ گمشدگی کی اطلاع کے اعلانات بھی مسجد کے سپیکر کے مرہون منت ہوتے ہیں وہیں پہ سماجی پیغامات، کسی کی اہم دستاویزات کی گمشدگی، کسی کی شادی طے پائی تھی لیکن اب تاریخ بدل گئی ہے۔ کسی کا مخلوط الحواس بزرگ یا بچہ گم ہو جائے تو اس کی گمشدگی کی اطلاعت بھی مسجد کے سپیکر سے ہی دی جاتی ہے۔ مابعد جدید صورتحال کا المیہ ناول میں بھی بیان ہوا ہے۔ انسان اپنے

اصل سے کٹ کر کئی بڑے ثقافتی کا حصہ گرہوں کا حصہ بنتا جارہا ہے لیکن بعد ازاں اسے شناخت کی کھوج پھر واپس نقطہ آغاز کی طرف کھینچ لاتی ہے۔ وہ اس کا حصہ بنتے ہوئے بھی اس ماحول میں اجنبیت محسوس کرتا ہے۔ واپسی کے سوا چارہ ممکن نہیں رہتا تاہم ضروری نہیں کہ وہ واپسی کی طرف سفر ممکن ہو۔ تاہم فرد کی تنہائی ضرور جنم لیتی ہے۔ ماسٹر ولایت احمد کے والد کے بیان میں کچھ ایسی ہی صورتحال دکھائی دیتی ہے۔

"امام مسجد نہ سہی، سکول کا استاد ہی سہی، خیر کی روشنی بکھیرنے والے دونوں ہی کام ہیں۔ ابھی تو خیر سے پڑھ رہا ہے۔ جوان ہے، شہر کی رنگینیوں کی طرف اس کا دل کھینچا ہے۔ لیکن جہاں انسان کی تار ڈوبی ہوئی ہو، وہ مٹی کھینچتی ہے۔ اپنی طرف بلاتی ہے۔ اپنی مٹی کی کشش سے کوئی پنڈ نہیں چھڑا پایا۔ وہ یہیں آئے گا۔ یہاں سکول سنبھالے گا تو مسجد کون سی سکول سے دور تھی۔"(33)

امام مسجد میں محض اپنے بیٹے کو اپنا جانشین ہی نہیں بنانا چاہتا بلکہ وہ اسے اپنی دھرتی کے ساتھ جڑا رہنے کا بھی خواہش مند ہے اور امید قوی کے ساتھ اس بات کا امکان ظاہر کرتا ہے کہ وہ لوٹ آئے گا۔ ناول میں مقامی مذہبی تصورات بارہا دکھائی دیتے ہیں۔ لاہور کی مقامیت میں مزارات جہاں مذہبی عقیدے کی جگہ ہیں وہیں ان کے ساتھ لاہور کی ثقافتی سرگرمیاں بھی جڑی ہیں۔ ان مزارات کو خاص مقامی ثقافتی سرگرمیوں کی جگہ کا درجہ بھی حاصل ہے۔ لوگوں کا اکٹھا ہونا مزاروں سے ملحقہ بڑے بازاروں، نوجوانوں اور بعض مقامات پہ نشہ فروشوں کا بھی ان کے گرد جمع ہو جانا یہ سب اس مقامیت کا حصہ ہے۔ ایسے رجحانات محض مذہبی عقیدے تک محدود نہیں رہے بلکہ مختلف محفلوں کی آماجگاہ بھی ان کے ارد گرد بن گئی ہیں۔ نوجوان ان بازاروں، ہوٹلوں میں اپنی محفلیں جماتے ہیں۔ الیاس چھرا کے کردار کے ضمن میں ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"پہلے میں داتا صاحب گیا تھا یاروں کے وہاں بھی ٹھکانے لگانے کا خطرہ تھا پھر خیال آیا کہ نہیں ابھی داتا صاحب جانے کا ویلا نہیں آیا۔"(34)

بھولے شاہ کا مزار لاہور کی اہم تر در گاہوں میں سے ہے۔ ان کا مزار چوک لوہاری منڈی سے سوتر منڈی کی جانب جائیں تو وہاں ان کے نام سے کوچہ منسوب ہے وہیں ان کا مزار ہے۔ ان کی کرامات بھی لاہور میں کافی مشہور ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بچوں کے ساتھ کھیل میں مشغول تھے، جو نذر و نیاز ان کو دی جاتی اسے بھی بچوں میں بانٹ دیتے۔ گلی کوچوں سے گزرتے وقت بچے ان کے ہمراہ ہو لیتے۔ ثقافتی نظریے کے تحت ان کے مزار پہ بھی لاہور کے دوسرے مزارات کی طرح ان سے عقیدت رکھنے والے ان کی قبر پہ حاضری دینے کے ساتھ ساتھ چادریں چڑھاتے اور منتیں مانتے ہیں۔ عقیدت مند مختلف طریقوں سے اپنے عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں یہ عقیدت جن میں مقامی ثقافت غالب ہوتی ہے بعد ازاں یہ مذہبی رسومات کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ یہ تہوار رسومات اس مقامیت کا خاص وصف بن جاتے ہیں بلکہ مقامی طور پہ ایک خاص مذہبی تصور کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔

"پھر بھولے شاہ کے مزار پر چراغ بجنے نہیں پاتے تھے۔ شام کو جلائے جانے والے چراغ ابھی جل رہے ہوتے کہ رات کو پھر سے کوئی ان میں تیل بھر جاتا۔ منتیں ماننے والوں نے دیے لو سے پریت لگائی ہوتی ہے۔"(35)

ناول میں مقامی مذہبی تصورات کئی موقعوں پہ دکھائی دیتے ہیں۔ مقامی نوعیت کے تصورات جو خالص مقامی روایت کے امین ہیں۔ برصغیر میں مسلمانوں کے آنے سے قبل ثقافتی عناصر بعدازاں مذہب کی تبدیلی کے باوجود رسم و رواج کی صورت میں بھی قائم رہے۔ اس کے تقدس کو پامال کرنا کس قدر معیوب خیال کیا جاتا ہے کہ اس خوف سے روایت کو مستحکم بنایا دیا جاتا ہے جو مذہب کسی عقیدت والے جذبات میں مدغم ہو کر اسی کا حصہ تصور کیے جانے لگتے ہیں۔

مقامیت کا ایک خاص پہلو مذہبی پہلو بھی ہے۔ مذہبی بیانیے ہر مقامیت میں اس مقامیت کے ثقافتی ماحول میں پروان چڑھتے ہیں۔ مذہب کی گہرائی کے باوجود بعض بیانیے مذہب سے زیادہ مقامی ثقافت سے متاثر ہوتے ہیں۔ نو لکھی کوٹھی مشرقی پنجاب کا تقسیم کے قبل کا بیان ہے۔ مولوی برکت کے کردار کے ذریعے مذہبی بیانیے ملتے ہیں۔ زندگی کے تمام معاملے پیٹ کے راستے سے ہو کر ہی نکلتے ہیں جب لوگوں کو ہما تن اس کو بھرنے کی فکر رہتی ہو تو وہ دوسری فکروں سے اپنا دامن چھڑا لیتے ہیں۔ مذہبی حوالے سے بھی لوگ بے عتنائی برتنیں لگتے ہیں۔ مولوی کرامت کا ذکر مذہبی نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس طبقے کے احوال، معاشی اور معاشرتی حالات کا بیان بھی ہے۔ مقامیت کے بیان میں مولوی کرامت کا کردار بھی ناول کے اہم کرداروں میں شمار ہوتا ہے۔ ناول کے آغاز میں ہی اس کردار کی بے توقیری یا قسم پرسی کا بیان ملتا ہے۔ تاہم اس کے باوجود لوگ نہ تو پڑھے لکھے ہیں اور نہ ہی معاشی لحاظ سے آسودہ حال اس کے باوجود اس کردار کی عزت دل میں بے پناہ رکھتے ہیں۔ مولوی کرامت کا کردار اس طبقے کا نمائندہ کردار ہے، جسے محض عزت کا مقام تو حاصل ہے مگر مالی لحاظ سے بے پناہ خستہ حالی کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس طبقے کی طرف سے بھی بعض اوقات غلطیاں سامنے آتی ہیں جو لوگوں کو خوف اور دہشت دکھا کر اپنے نقصان کا ازالہ کسی طرح ضرور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولوی کرامت کو گاؤں والوں کی طرف سے ہر گھر یومیہ ایک روٹی دیتا تھا۔ کھا چکنے کے بعد بچ جانے والی روٹیاں وہ بعدازاں فروخت کر کے چند پیسے بنالیتا۔

"سجدے رکوع اور قیام کے دوران مولوی کرامت نے فضل دین کو نہ جانے کتنی صلواتیں سنائیں اور ان گاؤں والوں کو بھی جو آرام سے پیچھے آکر نماز تو پڑھ لیتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھ سکتے کہ وہ بھوکا ہے یا پیٹ بھرا۔"(36)

مولوی کرامت کے ذریعے مقامی مذہبی معاشرے یعنی مسلمان معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔ دنیاوی تعلیم کے حوالے سے مولوی کرامت جیسے کئی دوسرے مولوی سکولوں کی تعلیم کو حرام کے فتوے دے چکے تھے۔ جس کی وجہ سے مسلمان تعلیم کے میدان میں پیچھے تھے۔ تقسیم سے قبل محض مشرقی پنجاب ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے طول و عرض میں یہی صورتحال تھی۔ مسلمان مذہبی طبقہ انگریزوں کی آڑ میں اور ان کے ظلم و ستم کے جواب میں ان کی تعلیم

کو بھی شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا تھا اس لیے مسلمان علمی میدان میں ہندوؤں اور سکھوں سے بہت پیچھے رہ گئے۔ بعد ازاں انگریز سرکار نے مولوی کرامت کو نوکری دے کر اپنا نمائندہ مقرر کیا تو مولوی ان کے حق میں کام کرنے لگا ۔ مسجدوں میں جا جا کر لوگوں کو بچے سکول بھیجنے کی سفارش اور گزارش کرنے لگا۔ مولوی کے کردار کے اتار چڑھاؤ سے مقامی مذہبی طبقے کے مفادات کا بھی علم ہوتا ہے کہ کس طرح مفادات کی غرض سے ان لوگوں کے فیصلوں میں تبدیلی آتی ہے۔ مولوی کی نسلیں اس وفاداری کے تقاضوں کے تحت بعد ازاں پاکستان کی سیاست اور معاشرے میں اہم مقام حاصل کر لیتی ہیں۔

ناول میں مقامی کے اعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ پنجاب کے بڑے مذہب سکھ کا بیان ملتا ہے۔ تقسیم سے قبل ایک وقت ایسا بھی تھا کہ دونوں مذاہب ہم آہنگی سے رہتے رہے اور کئی جگہوں پہ تو مجموعی لڑائی مذہبی منافرت کا باعث بن گئے۔ ان منافرتوں میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوا۔ ناول میں اس کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ دشمنی میں لڑائیاں محض انسان سے نہیں بلکہ مذہب کی پہچان سے بھی لڑی جانے لگی۔ عموماً ان لڑائیوں کا منبع اور محور جاگیردار اور بڑے سرمایہ داری ہوتے جو اپنے ذاتی اور مالی نفع نقصان کے لیے اپنے محاتحتوں کو ایک دوسرے کے دست و گریباں کرتے۔ اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے انہوں نے مذہب کا سہارا لیا اور لوگوں کے دلوں میں مذہب کی منافرت کا بیج بویا جو بعد ازاں تقسیم پاکستان تک ایک تناور درخت بن چکا تھا۔

> "واہگرو وہ جانتا ہے میں نے اس دن کے لیے کتنی منتیں مانیں۔ روز اس کی دھار تیز کرتا ہوں جب تک یہ کسی مسلے کا لہو نہیں پی لیتی واہگرو کی سونہہ اسے سیج نہیں ملے گی۔"(37)

سکھ مذہب کی مقامیت کے پیرائے نمائندگی ملتی ہے۔ ناول کے ان کرداروں کے ذریعے ان کے مذہبی بیانیے کی عکاسی کی گئی ہے۔ مذہبی بیانیہ بھی اس ضمن میں شامل ہیں سودھا سنگھ کے کردار کے ذریعے اس مذہب کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ سودھا سنگھ کا گوردوارے میں جانا، اپنے عبادت کے فریضے انجام دینا۔ اس کے علاوہ سودھا کی بیوی "بنیت کور" کو مذہبی کتاب پڑھتے دکھانا شامل ہیں۔ ان تمام امور میں اس مقامیت کے مذہبی بیانیہ کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے محض مسلمان معاشرے تک مقامی کرداروں کو محدود نہیں رکھا بلکہ معاشرے کے دونوں بڑے کرداروں مسلمان اور سکھ مذاہب کی نمائندگی بھی کی ہے۔

> "زنانے میں داخل ہوتے ہی سردار سودھا سنگھ نے بنیت کور کو آواز دی جو گرنتھ پڑنے میں مصروف تھی۔ او بنتے جلدی نال بھوجن دے دے ہن بھک بڑی لگ گئی آ۔ جد ویکھو گرنتھ پڑھ دی رہندی آ، پتہ نہیں گرو جی نال کوئی مک مکا کر لیا وا۔"(38)

مقامیت کے کرداروں کے بیان میں ناول نگار نے دونوں مذاہب کے بارے میں بات کی ہے۔ مولوی کرامت کے ذریعے مسلمان معاشرے کے مذہبی معاملات کو تفصیل سے بیان کیا تو دوسری طرف سکھ مذاہب کے

حوالے سے بھی بیان ملتا ہے۔ ناول میں بنیادی لڑائی بھی دو ایسے خاندانوں کے درمیان تھی جو ایک جو ان دو بڑے مذاہب کے نمائندے تھے۔اس کو مذہبی رنگ دے کر اس میں مزید شدت پیدا کی جاتی ہے۔ سودھا سنگھ اور غلام حیدر ان دونوں مذاہب کے نمائندے ہیں۔ تقسیم سے قبل دونوں مذاہب کے ہاں ماسوائے چند ایک واقعات اور بڑے زمینداروں، سرداروں کی آپس کے جھگڑوں کے مجموعی طور پر مشترکہ تہذیب کے علمبردار تمام لوگ امن و اتحاد کے ساتھ رہ رہے تھے۔ تقسیم کے واقعے سے جہاں زمینی سرحدوں کو تقسیم کیا وہیں تہذیب کو بھی ایک نئے موڑ پہ لا کھڑا کیا۔اس وقت ان مقامیوں نے مذہب کے نام پر ایک دوسرے کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔مقامی پہچان ان کی زمین ان کی مٹی ہوا کرتی تھی۔جب مذہب اس کی پہچان بننے لگا تو دونوں طرف اپنے ہی مذہب کا پرچار کرنے کی غرض سے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹی گئیں۔

غلام باغ میں دو مقامی علاقائی ثقافتوں کا احوال ملتا ہے۔اس کے علاوہ مرکزی قصہ شہر کی فضا میں پروان چڑھتا ہے۔انعام گڑھ اور سنمیال کی مقامی ثقافتوں کے احوال تفصیلاً بیان ہوئے ہیں۔انعام گڑھ کا آغاز میں اور ارذل نسلوں کا قصہ کسی مذہبی بیانیے کا بیان تو نہیں ہے۔اس میں زیادہ تر دوسرے سماجی پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے کیونکہ اس میں ایک نچلے طبقے کا بیان ہے۔یہ لوگ تو ریوڑ کی طرح جدھر ہانک دیے جائیں ادھر چلے جاتے ہیں۔خواہ مذہبی رہنما ہوں یا سیاسی دونوں ان کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔انعام گڑھ کے مانگر جو قبیلے کو مذہبی تعصب کا بھی نشانہ بنایا جاتا ہے۔ان کے لیے دین یا مذہب ایک الگ تصور ہیں جس میں خوف شامل ہے، پروان چڑھایا جاتا ہے۔ پھر اعلی طبقے کے افراد مل کر چاہے وہ مذہبی ہوں یا بڑے وڈیرے یا زمیندار سبھی مل کر ان کا استحصال کرتے ہیں۔ان لوگوں کو ہر صورت میں ہر میدان میں حقیر سمجھا جاتا ہے چاہے وہ مذہب ہی کیوں نہ ہوں۔ خادم حسین کا بیان اس حوالے سے اس مقامی پہلو کو بہت حد تک واضح کرتا ہے۔

"میں ساری عمر عزت دار بننے کی کوشش کرتا رہا ایسا جو اپنی روزی خود کماتا ہے اور اس کی اولاد پہلی صف میں سب کے برابر نماز پڑھ سکتی ہے۔"(39)

طاقتور لوگوں نے دین کی تشریح بھی اپنی مرضی کے مطابق کر رکھی ہے۔جہاں وہ نماز میں بھی ان کو برابری کے مقام پہ کھڑا کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ان لوگوں کا اس قدر استحصال کیا جاتا ہے کہ وہ معاشرے کا بدنما داغ تصور کیے جانے لگتے ہیں۔ناول میں انعام گڑھ کے ضمن میں مذہب کے حوالے سے مزید بیانیہ نادار ہیں۔تاہم اس ایک بیان سے ہی مقامی صورتحال کو کافی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔اسلام دین فطرت ہے جو ایک دوسرے کو سوائے تقوی کے کسی بھی طرح کی فضیلت نہیں دیتا تاہم بہت سارے لوگ مذہب تبدیل کرنے کے بعد بھی اپنے پرانے مذہبوں کی

تقلید میں یا اپنے معاشی اور مالی فوائد کی آڑ میں اس نسلی تضاد کو قائم رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ہر لحاظ سے اعلی سمجھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

مذہبی بیانیوں کے حوالے سے پوٹھوہار کی مقامیت کے بیان میں موضع سنیمال میں "ننگا افلاطون" اپنے قصے میں ایک پوری روایت کو سموئے ہوئے ہے۔ سنیمال کے گاؤں کی پہاڑیوں کے غار میں قید ایک بوڑھا آدمی نہ صرف سنمیال بلکہ پورے علاقے کی مرادوں کا ضامن تصور کیا جاتا ہے۔ ہند اسلامی تاریخ میں ایسے واقعات کی کثرت ہے جہاں تصوف کے پردے یا مذاہب کے پردے میں ایسے کردار موجود ہوتے ہیں۔ ناول نگار نے اس کردار کے ذریعے مقامی مذہبی تصورات کی ترجمانی کی ہے۔ ایک مقدس مقام کی صورت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کبیر اس راز کو جانے کو فجر کے وقت وہاں جا پہنچتا ہے۔ اس مجذوب کو خود لذتی کی کیفیت میں پاتا ہے۔ جو کسی وقت گالیاں دیتا اور دہاڑ دھاڑتا ہے۔ لوہے کی سلاخوں میں قید اس مجذوب بقول کبیر ننگے افلاطون کو ملنے نہ دیکھنے کی کسی کو اجازت نہیں۔ اس ان دیکھے درویش کے پاس منتیں مرادیں مانگنے والوں کی طویل قطاریں ہیں جو اپنے دامن کو مرادوں سے بھرنے کا تصور لیے ادھر آتے ہیں۔

پاکستان کے ہر خطے میں ایسی ضعیف اعتقادیوں کی کمی نہیں ہے۔ پہاڑی علاقوں میں یہ تاثر عموماً زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ مجبوریوں کے بھنور میں پھنسے لوگ راہ نجات کے لیے ایسے شعبدہ بازوں کا با آسانی شکار ہو جاتے ہیں۔ ضعیف الاعتقاد لوگوں کو قابو کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ جب وہ مالی و معاشی لحاظ سے بھی تہی دست ہوں۔ نور داد جیسے افراد ایسے سائیں یا قبر کے متوالے بن کر لوگوں کی ان ضعیف اعتقادیوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ لوگوں میں خوف وہراس عقیدت کے جذبات ابھار کر اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ دوسری طرف توہمات پرستیوں میں آئے لوگ ان کو اپنے ایمان کا جز و سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کی عقیدت نہ کرنا اپنے ایمان کے لیے خطرہ خیال کرتے ہیں۔

> "حجرے کے سامنے ایک لکڑی کے تخت پوش پر لوہے کا ایک بڑا صندوقچہ رکھا تھا جس میں حاجت مند سلام کے بعد کچھ نذرانے ڈال دیتے تھے۔ سلام کا طریقہ کار بھی کافی انوکھا تھا۔ سوالی نور داد کے حجرے کے سامنے آکر خاموش کھڑا ہو جاتا اور نور داد بھی اس سے کچھ کہے یا پوچھے بغیر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتا اور چند لمحوں کے بعد ہاتھوں کو نیچے گرا دیتا۔ اس عرصے میں اگر پیچھے کھوہ میں سے چٹے سائیں کی کوئی گالی کوئی غراہٹ یا چنگاڑ سنائی دے تو گویا حاجت مند کو شرف قبولیت مل جاتا۔"(40)

ناول میں موجود چٹے سائی کا المیہ محض سنمیال یا پوٹھوہار کا ہی نہیں یہاں کئی ایسے واقعات موجود ہیں اور ہنوز ابھی چل رہے ہیں۔ عقیدت کے کوئے میں لپٹے یہ لوگ ان سائیوں، درویشوں کے منہ سے نکلی ہوئی گالیوں توہین آمیز کلمات کو بھی اپنے لیے تبرکات کا درجہ دیتے ہیں۔ صدیوں سے استحصال کرواتے یہ لوگ اس طرح سے کئی ایسے

چٹے سائیوں کی درگاہوں مزارات اور پہ بیٹھے متوالیوں کی نظر اپنے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں خود اپنا استحصال کروا رہے ہیں۔

کبیر مہدی، ڈاکٹر ناصر اور زہرہ چٹے سائیں کے انتقال کے بعد اس کے جانشین کے طور پر مدد علی کو اس کی جگہ بٹھانے کا بندوبست کر لیتے ہیں کیونکہ وہ لاعلاج ہو چکا ہے۔ جسے نہ تو پاگل خانے والے رکھنے پہ آمادہ ہیں اور نہ ہی کسمپرسی کا شکار اس کے رشتہ دار اس کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہیں۔ اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جب باقاعدہ اس کی جانشین مقرر کیے جانے کی تقریب منعقد کی جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ لوگ اس کی آؤ بھگت کریں گے۔ اس سے عقیدت کریں گے۔ ایک مافوق الحواس شخص آسودگی میں رہے گا۔ شاید وہ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ اسی صورت میں کر کے اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے ہیں۔ وہ ایک حادثے کی صورت میں غلام باغ میں اس بیماری کا شکار ہو چکا تھا۔ سنیمال کے لوگوں کو بھی ایک درویش چاہیے جس کی درگاہ پہ وہ چڑھاوے اور نذرانے دیں۔ وہ چٹے سائیں کی روایت کو معدوم نہیں ہونے دے سکتے۔ ان کے ساتھ وہ لوگ بھی ہیں جو مجاور اور مرید بن کے اپنے لئے روٹی اور رہنے کا بندوبست کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"کیا ضروری ہے کہ گاؤں کے پہاڑی غار میں ایک پاگل کو دوسرے پاگل کے جانشین بنانے کا سلسلہ جاری رہے۔ گاؤں میں کسی زندہ پیر کا حاضر و موجود ہونا کیوں ضروری ہے کیا کلچر کی طلب ہے یا ضعیف اعتقادیوں کو فروغ دینے کی کوشش۔"(41)

گدی نشینی کی تقریبات پوری روایتی انداز میں کی گئی۔ ڈھول، باجے، بانسری چمٹے، دھمال تمام رنگ جو دیہاتی علاقوں میں ایسے موقع پہ ہوتے ہیں لوگوں نے بہت عقیدت سے اس تبدیلی کو قبول کیا۔ سنیمال سمیت بہت سے لوگ اس تبدیلی کو ملاحظہ کر رہے ہیں۔ درگاہ کے مجاوروں کی بھی ایک تعداد موجود تھی جو محض ان کی خدمت اور اس کے بدلے میں ملنے والی لنگر کے لیے اپنی تمام عمر گزار دیتے ہیں۔ اس علاقے کے مذہبی عقائد، تصوف کی ناول نگار نے بھرپور نمائندگی کی ہے۔ جو ان کی ثقافت اور مذہبی عقائد کا حصہ ہیں۔ یہ عقیدت اس قدر مضبوط ہوتی ہیں کہ ان کی حفاظت کے لیے لوگ اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سفیر حیدر لکھتے ہیں کہ :

"ننگے افلاطون کی کردار سازی مذہبی اوہام پرستی پر متلاشی ہونے کی کیفیت میں شدید طنز بھی ہے اور کہیں پس پردہ یہ احساس بھی کہ جنہیں اپنی ذات کے اندھیروں میں گم رہنے کا بہت زیادہ شوق ہے انہیں خواہ مخواہ روشنی کی خبر دے کر مضطرب کرنے سے کیا حاصل اس سے بہتر ہے کہ پوجاری روحوں کو دیوتا فراہم کرتے رہو خواہ ننگے افلاطون ہوں یا گونگے مدد علی ۔"(42)

ان ضعیف اعتقادیوں میں تعلیم کا عمل دخل بھی بہت زیادہ ہے۔ان علاقوں کے رہنے والے زیادہ تر نچلے طبقے، کمزور معاشی افراد کے حامل لوگ ہیں۔کان کنی، کھیتی باڑی اہم ذریعہ معاش ہے۔مالی مسائل اور تعلیم کی سہولت کی کمی کی وجہ سے زیادہ تر افراد کم تعلیم یافتہ رہ جاتے ہیں۔دوسرا اہم پہلو روایت کی پاسداری کم علمی،اور روایات پسندی کے پردے میں یہ لوگ نکل نہیں پاتے یوں یہ سلسلہ جاری اور ساری رہتا ہے۔اسی کے مد نظر تو ایک پڑھا لکھا سمجھدار فلسفیانہ ذہن کا کبیر، شہر کی پڑھی لکھی لڑکی اور ایک ڈاکٹر ان کی ضعف اعتقادیوں کے مد نظر مددعلی کو ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔جن کے نفسیاتی مسائل میں الجھا ہوا ذہن اس کا مختلف زبانوں میں بولنا ان کے لیے جنات کا حاضر ہونا اور اس کی خاموشی ان کے نزدیک مراقبے کی صورت اختیار کر جاتی ہے وہ اسے مقدس چیز کی مانند سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں۔ایسی مثالوں کو کم علمی یا جہالت سے تعبیر کیا جائے یا جس طرح بھی ہمارے معاشرے میں ان قدیم فرسودہ خیالات کی گنجائش بہر حال موجود ہے۔

خس و خاشاک زمانے ایک ایسے عہد میں مقامیت کو بیان کیا گیا ہے۔جب دو بڑے مذاہب ایک جگہ مذہبی ہم آہنگی سے زندگی گزار رہے تھے۔ان دونوں قوموں کا اصل ناطہ ایک ہی برادری نسل سے ہوتا ہے۔دو مختلف مذہبی نظریات کے لوگ باہم مل جل کر اس طرح رہتے ہیں کہ ان کے درمیان مذہبی تناظر میں ایک سمجھوتہ یارواداری کا پہلو نظر آتا ہے۔مذہب کی ایک الگ شناخت بھی برقرار ہے جبکہ اصل چھاپ ثقافت کی ہے۔اس مقامیت میں مذہب کی تفریق ضرور موجود ہے تاہم ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے جاٹ دونوں اپنے مذہب کے نام پر مرمٹنے کو تیار ہیں۔دونوں کی خصلت ایک سی ہے۔دونوں ہی محض نام لیوا تو ہیں مگر مذہب کے بارے میں زیادہ علم نہیں رکھتے ۔ناول نگار نے اس تناظر میں مذہبی رویے کی نشاندہی کی ہے جہاں مذہب/دھرم کے نام لینے والے تو موجود ہیں مگر اس مذہب کے بارے میں خود علم حاصل کرنے کو تیار نہیں ہیں۔مولوی (امام مسجد) کو یہ ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے وہ کتابیں پڑھے علم حاصل کرے ان لوگوں کو بوقت ضرورت اپنے علم کو بروئے کار لاتے ہوئے مستفید کرے۔ اس مقامیت میں مولوی کی اہمیت بھی اسی حوالے سے ہے۔وہ مسجد جائیں نہ جائیں مولوی ان کی روٹیوں سے پلتا ضرور ہے۔ہر مقامی گھر کے دل میں اس کی حرمت و عقیدت ضرور موجود ہے۔جاٹ قوم علم کو اپنے شایان شان نہیں سمجھتی۔وہ اپنے مسلمان ہونے پر فخر تو کرتے ہیں لیکن اس مذہب کے بارے میں زیادہ علم حاصل کرنا ان کی فطرت سے باہر ہے۔

"اوئے مردار خور تم لوگ تو رب کو نہیں مانتے تم تو ہمارے رب کا نام کیوں لیتے ہو۔
چوہدری تجھے کلمہ آتا؟
حافظ جی کو آتا ہے تو جاٹوں کو یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"(43)

اس مقامیت میں مسلمان اور سکھ مذاہب کے لوگوں کی اکثریت ہے۔ تقسیم ہند کے بعد محض مسلمان ہی اس مقامیت کا حصہ ہیں۔ جن کے تحت ناول کا زمانی ارتقاء جاری رہتا ہے۔اس مقامیت میں تمام مذہبی تصورات کی مرکزیت مولوی کو حاصل ہے۔ مسجد کا امام ہی لوگوں تک علم و مذہب علم کی رسائی کا واحد ذریعہ ہے۔ان کی زندگی کے اہم موقع پہ مولوی کی سند ضرور حاصل کی جاتی ہے۔اس کے علاوہ مولوی کو کوئی زیادہ حیثیت نہیں دی جاتی۔ گاؤں کے بچے بھی اکثریت ایسے ہیں جنھوں نے قران پاک بھی مکمل نہ پڑھا تھا۔ یہ لوگ تعلیم سے زیادہ روایات کے قائل تھے۔ روایات کے مد نظر ان کی زندگی گزر رہی تھیں۔ جاٹ قوم کی فطرت میں تکبر غرور اور بڑائی کا احساس ان کو اس معاملے میں ملحوظ خاطر رہتا۔ اسی وجہ سے وہ دینی اور دنیاوی دونوں طرح کے علم میں دوسروں سے پیچھے تھے۔اس تکبر سے مجبور وہ مولوی کو بھی ایک کمی کی حیثیت ہی دیتے کہ وہ ان کے نکاح پڑھائے ان کے مردوں کو کفن دے اور ان کے ورثاء کے لیے ثواب اور کے لیے قران پاک پڑھے۔ وہ تو اس سے دین بھی اپنی مرضی کا بنوا لیتے ہیں اگر کبھی ان کو کوئی مشکل پیش آئے تو وہ اپنی مرضی کا فیصلہ بھی کروا لیتے ہیں۔

"اسے سکھنی رہنے دے تم نکاح پڑھاؤ۔۔۔"

"شرعی طور پر ایسا ہو نہیں سکتا چوہدری۔۔۔"

"میں نے تم سے پوچھا ہے کہ یہ شرح کیا ہوتی ہے حافظ جی۔ ہر روز میرے گھر سے تمہارے ہاں جو روٹیاں جاتی ہیں جمعرات کی جمعرات حلوہ جاتا ہے وہ کبھی پوچھا ہے کہ شرح کیا ہے۔۔۔ حافظ جی اپنی جھولی میں گڑ، شکر اور گندم سنبھالتے ایک مذہبی فریضہ سرانجام دے کر امرت کور کا اسلامی نام کنیز فاطمہ تجویز کر کے چلے گئے۔"(44)

تقسیم سے قبل مختلف مذاہب کے لوگ اس مقامیت میں موجود تھے۔ان کے درمیان مذہبی ہم آہنگی مثالی تھی۔ جن میں سے ایک وجہ ان تمام لوگوں کا مذہب سے زیادہ مقامتی ثقافتی عناصر رسم و رواج اور روایات کو ملحوظ خاطر رکھنا تھا۔ مقامی لوگ اپنے تمام معاملات کو ما سوائے چند ایک بڑے مذہبی معاملات کے اپنے مقامی رسم و رواج کے مطابق ہی چلا رہے تھے۔ ان میں ذات پات کے تصورات طبقاتی نظام تمام مذاہب کے ہاں یکساں تھا جو خالصتاً مقامی نوعیت کا تھا۔ مذہب کے اثرات ان تصورات پہ حاوی نہ ہوئے۔ وہ جوں کے توں ہی رہے تمام مذاہب نے جیسے ایک مثالیت پسندی اس معاملے میں اختیار کر رکھی تھی۔

"پنجاب کے دیگر دیہات کی مانند کوٹ ستارہ کی کچی گلیوں جوہڑوں اور کھیتوں کے اوپر جو آسمان تھا وہاں تک کوئی ایک پکارنا جاتی تھی۔ قرآن گرنتھ اور رامائن کے ملے جلے مشترکہ سندیسے جاتے تھے۔ پر ان کا آپس میں اس لیے بیر نہ تھا کہ ان سندیسوں پر دھیان ہی کم دیا جاتا تھا۔ معاشرہ مذہبوں میں نہیں ذات برادری اور چودھری اور کمی کمینوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان کے سامنے مذہب کی حیثیت ثانوی تھی۔"(45)

مذہبی عقیدے انسان کی ذات کا حصہ ہوتے ہیں۔ جو وقت کے ساتھ نہ تو معدوم ہو سکتے ہیں اور نہ ہی بیرونی اثرات ان کو متاثر کر سکتے ہیں وقتی طور پہ انحراف کے باوجود انسان کے اندر اپنے اصل کی طرف لوٹنے کی جستجو ضرور رہتی ہے۔ امرت کور اور بخت جہاں کی محبت میں لہنا سنگھ کے دو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود اسے چھوڑ کر بخت جہان کے دروازے پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ مسلم مذہب کے مطابق شادی بھی کر لیتی ہے۔ اس کے باوجود وہ دلی طور پر اپنے عقیدے کو بھلا نہیں پاتی۔ وہ عمر کے آخری حصے تک اپنے اس عقیدے ہی کو مانتی ہے۔ اسی طرح بخت جہاں کا بیٹا جو کینیڈا کی زمین میں جا بسا۔ اپنی اولاد جو مختلف علاقوں کی بیویوں سے تھی۔ ان کو اس ماحول کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی حاصل تھی۔ اس کے باوجود بھی وہ اپنے عقائد سے انحراف نہ کر سکا۔ اس کی بیٹی ایک سکھ سے شادی کرنے کی خواہش کر کے اس سے ناقابلی تلافی نقصان پہنچاتی ہے جو اس کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کی داخلی حسیت اس سانحے کو برداشت نہیں کر پاتی کہ وہ اپنے نسلی تفاخر میں کمی کرتے ہوئے اپنی نسل میں ایک غیر مسلم کا پیوند لگائے۔

> "چودھری بخت جہان کی سگی پوتی ایک سکھڑے کے ساتھ شادی کرے۔۔۔ بے شک کرے۔ تب کرے جب میں اپنی اس جھیل میں ڈوب مروں جس کے پانیوں پر چار ایسی مرغابیاں تیرتی تھیں کہ جن کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں۔ یا پھر وہاں۔۔۔ جہاں۔۔۔ رچڑ اور بخت جہاں کی ماؤں کی قبریں ہیں۔ ندی کے کنارے کے قبرستان میں وہاں ایک اور قبر کھودی جا رہی ہو جس میں میں اپنے ہاتھوں سے اسے سیرت کو دفن کر رہا ہوں۔"(46)

تین نسلوں کے اس ناول میں ہر عہد، نسل کے بدلتے رجحانات کے ساتھ ساتھ مذہبی تصورات کبھی کچھ نہ کچھ تاثر ہر عہد میں موجود ہے۔ ناول کا ایک ضخیم حصہ اکیسویں صدی کے منظر نامے کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ نائن الیون کے واقعے نے عالمی منظر نامے کو بہت حد تک متاثر کیا۔ پوری دنیا نئے مسائل کا شکار ہوئی۔ عالمی طاقتوں نے اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک پہ کیا۔ امریکہ نے ایک ایسے مشتبہ واقعے کا الزام ایک پوری ملت (قوم) کو ٹھہرانا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کو پوری دنیا خصوصاً اہل مغرب نے خطرے کی علامت قرار دیا۔ ان کے نزدیک ہر مسلمان انتہا پسند، شدت پسند اور دہشت گرد ہی ہونے لگا۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی مسلمانوں خصوصاً مشرقی ممالک کے مسلمانوں کے لیے ڈرونا خواب ثابت ہوئی تو دوسری طرف مغرب میں رہنے والے مسلمان بھی اپنی شناخت کے متلاشی دکھائی دینے لگے۔

عالمی طاقتوں کی اس جنگ میں ایک مذہب کو بالخصوص نشانہ بنایا گیا۔ ان کے اندرونی معاملات میں بھی اس قدر غلط فہمیوں کو جنم دیا گیا ایک دوسرے کو ہی مجرم ثابت کرنے میں لگ گئے۔ مذہبی انتہا پسندی کو ہوا دینے میں بھی ان طاقتوں کا اتنا ہی ہاتھ تھا جن کا نشانہ بہر حال اپنے ہی لوگ بنے روشن کا کردار بھی ایسے ہی ہے۔ ہجوم کے جذبات کی نظر ہو جاتا ہے۔ عالمی طاقتوں کے ایسے ہتھکنڈوں سے مقامی لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ ایک

دوسرے پہ ہی اپنا غصہ نکال کر اپنے جذبات کی تسکین کی جاتی ہے جس کے نتیجے میں نقصان سراسر ان مقامی لوگوں کا اپنا ہی ہوتا ہے۔

"خس و خشک زمانے میں روشن کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ مذہبی شدت پسندوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔ ناول نگار نے روشن کے ذریعے جدید زمانے میں پیش آنے والے مذہبی مسائل کو دیکھا ہے۔ جو کبھی بھی کسی فرد کو موت کے منہ میں اتار سکتے ہیں۔" (47)

ناول میں مذہبی تصورات کی ذیل میں سلمان شاہ (موجو) سرو ہانسی کا بیٹا ہے۔ اس کے پیرائے میں پاکستانی مقامی معاشرے کی ذہنی عکاسی کی گئی ہے کہ طاقت کا گٹھ جوڑ کس طرح نسلوں کے تفاوت کو مٹا دیتا ہے۔ ظاہری حیثیت کی بنا پر لوگ کس طرح عزت کا مقام عطا کر دیتے ہیں۔ مال دار لوگ اپنے نسب کو بھی مٹا دیتے ہیں۔ دراصل ان کی جرات میں مقامی توہمات پرستیاں اور بے جا عقیدتوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ مقامی مذہبی تصورات مقامی رسم و رواج کے پردوں میں لپیٹ دیے جاتے ہیں۔ کھانے کو لنگر اور مذہبی دھاک بٹھانے کے لیے ان کے سامنے ریاکاری کارگر ثابت ہوتی ہے۔ مالی فوائد کی آڑ میں لوگ خوشامد کرتے چلے جاتے ہیں۔ مجموعی طور پہ اس مقامیت کے علاوہ دورِ حاضر میں پاکستانی معاشرہ ایسے ہی موقع پرستوں اور خود غرضوں کے ہاتھ لگ چکا ہے۔ سرکاری افسروں سے لے کر بڑے محکموں، کاروباری حضرات تک سب اپنے ذاتی مفادات کے غلام بن چکے ہیں۔ ایسی صورتحال میں مذہبی عقیدت کو بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ سرو ہانسی کے بیٹے کی کیا بات ایسے ہزاروں سلمان شاہ مقامی لوگوں کا استحصال کر رہے ہیں۔

خس و خاشاک زمانے ایک وسیع زمانی تناظر کا ناول ہونے کے ساتھ ہر زمانے کے مطابق معیارات کو بھی ساتھ لے کر چلتا ہے۔ مصنف کی فنکارانہ مہارت ہے کہ زمانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ دوسرے مقامی عناصر بھی ہر عہد کے تناظر کے مطابق ناول میں موجود ہیں 1930ء کے پنجاب سے بعد کے آنے والی نسلوں تک مذہبی تصورات بھی کرداروں کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔

شہر خالی کوچہ خالی کرونا کی وبا کے موضوع پہ ایک ناول ہے۔ ناول میں ایک ہی کردار ہے جو اس صورتحال میں اپنے روز و شب گزارنے کے ساتھ ساتھ زندگی اور موت کے مسئلے، انسانوں کی بستیوں کا اجڑنا، پرندوں جانوروں کی اساطیر میں انسانوں کی طرف سے کی جانے والی آبادکاریوں اور اس کے نتیجے میں ہونے والی فطرت کی تباہی کا بھی بیان ملتا ہے۔ ناول ایک فرد کے ذاتی حالات کا تذکرہ بھی ہے۔ لاہور کا یہ شہری وباء کے دنوں میں تنہائی کا شکار ہے۔ وباء میں زندگی کا سماجی ڈھانچہ تبدیل ہو گیا۔ ہر طرف موت کے منڈلاتے ہوئے سائے ہوں تو ایسی صورتحال میں زندگی کی بقاء اولین مرحلہ ہوتا ہے۔ وباء کی وجہ سے اول تو لوگ ڈر کر سمٹ کر بیٹھ گئے مگر کبھی یوں بھی سلسلۂ حیات چل سکتا ہے۔ بالآخر لوگوں نے اس کے ساتھ جینے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر کرتے بھی تو کیا کرتے زندگی کا تسلسل تو ہر صورت

میں چلنا ہی ہے۔ مقامی مذہبی بیانیہ کے تناظر میں اس مقامیت میں بھی مذہبی حوالے سے بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بارہا حکومتی احتیاطی تدابیر کی یاددہانی اور سماجی فاصلے کی ضرورت کے پیش نظر مساجد کو بھی ان پابندیوں کو لاگو کرنے کا حکم صادر ہوا۔ مصافحہ کرنا، گلے ملنا، یہ تمام امور کرونا کے پھیلاؤ میں مددگار ہونے کے سبب ان کو ترک کرنے کا کہا گیا ،ایڑیاں جوڑ کر کھڑے ہونے کی تلقین کرنے والے امام صاحب اب سماجی فاصلے کو یقینی بنانے کے لیے فکر مند ہیں۔ لوگ مساجد کے بجائے گھروں میں عبادت کرنے لگے۔ یوں مذہبی مقامات بھی ویران ہو گئے۔ خوف کی فضا ہر طرف پھیل گئی مکہ اور مدینہ میں بھی عام لوگوں کا داخلہ بند ہو گیا اور یوں ان مقامی لوگوں کو اپنی حالت بدلنے میں کسی حد تک جواز بھی مل گیا۔ لوگ عبادت کرنے عبادت گاہوں کی طرف بھی جانے سے رہ گئے۔ ایک طرف انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ مشکل وقت میں فوراً مذہب کی طرف رجوع کرتا ہے۔ کرونا میں بھی یہی صورتحال ہے کہ لوگ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کے طلبگار ہیں کہ یہ کسی طرح وہ ان سے اس وباء کو ٹال دے لوگ مسجدوں میں جانے سے گریزاں ہیں تو دوسری طرف گھروں کی چھتوں پہ چڑھ کے اذانیں دیتے ہیں کہ خدا ان سے اس مصیبت کو دور کر دے۔

> "ہمارے ہاں جب آفتیں حد سے گزرنے لگیں وباؤں بیماریوں اور موسموں کی شدت پر اختیار نہ رہے تو عبادتوں کی جانب رجحان زیادہ ہو جاتا ہے۔ لوگ چھتوں پر چڑھ کے اذانیں دینے لگتے ہیں۔ گھروں میں محبوس لوگ اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی یہ حالت انکار میں چلے جاتے ہیں لیکن جس شب ان کے آس پاس اذانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو ان کی ساری طفل تسلیاں اپنے آپ کو ایک مغالطے میں مبتلا رکھنے کی کاوشیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ وہ سہم جاتے ہیں۔ مزید ڈر جاتے ہیں اور اذانیں دینے والے خود سہمے جاتے ہیں۔ مزید ڈرتے ہیں اذان دینے والے خود سہمے ہوتے ہیں اور ان اور اس کا کتھارسس کرنے کے لیے اذانوں کا سہارا لیتے ہیں۔"(48)

اس مقامی مذہبی بیانیے میں مذہبی رسومات اور عبادات کے ساتھ ساتھ مقامی ثقافتی پہلوؤں کی بھی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ مقامی مذہبی تصورات، تصوف کی روایت، سب میں ہی اجتماعیت کا رنگ موجود ہے۔ درگاہوں، درباروں کا رخ کرنا منتیں، مرادیں مانگنا اس ثقافت کا اہم پہلو ہے۔ لوگ مزارات پہ بڑی تعداد میں حاضر ہوتے ہیں۔ لاہور کی مقامیت کی بات کی جائے تو جو تو وہاں کی مشہور درگاہیں، مزارات لوگوں کی عقیدت کا مرکز ہیں۔ جہاں حاضر ہونا وہ مقامی مذہبی بیانیے اور ثقافت کا اہم پہلو ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کو تصوف کے حوالے سے برصغیر میں خاص مقام حاصل ہے۔ ان کی درگاہ پہ روزانہ کی بنیاد پر ہزاروں عقیدت مند حاضر ہوتے ہیں۔ لاہور کے تصوف کے ساتھ ساتھ مقامی ثقافت کا اہم مرکز بھی ہے۔ دور دراز سے عقیدت مند اپنی ضروریات کی عرضی لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ کرونا وباء سے متاثر ہونے والوں میں بھی ہمیشہ کی طرح غریب آدمی زیادہ تھا۔ شہروں کی بندش سے یہ دیہاڑی دار غریب لوگ اپنے پیٹ کو بھرنے میں بھی ناکام نظر آنے لگے۔ داتا دربار کے ارد گرد بازار وہاں موجود نیازوں کا کاروبار ،لنگر خانے سے ہزاروں لوگوں کے پیٹ پلتے اور روزگار چلتے ہیں۔ کرونا میں یہ تمام سلسلہ بھی موقوف ہوا۔ یوں

غربت اور بے بس ایک ہی ایک نئی لہر نے جنم لیا۔ یہ غریب لوگ کسی حد تک اس وباء کے خوف سے ڈر کر سمٹ کر بیٹھے رہتے۔ انہیں تو دونوں صورتوں میں موت ہی نظر آرہی تھی۔ ان کے لیے گھروں میں بے بسی اور افلاس کی موت سے مر جانے سے بہتر تھا کہ وہ باہر اپنے رزق اپنی بقاء کی جنگ لڑتے ہوئے ہی مر جائیں۔ لہذا وہ لوگ اس کرونا سے زیادہ خطرناک بھوک کے وبال سے تنگ آکر گھروں سے نکل پڑے تھے۔ ناول کا کردار جب کرونا کی قید سے تنگ آکر داتا دربار پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں تو لوگوں کی کثرت ہے اور احتیاطی تدابیر بھی ان کے ملحوظ خاطر نہیں ہیں۔ ناول کے کردار کو ایک بزرگِ کامل ماننا ان لوگوں کی کسمپرسی اور مجبوری کی علامت ہے کہ وہ صدیوں سے اپنی اس غربت اور مشکلات کا حل کسی نہ کسی کے پاس تلاش کرنے جاتے ہیں جو کم از کم ان کی سنتا تو ہے۔ اس کردار کے گرد لوگوں کا جمع ہو جانا اور اسے پہنچا ہوا بزرگ کہہ کر دعا کی درخواست کرنا نہ صرف ان چند لوگوں پر کہ اس مقامیت کے ہزاروں لاکھوں بے بسوں کی داستان ہے۔ ایسی وباؤں سے تو لوگ کبھی کبھار نبرد آزما ہوتے ہیں ان کا واسطہ ایسی وباء سے ہے ۔ جن سے ان کی نسلیں لڑتی آرہی ہیں اور نہ جانے کب تک لڑتی رہیں گی۔

> "معاشرے کی ناانصافیوں کی ذلتوں کے مارے ہوئے لوگ آخر کہاں جائیں۔۔۔ وہ مزاروں کی چادروں کو اپنی بے بسی کے آنسوں سے گیلا کرتے ہیں۔ چوکھٹوں کو چومتے ہیں۔ جالیوں میں فریادوں کے دھاگے باندھتے ہیں۔ اپنے دکھ کی دوا کے متلاشی رہتے ہیں اور ایسے ماؤف ہو چکے لوگوں کو ولایت کے درجے پر فائض کر کے ان سے اپنے درد کا درمان چاہتے ہیں اور کیا کریں۔"(49)

مقامی ثقافت کے ان مذہبی بیانیوں میں جہاں مقامی ثقافت کے پہلوؤں کو دیکھا جا سکتا ہے وہیں ان وباء کے دنوں میں لوگوں کی بے بسی مزید کرب انگیز ہے۔ جب لنگر اور نیاز پہ پلنے والے لوگ افلاس زدہ ہیں۔ ناول میں داتا صاحب کے دربار پر موجود کبوتروں کا بھوک سے مرنا بھی ایک علامتی بیانیہ ہے۔ اس علامت کے تحت مصنف نے محض کبوتروں کا بیان نہیں کیا بلکہ داتا دربار پہ آنے والے زائرین کے ہاتھوں تقسیم ہونے والی نظر و نیاز اور ان سے پلنے والے سینکڑوں افراد کی داستان بھی ہے۔ یہ مقامات جہاں بہت سی ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بنتے ہیں وہیں ان کے فوائد و ثمرات بھی مقامی لوگ اٹھاتے ہیں۔ غیر مذہبی رسومات کے ساتھ مقامی ثقافتی رسومات کے آمیزش سے ان بے بس لوگوں کے کتھارسس کی آماجگاہ بھی بن جاتی ہے۔ کرونا کے ان وبائی ایام میں یہ تمام نظام ٹوٹ پھوٹ گیا۔ درگاہوں پہ تالے ڈال دیے گئے۔ عبادت گاہوں میں بھی ویرانی ہے۔ مقامی مذہبی بیانیے بھی تبدیلی کا شکار ہو گئے۔ مذہب کا بیانیہ بھی لچک دکھاتے ہوئے تبدیل ہو گیا۔ عبادتوں کا طریقہ کار بھی تبدیل ہو گیا۔ لوگ مذہبی معاملات میں بھی انفرادیت کا شکار ہو گئے ہیں۔ مابعد جدیدیت کے تناظر میں مہابیانیے کا تصور کرونا کی صورتحال میں ختم ہو گیا۔ مقامی ثقافتی بیانیہ، مذہبی تصورات اور بیانیہ سب ہی کا خاتمہ ہو گیا اور ایک نیا کرونائی بیانیہ سامنے آیا۔

"مابعد جدیدیت ہر مذہب کو ایک مہا بیانیہ قرار دے کر رد کرتی ہے۔ کرونا وباء نے مذہبی اقدار میں لچک پیدا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مذاہب نے اپنی عبادات کے طور اطوار اور دیگر سماجی اقدار میں وسعت لا کر موجودہ وبائی صورتحال کے عین مطابق بدلہ اور کئی نئی چیزوں کو جگہ دی ہے۔"(50)

کرونا وباء کے خلاف اس سے متاثرہ زندگی نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ زندگی کی بقا کی غرض سے مختلف امور تبدیلی قبول کی۔ مذہب ایسا معاملہ ہے جس سے جڑے جذبات، عقیدت، تصورات کو بدلنا سب سے مشکل ہے۔ مقامی تصورات بھی جب مذہب کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو اس میں تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ ایسا سوچنا بھی جرم عظیم خیال کیا جاتا ہے۔ تاہم کرونا کی وباء میں زندگی کے دوسرے پہلوں کی طرح مذہبی بیانیوں میں بھی تبدیلی رونما ہوئی اور ان مذہبی رسومات اور تصورات کو بھی وقت کی ضرورت کے مطابق ڈھالا گیا۔

3.2 مقامیت کے ثقافتی بیانیے:

ثقافت کسی بھی علاقے کی پہچان اس کی تاریخ کا اہم حصہ اور مختلف تصورات کی حامل ہوتی ہے۔ ثقافت مختلف عناصر کا مجموعہ ہے۔ مابعد جدیدیت چھوٹی ثقافتوں کی آواز کو تقویت دیتے ہوئے ان کے بیانیے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور ان بیانیوں کو بھی بولنے کی صلاحیت اور قوت عطا کرتی ہے۔ جو کسی بڑی ثقافت کے زیر اثر اپنی شناخت کے گم ہونے کے خطرے سے دوچار ہوں۔ اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں مقامی ثقافتوں کا رجحان بہت حد تک پایا جاتا ہے۔ اکیسویں صدی کے ناول نگاروں نے اپنی مقامی ثقافتوں کو اپنے بیانیے میں شامل کیا اور اپنی کہانیوں کا رخ اپنی مقامی ثقافتوں کے طرف موڑا جس سے مقامی ثقافتوں کی بازیافت کا نہ صرف موقع ملا بلکہ ان ثقافتوں سے اردو ادب کے قاری بھی واقف ہوئے۔

ہزارہ کی ثقافت کا بیان اردو ناول کا پہلا تجربہ تھا۔ اختر رضا سلیمی نے اپنے ناولوں میں ہزارہ کی تہذیب و ثقافت کو بیان کیا۔ اختر رضا سلیمی محض لوکیل سے ہی نہیں جڑے بلکہ ان کا اس ثقافت کا گہرا مشاہدہ ایک مستند حوالے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ جاگے ہیں خواب میں ہزارہ کی مقامی ثقافت کا بیان ہے۔ اس میں محض کسی ایک کردار یا زمانے کی بات نہیں بلکہ تاریخ کے مختلف ادوار کا بھی بیان ہے۔ ناول نگار نے تاریخی اعتبار سے ناول کے مختلف حصوں میں مقامی ثقافت کا پرچار کیا ہے۔ ہزارہ کی مقامی تاریخ و تہذیب پہ اثر انداز ہونے والے عوامل بھی وسیع مشاہدے اور تاریخی شعور کے ذریعے سے ناول میں بیان ہوئے ہیں۔

ناول میں مقامی ثقافت کو ایک گہرے مشاہدے اور تاریخی تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مختلف ادوار میں مختلف پہلوؤں کا بیان ملتا ہے۔ ناول میں قدیم رسم و رواج سے لے کر ثقافت کے مختلف پہلوؤں کا بھی مقامی کرداروں کے ذریعے سے اظہار ہوتا ہے۔ ناول میں مقامی ثقافت کو مختلف ادوار میں بیان کیا ہے۔ ناول نگار نے مقامی

ثقافت کے مختلف عناصر کی وضاحت کی ہے۔ان لوگوں کا خاص طرز رہائش ہو یا رسم و رواج مقامی سماجی عناصر سب میں مقامیت کا بول بالا ہے۔ہزارہ کی ثقافت کا تفصیلی بیان اس سے قبل اردو ناول میں شامل نہ تھا۔اختر رضا سلیمی کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے ہزارہ کی مقامیت کو اردو ناول میں اس طرح سے شامل کیا کہ اردو ناول کا قاری نہ صرف ہزارہ کی ثقافت سے آشنا ہوا بلکہ ہزارہ کی ثقافت کی تاریخ بھی ایک طرح سے محفوظ ہو گئی۔ناول نگار نے ماضی اور حال کے تقابل کے ذریعے سے مقامی ثقافت کی بازیافت کی ہے اور ایسے امور کو بھی زیر بحث لایا ہے جو مقامی ثقافت پہ اثر انداز ہو رہے ہیں اور بہت سی دوسری مقامی ثقافتوں کی طرح ہزارہ کی ثقافت بھی جدیدیت کے پر کشش نعرے اور عالمگیریت کے دلفریب فریب میں آتے ہوئے اپنی ثقافتی شناخت کو کسی حد تک کھو رہی ہے۔جدیدیت کی لہر نے نہ صرف لوگوں کی زندگیوں کو سہل کیا بلکہ اصل مسئلہ تب پیدا ہوا جب لوگ اپنی ثقافتوں سے ہٹ کر بڑی ثقافت کا حصہ بننے لگے اس سے وہ اپنی شناخت کے مسئلے سے بھی دوچار ہوتے نظر آتے ہیں۔ناول میں اختر رضا سلیمی نے ہزارہ کے مقامی ثقافت کے بیان میں ایک اہم اضافہ کیا ہے؛جہاں مقامی ثقافتوں کے بیانیے کے پہلو کو بھی تقویت ملتی ہے اور ما بعد جدید نقطہ نظر کی بھی توثیق ہوتی ہے۔

> "سلیمی اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے اردو طبقے کو ہزاروی تہذیب و ثقافت سے روشناس کرایا۔اس سے قبل اردو ناول کا قاری اس خوبصورت جغرافیائی خطے کی ثقافت سے روشناس نہیں تھا۔ان کے دونوں ناولوں میں ہزاروی ثقافت اور اس کے مختلف مظاہر کی پیشکش قدر مشترک حیثیت رکھتی ہے (51)"۔

ہزارہ اور اسے ملحقہ پہاڑی علاقوں میں چیڑ کا درخت خاص وقعت اور اہمیت کا حامل ہے۔ہزارہ کی مقامی روایت و ثقافت کے تناظر میں مصنف نے اس درخت کی اہمیت کا بھی تذکرہ کیا ہے۔جو ان کے مقامی ثقافت کا ایک اہم جزو ہے اور ان کی زندگیوں کا اہم حصہ بھی چیڑ کا درخت ان کے مختلف حوالوں سے مدد کرتا ہے۔ان کے کام آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس درخت کو روایت و تہذیب کا خاصہ بنا لیا جاتا ہے۔یہاں تک کہ زندگی اور موت کی رسم و رواج کے ساتھ ساتھ اس کو جوڑا جاتا ہے۔ناول نگار نے ایک ایسے علاقے کا انتخاب کیا ہے جہاں قدرتی مناظر کی فراوانی ملتی ہے۔قدرتی حسن سے مزین یہ علاقہ جدید سہولتوں سے کسی حد تک نابلد ہے۔یہاں کی زندگی جتنی پر کشش ہے اتنی ہی مشکل ہے۔جن کی زندگیوں کا زیادہ تر انحصار مقامی و قدرتی مصنوعات پہ ہوتا ہے۔بود و باش کے حوالے سے بھی یہاں کافی مسائل ہیں کہ روزگار نہ ہونے کے برابر ہیں اور فصلوں کی مقدار بھی اس طرح سے نہیں ہے کہ جس طرح سے میدانی علاقوں میں ہوتی ہے۔اس لیے مقامی لوگوں کے ہاں مختلف اساطیر اور مختلف تہذیبی اور ثقافتی عوامل ہیں جو ان کو ایک خاص مربوط انتظام میں جوڑے ہوئے ہیں۔

ناول نگار نے مقامی بیانیے کے ذریعے ان کی تاریخ سماجی نظام پہ بھی بات کی ہے۔ان علاقوں میں قبائلی نظام رائج ہے اور فیصلہ اپنے سردار یا بڑے کی تائید کرنا ان رسم ورواج کی پابندی سب پہ لازم ہے۔ علی احمد کی موت ہو یا ظفر علی خان کی شادی اس کی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو دیکھا جا سکتا ہے۔نور آباد ایک نئی بستی وجود میں آئی لیکن وہ اس تہذیب کا تسلسل تھی ۔اس آزاد و خود مختار بستی میں مقامی تہذیب زیادہ بہتر انداز میں پروان چڑھی اور ان کی روایات کو مزید استحکام ملا۔نور آباد میں ہی اس تہذیب کے عوامل کو دیکھا جا سکتا ہے۔نور آباد محض ایک بستی ہی نہیں بلکہ ایک علامتی جگہ ہے۔ جہاں ہزارہ کی ثقافت کو مختلف حوالوں سے جزئیات نگاری کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ان لوگوں کا سماجی بندھن اس طرح سے مضبوط ہے کہ وہ آپس میں ایک برادری کے ہوتے ہوئے بھی اور غیر برادری کے لوگوں کے ساتھ بھی اس طرح سے مربوط ہیں۔ مقامی لوگوں کی آپس میں اس جڑت کا ایک الگ ہی رنگ سامنے آتا ہے۔

"علی احمد بستی کا بزرگ ترین آدمی ہے۔وہ میرے باپ کی جگہ ہے۔خدا کرے اس کا سایہ تادیر ہمارے سروں پہ رہے لیکن اس کی موت میں اس کی قبر کے تختے اس وادی کے بزرگ ترین کاہو کے تنے سے نکالے جائیں گے۔ یہی ہماری صدیوں سے روایت رہی ہے۔"(52)

ناول میں مقامی ثقافت کے مطابق مکانوں کی تعمیر، مخصوص انداز، فن تعمیر کی بھی وضاحت ملتی ہے۔نور آباد کی بستی کی بنیاد ہو یا صابرہ خانم کے گھر کا بیان مقامی ثقافت کے پہلو ہر سو دکھائی دیتے ہیں۔ناول میں مقامی ثقافت کے کئی حوالے سے اہم شواہد ملتے ہیں۔گھروں کی تعمیر بھی موسمی صورتحال کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کے رسم ورواج اور مقامی ثقافت کی آئینہ دار بھی ہوتی ہیں۔ان چھوٹے مختصر گھروں میں اس کی ایک ایک چیز میں ان کی زندگی کا ایک انوکھا پن دکھائی دیتا ہے۔ جس میں ان مقامی لوگوں کی مقامیت کو تقویت ملتی ہے۔یہ مقامی لوگ خصوصی رسم ورواج اور ثقافت کے تحت جڑے ہیں۔ان کے ہر پہلو میں مقامی ثقافت کے رنگ نمایاں ہیں۔گھروں کی تعمیر سے لے کے روزمرہ کے کاموں تک ایک الگ انداز زندگی کا بیان ملتا ہے۔ جو ان لوگوں کو دوسری مقامی یا علاقائی ثقافتوں سے ممتاز کرتا ہے۔

"یہ دو کمروں پہ مشتمل ایک مکان تھا۔دونوں کمرے بالکل متوازی تھے اور ان کے آگے برآمدہ تھا۔۔۔ شہروں کے مقام استحصال سے ڈیڑھ فٹ نیچے ستون میں لکڑی کی کیل بھی انتہائی مہارت سے ٹھونکی گئی تھی۔ جس پر ایک دونالی؛بندوق لٹک رہی تھی۔۔۔ لکڑی سے ملی جلتی لکڑی کے تختوں کی ایک کارنس بنی ہوئی تھی جو کمرے کے پچھلی دیوار کو محیط تھی۔کارنس پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرخ کپڑا،اس طرح بچھایا ہوا تھا کہ کانس کی چوڑائی کے برابر نیچے لٹک رہا تھا۔کپڑے کے لٹکاؤ والے حصے پر سفید رنگ کی کشید کاری کی گئی تھی

۔جس کے پیچھے حصے پر مٹی، پیتل، کانسی اور تانبے کے برتن انتہائی سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔کارنس کے اوپر دیواروں میں لکڑی کی کیلیں ٹھونک کران پر چنگیریں، سجاوٹ کی دیگر چیزیں آویزاں کی گئی تھیں۔"(53)

ان قبائلی علاقوں کے ہاں ہتھیار اپنی بقاء اور تحفظ کے لیے رکھنا، قدیم روایت کے طور پر موجود ہے۔بندوق سے قبل کلہاڑی کو لازمی جزو سمجھا جاتا تھا۔جدید دور میں اس کی جگہ بندوق نے لے لی۔گھریلو دستکاریاں بھی اس خطے کی اہم پہچان ہیں۔مقامی ثقافت کے مطابق سلائی کڑھائی کی جاتی ہے۔جس کی اپنی علاقائی شناخت ہے۔ناول نگار نے ایک مکان کے بیان میں مقامی فنِ تعمیر کا بھی نقشہ کھینچ دیا ہے۔پہاڑی علاقوں پہ محیط اس خطے کے مکانات باہم جڑے ہوئے اس قدر کم رقبے پہ مشتمل ہوتے ہیں بلکہ اکثر تو ایسا ہوتا کہ ایک کا صحن دوسرے کی چھت ہوتا ہے۔مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی کام کاج کرتی ہیں، ان کے کاموں کی حدود گھر کے صحن اور باہر دونوں میں یکساں ہوتی ہے ۔ناول میں اگرچہ مختلف ادوار کا بیان ہے تو اسی وجہ سے ہر دور کے مطابق مصنف نے اس کی ثقافت کو بھی بیان کیا ہے۔ ظفر خان کی شادی کے موقع پہ بھی مقامی ثقافت کے مختلف رنگوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ظفر خان کا باپ کا سردار ہو کر اپنے بیٹے کے لیے عاجزانہ رشتہ طلب کرنا بھی مقامی ثقافت کا ایک پہلو ہے؛ جہاں والدین کی مرضی و منشاء کے مطابق اولاد کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں تو دوسری طرف میں باحیثیت ہونے کی کے باوجود بھی لڑکے والے عاجزانہ طور پر لڑکی کو عزت اور احترام سے بیاہنے کے لیے اس کے والدین سے رشتہ طلب کرتے ہیں۔

"حسن علی۔۔۔! میں نے تم سے ایک بہت اہم بات کرنی ہے۔چاہیے تو یہ تھا کہ میں یہ بات کرنے تمہارے گھر آتا لیکن سحر کی خرابی کی وجہ سے تمہیں یہاں بلانا پڑا" سردار جی گویائے ہوئے۔ سردار جی "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ہم آپ کے خادم ہیں۔۔۔" "نہیں بات ہی ایسی ہے کہ مجھے آنا چاہیے تھا۔اس لیے مجھے معاف کرنا اور انکار نہ کرنا" سردار جی نے کہا۔۔۔

حضور آپ حکم کریں میری جان بھی حاضر ہے۔

حسن علی جی کے لہجے میں تجسس تھا۔

"میں تمہاری بیٹی کا ہاتھ مانگنا چاہتا ہوں" سردار جی مدعا بیان کیا۔"(54)

ان لوگوں کے اپنے خاص رسم و رواج رہن سہن کے طوار طریقے ہوتے ہیں۔مختلف مقامی ثقافتوں کو دیکھا جائے تو ان کے ہاں روزمرہ کی زندگی میں مختلف امور ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق اس خاص مقامی دائرہ کار سے ہوتا ہے ۔شادی بیاہ کے رسم و رواج بھی مقامی ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔سرداران لوگوں کا بڑا ہونے کے باوجود بھی رشتے کے وقت عاجزانہ طور پہ حسن علی کی بیٹی کا ہاتھ مانگ رہا ہے۔عورت کی قدر و قیمت کے لیے اس سے رشتے کا پاس و لحاظ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔رشتوں کا تقدس ان کی تہذیب کا خاصا ہے۔ناول نگار نے چھوٹی چھوٹی جزئیات نگاری کے ذریعے سے مقامیت کے مختلف پہلوؤں کی نہ صرف وضاحت کی ہے۔ان کی اس مقامی زندگی میں اہمیت کو بھی

واضح کیا ہے۔ ناول میں مقامیت کے مختلف عناصر کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان پہاڑی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کا خاص طرز معاشرت اور طرز بود و باش اور ثقافتی پہلو ہر لحاظ سے واضح کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "اس ناول کا لوکیل اتنا پر شکوہ اور پر مست ہے جتنا کہ بالا سوات۔۔۔مارگلا کے عقب میں گلیات کی اترائی کے پہاڑی سلسلوں کے بیچوں بیچ بھی دریائے ہر و کے پر سکون کناروں کے قریب چیڑ اور کاہو کے جنگلوں کے پس منظر میں آباد ایک قدیمی گاؤں نور آباد اس میں بسنے والے لوگوں کا ثقافتی ماحول متعلقات وارائے اور آدرش اور جادو کی رسمیں اور نفسیات کے تہ در تہ در سلسلے ناول کے منظر نامے کی تشکیل کرتے ہیں۔"(55)

اس مخصوص فضا اور ماحول میں بسنے والے لوگوں کا صدیوں پرانا اپنا ایک طرز زندگی، طرز معاشرت اور ثقافتی عناصر ہیں۔ ان کی ثقافت ہی انہی پہاڑوں کے دامن میں پروان چڑھی۔ اس میں مقامی نوعیت کے مختلف ثقافتی میلوں، عرسوں اور ایسے اجتماعات کا تذکرہ ملتا ہے، جہاں مقامی ثقافت کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ ثقافتی تہوار بنیادی طور پہ بظاہر مذہبی یا کسی بھی ضمن میں ہو سکتے ہیں۔ مذہبی تہوار بہت حد تک ثقافت کے ہی آئینہ دار ہوتے ہیں اور ایسے موقعے پہ ان لوگوں کا گٹھ جوڑ ہوتا ہے۔ مختلف علاقوں چھوٹے چھوٹے گاؤں، ان پہاڑی علاقوں میں گاؤں کی نوعیت بھی ایسی نہیں ہوتی کہ، جیسا کہ میدانی علاقوں میں ہے۔ چند گھروں پہ مشتمل آبادیوں سے سینکڑوں میل دور سفر طے کر کے ان موقعوں پہ اکٹھے ہوتے ہیں جو ان کی ثقافتی گٹھ جوڑ کا ایک وسیلہ بھی ہے۔ ناول نگار نے اس ہزارہ کی مقامی ثقافت کے تناظر میں بھی ان مقامی اور ثقافتی پہلوؤں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے بیان میں ہزارہ کے مقامی تہواروں کا تذکرہ بھی ملتا ہے اور ثقافت کے مختلف اعمال کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ جس کے ساتھ ان مقامی تہواروں میں مقامی کرداروں کے مختلف پہلوؤں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مقامی مذہبی بیانیے کے ساتھ ساتھ مقامی ثقافتی عناصر کی بھی وضاحت کی ہے۔ ان مذہبی جگہوں پہ ہونے والے میلوں کا مقصد ہی ثقافتی گٹھ جوڑ اور تفریح کے مواقع بھی ہیں۔ دور دراز رہنے والے دیہاتوں کے لوگ میلوں سفر طے کر کے اور کئی دنوں کے مسافت کے بعد ایسی جگہ پر پہنچتے ایسے لوگ بھی میں شامل ہوتے جو کبھی زندگی میں اپنی اس مقامی حدود سے باہر نہیں گئے ہوتے تھے اور نہ ہی ان کی رسائی کسی بڑے شہر تک تھی ان کے لیے ایسے تفریحی مقامات ہی ان کے لیے سب کچھ تھا۔ لہٰذا مزارات اور عرس عقیدت کے پیرائے میں ان لوگوں کی تفریحی پہلو بھی شامل ہوتے۔

> "سال سات دسمبر کو نور آباد کے عقبی میدان میں ایک میلہ سجا تھا۔ جس میں مختلف کھیلوں خاص کر کبڈی، گھڑ دوڑ، مرغوں کتوں کی لڑائی کے مقابلے ہوتے جو کہ اس میلے کا آغاز عزیز جہاں کے دادا سر کاظم خان نے تقریباً ایک صدی قبل کیا تھا۔ اس لیے ہر سال اس میلے کا افتتاح سردار جی سے کرایا جاتا تھا۔ جس کے لیے بطور خاص نور آباد آتے۔ وہ ہر سال سات دسمبر کو میلے کا افتتاح کرنے کے بعد دن ڈھلے واپس شہر چلے جاتے ہیں۔"(56)

مقامی ثقافت میں رشتوں کا لحاظ و پاس بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ناول کے آخری حصے میں اس کی ایک تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ یعنی اکیسویں صدی کے زمانے میں بھی مقامی سطح پہ ان لوگوں میں رکھ رکھاؤ رشتوں کی پہچان موجود ہے۔ ان کے ہاں انسانی قدروں اور رشتوں کی اہمیت مقدم ہے۔ زمان کی بیوی کئی سال تک اس کی لاپرواہی کے با وجود بھی اس کی خدمت کرنا وہ اپنا فرض عین سمجھتی ہے۔ ہزارہ کی اس مقامیت کے بیان میں جہاں دوسرے مختلف عناصر کی وضاحت ملتی ہے وہیں اس کردار کے ضمن میں تصورِ عورت کے حوالے سے بھی کچھ شواہد ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ رشتوں کا پاس اور لحاظ ان لوگوں کی فطرت میں شامل ہے۔

"اس نے ماریہ سے جو کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھی، اجازت چاہی، پچھلے کچھ عرصے سے وہ جہاں کہیں بھی جاتا ماریہ سے اجازت لے کر جاتا تھا۔ اسے روکنا تو دور کی بات ماریہ اس بات پر خوشی سے پھولے نہ سماتی تھی کہ اس کا مجازی خدا اس سے باقاعدہ اجازت لے کر جاتا ہے۔"(57)

جاگے ہیں خواب میں مابعد جدیدیت کے تصورِ مقامیت کے تمام اصولوں پہ پورا اترتا ہے۔ ناول میں اپنی تہذیب و ثقافت کا وسیع کرداروں کے تناظر میں بیان موجود ہے۔ ناول نگار نے تمام مقامی عناصر کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ثقافت کے مختلف عناصر تاریخ کے اعتبار سے مختلف ادوار کے لحاظ سے مقامی ثقافت کی وضاحت کی گئی ہے۔ مذہبی تصورات ہوں یا سماجی نظام تمام عناصر کی مقامی کرداروں کے ضمن میں وضاحت ملتی ہے۔ اختر رضا سلیمی کے اس ناول کا منشا وہی ہے جو مابعد جدیدیت کا نقطہ نظر ہے۔ اختر رضا سلیمی نے ہزارہ کی مقامیت کو اردو ناول میں بیان کر کے نہ صرف اردو ناول کے قاری کو ہزارہ کی ثقافت کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا ہے۔ بل کہ اردو ادب میں بھی اس ثقافت کے پیرائے میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ ناول کی خاص بات اس کا وسیع تاریخی تناظر اور ارتقائی عمل ہے۔ ناول نگار نے اپنے گہرے مشاہدے اور علم کو بروئے کار لاتے ہوئے ناول میں کئی نسلوں اور کئی صدیوں پہ مشتمل عرصے کو دکھایا ہے۔ واقعات کے تناظر میں ناول نگار نے ہزارہ کی مقامی تاریخ کو بھی گہرے مشاہدے کے ذریعے سے مطالعہ کے عمل سے گزارا ہے۔ ناول میں مختلف تاریخی موقعوں پہ تاریخی حوالے بھی ملتے ہیں جو ہزارہ کی دستیاب تاریخ میں سے منتخب کیے گئے ہیں۔

اختر رضا سلیمی نے جاگے ہیں خواب میں کے بعد اپنے دوسرے ناول جندر میں بھی اپنے علاقے ہزارہ کی مقامیت کو ہی موضوع بنایا ہے۔ ناول نگار نے لوکیل کا انتخاب وہی کیا ہے جو جاگے ہیں خواب میں تھا۔ تاہم بنیادی فرق دونوں کے زمانہِ ارتقاء کا ہے۔ جاگے ہیں خواب میں تاریخی واقعات کی تفصیل زیادہ ہے جبکہ جندر میں واقعات محدود ہیں۔ بنیادی طور پہ جندر ایک ایسی تہذیب کا نوحہ ہے جو اپنے اختتام کی جانب گامزن ہیں۔ ایک کردار کے بیان میں ناول نگار نے پوری مقامیت کے زوال کو بیان کیا ہے۔ ناول نگار نے ہزارہ کی مقامیت کو تفصیل کے ساتھ اردو ادب سے روشناس کرایا ہے۔ مابعد جدید نقطہ نظر کی توثیق کرتے ہوئے ناول نگار نے مرکزی بیانیے کے تصور کو رد کرتے

ہوئے چھوٹے ثقافتی گروہوں کی جانب انحراف کو جاری رکھا ہے۔اس ثقافت کا راوی اس کا نوحہ کناں ہے۔ جس کی تہذیب اب مٹتی جارہی ہے۔اس کے بعد اس کا ماتم کرنے والا بھی کوئی نہ ہوگا ناول کا عنوان جندر ہے۔ جسے مقامی زبان میں پانی سے چلنے والی چکی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔صدیوں پرانے اس جندر کے ساتھ اس تہذیب کا بھی اختتام ہونے والا ہے۔ناول کا مرکزی کردار ایک جندروئی ہے۔جو ثقافت کے علمبردار کے طور پر ناول میں موجود ہے ۔اس کی سانسیں جندر کی سانسوں کے ساتھ جڑی ہیں۔دونوں ایک معدوم ہوتی تہذیب کے نمائندے کے طور پہ موجود ہیں۔ناول نگار نے مرکزی کردار کی موت کو ایک ایسے کی صورت میں دکھایا ہے۔جس کا مرنا محض اس کا مرنا نہیں بلکہ ایک ثقافت کے مرنے کا پیش خیمہ ثابت ہورہا ہے۔ناول نگار نے ناول کے مرکزی کردار کی سانسوں اور جندر کی سانسوں کا تانا بانا اس طرح سے جوڑ دیا ہے۔یوں معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں جیسے جیسے جندر چلتا ہے۔ویسے ویسے ولی خان بھی زندگی کی طرف گامزن ہوتا ہے۔اور جیسے جیسے اس کی جندر کی ہوک کم ہوتی ہے،اسی طرح اس کی سانسوں کے ٹوٹنے کا سلسلہ بھی شروع ہوجاتا ہے۔

> "جب ثقافت معدوم ہونے لگتی ہے یا موت سے ہمکنار ہوتی ہے تو یہ فقط ثقافت کی موت نہیں ہوتی بلکہ اس سے جڑے افراد کی بھی موت ہوتی ہے یہی موضوع اختر رضا سلیمی کے دوسرے ناول جندر کا جندر جو ثقافتی علامت بھی ہے۔"(58)

ناول کے بیانیہ میں مقامیت کی ثقافت پوری آب وتاب کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ثقافتی رسم ورواج اساطیر مذہبی تصورات تاریخ نیز مقامیت کے تمام پہلوؤں کی مقامی کرداروں کے تناظر میں وضاحت ملتی ہے۔ناول میں مقامی ثقافت کا ماضی کے جھروکوں سے عہد حاضر تھا ایک تقابل بھی ملتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ماضی کی طرف ذہنی انحراف کرتا ہے۔یہ مابعد جدید دنیا کی صورتحال بھی ہے جہاں فرد ترقی کی دوڑ میں دوڑتے دوڑتے خود کو بھی گم کردیتا ہے اور بلآخر ذہنی خیالوں میں تصورات کے ذریعے ماضی کی طرف مراجت کرتا ہے۔مابعد جدید دنیا کے اس سفر میں وہ اپنے اصل ہی میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ جندروئی بھی اس ماضی پرستی میں اپنے لیے عافیت کے چند لمحے تلاش کرتا ہے۔وہ جدید دنیا کے ساتھ چلنے کو اس لیے تیار نہیں کہ وہ اپنی ثقافت سے ہٹنا نہیں چاہتا۔وہ ایک جدید عہد کا انسان ہونے کے باوجود اپنی مٹی سے وفاداری نبھاتے ہوئے موت کو گلے لگانا پسند کرتا ہے۔وہ ایسے عہد کا نمائندہ ہے جہاں مقامیت اپنے تمام تر عناصر کے ساتھ موجود تھی۔ وہ ایسے عہد کا نمائندہ ہے جو اپنی روایات کا پاس رکھا کرتے تھے۔اپنے اس ثقافتی ورثے کی بقاء کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار تھے۔جدیدیت نے جہاں انسان کی زندگی کو سہولتوں سے مزین کیا وہیں اس کے اثرات منفی صورت میں بھی انسانوں پہ رہنما ہوئے اور سب سے زیادہ نقصان مقامی ثقافتوں کی ذیل میں اٹھانا پڑا ۔مقامی لوگ اپنے اصل سے اس طرح کٹتے چلے گئے۔وہ جدیدیت اور اپنے مقامی حالات میں توازن قائم نہ رکھ پائے ۔جس میں پلڑا جدیدیت کا بھاری ہوا اور بالآخر وہ اپنی جڑوں سے بالکل ہی جدا ہوتے چلے گئے۔

"اب ہمارے گاؤں میں بھی موبائل فون کی سہولت موجود ہے لیکن میں کبھی اپنے اسے اپنے زیر استعمال نہیں لایا کہ ایک تو مجھے کبھی ان چیزوں سے دلچسپی نہیں رہی اور دوسرا جندر والے مقام پر کسی کمپنی کے سگنل ہی نہیں آتے اس کے چاروں طرف پہاڑیاں ہیں۔"(59)

جندر کے مقام پہ سگنل کا نہ آنا بھی ایک ایسی علامت ہے جو اس مقامی اور جدید نظام کے درمیان فرق ہے کہ مقامیت کو اس سے مستفید یا اس میں ترقی کے بجائے اس نظام سے یکسر انحراف کا رویہ ہے جو اس کا رد ہے۔ مقامیت سمٹ جاتی ہے بالکل ولی خان اور اس کے جندر کی طرح ایک کونے میں جہاں کوئی جانا بھی پسند نہیں کرتا۔ لوگوں کی جدیدیت کے راستے اس مقامی جگہ سے دور دوسری طرف ہی نکلتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ جدید دنیا سے کٹ کے رہنے والا ایک شخص ہے جو اس تنہائی کو برداشت نہ کر پایا اور بالآخر معاشرے نے اس کو اس قدر رد کیا کہ اس کا مرنا ہی اس کے لیے بہتر ثابت ہوا کہ وہ وقت اور حالات کے مطابق نہیں چل سکا لیکن اصل مسئلہ اس کے اپنے حالات اور اپنی ثقافت کا مسئلہ ہے۔ وہ اس کی بقاء کی خاطر کسی صورت بھی ایسی جدیدیت کو اختیار کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا جو اس کو اپنی جڑوں سے اپنی مٹی اور اپنی دھرتی اور اپنے رسم ورواج سے دور کر دے۔ اسی ورثے کی بقا کی خاطر وہ تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جندروئی پڑھا لکھا شخص ہے۔ وہ محض جندروئی ہی نہیں ہے نہ ہی ایسا شخص کہ جو جدید دنیا سے واقف نہیں۔ اس نے اس جدید دنیا سے دور رہ کر بھی علم بھی حاصل کیا۔ تاہم وہ ایک ایسا شخص ہے جو اس نظام کا حصہ نہیں بنتا۔ وہ اپنے قریبی لوگوں کے ساتھ ہی جڑا ہے۔ وہ اجتماعیت کا نمائندہ ہے جہاں دوسروں کے دکھ سکھ ہر حال میں شریک ہونا ضروری ہے۔ اس لیے وہ اس گلوبلائزیشن کی دنیا سے دور ہے۔ وہ جدیدیت کا نہ تو مخالف کردار ہے اور نہ ہی اتنا قدیم کے جدید دنیا کے بارے میں اس کو کسی بات کا علم نہ ہوا۔ صل مسئلہ اس کی اپنی ذات اس کی شناخت کا مسئلہ ہے۔ وہ اپنی شناخت کو کسی طور پر بھی معدوم ہونے سے بچانے کی خاطر اپنے حالات اور واقعات کے ساتھ سمجھوتہ کر کے چلتا جاتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"جندر ایک ایسی علامت بن کر آتا ہے جہاں پرانی اشیاء اور اقدار اپنی چمک کھوتے جا رہے ہیں اور ایک نئی نسل ماڈرن ٹیکنالوجی اور سائنسی ارتقاء کے ساتھ وقت کو نئے معنی پہنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہم ایک ایسے عہد میں آ گئے ہیں جہاں دھند ہے تاریکی ہے مگر خواب زندہ ہے۔"(60)

ناول میں ہزارہ کی مقامیت کو جزئیات نگاری کے ساتھ ناول نگار نے وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس مقامیت کی مرکزیت دراصل اجتماعیت ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رسم ورواج کے ساتھ جڑے ہیں۔ ان کے ہاں اجتماعیت کا وصف ہے وہ ہر اہم مرحلہ چاہے فصل کی بوائی ہو یا کٹائی غم کا موقع ہو یا خوشی کا ایک مخصوص سماجی نظام کے تحت آپس میں جڑے ہیں۔ ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں جو ان کی اجتماعیت کی بنیاد بھی ہے۔ جندروئی ماضی کو یاد بھی کرتا ہے اور ثقافت کا نام بھی دیتا ہے اور بالآخر اسے مجبوری کا نام بھی دیتا ہے۔ جو دراصل اس کے ذہن کی تشنگی ہے

اور اب یہ روایات ثقافت دم توڑ رہی ہیں یا توڑنے کے قریب ہیں جندروئی کے کردار کے ذریعے سے شعور کی رو کا استعمال کرتے ہوئے ناول نگار نے جندروئی کے ماضی کے بیان میں اس مقامیت کے مختلف عناصر کی وضاحت کی ہے۔ اس مقامیت کے عروج کا بیان کرتے ہوئے ناول نے مختلف موضوعات کو چھیڑا ہے ایک ایسا معاشرہ جو اجتماعیت پہ یقین رکھتا ہے۔ جہاں ایک ایسا سماجی نظام ہے جہاں ایک دوسرے کا لحاظ اور پاس رکھنا لازمی خیال کیا جاتا ہے۔

"سب مل جل کر ایک دوسرے کی فصلیں کاٹتے انہیں ڈھو کر مکانوں کے صحنوں اور کھلیانوں میں جمع کرتے اور پھر بیلوں کی جوڑیوں کے پیچھے کاہو کی خشک پینگیں باندھ کر رسے گاہتے۔ مکئی کی کٹائی کے بعد گاؤں کی عورتیں مل کر اسے چھیلتی اور پھر مرد راتوں کو بھاری سوٹے لے کر اسے کوٹتے شاید یہی مجبوریاں تھیں جو لوگوں کو ایک دوسرے سے جڑے رہنے اور محبت کرنے پہ اکساتی تھی۔"(61)

ناول کا مرکزی کردار قاری کو ماضی کے جھروکوں میں لے جاتا ہے۔ مندرجہ بالا بیان میں وہ ان سماجی معاملات کو ایک مجبوری محض طنزیہ انداز میں کہتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے پہ انحصار کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے اندر مہر اور محبت بھی تھی۔ جدیدیت کے آنے سے جہاں زندگیاں سہل ہوئیں وہیں لوگوں کے اندر پیار اور محبت اور الفت کا رشتہ بھی ختم ہو گیا۔ انسانوں کے متبادل مشین کے آنے سے انسانوں کے اندر وہ جذبات اور احساسات بھی ختم ہو گئے بالکل ایسے ہی کہ جیسے مشین آپ کے جذبات اور احساسات سمجھنے سے عاری ہوتی ہے یونہی انسان بھی ایک دوسرے سے اسی طرح بے اعتنا ہی برتنے لگے۔ ناول کا مرکزی کردار ناول میں جا بجا ماضی کی طرف ذہنی سفر شروع کر دیتا ہے۔ وہ اس ثقافت کا علمبردار ہے جہاں اجتماعیت اپنے معراج پہ تھی۔ مقامیت کے وہ اوصاف تھے جہاں انسان کے نزدیک اخلاقی قدریں، رسم و رواج مقدم تھے۔ ان کے نزدیک ایک ایسا نظام تھا جہاں محض کام کاج کی خاطر ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی خوشی اور غمی میں بھی اسی طرح سے شریک ہوا جاتا اور سب کا دکھ درد بانٹا جاتا اور اسے اپنا سمجھا جاتا جدید دور نے ان جذبات اور احساسات کا گلا گھونٹ دیا ہے جہاں انسان محض اپنی ذات تک سمٹ کے محدود ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر شاہد نواز اس مقامیت اور مٹتی ہوئی تہذیب کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"جندر اور جندروئی کا خاتمہ دراصل اس تہذیب اور اجتماعی زندگی کے خاتمے کی علامت بن رہا ہے۔ جس میں کسی نہ کسی طرح مقامیت کو زندہ رکھا ہوا تھا۔ مقامیت کے اس رنگ ڈھنگ میں قناعت دوسروں کے مدد اجتماعی پن رشتوں کی پہچان، عدم تشدد، دکھ درد میں شریک اور زندگی کو قبول صورت بنانے کے لیے انتھک محنت نمایاں وصف ہیں۔"(62)

مقامیت کے مختلف ثقافتی پہلوؤں کا بیان ناول کے مختلف کرداروں کے ضمن میں ہوتا ہے۔ ولی خان اپنے ماضی میں جا کے اس مقامیت کو تفصیلاً بیان کرتا ہے۔ جو اس مخصوص علاقے کی خاص ثقافت ہے۔ ایسی ثقافت جہاں رشتوں کا پاس بھی ہے اور ان کا احترام بھی ولی کا باپ اولاد نہ ہونے کے باوجود اپنی بیوی سے محبت کرتا ہے اور مرنے

کے بعد بھی بیٹے کے سہارے زندگی گزار کر اس کے ساتھ وفاداری نبھاتا ہے۔ رشتوں کا یہ پاس آنے والی نسلوں میں اس قدر اہم نہیں ہے۔ اسی کے بر عکس ولی خان کا اپنا بیٹا اسے اس لیے اچھا نہیں سمجھتا کہ وہ ایک جندر پہ کام کرتا ہے ایک جندر روئی ہے۔ وہ جندر جس کی تعمیر ایک اعزاز اور کارنامہ تھا جس سے ان کی تین نسلوں نے پرورش پائی۔ ولی خان کے بیٹے کے ضمن میں بنیادی طور پہ مقامی ثقافتوں کا وہ احساس کمتری ہے جو بڑی ثقافتوں نے ان کے ذہنوں میں انڈیل دیا ہے۔ وہ اپنی ثقافت اپنی پہچان اپنی شناخت کو اس حوالے سے گم کر دیتے ہیں کہ ان کی نظر میں اس کی کوئی وقت نہیں ہوتی اور نہ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ اس سے انہیں پہچانیں وہ اپنی شناخت کو گم کر دیتے ہیں اور بالآخر کسی دوسری شناخت کو بھی اپنانے کے قابل نہیں رہتے۔ ولی خان نے اپنے ماضی کے بیان میں اس ثقافت کے معراج کے مختلف پہلوؤں کا تفصیلاً بیان کیا ہے۔

> "میں صبح سویرے اٹھتا جندر کے پچھواڑے جا کر کھٹے میں ہاتھ دھوتا واپس آ کر ناشتہ کرتا اور سکول چلا جاتا۔ واپس آتا تو میرا باپ کھانا تیار کر رہا ہوتا۔ میری یاداشت میں کوئی بھی ایسا دن محفوظ نہیں جس میں اس نے میری واپسی سے پہلے کھانا کھایا ہو۔"(63)

مقامیت کا وصف یہ تھا کہ لوگ ایک مخصوص سماجی نظام میں رضا کارانہ طور پر جڑے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ان کی مشکلات کو آسان کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ ان رسموں سے وہ اپنے کام اجتماعی طور پہ کرتے فصل اگانے کا وقت ہو یا کٹائی کا مکانوں کی تعمیر ان تمام کاموں کو رضا کرانہ طور پہ مل جل کے کیا کرتا ہے۔ ان کاموں میں نہ کوئی معاوضہ تھا اور نہ ہی اس کا صلہ دینا پسند کرتا تھا۔ مقامی ثقافت میں مخصوص مقامی الفاظ میں ان موقعوں کے یا ان رسموں کے نام رکھے گئے ہیں۔ ناول نگار نے وضاحت سے ان عناصر کی بھی وضاحت کی ہے۔ ناول نگار نے ان مقامی تہواروں اور رسموں کے نام بھی مقامی الفاظ میں بیان کیے ہیں۔ جس سے اس مقامی ثقافت کو سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملتی ہے۔

> "لہتری، بہوچی اور اس طرح کی دوسری رضا کار تنظیموں نے لوگوں کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا تھا اور ان کے بغیر گاؤں میں کسی بڑے کام کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لوگ جنازے کو تو فرض کفایہ سمجھ کر چھوڑ دیتے تھے لیکن ان چیزوں پر فرض عین کی طرح عمل کرتے تھے۔ یہاں تک کہ گاؤں کے مولوی صاحب ان لوگوں کو تو معاف کر دیتے تھے جو صرف نماز عید پڑھنے سال کے بعد مسجد کا رخ کرتے ہیں لیکن لہتری سے غیر حاضر ہونے والے کو یوں دیکھتے جیسے وہ کافر ہوں۔(64)

جندر روئی اس تہذیب کا اہم کردار بلکہ اس کا آخری نمائندہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ ماضی کے بیان میں ان مقامی ثقافتی عناصر کی وضاحت کرتا ہے جو اس مقامیت کا اہم حصہ تھیں۔ مگر اب وہ ایسے مقام پہ ہے جہاں اس کے ساتھ ساتھ یہ ثقافت بھی مٹنے کے قریب ہے۔ گلوبلائزیشن نے جہاں انسان کی زندگی کو خارجی طور پہ پر سکون کیا ہے وہیں اس نے

انسان کو داخلی طور پہ تنہا بھی کر دیا۔ فرد کی شناخت بھی اس جدید عہد کا ایک اہم مسئلہ بن گئی ہے۔ جدیدیت کے اس تصور نے مقامی ثقافتوں کو مٹانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ گلوبلائزیشن کے تصور کے تحت ان تہذیبوں کا خاتمہ تیزی سے جاری و ساری ہے۔ اول اول تو اس کے اپنے مکین ہی جدیدیت کو گلے سے لگاتے ہیں۔ جب ان پہ حقیقت عیاں ہوتی ہے تو وہ اپنی شناخت بھی کھو چکے ہوتے ہیں۔

> "جندر اور جندروئی مقامیت کی وہ شکلیں ہیں۔ جنھیں جدیدیت اور عالمگیریت کے تحت پروان چڑھنے والی طاقتور زندگی اپنے فولادی بہاؤ میں بہا کر لے جا رہی ہے۔ چھوٹی چھوٹی رسموں سے لے کر عقیدوں اور تعصبات میں گندھا ہوا یہ ناول اپنے اندر مقامیت کے دلکش رنگ رکھتا ہے۔"(65)

جدیدیت کی آمد سے مقامیت بری طرح متاثر ہوئی۔ مشین نے انسانوں کی جگہ لے لی لوگوں کو سہولیات تو دیں مگر اخلاقی معاشرتی قدروں کا زوال بھی شروع ہو گیا۔ لوگ ایک مخصوص اجتماعی نظام سے کٹ کر انفرادیت کی طرف انحراف کرنے لگے۔ جدیدیت کے پردے میں مقامی ثقافتوں کی موت واقع ہونے لگی۔ ناول نگار نے اس مقامیت کے معدوم ہونے کا رونا رویا ہے۔ لوگ قدیم رسم و رواج کے لحاظ اور سماجی بندھن سے آزاد ہو گئے۔ نفع اور نقصان ذاتی مفادات کا کلچر بھی اس جدیدیت کی دین ہے۔ مقامیت کی اپنی مخصوص اقدار روایات معدوم ہونے لگی ہیں۔ اکیسویں صدی نے بیسویں صدی کے انقلابات میں بے تحاشا اضافہ کیا۔ زراعت اور دوسرے معاملات میں مشینوں کی بھرمار ہوئی۔ ان مشینوں کے آنے سے مجبوری کے وہ سارے بندھن بھی ٹوٹ گئے۔ جس کے تحت مقامی لوگ آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ مشینوں سے ان کا ایک دوسرے پہ انحصار ختم ہو گیا اور اجتماعیت کی وہ شکل بھی معدوم ہونے لگیں۔ ہزارہ کی مقامیت کے بیان میں جندروئی کا یہ بیان ہی نہیں ہمارے ہاں دیہاتوں میں رہنے والی اکثریت اسی نظام کے تحت زندگی گزار رہی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ اجتماعیت کا یہ نظام اس جدیدیت کی نذر ہوتا جا رہا ہے۔

> "ٹریکٹر اور ان سے وابستہ مشینوں نے آدمی کو پہلے زمین کی اور بالآخر آپس کی جڑت سے آزاد کر دیا۔ اب ہر آدمی آزاد اور خود مختار تھا۔ وہ جب چاہتا ٹریکٹر والے کو بلوا کر زمین بیچ ڈالتا اور جب چاہتا تھریشر کے ذریعے دانے اور بھوسا الگ کروا دیتا۔ یہ خود مختاری غیر محسوس طریقے سے لوگوں کی رگوں میں دوڑنے لگی اور لوگ ایک دوسرے سے کٹتے چلے گئے۔ اگلے چند سالوں میں شادی بھی اور ماتم کے لیے برتن بھی جو پہلے تمام گاؤں والوں کے گھروں سے اکٹھے کی جاتے ٹینٹ سروس کی دکانوں سے آنے لگے اور قبریں مزدوری پر کھودی جانے لگیں (66)"۔

لوگوں کے درمیان سماجی جڑت کا ذریعہ ختم ہونے لگا خود انحصاری نے نہ صرف لوگوں کو ان قوموں سے الگ کیا بلکہ ان تمام روایتی ثقافتی رسم و رواج سے بھی جدا کر دیا۔ روایات کا خاتمہ ہونے لگا، پرانے لوگوں کے ساتھ رکھ رکھاؤ اگلی نسلوں میں منتقل نہ ہو سکا۔ مقامیت کا تسلسل جمود کا شکار ہوتے ہوئے مٹنے کے قریب جا پہنچا۔

ناول میں جندر روئی کا بیٹا دراصل اس طبقے کا نمائندہ ہے۔ جو اپنی مقامیت سے دور ہونا چاہتے ہیں۔ ان کے ہاں روایتی اخلاقی قدروں، مقامی ثقافت اس کے عناصر سے انحراف یہی ان کی ترقی اور خوشحالی کا باعث ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایسے لوگوں کی وجہ سے مقامیت کا زوال بھی ہوتا ہے۔ راحیل کا کردار ایسے ہی کرداروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو نہ صرف اپنے ماضی اور اپنے آباواجداد سے بھی کسی طرح صرف نظر کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسے مقام کا حصہ بننا چاہتے ہیں جہاں سے ان کی ماضی کی شناخت معدوم ہو جائے وہ اپنے ماضی کی شناخت کو معلوم کر کے اپنی ایک الگ شناخت قائم کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اپنے اس رکھ رکھاؤ کو قائم کرنے کے لیے یہ بتانے سے گریز کرتا ہے کہ اس کا باپ ایک جندر روئی ہے۔

"جب کچھ عرصے پہلے جب مجھے دمے کا شدید دورہ پڑا اور وہ مجھے یہاں سے شہر لے گیا تو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا کہ ابا ڈاکٹر صاحب کو یہ نہ بتانا کہ آپ جندر روئی ہیں۔"(67)

"اب کی بار اس کے لہجے میں ایک افسر بول رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ خدارا میری عزت کا خیال کریں اب سے یہ سب چھوڑیں اور گھر بیٹھ کر اللہ اللہ کریں۔"(68)

اس کردار میں ان لوگوں کی نمائندگی ملتی ہے جو اپنی مقامیت سے انحراف کرتے ہیں۔ اس کے خاتمے کا خود ہی سامان کرتے ہیں۔ گلوبلائزیشن کے نرغے میں آکر وہ محض ترقی کی سڑھیاں ہی نہیں چڑھتے بلکہ اپنی اصل شناخت کو بھی کسی طور ختم کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ ٹریکٹر کو بھی گلوبلائزیشن کی علامت کے طور پہ دکھایا گیا ہے۔ ایک مشین کے آنے سے لوگوں کے درمیان صدیوں سے موجود قلبی رشتے کا خاتمہ ہوا۔ ان کے رسوم ورواج کا اختتام ہو گیا اور ان کے دلوں میں جو مہر و محبت چاہے اس کی بنیاد ایک دوسرے کی ہمدردی اور ایک دوسرے کی مدد کا محتاج ہونا کیوں نہ ہو ان کا خاتمہ ہو گیا۔ جدیدیت کی لہر نے انہیں چھوٹے مقامی ثقافتی گروہوں کی قدروں کو بری طرح پامال کیا جہاں زندگی سہل ہوئی وہیں ان کے دلوں میں بھی انسانوں کے بجائے مشینوں کی محبت نے لے لی۔ ناول کا مرکزی کردار اسی کا نوحہ بار بار پڑھتا ہے۔ اس معاشرے میں موجود اجتماعیت بڑے پیمانے پہ انفرادیت میں تبدیل ہو رہی ہے۔

"جندر روئی کا بیٹا خود اسی بستی کے امام مسجد کو بجلی سے چلنے والی چکی لگا کے دیتا ہے یوں ناول نگار ہلکا سا اشارہ دیتے ہیں کہ مقامیت کی موت دراصل انہی لوگوں کے ہاتھوں ہوتی ہے جو مقامیت سے فرار یا مقامیت کو اپنی شناخت بنانے سے گریزاں ہیں۔"(69)

ناول میں ایک طرف جندر روئی کا کردار ہے جو اپنی آخری سانسیں ایک جندر کی ہوک اٹھنے کے ساتھ ساتھ چلا رہا ہے اور جندر کی ہوک کے ختم ہونے سے اس کی سانسوں کا سلسلہ بھی ٹوٹ رہا ہے۔ جو اس مقامیت کا ایک آخری فرد ثابت ہوتا ہے تو دوسری طرف ناول نگار نے پن چکی کی جگہ بجلی سے چلنے والی چکی کو علامتی طور پہ بیان کر کے ایک

تہذیب سے دوسری تہذیب یا ایک ثقافت سے دوسری ثقافت کا بیان کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ محض مسئلہ ترقی یا جدیدیت کا نہیں ہے مسئلہ اپنی قدروں کے زوال اور اپنی اصل سے انحراف کا ہے۔

ناول میں مجموعی طور پر ہزارہ کی ثقافت کا محض بیان ہی نہیں ہے بلکہ اس ثقافت کے مٹنے یا معدوم ہونے کا بیان بھی ہے۔ جدید دنیا میں گلوبلائزیشن کے نرغے نے مقامی ثقافتوں کو بری طرح اپنی لپیٹ میں لیا ہے۔ ایسے میں مختصر ناول میں اس معدوم ہوتی ہوئی تہذیب کا بیان اختر رضا سلیمی کا ایک اہم کارنامہ گردانا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اس مٹتی ہوئی تہذیب کا نہ صرف بیان کیا بلکہ ہزارہ کی مقامیت سے اور اس کے عروج سے اردو ناول کے قاری کو بھی آگاہ کیا۔

> "اختر رضا سلیمی کا ناول جندر مقامیت کی دل آویز تشکیل کا نہایت عمدہ اور بھرپور نمونہ ہے۔ جندر کہنے کو تو ایک فرد کی داستان گزشتہ ہے۔ مگر فرد چونکہ سماج کا حصہ ہے تو فرد کے پس منظر میں مقامی سماج پوری آب وتاب سے موجود ہے۔ زندگی کے آخری لحات میں ایک جندروئی اپنے گزرے ایام اور ان سے منسلک اپنی تین نسلوں کو اختصار مگر پوری جامعیت سے کہانی کا حصہ بناتا ہے۔ اس ناول کے لوکیل سے لے کر اسلوب اور کرداروں سے لے کر جذیات سب پہ مقامیت چھائی ہوئی ہے۔"(70)

ناول میں مقامی ثقافت کا نوحہ جگہ جگہ ملتا ہے۔ جدید دنیا کے وسائل ان روایتی ثقافتوں کی شناخت کو ختم کر رہا ہے۔ مہابیانیوں کے اس دور میں اختر رضا سلیمی نے اپنے مقامی ثقافتی بیانیے کو ذریعہ اظہار بنایا جندروئی کا اپنی زندگی سے زیادہ اپنی تہذیب کے خاتمے کا دکھ ہے ناول میں خود کہتا ہے کہ:

> "میرا یہاں اس طرح مرنا صرف ایک انسان کی نہیں ایک تہذیب کی موت ہے۔"(71)

جندر مابعد جدیدیت کا نمائندہ ناول ہے۔ ناول کا مرکزی کردار خود ہی اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ وہ محض ایک جندروئی، محض ایک کردار ہی نہیں بلکہ ایک ثقافت، تہذیب کا علمبردار اور نمائندہ ہے۔ یہ اس تہذیب کا آخری فرد ثابت ہوتا ہے جو اس مقامیت کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے اور اس کا امین ہے۔ نئ نسلوں نے اپنی مقامی جڑوں سے انحراف کیا اور جدیدیت کے چکر میں اپنے ثقافتی ورثے کو خود ہی مٹا دیا۔ اختر رضا سلیمی کے اس ناول میں جہاں ہزارہ کی مقامی ثقافت کے مختلف خدوخال کا بیان ملتا ہے وہیں اکیسویں صدی میں بڑھتے ہوئے وسائل اور ٹیکنالوجی سے ان مقامی ثقافتوں کے مٹنے کے بھی اشارے ملتے ہیں۔

ادھ ادھورے لوگ کا موضوع وہی ہے جو مابعد جدیدیت کا منشاء ہے۔ عالمگیرت کی یلغار نے مقامی ثقافتوں کو معدوم کر دیا ہے۔ فرد اپنی شناخت کا متلاشی ہے۔ ناول میں بہاولپور کی مقامیت کا نوحہ ہے۔ بہاولپور صدیوں پرانی ایک خودمختار ریاست جہاں کا اپنی ثقافتی ورثا، سیاسی سماجی نظام اور تمدن تھا۔ ناول کا آغاز جولائی 1947ء سے ہوتا ہے۔ اس مختصر عرصے میں ناول نگار نے ناول میں بہاولپور کی مقامی ثقافت کے خدوخال کو واضح کیا ہے۔ ناول نگار نے بہاولپور کی

ثقافتی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ناول میں اس مقامیت کے مختلف ثقافتی عناصر کی مقامی کرداروں کے تناظر میں وضاحت ملتی ہے۔اس مخصوص خطے کی اپنی مخصوص پہچان اور ثقافتی شناخت تھی۔

ناول میں مقامی زندگی کے مختلف خدوخال کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔مقامی لوگوں کا طرز معاشرت ہو یا معیشت یا ثقافتی تہواروں اور مجالس کا بیان ناول نگار نے ہر قدم پہ مقامیت کو واضح کیا ہے۔ناول کا اگرچہ موضوع ہی بہاولپور کی مقامیت ہے ناول نگار نے محض بہاولپور کی مقامیت کے معدوم ہونے کا گریہ نہیں کیا بلکہ ناول میں بہاولپور کی مقامی ثقافت کے عروج کو بھی بیان کیا ہے۔ناول میں موجود کردار بھی مقامی کردار ہیں۔مختلف طبقوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے یہ کردار مقامیت کی بھرپور وضاحت کرتے ہیں۔یہ کردار مقامی رنگ میں رنگے مقامی ثقافت کے نمائندے ہیں۔ان کرداروں کے عمل میں مقامیت متحرک دکھائی دیتی ہے۔یہ کردار مختلف مذاہب طبقوں کے ہونے کے باوجود اپنی مقامی شناخت کے حامل ہیں اور ان کے معدوم ہونے کے بعد اسی کو تلاش کرنے میں سر گرداں ہیں مقامی رسم و رواج توہمات، ثقافت کے مختلف عناصر ان کرداروں کے ذریعے سے ناول میں مختلف موقعوں پہ بیان ہوئے ہیں۔

ناول میں خواتین اور مرد دونوں متحرک کردار ہیں۔دونوں کے بیان سے مقامی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت ہوتی ہے۔ایسی فرسودہ رسومات بھی جو مقامی ثقافت کا حصہ ہیں۔لوگ ان کی تقلید کرتے ہیں بالخصوص پرانی نسل کے لوگ ان کو توڑنے کو تیار نہیں ہیں۔وادھو کی ماں اور اس کی بیوی کے واقعات میں مقامیت کے اس ان ہی پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے۔وادھو کی ماں اس کی اولاد کی متلاشی ہے۔جو اپنی بہو کی عزت نیلام کرنے کو تیار ہے کیونکہ اس کا اپنا بیٹا قصوروار ہے۔ناول میں وادھو کی ماں اور بیوی کے قصے کے ضمن میں ایسے کئی عناصر کی ناول نگار نے وضاحت کی ہے اور ایسے منہ سے پردہ اٹھایا ہے جو عموماً صرف نظر ہو جاتے ہیں۔جعلی عامل لوگوں کو اپنے جال میں پھنسا کر ان کا مالی و جسمانی استحصال کرتے ہیں۔طاقت ور طبقہ کہیں جاگیر دار کے روپ میں ہے تو کہیں عاملوں اور پیروں کے روپ میں ان مقامی مظلوم لوگوں کا استحصال کرتا ہے۔ناول میں ان عناصر کا بیان یعنی کرداروں کے ضمن میں ملتا ہے ۔جن کی اپنی زندگیاں مذہب کے بالکل برعکس ہیں۔تاہم اس کے باوجود مقامی لوگ ان کی صحت پر اس قدر اعتبار کرتے ہیں کہ ان کے در پہ نہ صرف چلے آتے ہیں بلکہ وہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ان کا روپ مقامی ثقافت میں اس قدر بڑھ گیا ہے کہ لوگ اس کے خلاف جانے کو تیار ہونا تو در کنار ایسا سوچنے کو بھی اپنے لیے باعث گناہ تصور کرتے ہیں۔ان کی توہمات پرستیوں اور ضعیف الاعتقادیوں میں ان کی مفلوک الحالی بھی ہے۔اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔وہ اپنے دکھ درد اپنے مرضوں کا اور پریشانیوں کا علاج ان کے پاس کرانے جاتے ہیں۔جہاں ان کو مختلف قسم کے استحصال کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

"یار اپنی عورت کو کسی بھوپے کے پاس لے جا۔۔۔میں نے سنا ہے کہ مڑیچی والے بھوپے کو آٹا گھٹا دینے کے بعد اگر جمرات کی شام کو جن کھلاؤ تو سخت سے سخت گیر سایہ بھی جان چھوڑ دیتا ہے۔"(72)

سادہ لوح انسان معمولی مرض کو بھی جنات کا سایہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ بعض اوقات حقیقت سے چشم پوشی اور بسا اوقات غلط فہمی یا خوش اعتقادی ایسے عاملوں کے آستانوں کو بھر دیتی ہے۔ مقامی لوگ ان شعبدہ بازوں کی تعظیم بھی کرتے ہیں ان پر چڑھاوے بھی چڑھاتے ہیں۔ ناول میں بھوپے کا مقامی کردار بھی ایسا ہی ہے۔ جہاں لوگ اپنی جوان عورتوں کو بھی جنات سے نجات دلوانے لے جاتے ہیں۔ ناول نگار نے یہاں ایک حساس معاملہ چھیڑا ہے۔ انسان کی فطری خواہش کا ادراک جب درست انداز میں نہیں ہوتا تو ایسے بھوپے اپنے نفس کی تسکین میں احمد پور کے معاشرے سمیت دنیا کے ہر حصے میں جنم لے لیتے ہیں۔ جو ان کا استحصال کرنے کو موجود ہوتے ہیں۔ وادھو کی بیوی مہراں ہو یا کئی دوسری عورتیں ایسے پھولوں کے آستانوں پہ اپنی عصمت دری کا ماتم بھی نہیں کر سکتیں۔ جن کے وارث خود اس چتا میں انہیں جلنے چھوڑ جاتے ہیں۔ تو دوسری طرف مرد سماج میں برتری ثابت کرنے کی خاطر کوئی بھی الزام اپنے سر لینے کو تیار نہیں ہوتے بلکہ اس کا قصوروار بھی عورت کو ہی ٹھہراتے ہیں۔ اپنے گناہوں پہ پردہ ڈالنے کے لیے وہ بڑی آسانی سے انہیں دوسروں کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اولاد کے معاملے میں بھی عورت کا ہی گناہ شمار کیا جاتا ہے۔ اگر اولاد نہ ہو تو ایسے معاشرے میں عورت کا جینا دو بھر کر دیا جاتا ہے۔

"یہ پچیس چھبیس دوشیزائیں، مڑیچی والے بھوپے کے آستانے پر اپنا اپنا جن نکلوانے آئی ہوئی تھیں۔ نصف دائرہ بنائے بیٹھی ان جوان لڑکیوں کے ناآسودہ جسموں کے وسط میں بیٹھا بھوپا کچھ دیر کے بعد اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چابک دائیں بائیں گھمائے رہتا۔"(73)

ناول میں مہراں کا کردار مقامی عورت کا وہ کردار ہے جو اپنے جائز حقوق کے لیے بھی آواز نہیں اٹھا سکتی۔ وہ حق تلفی کے باوجود ظلم کا شکار ہوتی ہے۔ ایسی کئی عورتیں جن کے شوہر اپنے اندر موجود نقائص کو سماج میں سامنے نہیں لاتے بلکہ اس کا قصور عورت کے سر ڈال دیتے ہیں۔ وادھو کا کردار مقامی نوعیت کا ایسا ہی کردار ہے۔ وہ عورت پہ تشدد اس لیے کرتا ہے کہ وہ خود عورت کے قابل نہیں ہے۔ جب وہ اس سے اس کا حساب لیتی ہے۔ تو اسے جنات کا اثر ظاہر کرتا ہے۔ دوسری طرف ان کے لیے اس کے جذبات کی فطری تسکین سے زیادہ اپنی نسل کی بقاء کی فکر ہے۔ ناول نگار نے ایک ثقافتی رسم کا بھی تذکرہ کیا ہے جو اس مقامیت میں اس طرح موجود ہے۔ وہ عورت اپنے شوہر کی نسل کی خاطر اپنی آبروریزی کراتی ہے۔ مہراں کی ساس بھی اسے اپنے مقاصد کی بھینٹ چڑھاتی ہے۔ اس مقامی رسم کو تڈی کے نام سے پکارا جاتا ہے اصل مسئلہ یہاں بھی مرد کی عزت و ناموس کی خاطر عورت کی قربانی دینا ہے۔ چاہے اس کے استحصال کی کوئی بھی صورت ہو اس کے جذبات کی پرواہ یا فطری خواہش کی تسکین ملحوظ خاطر نہیں ہے بلکہ اپنے حسب و نسب کی

فکر ہے۔اپنے بیٹے کی عزت کی فکر ہے کہ اس کا قصور کسی کو معلوم نہ ہو۔آخر کار مرد کی برتری کو ہر صورت میں قائم رکھنا ہی مقصد ہے۔

"مہراں اگرچہ فیاض کی پکڑ میں ذہنی طور پر پکڑی جاچکی تھی مگر پھر بھی اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اسے اپنے شوہر کی گدی پر لابٹھاتی۔یہ چال تو اس کی ساس کی تھی جس نے اس کی سوچ میں جونک چمٹادی کے تڈی بدلنا بھی سماج کی مستوریت ہے۔جو عورت کو اپنے شوہر اور خاندان کا شملہ اونچا رکھنے کے لیے نبھانی پڑ جاتی ہے۔"(74)

ناول میں مقامی تہواروں کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔یہ محض مقامی تہوار ہی نہیں، مقامی ثقافت کے مراکز ہوتے ہیں۔ان تہواروں کو مقامی ثقافت میں خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔یہاں ثقافت کا اصل مظہر نظر آتا ہے۔ان تہواروں کو مقامی ثقافت کا مرکز بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔بہاولپور میں مقامی مزارات اور ثقافتی میلوں کی بھی کثیر تعداد موجود ہے۔اوچ شریف کا مقام خاص عقیدت کا حامل ہے۔بہاولپور کی مقامی ثقافت کا مرکز بھی ہے۔یہاں پہ منعقدہ میلوں پر لوگ دور دراز سے آتے ہیں۔ناول میں مقامی مزارات اور درگاہوں کا بھی تذکرہ ہے۔ان پہ ہونے والے ثقافتی پہلوؤں کا بھی ناول نگار نے احوال بتایا ہے۔ناول نگار نے ان میلوں کا تذکرہ کر کے گویا بہاولپور کی مقامی ثقافت کے بیان کو مکمل کر دیا ہے۔لوگ ان میلوں پر جہاں خرید و فروخت کرتے ہیں وہیں ان مقامی لوگوں کی تفریح کا سامان بھی ہو جاتا ہے۔اجتماعیت کہ یہ مقام مقامی ثقافت کے اہم مراکز بن جاتے ہیں۔چنن پیر کا میلا ہو یا اوچ شریف کا میلہ ایسے میلے مقامی ثقافتی تہوار کے طور پہ منائے جاتے ہیں۔ناول نگار نے اس کے بیان میں مقامی ثقافت کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔لوگ دور دور سے عقیدت اور محبت اور خلوص کے جذبات لیے ان میلوں میں شریک ہوتے ہیں۔یہ میلے ایک اہم معاشی سرگرمی کا بھی مرکز بن جاتے ہیں۔دور دراز سے آنے والے خرید و فروخت کر کے سامان اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں۔تاجروں کو بھی خرید و فروخت میں آسانی ہو جاتی ہے۔یہیں مقامی مصنوعات، مقامی لباس کا بھی پرچار ہوتا ہے۔وہ دور دراز دیہاتوں میں رہنے والے لوگوں کے لیے ایک اہم تفریحی مقام کی حیثیت بھی ان مقامات کو حاصل ہوتی ہے اور ان کے لیے باہر کی دنیا کو دیکھنے کا بھی ایک موقع میسر آجاتا ہے۔

"یہ اونٹوں کی قطاریں رنگلے کی وے اور کجاوں میں بیٹھی سجی سنوری جوان عورتیں کہیں کہیں کجاؤں سے جھانکتے ان کے بچے اور اونٹ کی باگ پکڑ کر آگے آگے بھاگتے جتوال۔میلہ دیکھنے کے یہ شوقین دور دور سے اونٹوں کی طویل قطاریں بنا کر چلتے ہیں اور پھر ایک آدھ منزل فاصلہ طے کرنے کے بعد جہاں کوئی چٹیل میدان دکھائی دیتا ہے وہیں اونٹ بٹھا کر روٹی مانی کے بندوبست میں جت جاتے ہیں۔"(75)

ان ثقافتی میلوں کی مقامی افراد کی زندگیوں میں بہت اہمیت ہے۔وہ ان میلوں پر اہتمام سے جاتے ہیں۔میلوں میں لگنے والے بازار میں سبھی چیزیں ان کی دلچسپی کا خاص سامان ہوتی ہیں۔مزارات پہ لگے میلوں میں بھی مذہبی اور ثقافتی رنگوں کو سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ناول میں مقامی تہواروں کا بھی تذکرہ ناول نگار نے کیا ہے۔جس سے اس کی ثقافتی

حیثیت کے ساتھ ساتھ ان کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے جیسا کہ ناول میں تذکرہ ملتا ہے۔ مقامی سطح پہ لوگ امن و امان سے رہ رہے تھے۔ مذہبی ہم آہنگی تھی تو ایسے میں لوگ سیر و تفریح کے موقع سے بھی حظ اٹھاتے ہیں۔ تنگ نظری کے بجائے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان کی خوشحالی اور مقامی تہواروں کے ساتھ جڑت بھی دکھائی دیتی ہے۔

> چنن پیر کے میلے کا چوتھا جمعہ ہوتا تو اُچ شریف کے میلے کا پہلا جمعہ شروع ہو جاتا جسے بوہاری (جھاڑو) والا جمعہ کہا جاتا۔ بوہاری کے بعد دوسرا جمعہ چھٹر کاؤ والا اور پھر چل سو چل پورے ساتھ جمعے۔ یہاں بھی چوتھے اور پانچویں جمعے کا میلہ بہت رش لیتا۔ اُچ کے میلے کے آخر تک اپریل کے دوسرے ہفتے میں احمد پور کا (بیساکھی) والا تین دن کا میلہ عظمت سلطان سئیں کے مزار کا ملحقہ میدان میں شروع ہو جاتا۔" (76)

مختلف میلوں اور مزارات کے تذکرے سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بہاولپور کے گرد و نواح میں بزرگوں، درویشوں اور پیروں سے گہری عقیدت و محبت کا جذبہ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ یہاں بسنے والے لوگوں نے اول دن سے ہی ان درویشوں اور مذہبی رہنماؤں کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا اور ان کو اپنے سر آنکھوں پہ بٹھایا۔ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کے عقیدت میں بھی اس قدر آگے بڑھ گئے کہ بعض خرافات بھی اس میں شامل ہو گئیں۔ اس کے باوجود ان مزارات کو مقامی ثقافت میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ اہم ثقافتی مرکز کا درجہ رکھتی ہیں۔ مقامیت کے بیان میں مختلف امور کا تذکرہ ناول کے کرداروں کے ضمن میں ملتا ہے۔ ناول میں مقامی لوگوں کے رسم و رواج کھانے پینے کی وضاحت دکھائی دیتی ہے۔ ریاست کے لوگ قدرے خوشحال اور پر امن ماحول میں رہ رہے تھے۔ جب امن کی صورتحال ہو تو لوگوں کی زندگیوں کا ڈھنگ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان کی معاشی فکر قدرے کم ہو جاتی ہے۔ ناول میں مقامی لوگوں کے کھانوں، لباس اور مختلف امور کا تذکرہ ملتا ہے۔ مقامی ثقافتی رنگ کھانوں ان کے برتاؤ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مقامی بازاروں کی رونقوں میں ناول نگار نے بہاولپور کی مجموعی مقامی ثقافت کے پہلو کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

> "قیمے کی ٹکیاں آلو اور املی کی ٹکی والے پکوڑے، سیخ کباب، کلیجی کی بھنی ہوئی بوٹیاں سری پائے، اوجھڑی، پکوڑے اور دال مونگ کی ریڑیوں نے انتشار برپا کیا کہ لوگوں کا گزرنا محال ہو گیا۔ ریاست کے دیگر شہروں کی طرح احمد پور میں بھی شام کو کھانا پکانا خواتین کے لیے سستی اور عذاب سے کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے شوہر عموماً گھر جاتے ہوئے اس کوشش میں ہوتے کہ شام کا کھانا بازار سے لیتے جائیں۔" (77)

فیاض ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس کردار کے ذریعے ناول نگار نے مٹتی ہوئی تہذیب اور ثقافت کو بیان کیا ہے۔ بہاولپور کی اپنی پہچان سیاسی فیصلوں کی نظر ہو کر معدوم ہو جاتی ہے۔ تاہم فیاض اور اس جیسے کئی افراد اپنی مٹتی ہوئی مقامی شناخت کو حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی تک داؤ پہ لگا دیتے ہیں۔ فیاض اپنی کھوئی ہوئی شناخت کو حاصل کرنے لئے اپنی زندگیاں قربان کر دیتے ہیں۔ فیاض کے کرداروں میں ناول نگار نے پوری ریاست کی عوام کی شناخت کے

بحران کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ وہ لوگ جو اپنی مخصوص ثقافتی تہذیبی پہچان رکھتے تھے۔ ان کی اس مقامی پہچان کو فوراًہی ختم کر دیا گیا۔ فیاض اپنی شناخت کی تلاش میں سر گرداں ہیں۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی شناخت کو حاصل تو نہیں کر سکتا تاہم اس مٹی میں مل کر وہ امر ضرور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے حکیم رام لال کے بیان میں بھی ناول نگار نے اسی امر کی طرف نشاندہی کرتا ہے کہ جو اپنی دھرتی کو چھوڑنے کو تیار تو نہیں تھے بوجہ مجبوری وہ اس کو چھوڑنے کو تیار تو ہو گئے۔ اس کے باوجود وہ اس مٹی کا ہی پیوند بنے۔ ناول کے آخر میں ناول نگار کا اس گڑے میں سے تین لاشوں کا نکلنا اسی امر کی طرف نشاندہی کرتا ہے کہ یہ لوگ اپنی مٹی کی شناخت کی تلاش میں اسی مٹی کا حصہ بن کے امر ہو گئے۔

"فیاض جیسا کردار تمام عمر اپنی شناخت اور اپنی دھرتی کا متلاشی رہا لیکن اس کے ساتھ اس کی شناخت بھی ادھا دھوری سی رہی، اس کا سفر شناخت سے شروع ہوا اور شناخت پر اختتام ہوا"۔(78)

حکیم رام لال اس کی بیٹی اور بیوی کی موت کا سراغ بھی اچانک ناول کے اختتام میں ملتا ہے۔ گویا یہ کردار بھی اپنی شناخت سے محروم ہونے کے باعث نئی شناخت کی تلاش کو زیادہ دیر جاری نہ رکھ پائے اور اپنی ہی مٹی میں جا ملے۔ حکیم رام لال ہو یا فیاض یہ تمام کردار اپنی ثقافت سے محبت کرنے والے کردار ہیں۔ ان کے بیان سے جہاں مقامیت واضح ہوئی وہیں انہوں نے اپنی معدوم ہوتی شناخت کے لیے جان بھی دے دی۔ ان کرداروں کے بیان میں ناول نگار نے ہجرت کے سانحے کا بھی مختصراً تذکرہ کیا ہے۔ مگر دوسرے ناول نگاروں کی طرح انہوں نے ہجرت کا روگ نہیں رویا بلکہ ایک اہم موضوع بہاولپور کی مقامی شناخت کے مسئلے کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس حوالے سے اردو ناول میں یہ اپنی نوعیت کا ایک اہم اور نمایاں تجربہ ہے۔

"ناول کے ادھ ادھورے لوگ ایک دوسرے کے سنگ دوڑتے دوڑتے قلعہ ڈیرے سے چند میل آگے ریت کے ٹیلوں پر پہنچ کر ایک دوسرے میں مدغم ہو کر کہانی مکمل کر دیتے ہیں۔"(79)

بہاولپور کی ثقافت کا تفصیلاً بیان ناول ادھورے لوگ کا بنیادی موضوع ہے۔ جو اپنے طور پہ اردو ناول کا ایک اہم اضافہ ہے۔ بہاولپور کے مقامی ثقافت کو اس قدر فراستِ نگاہ سے دکھایا گیا ہے کہ اردو ناول کا قاری پہلے آشنا نہ تھا۔ ناول میں محض معدوم ہوتی تہذیب کا نوحہ یا ہجرت کا موضوع نہیں بلکہ اصل مسئلہ شناخت کے بحران کا مسئلہ ہے۔ ناول نگار نے بہاولپور کی مقامیت کو موضوع بحث بناتے ہوئے باقی ضمنی مسائل کا بھی تذکرہ ناول کے مقامی کرداروں کے ذریعے سے کیا ہے۔ ناول میں مختلف جہتوں کے حوالے سے گفتگو ملتی ہے۔ جس میں سے سب سے اہم مسئلہ گمشدہ شناخت کا مسئلہ ہے۔

انواسی میں بہاولپور کی ایک بستی آدم واہن کا قصہ ہے۔ اس بستی کے ذریعے ناول نگار نے مقامی زندگی کو بیان کیا ہے۔ بہاولپور قیام پاکستان تک ایک خود مختار حیثیت کی مالک ریاست تھی۔ حفیظ خان کے ناول "انواسی" میں اس مقامی بستی کے ذریعے اس عہد کے سماجی معاشی اور ثقافتی حالات کو بیان کیا ہے۔ یہ بستی علامتی بستی بھی ہو سکتی ہے

جو اپنے ارد گرد کے معاشرے کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس بستی میں رہنے والے لوگ ایک مکمل ثقافتی ورثے کے مالک ہیں۔ انو اسی کا نام ہی مقامی نوعیت کا ہے ناول کا عنوان ایک مقامی لفظ پہ ہے۔ ناول میں موجود اس مقامیت کے گرد ناول کے مقامی کرداروں کے ذریعے کہانی چلتی ہے۔ مقامیت کے تصور پہ قائم اس ناول کے عنوان کے بارے میں منیر فیاض رقم طراز ہیں۔

"سنگری اس ناول کی انواسی ہے۔ انواسی ایسی عورت کو کہتے ہیں جس کی بکارت زیادتی کے نتیجے میں زائل ہوئی ہو۔ انواسی ایسی عورت کو بھی کہتے ہیں جس کے ایک سے زائد مردوں کے ساتھ تعلقات ہوں۔"(80)

ناول کا مرکزی نسوانی کردار سنگری ہے۔ ناول نگار نے عورت کی معاشرتی حیثیت اس مقامیت کی ذیل میں بیان کی ہے۔ سنگری محض اس ناول کی ہیرون ہی نہیں اس مقامی ثقافت میں عورت کا نمائندہ کردار ہے۔ پدر شاہی سماج میں ایسا معاشرہ جو اپنی قدیمی روایات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اور عورت کو کمزور ثابت کر کے اس کا استحصال مختلف صورتوں میں کرتا ہے۔ سنگری ایک ایسے معاشرتی نظام کی عورت ہے جس کا بچپن میں ہی کسی لڑکے سے نکاح کر دیا جاتا ہے۔ اس ثقافتی رسم کی وجہ کوئی بھی ہو اس کی بھینٹ عورت ہی چڑھتی ہے ہر صورت میں پابندی کا طوق اس کے گلے کا مقدر بنتا ہے۔ دوسری صورت میں اس معاشرے میں عورت اس قدر غیر محفوظ ہے کہ اس کو اغوا اور اس کی خرید وفروخت کا معاملہ بھی کوئی انوکھا واقعہ نہیں بلکہ بسا اوقات اس کو مردانگی کے جوہر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مقامی ثقافت کے ضمن میں اس مقامیت میں ایسے رسم و رواج موجود ہیں۔ بچپن سے اسے کسی نام کی امید میں جینا ہے تو دوسری طرف مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ وہ عورت کو کسی کے ساتھ منسوب کر کے اس کی عزت وآبرو کی حفاظت کو یقینی بنانا چاہتے ہیں۔ جس کی بربادی کا انہیں خدشہ ہے۔ ان کی کمزوری اور بے بسی ان کو بس یہ ہی راستہ سجھاتی ہے۔

"اس قسم کے سماج میں جہاں شادی کے لیے لڑکے کا حصول "ٹکے" یا "وٹے" کے بغیر ممکن نہ ہو وہاں اسے دلہن کا درجہ مقامی رواجی قانون کے تحت دیا جاتا ہے۔ یعنی ایسی متوازی دولت جس کے بدلے یا جس کے بل بوتے پر خریداری یا بارٹر ڈیل ممکن ہو سکے۔ لہذا اپنے دھن کی حفاظت کرنے میں امکانی طور پر ناکام والدین اسے پرایا دھن قرار دے کر جلد از جلد وہاں سونپنے کی کوشش کرتے ہیں۔"(81)

مقامیت کے ان امور سے عورت کے تصور سے بھی آگاہی ملتی ہے۔ سنگری بھی رسم بد کا شکار ہو کر اپنی عزت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس کی عصمت دری کا باعث بننے والا بھی اس کا اپنا محافظ سیدا ہوتا ہے۔ بعد ازاں وہ اپنے تحفظ کے لیے مولوی جار اللہ کے پاس پناہ لینے پر مجبور ہوتی ہے وہ اپنی عمر سے کئی گنا زیادہ عمر کے آدمی کے نکاح میں اس لیے جاتی ہے کہ اس معاشرے میں وہ اپنی زندگی کو اور نہ ہی اپنی عزت کو محفوظ کر سکتی ہے۔ وہ ایسے مرد کی تحفظ میں جانا چاہتی ہے جو اسے تحفظ فراہم کرے۔ اس کی معاشی ضروریات کے ساتھ ساتھ جس کی عزت کا بھی محافظ ہو کہ وہ ایک

محفوظ زندگی گزار سکے۔ سنگری جیسی خوش شکل لڑکیوں کا ایسے معاشروں میں اپنی زندگی کو اچھے ڈھنگ سے اور عزت کا مقام پانے کے لیے کسی بااثر فرد کا تحفظ ضرور چاہیے ہوتا ہے۔

"سنگری برصغیر میں صدیوں سے موجود عورت کی مثالی تصویر کی اگر نفی نہیں بھی ہے تو اس میں ایک بڑا انقلاب ضرور ہے۔ عورت کا یہ کلاسیکی تصور بنیادی طور پر ہندی اساطیر کے کرداروں رتی اور سیتا سے تشکیل ہوتا ہے۔"(82)

عورت کے تصور کے ضمن میں ناول میں سنگری کا کردار عورت کے مقام کے حوالے سے ناول میں مکمل تفصیل موجود ہے جو تانیثیت کے ضمن میں ایک اہم اضافہ ہے۔ مقامی ثقافتی عوامل کے ضمن میں عورت کی معاشرتی حیثیت کا مختصر اًحوال سے اس مقامیت میں عورت کی حیثیت کا علم ہو جاتا ہے۔اس بستی آدم واہن میں مقامی اعتبار سے لوگوں کے سماجی میل جول مرکزیت ایک مرکزی کردار کو حاصل ہے۔ ناول نگار نے مقامی کرداروں کے ذریعے مقامی ثقافت کے مختلف عوامل کو بیان کیا ہے۔ان مقامی کرداروں میں ذات پات کے تفریق سے زیادہ ان کی پہچان ان کا اہم حوالہ ہے۔ مخصوص طبقاتی فرق ان کی پہچان میں اہم حوالہ بن جاتا ہے۔ روائیتی طبقاتی نظام کی آویزش یہاں دکھائی دیتی ہے۔ مذہبی ثقافتی میلے اس ثقافت کے اجتماع کا ایک اہم موقع اور ذریعہ ہے۔ جہاں اس مقامیت سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ مقامی ثقافت میں میلوں کے بیان میں مذہب کے ساتھ ساتھ ثقافت کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ مقامی ثقافت نے مذہبی تصورات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔اس کے بیان میں ناول میں زندہ پیر کرامت کا مزار جس کے عقیدت مند مختلف مذاہب کے لوگ ہیں۔ان تمام مذاہب کے لوگوں میں عقیدت کے جذبات کا اظہار مقامی ثقافت میں موجود یکجہتی کی مثال بھی ہے۔اس ثقافت کی معراج بھی مقامی ثقافت کا اظہار اس جگہ پہ بہتر انداز میں ہوتا ہے۔ان مقامی پہلوؤں میں ثقافت کا پرچار زیادہ ہوتا ہے۔زندہ پیر کرامت کے بیان میں بھی ثقافت کا پہلو سر دست ہے۔ جسے ہر مذہب نے اپنے مذہب کے رنگ کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

"مسلمانوں کے علماء، ہندوؤں کے پنڈت اور بدھ مت والوں کے بھکشوؤں نے علیحدہ علیحدہ محفلیں جمار کھی تھیں مسلمانوں کے ہاں قوالیاں ہندوں کے ہاں بھجن اور بھکشوؤں کی محفل میں ان کے مذہبی مناجات کے رنگ جمائے ہوئے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ ہر مذہب کے مذہبی رہنما مذہبی موسیقی کے وقفوں میں وعظ و تلقین کی محفل سجا لیتے۔ جہاں ان کے مخاطب بستی آدم واہن اور اس کے قرب وجوار کے نوجوان ہوتے۔"(83)

زندہ پیر کرامت کا سالانہ عرس ان تمام مقامی لوگوں کے لیے ایک اہم ثقافتی گٹھ جوڑ تھا۔ جہاں مختلف مذاہب کے لوگ اپنے مذہبی رنگوں کے ساتھ حاضر ہوتے ۔مذہبی اور ثقافی سرگرمیوں کا خوبصورت امتزاج ہوتا۔انگریزوں نے جب بستی آدم واہن کے قبرستان کو ریلوے ٹریک بچھانے کے لیے اجاڑا تو اس ثقافتی ورثے کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ مسلمانوں کی قبروں پہ آنے والے درویشوں کو بھی نہ چھوڑا۔ نہ تو قبریں رہیں اور نہ ان پہ آنے والے

مجاور۔ ترقی کے نام پہ ہونے والی اس تبدیلی نے مقامی لوگوں کی ثقافتی ورثے کو مٹانے کا حربہ آزمایہ۔ مقامیت کا زوال ان کی ٹیکنالوجی کے ہاتھوں ہو گیا۔ یہاں ترقی سے زیادہ اپنے مقاصد کے حصول اور اپنی ثقافت کی آفرینش کے خواہشمند تھے۔اس جدید ثقافت کے ہاتھوں مقامیت کو زوال آگیا جسے وہ فرسودہ کہہ کے مٹاتے ہوئے اس کا قصور بھی ان کو ہی دینے لگے۔

"محمد حفیظ خان کے ناول انواسی میں 1872ء کے واقعات بیان کیا گیا ہے۔ ناول کے قصے میں جب برطانوی استعمار کے ہاتھوں مقامیت برباد ہو گئی یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کی حامل جدید ثقافت نے قدیم ثقافت کو شکست دے دی۔"(84)

مقامی ثقافت کو اجاڑ کر استعماری قوت اپنی بنیاد مستحکم کرتی ہے۔ ناول میں بظاہر بستی آدم واہن کے لوگوں کا رویہ ایسا دکھایا گیا ہے۔ وہ اپنی قدامت میں اس قدر خوش ہیں۔ وہ اس خستہ حالی کو تبدیل کرنے پہ نہ تو راضی ہیں اور نہ ہی اس کی اجازت کسی اور کو دیتے ہیں۔ ناول میں استعماری بیاری قوتوں کے غلبے اور محکوم لوگوں پہ طاقت کے لیے بے دریغ استعمال کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اپنے مقاصد کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو ہٹانا ان کے لیے مشکل نہیں ہے۔ مقامی لوگ ریل تک سے نہ واقف ہیں اور ان کے پر آسائش کیمپوں کا تصور ان کے ہاں ان کے نوابین کے ہاں موجود سہولیات اور آسائشوں سے بھی کہیں بڑھ کے ہے۔ ان مقامی لوگوں کے لیے ان اجتماعی قوتوں کے ساتھ ٹکر لینے کا جواز نہیں ہے۔ وہ ان کی حاکمیت کو قبول کر بیٹھے ہیں جیسا کہ ان کے وڈیروں اور نوابین نے کیا۔ تاہم وہ اپنے عقیدوں اور ثقافت کو مسمار ہوتے نہیں دیکھ سکتے وہ کمزور ہوتے ہوئے بھی اپنے ثقافتی، مذہبی اقدار کے تحفظ کی ناتواں کوشش ضرور کرتے ہیں۔ وہ اس ورثے کی خاطر تڑپ ضرور رکھتے ہیں۔ سیدا اور ان کے ہم خیال نوجوان اس ورثے کی بقاء کے لیے اپنی جان تک گنوا دیتے ہیں۔ ان کی مزاحمت اگرچہ کمزور ثابت ہوئی استعماری قوتوں کی بندوقوں کا مقابلہ ان کی تلواریں اور برچھیاں نہ کر سکیں۔ اس کے باوجود وہ اپنی مقامی ثقافت کے لیے اور اپنے مذہبی اور تاریخی اقدار کو بچانے کے لیے کسی بھی مصیبت سے ٹکرا جانے کا حوصلہ ضرور رکھتے تھے۔

"یہ کیسے لوگ ہیں جو اپنے کیے کو دوسروں کے سر تھوپ کر ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ تبدیلی یہ خود نہیں چاہتے اور اس کا الزام ہم لوگوں کو دیتے ہیں کہ ہم ترقی نہیں چاہتے بھلے سے ترقی کرو۔ جو چاہے کرو مگر ہمارے ماں باپ اور اجداد کی قبروں کو مسمار کر کے نہیں۔"(85)

ایک ایسا مقامی زرعی معاشرہ جو اپنی روایات پہ قائم تھا۔ ان کا رہن سہن سادہ ہے مقامی اشرافیہ نے جاگیرداروں اور زمینداروں نے ان کو اپنا ماتحت بنا رکھا تھا کہ وہ ان کے تجوریاں بھرنے کے کام آتے ہیں۔ ان کے بغیر معاوضہ غلامی کرتے ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ ایسے میں استعماری قوتوں کے ہمنوا اور وفادار بن گئے ہیں ۔وسائل سے محروم یہ لوگ بھی براہ راست ان نو آبادکاروں کا ہی نشانہ بنے۔ ناول میں دکھایا جانے والا منظر اکیسویں

صدی اور بیسویں صدی کے اختتام پہ زیادہ زور آور ثابت ہوا بڑی ثقافتیں جنگ سے ہٹ کر دوسرے طریقوں سے مقامی ثقافتوں کو مٹانے کے حربے آزما رہی ہیں۔ مقامی ثقافتوں کو اب بھی فرسودگی سے تعبیر کر کے مٹایا جا رہا ہے۔ اس کے بدلے ٹیکنالوجی سے لیس ثقافتوں کو مسلط کیا جا رہا ہے۔

"محمد حفیظ خان کے تاریخ کے ایسے دور کا انتخاب کیا جہاں ایک طرف ایک ایسا زرعی معاشرہ ہے۔ جس میں Pimitive معاشرے کے انسان کی تہذیب کی باقیات دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ معاشرہ مذہبی توہم پرستی اور قبائلی طرز کی سماجی طاقت کے زیر اثر ہے۔ اس معاشرے میں مذہبی اشرافیہ بھی بہت طاقتور ہے۔ دوسری طرف استعماری طاقتیں ہیں جو صنعتی قوت کے بل بوتے پر اس تہذیب کے وسائل کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہیں اور شناخت کو مٹانا چاہتی ہیں۔ پہلی تہذیب کا ماقبل پتھر کے عہد کا انسان ہے اور دوسری تہذیب کا (مابعد) آج کے صنعتی دور کا ہے۔ درمیان میں 8 انواسی ایسی جغرافیائی اور زمانی اور اکائی بنتا ہے۔ جہاں ایک عہد دوسرے کو کچل کر آگے بڑھتا دکھائی دے رہا ہے۔ اکیسویں صدی میں یہ منظر نامہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔"(86)

بستی آدم واہن کے ان کرداروں کی زندگی کے معاملات ہوں یا رسم و رواج مقامیت کے زیر اثر پروان چڑھتے ہیں۔ مولوی جار اللہ کی ہلاکت کے بعد اس کے جانشین اور وارث کی وراثت کی تقسیم کا مسئلہ بھی مذہبی قانون کے مطابق نہیں بلکہ مقامی ثقافت کے تحت حل کیا گیا۔ مقامی ثقافت کے اثرات اس قدر گہرے ہوتے ہیں کہ ان کو مذہب کے تصورات بھی معدوم نہیں کر سکتے۔ مقامی قانون کی عملداری ہی زیادہ ہوتی ہے بلکہ قانون بھی اس معاشرے کے معاملات کے معیارات رجحانات کو مد نظر رکھ کر ہی بنائے جاتے ہیں۔ ان چھوٹے ثقافتی گروہوں میں تو قانون کی عملداری سے زیادہ روایات کا پاس زیادہ رکھا جاتا ہے۔ روایات کے خلاف جانا قانون شکنی سے بھی زیادہ برا خیال کیا جاتا ہے۔ ان روایات کا پاس اس قدر مقدم ہوتا ہے کہ روایت شکنی کرنے والوں کو مقامی سطح پہ ہی سزا اور جزا کے عمل سے گزار لیا جاتا ہے۔ مقامی ثقافتوں کے منفی اور قدامت پسند خیالات کے ساتھ ان مثبت پہلوں کی آبیاری بھی ملتی ہے۔ ہمارے ہاں ابھی تک پڑھے لکھے جدید معاشرے میں بھی عورت کو وراثت میں حق نہیں دیا جاتا اور نہ ہی اس کو برا خیال کیا جاتا ہے۔ شادی کے موقع پہ جہیز جیسی رسم بد کی پاسداری کی جاتی ہے۔ تاہم صاحب حیثیت لوگ بھی بیٹی کی رخصتی کے بعد اس کا کسی چیز میں حق تصور نہیں کرتے۔ یوں کہا جائے کہ اکیسویں صدی کا زمانہ بھی قدیم ہندو ثقافت کے زیر اثر ابھی تک ہے۔ تو بے جا نہ ہو گا مولوی جار اللہ کے مرنے کے بعد اس کی وراثت کو بھی مقامی رواج کے مطابق اولاد کے لحاظ سے تقسیم کیا گیا۔

"بستی آدم واہن میں وراثت مطابق شریعت نہیں بلکہ تخت رواج پگ ونڈی ہی تقسیم ہوتی آئی ہے۔ اس لیے مولوی جار اللہ کی وراثت بھی پگ ونڈ کے مطابق ہو گی کہ جس میں صرف مرد وارثان ہی وراثت کے حقدار ہوں گے۔ اور چونڈا ونڈ کی طرح نہیں کہ جہاں خواتین بھی وراثت کا حق رکھا کرتی ہیں۔"(87)

ناول میں مقامی سطح پہ ایک دوسرے کی شناخت قبیلوں اور ذاتوں سے دکھائی گئی ہے۔ نام کے ساتھ اس کی پہچان کے لیے اس کی قوم یا پیشہ منسوب کیا گیا ہے۔ ناول میں یہ تمام مقامی کردار ہیں۔ ان میں سے برتری مولوی کے گھرانے کو ہے جو با اثر بھی ہیں۔ ناول میں ایک عجیب صورتحال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دریا ستلج میں سیلاب آتا ہے۔ اس سیلاب نے پورے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ موت کا خوف تمام امور پہ حاوی ہو جاتا ہے۔ جب زندگی کے امکانات معدوم اور موت کا تصور روشن ہوتا جا رہا ہو تو زندگی سے جڑی چیزوں کا تصور بھی ماند پڑتا جاتا ہے۔ اچانک بستی آدم واہن کے لوگوں پہ موت کا تصور غالب آ گیا۔ ہر کوئی اپنی بقا کے لیے دوڑ رہا تھا۔ قدرت کے اس نظام نے حالات کو پلٹ دیا۔ صاحب حیثیت مولوی بخشو بھی اپنی جان کو بچانے میں زیادہ مصائب کا شکار ہوا کیونکہ وہ اپنی طاقت کے بھروسے پہ قائم تھا جبکہ دوسرے لوگ اس معاملے میں فراست زیادہ دکھا گئے۔

> "ملا بخشو حیران ہو رہا تھا کہ بستی کے سارے کمیوں اور چھوٹی ذات کے لوگوں نے ان کی پرواہ کیے بغیر بستی کے قریب سبھی اونچے ٹیلوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب آنکھوں کے ڈھیلے سفید کیے انہیں خوار ہوتے دیکھ رہے تھے۔۔۔ اگر کوئی کیل کٹانا، کمہار، یا چمار مولویوں کی حویلی کے پاس سے گزرتا اور باہر موجود ملا خاندان کے کسی فرد کو روکنے پر بھی نہ رکتا تو وہ سب حیرت سے ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھتے جیسے قیامت کے دن کے کا دن رات میں اتر آیا ہو۔"(88)

ناول کے آخری حصے میں اچانک سیلاب کا آنا اور اس سے قبل استعماری قوتوں کے ذریعے مقامی لوگوں کو پست کر دینا۔ دونوں امور ایسے ہیں جو مقامی ثقافت کو مٹانے کا باعث بنتے ہیں۔ مقامی ثقافت کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا اور پھر سیلاب سے اس کا مٹ جانا دراصل اس مقامیت کے زوال کے نشانات ہیں۔ استعماری قوتوں نے اپنے غلبے کو مضبوط اور طاقتور کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے، ٹیکنالوجی اور جدید ثقافت کے تصور سے مقامی ثقافتوں کو زیر کر کے ختم یا معدوم کر دیا۔ ان لوگوں میں چھپے احساسِ کمتری کو مزید طاقتور کیا۔ جو انہوں نے ان کے مسائل پہ قابض ہو کر قائم کیا تھا۔ مقامی اشرافیہ کا بھی اس میں اتنا ہی عمل دخل تھا جنہوں نے ان لوگوں کو پسماندہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ وہ ان کے ہمیشہ محتاج رہے۔ ناول کے اس آخری حصے میں موت کا تصور دیکھا گیا ہے کہ موت کا غلبہ انسان کو ثقافت، رسم و رواج، حیثیت، نام اور چیزوں سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد باقی تمام تصورات معدوم ہو جاتے ہیں ۔ مقامی لوگ اس کا شکار ہوئے۔ بچ جانے والے لوگوں کو بعد ازاں خیموں میں رکھا گیا اور ان کے کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا خیموں میں آباد ہونا ایک نئی ثقافت کا آغاز ثابت ہوا۔

مقامی ثقافتی بیانیہ اکیسویں صدی کے پاکستانی ناول کا اہم وصف بنتا جا رہا ہے۔ اکیسویں صدی میں ناول نگاروں نے بہت حد تک اپنے مقامی بیانیے کی طرف انحراف کیا۔ ایسی ہی ایک مثال نیلی بار کی بھی ہے۔ نیلی بار میں طاہرہ اقبال نے بار کے علاقے کی ثقافت کو ناول میں بیان کیا ہے۔ وسطی پنجاب کے ایسے علاقے جو دریا کنارے آباد ہیں۔ ان

علاقوں میں خوشحالی کی امید میں دوسرے علاقوں کے بھی لوگ آبسے جو اب مقامی لوگوں سے زیادہ ترقی کر گئے اور ایک طبقہ وہ تھا جو قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے یہاں آبسا۔ان باہر سے آنے والے طبقوں نے مقامی لوگوں سے کسی قدر زیادہ ترقی کی۔ناول کا کینوس کئی دہائیوں کے ساتھ ارتقائی سفر طے کرتا ہے۔ناول میں وقت کے ساتھ ساتھ ملکی سطح کے بیانیہ بھی ہے۔اصل مدار اسی مقامی بیانیہ کے گرد ہی گھومتا ہے۔ان مقامی لوگوں کے رہن سہن، بود و باش، رسم و رواج، ثقافت کا عکاس یہ ناول اس مقامیت سے اردو قاری کو روشناس کراتا ہے۔جو اس ناول سے قبل اس علاقہ کے بارے میں زیادہ نہ جانتے تھے۔نیلی بار کے علاقے کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر محمد ہارون لکھتے ہیں کہ:

> "نیلی بار کے منظر نامے کو سمجھنے کے لیے وسطی پنجاب کے جغرافیہ سے آگاہی بہت ضروری ہے۔بار اس گھنے جنگل کو کہتے ہیں جو نو آبادیاتی دور میں بننے والے نہری نظام سے قبل دریاؤں کے دوران واقع ہوتا تھا۔اس طرح کی باریں وسطی پنجاب کے مختلف علاقوں میں موجود ہیں۔جن میں نیلی بار، گنجی بار، سندل بار، گوندل بار اور کٹھرانہ بار شامل ہیں۔نیلی بار وسطی پنجاب کا وہ علاقہ ہے جو دریائے راوی اور دریائے ستلج کے درمیان واقع ہے۔"(89)

نیلی بار کے اس علاقے کی ثقافت کو ناول میں بیان کیا گیا ہے۔اس ثقافت کی تمام جزئیات ناول میں موجود ہیں۔ناول میں مقامی ثقافت کو عہد باعہد مختلف تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ناول کا بیانیہ 1950ء کی دہائی سے اکیسویں صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ناول میں مقامی لوگوں کے ذریعے اپنی پستی کے باوجود اس ثقافت کے امین ہیں۔اس ثقافت کے بیان میں ان مقامی لوگوں کی لاچارگی بھی عیاں ہوتی ہے۔جو اس خطے کی اصل وارث ہونے کے باوجود تہی دست ہی رہتے ہیں۔مقامی جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ باہر سے آنے والے مہاجروں اور ذیلداروں نے بھی انہی پر حکم چلایا۔ناول کے آغاز میں ہی اس المیہ کا جواز ناول نگار نے کچھ اس انداز میں بیان کیا کہ:

> "باہر سے آنے والے گکھڑ، ایوان، راجے، ملک اور چوہدری کہلانے والے یہاں ایسے آئے جیسے کبھی یہاں آریا حملہ آور ہوئے تھے اور دراوڑ اور کول نسلوں کی چپٹی آنکھوں میں نکیل ڈال کر انھیں شودر اور راکشس بنالیا تھا۔اب پھر سے اس بار کی یہ قدیمی باشندے یہ دراوڑ اور کول نسلیں مزارعے اور گولے باندھے بنالیے گئے اور مسلی اور چوہڑے کہلائے۔ان سیاہ موٹے چمڑے والے لنگوٹ کسے غلام جسموں پر کمی کمین کے ٹھپے ثبت کر دیے گئے۔"(90)

ناول میں طبقاتی نظام اور ایک ایسے نظام کا حوالہ بھی ملتا ہے جو خاص اس حدود میں قائم تھا۔جاگیردارانہ سماج میں اس ثقافت کا اہم حوالہ جاگیردارانہ نظام ہی ہے۔اسی مقامیت میں جاگیردار نظام رائج ہے۔جو اس علاقے کے کرتا دھرتا بھی ہیں اور مالک بھی اور حاکم بھی جن کے اپنے حصول و ضوابط ہیں۔یہ لوگ ان کے غلام ان کی رعایا ہیں۔جن کی زندگیاں ان کی امانت ہیں۔ان کی زندگیاں ان حاکموں کی چاکری کے لیے وقف ہیں۔ان کی روزی ان سے منسلک

ہے۔ان کی عورتیں بھی ان کی رعایا ہیں۔ جوان ہو تو ان کے بستر گرم کریں، عمر ڈھل جائے تو ان کی عورتوں کی چاکری کریں۔ ان کی سوچ ان کے تابع ہے۔ان کے جسم ان کی امانت ہیں۔ان کی زندگیوں کے واحد مالک ہیں اور اگر غلطی سے اس میں بغاوت کا مادہ پیدا ہو تو وہ اپنی موت مارا جائے گا۔ کیونکہ اس کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ حکم عدولی پر اس کی سرکوبی کی ایسی سزا تجویز کرے کہ باقی لوگ اس سے اس قدر عبرت حاصل کریں کہ کوئی آئندہ ایسا تصور کرتے ہوئے بھی ہزار بار ضرور سوچے۔

مقامیت کے اس پہلو کو ناول میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اگر اپنے حقوق حاصل کرنے کی سعی کر بھی لیں یا کوئی ایسی جرات پیدا کرے بھی تو طاقتور اس کو کچلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ایسی ہی صورت حال ناول میں دکھائی دیتی ہے جب یہ مقامی غریب لوگ ایک مہاجر کے بتانے پہ کہ جنرل ایوب زرعی اصلاحات کر کے لوگوں میں زمین تقسیم کرے گا۔ بات کو سچ مان کر ایک روز ذیلدار کی خدمت کو حاضر نہیں ہوتے تو ان کی پولیس کی خدمت حاصل کر کے ان کو ایک ان کی اصلیت بار آور کرائی جاتی ہے۔ قانون بھی ان وڈیروں کے تابع ہوتا ہے۔ قانون کے یہ رکھوالے خود ان کے در کے سوالی اور خدمت گار ہوتے ہیں۔

> "نہیں تھانیدار صاحب! یہ سب جدی پشتی ہمارے بردے غلام ہیں، بے زبان رعیت ہیں، انھیں گمراہ کیا گیا ہے ورنہ ان کی بدھی میں ایسی سکیم اور منصوبے آ ہی نہیں سکتے یہ صرف خدمت گزاری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ خود کو ان سے کوئی کام نہیں لینا ان سے تو نماز اور روزے کی بازپرس بھی نہ ہو گی اس لیے تو انھیں پہلا کلمہ بھی نہیں آتا۔"(91)

ان بیانات سے اس مقامی اشرافیہ کی ذہنی عکاسی ہوتی ہے۔ مقامی جاگیردار اور سرمایہ دار ان لوگوں کو ان پڑھ اور جاہل رکھتے ہوئے ان کی سوچوں پہ خود کا تصور مسلط رکھتے ہیں۔ وہ کبھی بھی وہ ان کی حکم عدولی کرنے کی جرات بھی نہیں کریں گے۔ دوسرا اہم بیان اس مقامیت کی ذیل میں یہ ہے کہ ان جاگیرداروں کے ظلم محض ان کی عوام اور عایا تک ہی محدود نہیں۔ان کی اپنی بہن بیٹیاں بھی اس کا شکار ہیں۔اس مقامیت میں بیٹی اور بہن کو نہ بیاہنے کی رسم موجود ہے۔ جو ملک فتح شیر اور ذیلدار کے ضمن میں دیکھی جا سکتی ہے۔ منصورہ ملک فتح شیر کی بہن بھی اس قابل نہیں کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ بلکہ اس کو مرد کے تصور سے بھی دور رکھا جاتا ہے۔اس قانون کی خلاف ورزی پر اسے مار دیا جاتا ہے۔ تو دوسری طرف ذیلدار کی بیٹی بختاور بھی اسی خوف کی وجہ سے مر جاتی ہے۔ان جاگیرداروں کو اس بات کا خدشہ لاحق ہے کہ ان کی عورتیں بیاہے جانے سے ان کی جاگیروں اور زمینوں میں کمی واقع نہ ہو جائے۔ وہ ان کا وراثت میں حق دینے کو تیار نہیں ہیں۔

ان مقامی بیانیوں میں مسئلہ غیرت کا نہیں ہے کہ ان کی عورتوں کے غلط کام کرنے کی وجہ سے اس کو سزا دی جاتی ہے۔ جبکہ اس کے فطری حق سے اس کو محروم رکھا جاتا ہے۔اس کو گھر میں مقید کر کے ان کی زندگی کی تمنا ختم کی

جاتی ہے۔بیاہی اس لیے نہیں جاتی کہ ان کی جاگیروں میں کوئی فرق نہ آئے۔وہ بھی اس بات سے باخبر ہیں کہ اس گھر سے ان کی ڈولی نہیں جنازہ ہی نکلے گا۔ان کو جینے کا حق محض حویلیوں کی چار دیواروں کے اندر ہی ہے۔ان کا پیدا ہونا بھی وہ اپنے لئے باعث تسکین نہیں باعث وبال سمجھتے ہیں۔انسانی کی فطری خواہشات اور تقاضے بسااوقات کتنا ہی بیرونی دباؤ کیوں نہ ہو اثر قبول نہیں کرتے اور اپنا راستہ بناتے وقت غلط طرف کا بھی انتخاب کر لیتے ہیں۔ذیلدار کی بیٹی بختاور ایک نوجوان کو دیکھتے ہوئے گھبراہٹ اور باپ کی خوف کی وجہ سے ہی موت کا شکار ہو جاتی ہے۔اس کا باپ اس کی موت پر غم کے بجائے خوشی کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی ساکھ خراب ہونے سے بچ گئی۔عورت کے فطری جذبات کی تسکین نہ ہونے سے اگر وہ کسی غلطی کا مرتکب ہو جائیں تو ایسے میں ان کو قرار واقعی سزا دی جاتی ہے۔ان سے جینے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے دراصل یہ ان کا اپنا ہی منصوبہ ہے۔ان کی موت ان کے لیے باعث اطمینان ثابت ہوتی ہے۔

"انھوں نے بختاور کی میت کی پٹی پر ہاتھ رکھا اور جیسے زمین و آسمان تقدیر اور زمانے کو مخاطب کیا۔"میری بچی میں تیرا بڑا شکر گزار ہوں تو نے مجھے کسی کمینے کے سامنے سر جھکانے پہ مجبور نہیں کیا۔تو نے مر کر مجھ پہ بڑا احسان کیا۔اب میں باقی ماندہ زندگی سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہوں گا۔شکریہ میری بچی۔۔۔شکریہ"۔(92)

پاکیزہ کا کردار بھی اسی فرسودہ نظام کا شاہد کردار ہے۔جو زندگی کا ایک خاص حصہ حویلی میں قید گزار دیتی ہے ۔جسے حویلی کی نوکرانیوں سے بھی بات کی اجازت نہیں کہ کوئی اس بغاوت یا اس نظام سے انحراف کا کوئی رستہ نہ سجھا دے۔اس مقامی المیے میں ان عورتوں کی زندگی اس قدر اجیرن ہو جاتی ہے کہ وہ موت کی آرزو کرنے لگتی ہیں۔ناول مقامی ثقافت کے مختلف عناصر کی وضاحت کرداروں کے ضمن میں ملتی ہے۔اس علاقے میں لوگوں کا مخصوص طرز رہائش اور ان گھروں کو سجانا سنوارنا عورتوں کی مہارتیں،ان کی دستکاریاں بھی مقامی ثقافت کے نمایاں اوصاف میں شامل ہیں۔موسموں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی مصروفیات کا بھی انداز بدل جاتا ہے۔ان کے گھروں کی تعمیر،سجاوٹ،رکھ رکھاؤ میں بھی مقامی ثقافت کے رنگ نمایاں ہیں مقامی ثقافت ان کے ہر پہلو میں عیاں ہوتی ہے۔بود و باش کے مخصوص انداز میں ان کی انفرادیت کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔

"چیت کی میٹھی میٹھی ٹھنڈ میں چارپائیاں گول برآمدے میں بچھی تھیں۔پشو مویشی کوٹھوں کی ٹھنڈی تاریکیوں سے نکال کر کھلے آسمانوں تلے تاروں بھری وسعتوں میں باندھ دیے گئے تھے۔کھٹی لسی کی جاگ لگی اور دودھ کی چاٹی یا باہر صحن میں نہلتوں پر رکھی جانے لگی تھیں۔گاؤں بھر کی عورتوں نے چکنی مٹی میں لید پھوسی گوندکر کچے مکانوں کو لیپ دیا تھا اور گاچنی کے پانی میں نیل ملا کر کلی پھیری تھی۔نئے تنوروں اور چولہوں کو سارا جا رہا تھا ۔بورکتر کی سخت گندھی چکنی مٹی سے روزانہ ایک ایک وار سارتیں اور پھر انھیں بوری سے ڈھانپ دیتیں کہ تیز دھوپ میں یکدم خوش ہو کر دراڑیں نہ چھوڑ جائے۔"(93)

اس مقامی ثقافت میں پانا سماجی نظام موجود ہے۔ جو تمام افراد کو ایک دوسرے سے جوڑ کر رکھتا ہے۔ خوشی ہو یا غم دو لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ عورتیں گھروں کی لپائی میں بھی مشترکہ طور پر ایک دوسرے کے ساتھ شامل ہوتی ہیں۔ فصل کی کٹائی ہو یا مکان کی تعمیر لوگ رضاکارانہ طور پہ ایک دوسرے کی مدد کے لیے مستعد دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا ایک دوسرے سے اختلاف کے باوجود الگ نہیں ہونے دیتا۔ ساجدہ سلطانہ اس ضمن میں لکھتی ہیں کہ :

> "نیلی بار کے لوگ آپس میں محبت اور یگانگت کے عجیب رشتوں میں بندے ہیں جو ایک دوسرے سے لڑتے بھی ہیں گالی گلوچ بھی کرتے ہیں لیکن غمی یا خوشی کے موقع پر سب جھگڑے بھلا کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح فصل کی کٹائی کے موقع پر ونگار ہوتا تو سب مل جل کر فصل کی کٹائی میں شرکت کرتے۔"(94)

ناول میں معمولی واقعات کے بیان سے مقامیت کے خدوخال کو واضح کیا گیا ہے۔ اسے مقامی ثقافتی بیانیے کو مقامی کرداروں نے خوب نبھایا ہے۔ اس مقامیت کے معاشی نظام کا دارومدار زرعی زمینوں، ان کی فصلوں پہ تھا۔ ان فصلوں کے اگانے کاٹنے کے ساتھ تو کئی ثقافتی پہلو جڑے ہوتے ہیں۔ ان کی کٹائی کے بعد ان لوگوں کی زندگیاں عجب سرور سے آشنا ہوتی ہیں۔ وہ نئے نئے ذائقوں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جو ان کو معمول میں نہیں ملتے۔ عورتیں بیٹیوں کے جہیزوں کے لیے اس موسم میں خریداری کرتی ہیں۔ یہ موسم ان کی زندگیوں ان کی ثقافت میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان فصلوں سے ہی ان کی خوشیاں وابستہ ہیں۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جو زمیندار ہے۔ جو ان زمینوں سے اپنا منافع کماتا ہے اور اپنی زندگی آسائشوں سے گزارتا ہے؛ تو دوسری طرف ان کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور طبقہ بھی شامل ہے۔ جو ان زمینداروں کی وہ فصلیں اگانے اور دوسرے معاملات میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کا روزگار، ان کا رزق بھی وابستہ ہوتا ہے۔ زمیندارنیاں اس موسم کے انتظار میں ہوتی ہیں۔ جب وہ اپنی بیٹیوں کے جہیزوں کے لیے زیورات وغیرہ خریدتی ہیں۔

> "منیاری اور کپڑے والے ڈیرے ڈال دیتے کسی دیوار کے ساتھ کپڑا ٹھونک کر ساتھ تھانوں کی ٹھلیاں لگا دیتے۔ چھینٹ، کمرک، ٹویرا، کے ٹی، ساٹن۔ دل پیاس، خوشالی لنگیاں، سفید پگڑیاں کیسے کیسے خوش "رنگ ڈیزائن خریدنے والوں کی نسبت چھو کر ملائمت اور کور کو محسوس کرنے والی زیادہ ہوتیں۔۔۔ سال بھر میں ایک ہی چکر لگانے والے سنیارا بھی آ پہنچتا۔ تولہ تولہ جوڑ کر سیر بنانے والے گھی بیچ پڑیاں چھان پھٹک کر کپاس چھوٹ چن چن کر ناخن گھسا دینے والی سگھڑ مائیں کوئی ٹوم چھلا گھڑوا ہی لیتیں اور بیٹیوں کے جہیز والے صندوقوں میں بند کر دیتیں۔"(95)

فصلوں کے ساتھ ان کی جڑت مال مویشی پالنا اور دیہاتی بچوں کا ان کی دیکھ بھال کرنا یہ تمام مقامی ثقافتی پہلو ناول میں موجود ہیں۔ عورت کے مقام اس کی حیثیت کے بارے میں بھی ناول نگار نے مختلف پہلوؤں میں مختلف

پیرائے سے گفتگو کی ہے۔اس بیانیے میں مقامی عورت خواہ وہ امیر طبقہ کی ہو یا غریب سب کا احوال موجود ہے۔ وہ فصلوں کی کٹائی مویشیوں کے پالنے کے ساتھ ساتھ گھرداری کے کام بھی کرتی ہیں۔گھریلو ذمہ داریاں کام کاج بچوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف دکھ جھیلنے والی مقامی عورتیں ذمہ داریوں کا بوجھ بھی سہارتے سہارتے خود مٹی میں جا ملتی ہیں۔ناول میں اس مقامی عورت کی زندگی کا احوال اور اس کو درپیش مسائل کا بیان ناول میں کچھ اس انداز سے ملتا ہے۔

> "اس پنجابی کسان عورت اور مویشیوں میں فرق کیا ہے بس کچھ زیادہ نہیں یہی کہ ان عورتوں کو مویشیوں کی خدمت پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ بھینس کی ٹیل سیوا ضروری ہے اور اگر پھنڈر رہ گئی تو بچے دودھ کہاں سے پییں گے۔ہالی بیل کو سانی نہ کھلائی تو زمین میں ہل گہرا گہرا کیسے اترے گا۔گھر کی لیپا پوتی نہ ہوئی تو وہ بھلا سگھڑ کبھی نہ کہلائے گی خود اس کی اپنی ذات مویشیوں میں بچوں میں اور گھر کے تنوں میں کرچی کرچی یوں تقسیم ہوتی ہے کہ اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں بچا پاتیں۔ تیس، پینتیس برس کی نانی، دادی بڑھیا۔کرم خوردہ دانت جھنڈ کی جڑیں سی بالوں کی لٹکتی ہوئی لٹیں۔وہ بھی ایسی صورت میں اگر زچگی میں دائی کی جہالتوں سے بچ نکلے۔ورنہ اس عمر تک پہنچنا کتنوں کو نصیب ہوتا ہے۔"(96)

ناول کا کینوس خاصا وسیع ہے۔ناول میں مقامی زندگی کے بیان میں ناول نگار نے عورت کی مقامی زندگی کے حوالے سے بھی زیر حاصل بحث کی ہے۔اس بیانیے میں عورت کی زندگی کو درپیش مسائل کا اندازہ ہوتا ہے۔اس مقامی ثقافت میں عورت کی اہمیت اور مرکزیت بیان ہوئی ہے۔اس کی مشکلات کا تذکرہ بھی اس میں موجود ہے۔ ناول کا کینوس خاصا وسیع ہے۔جس میں پاکستان کی سیاست کے بدلتے تناظر سماجی حالات، عالمگیرت کا غلبہ، اکیسویں صدی کے مسائل تک محیط ہے۔اس کے باوجود مقامی بیانیے کی اہمیت اپنی جگہ موجود ہے۔ ناول نگار نے ایک مخصوص علاقے کی مقامی ثقافت کا بیان نہ صرف تفصیل سے کیا ہے۔اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔اکیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے مقامی ثقافتیں عالمگیریت کے دلفریب نعرے سے متاثر ہو چکی تھیں۔ان دیہاتوں، گاؤں، مضافاتی علاقوں میں بھی عالمگیرت کی یلغار سرائیت کر رہی ہے۔لوگ جدید طرز زندگی کے ساتھ جڑ رہے ہیں۔جس کی وجہ سے مقامی بیانیہ، ثقافتیں زوال کا شکار ہو رہی ہیں۔اس میں اہم کردار میڈیا کا ہے جس کی رسائی دور افتادہ علاقوں میں بھی ہو چکی ہے اور اپنے اثرات کو تیزی سے پھیلا رہا ہے۔اس کے باوجود مقامی ثقافتیں اپنے وجود کو برقرار رکھتے ہوئے ناول میں بھی آخری حصے میں اس حوالے سے شواہد موجود ہیں۔مقامی لوگوں کی نئی نسلیں بھی اس مقامیت سے راہِ فرار اختیار کر رہی ہیں۔

Post modernism کے تناظر میں اشرافیہ کے لیے نئے ڈسکورس کو آپ نے درست معنی پہنائے ہیں۔
اس مابعد جدیدیت کے لیے بھی پیراڈائم اس ایک شعبے سے پھوٹتے ہیں۔ آپ آل ان ون ہیں چاہیں تو برف میں
آگ لگا دیں چاہیں تو آگ میں برف آگ میں برف اگا دیں یہ میڈیا دیوتا نئے عہد کا ایک یکتا خدا ہے۔"(97)

میڈیا کی بڑھتی یلغار نے اس مابعد جدید عہد میں مقامی ثقافتوں کو خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ آنے والی نسلیں اس کی ہم نوا ہیں اپنی ثقافتی قدروں کی پامالی نئی نسل کا معمول ہے۔ اس عالمگیریت کے جھانسے نے فرد کو اس کی اصل شناخت سے محروم کر دیا۔ جدیدیت کے پیرائے میں مقامی ثقافتوں سے انحراف کا بڑا رجحان دیکھنے میں نظر آ رہا ہے۔ پرانی قدریں معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ ناول کے آخری حصے میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اگرچہ نیلی بار کی مقامی ثقافت تاحال موجود تو ہے تاہم مصنفہ کو اس بات کا خدشہ ہے کہ اس کا تحفظ کرنے والی آخری نسل چل رہی ہے۔ جس کے بعد یہ ثقافت بھی مٹ جائے گی اور مہابیانیوں میں اس کا بیانیہ گم ہو جائے گا۔

اکیسویں صدی کے ناول میں مقامیت کی طرف انحراف کا جو سلسلہ چلا وہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چھوٹی یا ایسی ثقافتیں جو اپنے طور پر مکمل ہونے کے باوجود کسی بڑی ثقافت کا ہی سلسلہ تصور کی جاتی تھیں۔ ان کی بازیافت بھی ہونے لگی ہے۔ اردو ناول نے جہاں ان کے بیان سے ان کو محفوظ اور اجاگر کیا وہیں ان مٹتی ہوئی مقامی ثقافتوں کے بیان سے ایک طرح سے تاریخ میں محفوظ بھی کر دیا ہے۔ پنجاب ایک وسیع و عریض صوبہ ہے۔ تقسیم ہند کے بعد پنجاب دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے بعد بھی پاکستان کے حصے میں آنے والا پنجاب بھی باقی تمام صوبوں سے آبادی کے لحاظ سے بڑا ہے۔ ثقافتی اعتبار سے متنوع علاقہ ہے۔

گلوبلائزیشن کے اس دور میں مقامی ثقافتوں کو زوال آ رہا ہے۔ مقامی ثقافتوں کی جگہ گلوبلائزیشن کے تحت بڑا کلچر سرایت کر رہا ہے۔ ان مقامی ثقافتوں کے افراد خود ہی ان کی بقاء اور تحفظ سے عاری ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ اس عالمی سازش کا حصہ آسانی سے بنتے جا رہے ہیں۔ جس سے ان مقامی ثقافتوں کے مٹنے کے خدشات وسیع ہو رہے ہیں۔ ناول گراں کا موضوع بحث ہے۔ گراں میں اسی مسئلے کا بیان ہے کہ مقامیت زوال کی جانب گامزن ہے۔

گراں صوبہ پنجاب کے شمالی علاقے پوٹھوہار کا بیان ہے۔ پوٹھوہار کے لوگ ایسے خطے میں آباد ہیں جہاں پہاڑ بھی ہیں اور میدان بھی جغرافیائی لحاظ سے اس کا ایک سرا کشمیر سے اور دوسرا سرا خیبر پختونخواہ سے ملتا ہے۔ یہ پہاڑی اور نیم میدانی علاقوں پہ مشتمل ہے۔ اس مخصوص جغرافیہ کے حامل اس خطے کے لوگوں کے رہن سہن کا طریقہ بھی جداگانہ ہے۔ ان لوگوں کا مخصوص طرز رہائش، لباس، رسم و رواج اور مقامی تاریخ ہے۔ اسے پنجاب کے ضمن میں پنجابی ثقافت کا حصہ تو در کنار اسے خالصتاً اسی نظر سے دیکھنا یقیناً ناانصافی کی بات ہو گی۔ خطہ پوٹھوہار مخصوص ثقافت کا حامل ہے۔ اس کی مقامی ثقافت پنجاب کی عمومی ثقافت سے بہر حال بہت مختلف ہے۔ اس کی اپنی وضع اور مخصوص شناخت رہے۔ گراں مقامی زبان کا ہی لفظ ہے۔ جس کا مطلب گاؤں ہے۔ پنجابی میں گاؤں کے لئے "پنڈ" کا لفظ استعمال

ہوتا ہے۔ مصنفہ نے اس گاؤں کے پیرائے میں پوٹھوہار کی مقامی ثقافت کو بیان کیا ہے۔ پہاڑوں اور میدانوں میں بسے لوگوں کا قصہ ہے۔ جن کا مخصوص طرز معاشرت رسم ورواج ہے۔ یہ لوگ اپنے اس علاقے میں صدیوں سے آباد ہیں ۔ بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی میں لوگوں نے شاید جدید دنیا کے اثرات کو جلد ہی قبول کر لیا اور اپنی مقامی ثقافت کو مٹانے کے درپے ہو گئے۔ ناول میں اس مقامی ثقافت کے عروج وزوال کی کہانی ملتی ہے۔ جغرافیائی حوالے سے اس علاقے میں پنجاب جیسی زرخیزی نہیں ہے۔ دور دراز کے علاقے میں بسے یہ لوگ روزگار کی کمی شکار تھا ۔ یہاں فیکٹریاں اور کارخانے بھی نہ ہونے کے برابر ہیں اور زمینوں کی پیداوار بھی پنجاب کے دوسرے میدانی علاقوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ یوں ان خطوں میں بسنے والے لوگوں نے زیادہ تر ملک سے باہر جانے کو ترجیح دی اور ان میں سے بہت سے دوسری ملازمتوں کے سلسلے میں اپنے علاقوں سے دور ہونے لگے۔ اس طرح سے اس مقامیت کے لوگ مختلف جگہوں کی طرف مراجت کر کے ان کا حصہ بننے لگے۔

> "عالمگیریت کا مرکزی ہدف ترقی پذیر ممالک کی مقامی ثقافتیں مٹا کر پوری دنیا کو ایک عالمی گاؤں بنانا ہے۔ ایسی صورتحال میں ایک ادیب کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ ادیب کو تاریخ تہذیب اور ثقافت کا امین سمجھا جاتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے ایک ادیب ہونے کے ناطے یہ ذمہ داری خوب نبھائی ہے۔ وہ پوٹھوہار کی مقامی ثقافت کو اپنے ناولوں بیانیوں میں سمیٹ کر پوٹھوہار کے کے شاندار ماضی اور ثقافتی ساخت کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔"(98)

اس خطہ میں روزگار، ذریعہ معاش کا مسئلہ رہا ہے۔ تاہم اس کے باوجود یہ لوگ اپنی ثقافت کے ساتھ جڑے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے حالات کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے بھی اپنی مٹی کے وفادار ہیں۔ روایتی طور طریقوں کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی رسم ورواج، رکھ رکھاؤ، خوشی، غمی کی مقامی رسمیں کبھی نہ دم توڑتی تھیں۔ پہاڑوں میں بسنے والے یہ پوٹھوہاری لوگ اپنے ثقافتی ورثے کے امین تھے۔ ناول کے آغاز میں مقامی ثقافت اپنی آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ یہ زمانہ اس ثقافت کی معراج کا ہے۔ اس خطے کی خواتین اس قدر جفاکش ہیں کہ عورتیں مردوں سے بھی زیادہ کام کاج کرتی ہیں۔ یہ عورتیں دراصل ثقافت کی زیادہ امین ہیں۔ اس مقامیت میں بطور عورتیں بچوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ مال مویشی پالنے اور برساتی نالوں میں کپڑے دھونے تک کے تمام مشکل امور انجام دیتی ہیں۔ پوٹھوہاری لوگوں میں رشتوں کی قدر اور پہچان کا پہلو بھی مبالغے کی حد تک زیادہ ہے۔ ناول کے آغاز سے ہی خواتین کا بیان آتا ہے۔ ناول کے کے آغاز سے ہی جو ثقافت کی رسم ورواج کو نبھاتے نبھاتے خود کو بھی بھول جاتی ہیں۔ یہ پوٹھوہاری عورتیں اپنے نظام ثقافت کی اس قدر وفادار ہیں۔ محض زبان سے کہے ہوئے الفاظ کا پاس رکھنے کے لیے تمام عمر گزار دیتی ہیں۔ ناول میں مصنفہ نے ایسے مقامی انسوانی کردار تخلیق کیے ہیں جو اس مقامی ثقافت

پہ پورا اترتے ہیں۔ مرد کی بے وفائی سہنے والی عورتیں ان مردوں کی عزت اس قدر کرتی ہیں کہ ان کے حکم کو کبھی نہیں ٹالتی۔

اس ثقافت کا ایک نمایاں وصف مصنفہ نے یہ دکھایا ہے کہ یہاں کے لوگ ایک روایتی نظام میں جکڑے ہوئے ہیں۔ تمام لوگ اپنی حدود جانتے ہیں ایک دوسرے کی عزت کرنا ان کا خاصہ ہے۔ بچپن میں رشتے طے ہونے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے پردہ اور لحاظ کرتے ہیں۔ گھروں میں پانی نہ ہونے یا کم ہونے کے باعث کسوں، برساتی نالوں میں کپڑے دھونے جاتی ہیں۔ جہاں وہ اپنے تن کے کپڑے بھی اتار کے دھوتی اور سکھاتی ہیں۔ مگر مقامی ثقافتی اقدار اس قدر مضبوط ہیں کہ ان کو کسی کا ڈر نہیں، کوئی ان کی طرف دیکھتا نہیں کیونکہ سب کی عزت سانجھی ہے۔ وہ جانوروں کو پانی پلانے جب ان کسوں/نالوں میں آتے ہیں تو اس کی اطلاع دیتے ہیں کہ کہیں کسی برہنہ، بے پردہ عورت پہ نگاہ نہ پڑ جائے۔ وہ سب کو اپنی بہو، بیٹی، بہن خیال کرتے ہیں۔ ناول میں مصنفہ نے پوٹھوہاری زبان کے الفاظ کے استعمال کے ذریعے ان مقامی کرداروں کے امور کو بیان کیا ہے۔

"نیچے گہری کھائی میں برساتی نالہ اترتا چلا گیا جس کے کنارے بیٹھی عورتیں کپڑے دھوتی تھیں۔ پنڈیں کپڑوں کی دھل کر جھاڑیوں اور پتھروں پر سوکھ رہی تھیں۔ اب تن کے کپڑے اتار کر انہیں دھو رہی تھیں۔"

"بی بیو چیلا (دوپٹہ) کروڈ نگروں کو پانی پلانا ہے۔ اصغر کان کی ہانک کے ساتھ نہائی دھوئی عورتوں نے سالٹن کی شلواریں اور دل پیاس کی قمیض جلدی جلدی پہنیں۔" (99)

پوٹھوہاری عورتیں وفاداری کے ساتھ ساتھ سلیقہ مندی میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ ناول میں لڑکیوں کا اکٹھے بیٹھنا اور سلائی کڑھائی کرنا بھی دکھایا گیا ہے۔ جو کسی زمانے میں دیہاتوں کا ایک عام رواج تھا۔ زیادہ تعلیم حاصل کرنے کا رواج اس مقامیت میں نہ تھا۔ جس کی ایک وجہ دور دراز کے اسکولوں کا ہونا اور وہاں تک رسائی تھا۔ ان کو گھرداری کے معاملات بخوبی سکھائے جاتے۔ گھریلو دستکاری سکھائی جاتی۔ زمینداری کے معاملات یہ عورتیں مردوں کے ساتھ ساتھ شانہ بشانہ کرتیں۔ خطہ پوٹھوہار میں پانی کا مسئلہ اکثر گاؤں میں ہے۔ عموماً گرمیوں میں تو دور دراز سے پانی لایا جاتا۔ گاؤں میں کنویں اس مقصد کے لیے اجتماعیت کا نمونہ تھے۔ عورتیں پانی گڑوں میں بھر بھر کر لاتی ہیں۔ گرمیوں میں مشقت طلب کام مزید مشکل ہو جاتا ہے۔ عورتوں کا گھریلو کام کاج کی غرض سے باہر جانا معمول تھا۔ یہ عورتیں جدید زمانے کے مقابلے میں کہیں زیادہ محفوظ تھیں۔ ان کے پاسبان پورے گاؤں کے لوگ ہوتے۔

"لڑکیاں پانی پلانے والے نوجوانوں کی چھی او چھی کی صداؤں کے ساتھ چوہے کے پانیوں میں سے گھڑے ڈبو ڈبو بھرتیں۔ تین تین گھڑے سروں پر ایک ایک لوہے کی ہڈی پر جمائی سانپ کے لہر سی پہاڑی پگڈنڈی چڑھتیں، اترتیں۔ بھاری شلواروں اور لمبی قمیضوں والے نوجوان کبھی سر اٹھا کر انہیں نہ دیکھتے۔" (100)

فصلیں کاشت کرنے، کاٹنے کے علاوہ بھی ان کے ہاں سماجی نظام مربوط تھا۔ تمام امور آپس میں مل جل کر سرانجام دیے جاتے ہیں۔ گاؤں کی اکثر آبادی ایک دوسرے کے ساتھ رشتے دار تھی۔ یوں ان کے ہاں سماجی میل جول بھی مخصوص تھا۔ تمام گاؤں کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ منسلک تھے اور اکثر کام کاج اجتماعی طور پر مشترک نظام کے تحت کیے جاتے تھے۔ "گراں" کے پیرائے میں مصنفہ نے اس خطے کی ثقافت کے خدوخال کو واضح کیا ہے۔ اس ثقافت میں ہر گاؤں میں ایسا ہی نظام تھا۔ وہاں حقیقی رشتوں کے ساتھ فرضی رشتے بھی قائم کیے جاتے ہیں اور ان کا پاس ولحاظ بھی سگے رشتوں کی طرح ہی کیا جاتا ہے اسی حوالے سے ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اس گراں کے دس گھرانوں کے کپڑے لتے سودا سلف صوبیدار حکم داد ساگری یا پھر روات سے خرید کر لاتے ۔ گھر گھر جا کر مردوں عورتوں کی گنتی کرتے ضروریات پوچھتے اور فہرست بنا لیتے نہ کبھی کسی نے اعتراض کیا نا نقص نکالے۔ جب سے ساگری گراں میں جندر لگی تھی پورے گاؤں کی گندم باجرے مکی کی پسوائی کی ذمہ داری چاچا قیوم کے سپرد تھی۔ سارے گاؤں کے لڑکوں کو روات سکول چھوڑنے لانے کا ذمہ امانت خان کا تھا۔ یہاں ہل بیل، گیس لالٹین، بستر، بستر بند بیگ بکسے پلیٹیں، گلاس بیٹھکیں، ترپال کچھ بھی ذاتی نہ تھا سب اجتماعی استعمال تھا۔"(101)

اس مقامیت کا خود ساختہ نظام تھا۔ یہ لوگ رسم ورواج کو ہر لحاظ سے ضروری خیال کرتے، سب کی ذمہ داریاں سانجھی ہوتیں۔ ان کے ہاں ذاتی خود غرضی کا عنصر نہیں تھا بلکہ اجتماعی تصور ہر امر میں کار فرما نظر آتا ہے۔ پوٹھوہار کے علاقوں میں زرعی آلات بھی تاخیر سے ہی آئے۔ جس کی وجہ محدود زرعی رقبے اور زمین کی ناہمواری بھی ہے۔ بارانی علاقوں میں فصلوں کی کاشت اور پیداوار بارشوں سے مشروط اور چھوٹے چھوٹے کھیتوں تک ٹریکٹر کی رسائی بہت بعد میں ہوئی اور تاحال کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں زرعی آلات استعمال کرنا مشکل ہے مقامی لوگ جب تک باہم جڑے تھے تو اس کی ضرورت بھی زیادہ محسوس نہ ہوئی۔ یہ مقامی لوگ ان مواقعوں پہ اجتماعی طور پر اکٹھے ہوتے ۔ یوں بوجھ مشترکہ طور پر سہار لیا جاتا ہے۔ کبھی مکانوں کی تعمیر اور لپائی ہو رہی ہے تو کبھی فصلوں کی کٹائی اور گاہی ہو رہی ہے۔ گاؤں سے باہر ملازمت کرنے والے بھی اس موسم میں ضرور چھٹی لے کر آجاتے تاکہ وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ ایک وقت تو وہ تھا کہ لوگ کئی گاؤں دور سے بھی لوگوں کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔ ناول میں ایسے مناظر کی مصنفہ نے بارہا منظر نگاری کی ہے۔

> "ان دنوں گندم کی گاہی ہو رہی تھی۔ سجے ہوئے جیوٹ اور پنجالیوں والے بیل کی جوڑیاں اکٹھی ہوئی تھیں۔ موہڑے۔۔۔ گوڑھے، ہاتھلے، بگے، پرتھے، کرپال، پھوڑے بیسیوں گراؤں سے بہترین بیل آئے تھے اور ڈھول اور گھنگروؤں کی آنکھ اواز پرپڑ (کھلیان) گاہ رہے تھے۔ بزرگ سروں پر مشدی لنگیاں اور قراقلی ٹوپیاں جمائے پھلائیوں دریکوں کی چھاؤں میں بیٹھے بیلوں اور نوجوانوں کو ہلاشیری دیتے تھے۔ بچے ان نوجوان کھڑاوں اور فوجی بوٹ پہنے کھلیان پر دائروں میں گھومتے رہے تھے۔ ہر گھرانے میں کوئی نہ کوئی فرد فوجی میں رہ

چکا تھا۔اس لیے فوجی بندوق فوجی بوٹ اور جیکٹ ہر گھرانے کا اعزاز تھا۔ہر گھر کے صفے یعنی بڑے کمرے میں کھونٹیوں یا کیلوں سے سجاوٹ کی طرح ہی اعزازات سجے رہتے تھے۔"(102)

ناول نگار نے جہاں اس مقامیت کی مختلف رسم و رواج اور مقامی زندگی کا بیان کیا ہے وہیں مقامی الفاظ کی بھرمار بھی نظر آتی ہے جو پوٹھوہاری نہ سمجھنے والے لوگوں کے لیے شاید اجنبی ہوں یا کسی قدر بوجھل پن کا باعث بنے۔ جو لوگ اس خطے کی ثقافت اور زبان سے واقف ہیں۔وہ جان سکتے ہیں کہ مصنفہ نے اس مقامی زبان کے الفاظ کے استعمال سے اس مقامیت کو کس طرح سے قریب سے بیان کیا ہے۔اگرچہ بعض اوقات ان الفاظ کی کثرت سے اس ناول کا عیب بن سکتا ہے۔پوٹھوہاری زبان سے ناواقف لوگ اس کو سمجھنے میں کسی قدر مشکلات کا شکار ضرور ہوں گے۔ تاہم ناول کے کرداروں کے ضمن میں اس مقامیت کے وضاحت کا بھی ایک اہم وسیلہ ہے۔

ناول میں نوآبادیاتی عہد کے اثرات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ناول کا آغاز ہی نوآبادیاتی عہد سے ہے۔اس کے زیر اثر پروان چڑھنے والی اس مقامیت کا ہے۔نوآبادیاتی عہد نے اس علاقے کی مقامیت کو ایک نیا رخ عطا کیا۔عہد نوآبادیات میں استعماری قوتوں نے نہ صرف مقامی لوگوں کے وسائل پہ قبضہ کیا بلکہ ان کے حربوں میں مقامی ثقافتوں کو مغلوب کرنا بھی شامل تھا۔اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ان لوگوں نے مقامی جاگیرداروں کو بھی اس طرح قابو کیا کہ وہ ان کے احسان مند ہو کر ان کے ہم نوا ہونے پہ اترانے لگے۔خطہ پوٹھوہار کے سخت جان محنتی نوجوانوں کو اپنی دفائی ضروریات کے پیش نظر عہد نوآبادیات میں انہیں فوج کی ملازمت کی طرف مائل کیا گیا۔جس میں کسی حد تک کامیابی میں معاشی حالات کا کردار ہے۔اس خطے کے نوجوانوں کی مالی مدد کے پیش نظر ان نوجوانوں کی خدمات فوج میں بھی حاصل کی گئیں۔یہ دور بھی اس مقامیت میں اہم تھا۔پوٹھوہار کے ان بارانی زمینوں میں ہل چلانے والے نوجوان فوج میں جانے لگے تو پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان نوجوانوں نے فوج کو ہی روزگار کا مستقل ذریعہ بنا یا لیا۔جو بیسویں صدی کی ساتویں دہائی تک عروج پہ رہا۔اس سے مقامی لوگوں کا معاشی مسئلہ بھی کسی حد تک حل ہو گیا۔قیامِ پاکستان کے بعد بھی ان مقامی افراد کا مرغوب پیشہ فوج میں بھرتی ہونا ہی تھا۔بعد ازاں بڑے بڑے عہدے دار انہی علاقوں سے سامنے آئے۔

پوٹھوہار کی مٹتی تہذیب جس کا نوحہ مصنفہ نے پڑھا ہے۔اس کا اہم دور اس وقت شروع ہوا۔جب یہ لوگ اپنے روایتی زمینداری نظام اور فوج سے ہٹ کر بیرون ملک جانے لگے۔اس کے بعد پیسوں کی آمد اور جدید سہولتوں کے آنے سے لوگوں کے مزاجوں میں بھی یکسر تبدیلی آنے لگی۔عالمگیریت کے اثرات نے ان مقامی لوگوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔لوگ اجتماعیت سے کٹ کر انفرادیت کی طرف منتقل ہونے لگے۔

"فرانز فینن اور ایڈورڈ سعید نے جن مابعد نوآبادیاتی حربوں، بیانیوں اور کلامیوں کی نشاندہی کی تھی۔اس کی عملی صورت "گراں" کے مابعد نوآبادیاتی بیانیے میں نظر آتی ہے۔ جو عالمگیریت کی یلغار میں گراں کے ٹوٹتی ہوئی ثقافت کا نوحہ ہے۔"(103)

مقامیت میں یکسر تبدیلی آنے لگی۔ لوگ اس ثقافت سے اس قدر مرغوب ہوئے کہ باہر جانے والوں سے زیادہ ان کے ورثا اور رفقاء اس مقامیت سے متاثر ہونے لگے۔ باہر جانے والوں کو تو ایک وقت میں اصل حقیقت آشکار ہو گئی اور وہ اس بڑے نظام کا حصہ نہ بن پائے۔ اپنی روایتی قدروں کو کسی حد تک زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ جبکہ دوسری طرف ان کی اولادیں خالصتاً مغربی رنگ میں رنگ گئیں۔ اپنی ثقافت سے دور ہو گئے۔ اپنی ثقافتی قدروں کو خود ہی توڑ ڈالا۔ نئی نسل محض اپنی ذات تک مٹنے لگی۔ سہولیات نے جہاں ان کی زندگیوں کو سہل کیا وہیں ان کے ہاں مقامی روایات اور ثقافت کی پامالی بھی نظر آنے لگی۔ یہاں کے نوجوانوں اپنے لباس، خوراک، رہائش ہر پہلو میں اپنی ثقافت کو پس پشت ڈالا۔ پچھلی نسل کے لوگوں کے مٹنے کے ساتھ ہی پرانی قدریں بھی زوال پذیر ہونے لگیں۔ عالمگیرت نے اس مقامی ثقافت کو بھی اپنی لپیٹ میں اس طرح سے لیا کہ نئی نسل ثقافت کو اپنانے میں نہ صرف تعامل کرنے لگی بلکہ ان کے نزدیک ان کی پسماندگی کی اصل وجہ بھی ان کی مقامی ثقافت ہے۔ پرانی نسل محض اس ثقافت کے زوال پہ نوحہ کناں ہی ہو سکتی ہے۔

"مابختو، نسوار کی چٹکی نتھنوں سے کھینچتی بہن بھرے بازو چار چفیرے لہراتی۔

"ہائے جینے کا سواد نہ رہا۔۔۔ کبھی اوس میں بھیگتے گھڑوں میں بھرے چوہے کے پانی کا ایک پیالہ پی لو ہو تو دل جگر ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ہائے فریج کی بوتلیں تو نرا ساڑ۔۔۔ہائے! پٹھ کی بوٹیوں میں چونگیں ڈال دیسی گھی میں بھون کے پکاتی۔ چیپڑی تنوری روٹیوں کے ساتھ منہ سے نہ اترتے۔ہائے یہ فارمی گوشت، کھادوں والی سبزیاں نہ شیریں رہی نہ سواد رہا۔"(104)

اس بیان میں ایک مقامی عورت کا مقامی لب ولہجہ دکھائی دیتا ہے وہیں جدیدیت کے نام پہ آنے والی تبدیلی کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مقامی خوراکیں، مقامی فصلیں اور مقامی غذائیں سب کچھ تبدیلی کا شکار ہو گئیں۔ لوگ بڑی مقامیت سے اس قدر مرغوب ہوئے کہ انہوں نے اپنی خوراکوں اور اپنے رسم و رواج کو بھی ترک کر دیا۔ ثقافت کے ضمن میں ناول نگار نے پوٹھوہاری ثقافت کو مختلف کرداروں کے ذریعے سے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ تاہم ان کی زبان و بیان میں کسی قدر بوجھل پن ضرور محسوس ہوتا ہے۔ ایسا قاری جو اس مقامیت سے یکسر ناواقف ہے۔ اس کو ان الفاظ کے سمجھنے میں کسی قدر دشواری ضرور پیش آسکتی ہے۔ ناول نگار نے اگرچہ اس زبان کی بھرمار سے ناول کے مقامی کرداروں کے ذریعے اسے پوٹھوہاری کا نمائندہ ناول بنانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اردو ادب کے قاری کے لیے کسی

قدر بوجھل پن ضرور پیدا کرتا ہے۔ البتہ ثقافت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ناول اس مقامی ثقافت کو سمجھنے میں ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

اکیسویں صدی کے انسان کو اپنی شناخت کی پہچان کے مسئلے کا سامنا بھی ہے۔ جہاں وہ جدید دنیا کا حصہ بن رہا ہے تو وہیں اپنی دھرتی ثقافت سے بھی دور ہو رہا ہے۔ مابعد جدید عہد میں مقامی ثقافتیں تیزی سے رو بہ زوال ہیں۔ انسان تنہائی کے کرب میں مبتلا ہو رہا ہے اس لیے تمام صورتحال میں فرد کی تنہائی اور ثقافتی بحران جنم لے رہا ہے۔ ناول میں اس مقامیت کے عروج و زوال کی داستان اس طرح بیان ہوئی ہے کہ نئی نسل آسائشوں کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافت سے بیزار نظر آتی ہے۔ بڑے نظام کا حصہ بننے کی خواہشمند آخر میں اپنی ثقافت کی چھتری تلے پناہ لینے پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ ناول میں دوسرا رویہ ان لوگوں کا ہی ہے جو بڑی ثقافتوں کا حصہ بنتے ہوئے بھی اپنی مقامی شناخت کو برقرار رکھنے کے درپہ ہیں۔ ناول کا دوسرا حصہ اسی طرز کے بیانیے پر مشتمل ہے۔ اسی پوٹھوہار کے لوگ جو دہائیوں سے مشرق وسطیٰ، یورپ اور امریکہ میں مقیم ہیں۔ انہوں نے اپنی زبان سمیت تمام ثقافت کو اپنی پہچان کے طور پہ برقرار رکھا ہے۔ شاید اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ ان کی اصل شناخت ان کی مقامی ثقافت ہی ہے۔ دوسری طرف ان کی اولادیں اپنے علاقوں میں رہنے کے باوجود اس سے بیزار نظر آتی ہیں۔

"ہندوستانیوں نے خود کو تو انگلینڈ منتقل کر لیا تھا لیکن وہ اس ثقافت سے جان نہ چھڑا سکے جس میں صدیوں رہتے چلے آئے تھے۔ انھیں یورپی ثقافت میں انضمام کا خوف اور شناخت گم ہونے کا خدشہ لاحق تھا۔"(105)

مابعد جدیدت کے نقطہ نظر کے مطابق ناول گراں پوٹھوہار کی مقامی ثقافت کو تمام جزئیات نگاری کے ذریعے مقامی کرداروں کے توسط سے ناول نگار نے بیان کیا ہے۔ پوٹھوہار کی ثقافت کی بازیافت کا یہ تجربہ اردو ناول میں مقامیت کے باب میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ ناول نگار کے آباؤاجداد کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ ان کی بزرگوں کی اس دھرتی کے بیان میں ان کا گہرا مشاہدہ/ تعلق نمایاں نظر آتا ہے۔

ناول میں تاریخ و تہذیب اور ثقافت عالمگیریت کی یلغار نے ان ثقافتوں کے زوال میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نوآبادیاتی علاقوں کے ذہنوں کی احساس کمتری مابعد میں نوآبادیاتی عہد میں چلتی آرہی ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ان علاقوں کی نئی نسل بڑی حد تک ان استعماری قوتوں کی چال میں آسانی سے پھنس جاتی ہے۔ جس سے ان مقامی ثقافتوں کو زوال آرہا ہے۔ ناول میں مصنفہ نے اس کا بیان کیا ہے تاریخی اعتبار کے ساتھ مقامیت میں ہونے والی تبدیلیوں کے ذریعے سے ناول نگار نے مقامیت کے مختلف ادوار کا بیان قلم بند کیا ہے۔

مقامیت کا اصل وصف اور رنگ اس کی ثقافت ہوتی ہے۔ مقامیت کے مختلف عناصر اس کا کل ہوتے ہیں۔ شہرِ مرگ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں تخلیق کیا گیا ایسا ناول ہے جس میں تاریخی اعتبار سے گزشتہ صدیوں کے

نوآبادیاتی عہد کا شعور ملتا ہے۔ ناول میں اگرچہ طے شدہ کوئی واضح شہر کا نام اور تصور تو موجود نہیں ہے۔ ناول میں موجود عوامل اور عناصر سے اس میں مشرق بالخصوص برصغیر کی مقامیت کا احوال ملتا ہے۔ ناول میں مقامی لوگوں کی بے بسی، مفلسی اور مفلوک الحالی سے لے کر ان کی بے بسی کی موت تک کا بیان ہے۔ ناول میں برصغیر کی مقامیت کے واضح شواہد موجود ہیں۔ نوآبادیاتی عہد میں استعماری قوتوں نے کس طرح مقامی لوگوں کی زندگیوں کو اجاڑا۔ ان کے وسائل پہ قابض ہوئے اور نوابین کی زندگیاں گزاریں۔ ناول کے بارے میں جواد حسین بشیر لکھتے ہیں:

> "ناول میں ایک شہر تو ہے لیکن یہ کسی شہر کی کہانی نہیں اور نہ کسی شہر کے عروج و زوال کا نوحہ ہے۔ مشرقی اور غربی حصوں میں منقسم ایک بے نام شہر ہے البتہ اس کے نقشے اور چند دیگر تفصیلات کو مد نظر رکھیں جیسا کہ لوگوں کا رہن سہن کرداروں کے نام بعض مبہم اور غیر مبہم حوالے واضح کلچر اور مذہبی کوڈز اور Intertextulite کی بلاواسطہ موجودگی ایسے میں شعوری اور لاشعوری طور پر ایک مانوس دور کا منظر نامہ ابھر کر سامنے ضرور آتا ہے۔ جسے شاید یا پھر باسہولت نوآبادیاتی دور سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔"(106)

ناول میں اگرچہ واضح طور پر کسی شہر کا تصور تو نہیں ہے۔ اسی طرح ناول میں کسی مخصوص مقامیت کا بیان تو نہیں تھا تاہم یہ برصغیر کے مقامی آبادی کا نوحہ ضرور ہے۔ روز مری کا کردار استعماری قوتوں کا نمایاں کردار ہونے کے باوجود رحم دلی اور ہمدردی کے جذبات سے معمور کردار ہے۔ روشن آراء اور رمضو(رمضان) مقامیت کے نمائندہ کردار ہیں۔ ان کرداروں کا تعلق مقامیت سے ہے۔ ان کے ذریعے ہی ناول میں مقامی ثقافت کا سراغ ملتا ہے۔ روشن آراء زمینداری اور جاگیرداری عہد کا نمائندہ کردار ہے۔ نوابوں کی عیاشیاں، طوائف کا کلچر مقامی ثقافت کے اہم پہلو رہے ہیں۔ ناول میں روشن آراء کے ماضی کے بیان میں نواب کا تذکرہ اس سماج کی عکاسی کرتا ہے۔ نواب اپنی دولت کو نئی طوائفوں کے حسن کے سحر میں کھو کر کس طرح اڑاتے ہیں۔ ایک طرف مقامی لوگوں کی غربت تو دوسری طرف نوابین کی عیاشیاں استعماری قوتوں کے تسلط کو مضبوط کرنے میں ان پہلوؤں کا بھی کردار رہا ہے۔ روشن آراء اور نواب کے بیان میں ناول نگار نے اس عہد کا نقشہ کھینچا ہے۔ طوائف کا کلچر برصغیر کے تمام بڑے شہروں میں موجود تھا۔ جسم کی فروخت کا یہ کاروبار ثقافتی رنگ اپنا گیا اور ان طوائفوں کے بازار ثقافت کا نمونہ بننے لگے۔ عوام اور خواص دونوں ہی ان کا رخ کرنے لگے یہاں تک کہ مقامی حکمران اور نوابین کبھی کوٹھوں کے در پہ آتے تو کبھی ان کی حویلیوں میں ساز و رنگ کی محفلیں جمتیں۔

> "اسی لمحے وہ ناچ رہی تھی اور اسے دیکھنے والے سب بے حال ہوتے تھے۔۔۔ نواب دولت مرزا کے پاس کتنی دولت تھی اس کا انہیں خود بھی کچھ پتہ نہ ہوگا۔۔۔ پر وہ اسے دونوں ہاتھوں سے لٹا رہے تھے۔۔۔ خود ہی اس دولت کو لٹا رہے تھے تو ان کو لوٹ لینے میں کیا حرج تھا۔۔"(107)

ایسی عشقیہ داستانیں کئی نوابوں کی موجود ہیں۔جو کسی طوائف کے حسن کے سحر میں کھو کر اپنے منصب اقدار اور حتی کہ عزت سے بھی محروم ہو گئے۔ مقامیت کے ان کرداروں سے اس مقامیت کو واضح کیا گیا ہے۔ مرزا نواب کی دولت مرزا کا بیان بنیادی طور پہ مقامی نوابین کا ایک نمائندہ کردار ہے۔اس کردار کے ذریعے مصنف نے اس عہد میں مقامی زمینداروں، جاگیر داروں اور نوابوں کے اس رخ کو بے نقاب کیا ہے کہ وہ محض اپنی ذات تک محدود ہو گئے رقص و سرور کی محفلوں میں مست رہے اور سلطنت اور اپنی رعایا کے بارے میں ان کو چنداں فکر نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ استعماری قوتوں نے برصغیر کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

"شکار اور رقص ان کے دو مشغلے تھے شکار سے واپس آتے تو اونچے کنگرے والی حویلی میں رقص کی محفلیں سجاتے۔"(108)

ناول نگار نے علامتی شہر کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ایک حصہ مقامی، استعماری اشرافیہ کا اور دوسرا مقامی لوگوں کا یہ مقامی حصہ ہی مقامیت کی ثقافت کا آئینہ دار بھی ہے۔ان کی مفلوک الحالی کا بیان بھی، نو آبادکاروں کے ظلم کا شکار، آئینہ دار بھی یہ مقامی لوگ ہی مقامی رسم ورواج اور ثقافت کے نمائندے ہوتے ہیں جبکہ مفاد پرست ٹولہ تو محض اپنے مفادات کی خاطر کوئی بھی رنگ اپنا سکتا ہے۔ان کو نہ تو اپنی مٹی سے نہ اپنی دھرتی سے اور نہ ہی اپنی ثقافت سے پیار ہوتا ہے۔ان کو اگر محبت ہے تو صرف اپنی ذات سے جو اپنے ذاتی مفادات اور دولت کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی مٹی کا سودا کرتے ہوئے بھی نہیں گھبراتے ڈاکٹر غلام فرید لکھتے ہیں۔

"نوآبادیاتی جبر اور ظلم کو براہ راست کسی سانحے سے واقعہ نہیں کیا گیا بلکہ انہیں مختلف چھوٹے چھوٹے وقوعوں سے محسوس کروایا گیا ہے۔ قبرستان، قبریں، وباء اپنے وطن میں جھانکنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ ایسا شہر ہے جہاں غریب، مفلوک الحال، اور بے بس لوگ مسلسل موت کا شکار ہو رہے تھے۔"(109)

ناول میں ایک قدیم شہر کا تصور ابھرتا ہے۔ غربت کے ساتھ ساتھ اس کے قدیم اور تاریخی ہونے کے شواہد بھی ملتے ہیں۔ مقامی لوگوں کے پاس وسائل ناپائید ہیں۔ تنگ و تاریک گلیوں میں رہنے والے لوگوں کی بے بسی دکھائی دیتی ہے۔ ناول نگار نے علامتی طور پر تخلیق کردہ اس ناول میں محکوم اور مظلوم طبقے کی نمائندگی کی ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں اس طرح کے معاملات کئی جگہوں پہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

"اندرون شہر کی گلیاں تنگ تھی اور ان میں صفائی کا بھی خاص انتظام نہ تھا۔۔۔ جگہ جگہ کوڑا کرکٹ بکھرا نظر آتا۔۔۔ اکثر بچوں کو اس نے ننگ دھڑنگ پھرتے دیکھا جبکہ بڑوں کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے لوگوں کے چہروں سے غربت عیاں تھی۔"(110)

ناول میں نظر آنے والی صورتحال موجودہ دور کے افریقہ یا کسی بھی غریب ملک کا بیان ہو سکتی ہے۔ ناول میں موجود کرداران کے نام، ان کے مذہب، ان کے رسم ورواج، ان کے اٹھنے بیٹھنے، زبان و بیان سے یہ اندازہ ضرور ہوتا

ہے کہ ناول میں برصغیر کی مقامی زندگی کا بیان ہے۔ شہر مرگ میں ہندوستان کے مقامیت کا بیان واضح انداز میں دکھائی دیتا ہے۔ ناول میں بظاہر کوئی واضح شہر کا نام نہ ہونے کے باوجود بھی خارجی شواہد سے ہندوستان کی مقامیت کو بیان ملتا ہے۔ مقامیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ تو نہیں کیا گیا تاہم چند ثقافتی عناصر ناول میں ملتے ہیں۔ ناول میں دوسرے ناولوں کی طرح انداز نہیں اپنایا گیا۔ مابعد جدیدیت کے تصورِ مقامیت کے حامل اس ناول میں مشرقی تہذیب کے پیرائے میں ہندوستان کے ان پسماندہ شہروں کی مقامیت کا بیان ضرور دکھائی دیتا ہے۔

دائرہ میں عاصم بٹ نے لاہور کی مقامیت کو موضوع بنایا ہے۔ ناول نگار کا اپنا تعلق بھی لاہور سے ہے۔ وہ اس فضا کو نہ صرف لفظوں میں پروتے ہیں۔ ان کے بیانیے میں مقامی ثقافت اپنے تمام تر عناصر کے ساتھ مقامی کرداروں کے کرادر میں متحرک دکھاتے بھی ہیں۔ ناول نگار نے قاری کو لاہور کی جدید و قدیم زندگی کے تصور سے روشناس اس طرح کرایا ہے کہ قاری خود کو بھی لاہور کے ان چوراہوں، سڑکوں تنگ وتاریک گلیوں کے گوشوں میں متحرک محسوس کرتا ہے۔ لاہور کی سینکڑوں سالہ قدیم تاریخ کا بیان ہو یا موجودہ نسل کا داخلی انتشار، قدروں کا زوال، پرانے محلوں میں پایا جانے والا رکھ رکھاؤ، مروت ولحاظ سبھی کچھ اس ناول میں موجود ہے۔

ناول میں جدید دنیا کا المیہ یعنی فرد کی تنہائی کا تصور بھی گہرا ہے۔ مابعد جدید دنیا میں اصل مسئلہ داخلی بحران، فرد کی تنہائی اور شناخت ہی تو ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اسی داخلی بحران کا شکار ہے۔ وہ بظاہر پر سکون، شہرت آمیز زندگی، سہولتوں سے مزین عارضی خوشحال زندگی میں خود کو اس قدر گم کر دیتا ہے کہ بالآخر اسے اپنی ذات کو تلاش کرنے میں بھی دشواری ہوتی ہے۔ مابعد جدیدیت کا تصورِ مقامیت اسی جمود کو توڑنا چاہتا ہے۔ بڑی ثقافتوں میں چھوٹی ثقافتوں کے مدغم ہونے کے ساتھ ساتھ فرد کی تنہائی اور اس کی شناخت کے بحران کا مسئلہ جنم لیتا ہے۔ ان مقامی ثقافتوں کی حوصلہ افزائی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ناول میں مقامی ثقافت کا تفصیل سے بیان ہے وہی جدید انسان کی المیے کا بھی جو اپنی ذات کو ایک دوسرے نظام کے تابع کر کے اپنی اصل شناخت سے محروم ہو جاتا ہے۔

> "محمد عاصم بٹ کا ناول شہری زندگی اور فرد کی اکائیت پر مشتمل ماجرا ہے۔ جہاں فرد نے اپنی شناخت گم کر دی ہے۔ کیونکہ وہ اب کائنات کا مرکز رہا ہی نہیں۔ عاصم بٹ کے افسانوں اور ناول دائرہ کا موضوع بھی زندگی کے لیے معنویت، لغویت اور بے کیفی ہے جو جدید انسان کا المیہ بن چکی ہے۔"(111)

جدیدیت یا دوسری ثقافتوں کے اثرات شہروں میں جلدی اور تیزی سے اثرات قبول کیے جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں میں تبدیلی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ جو جلد ہی دوسری ثقافتوں سے متاثر اور مغلوب ہو جاتے ہیں۔ یہی صورتحال گزشتہ چند دہائیوں سے دیکھنے میں آرہی ہے۔ شہروں میں جدیدیت کے نام پہ ہونے والی ان تبدیلیوں سے لوگ بڑی تعداد میں اپنی اصل شناخت سے محروم اور دور ہو رہے ہیں۔ ناول میں جدید عہد کے المیے کا بیان ہے کہ فرد کس طرح ہیجان کا شکار ہو جاتا ہے۔ ناول نگار نے قدیم اور جدید کے تقابل کی فضا سے نئی نسل کے داخلی انتشار کا بیان

بھی کیا ہے۔ مقامیت کے ثقافتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ نئی قدروں کے غلبے اور پرانی قدروں کے زوال کا نوحہ بیک وقت ناول میں موجود ہے۔ جدید عہد میں انسان تشفی اور مصنوعی رنگینوں کا اسیر ہو چکا ہے۔ وہ حقیقت سے زیادہ عارضی بنیادوں کی طرف متوجہ دکھائی دیتا ہے۔ لوگوں کے ایسے مرکز کی طرف رواں دواں ہیں جہاں پہنچ کر وہ اپنی شناخت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ اس نئے مرکز کا حصہ ہوتے ہوئے بھی ادھورے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار اسی کشمکش کا شکار ہے۔ اس کرب میں ناول نگار نے جدید دور میں ہونے والی تبدیلیوں کو دکھایا ہے کہ ان بھول بھلیوں میں کس طرح سے لوگ ان کے پرکشش نعروں اور ان بھول بھلیوں کا شکار ہو کر ذہنی رجحان اضطراب اور پریشانیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جہاں نہ تو واپس پلٹنے کا کوئی راستہ باقی رہتا ہے اور نہ ہی اس نظام کا مستقل حصہ بننے کو وہ ذریعہ عافیت خیال کرتے ہیں۔

> "اس دور میں زندگی اتنی الجھ گئی ہے کہ انسان اپنی پہچان بھول کر اس مصنوعی دنیا میں کھو گیا ہے۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ وہ اپنے باطن میں جھانک سکے۔ لیکن محمد عاصم بٹ کے ناول "دائرہ" کے کردار راشد کا یہ مسئلہ ہے کہ وہ پہچان چاہتا ہے۔ وہ اپنے اندر خود کو تلاش کرتا ہوا بھی نظر آتا ہے اور اس طرح پوری کہانی دائرہ میں گردش کرتی رہتی ہے۔"(112)

مابعد جدیدیت صورتحال کا آئینہ دار یہ ناول جہاں جدید انسان المیے کو بیان کرتا ہے وہیں مقامیت کی ذیل میں اس ناول میں لاہور کی مقامی ثقافت کا بیان بھی تفصیل سے ہوتا ہے۔ ناول نگار نے لاہور کی مقامی ثقافت کے ماضی کے ساتھ ساتھ حال کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ناول میں جگہ جگہ لاہور کی ثقافت متحرک دکھائی دیتی ہے۔ مابعد جدید عہد میں اب بڑے شہروں میں گلوبلائزیشن کا تصور مزید مستحکم اور تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے۔ شہروں کے لوگ اس پرکشش تصور کے جال میں جلدی پھنستے چلے جا رہے ہیں جو بظاہر تو فائدہ مند ہے۔ اس کے دور س نتائج میں مقامی ثقافتوں ہی کا نقصان ہے۔ دائرہ میں عاصم بٹ نے لاہور کے مقامی ثقافت کو بھرپور انداز میں اس زوال اور عروج دونوں پیرائیوں میں بیان کیا ہے۔ لاہور کی ثقافت کے بیان میں سب سے اول ذکر تو ان بازاروں کا بنتا ہے جن میں شہر کی ثقافت قائم ہے۔ ان بازاروں میں لاہور کے شہر کی زندگی مختلف کرداروں کے حوالے سے مختلف حوالوں سے بیان ہوئی ہے۔ ناول کے آغاز میں ان بازاروں کا احوال ناول نگار نے جو بیان کیا ہے۔ وہ لاہور کی مقامی ثقافت کی معراج بھی ہے اور اس کی پہچان بھی۔

> "سکول پہنچنے کے لیے اسے جانی پہچانی ٹھنڈی گلیوں کے بجائے لوہاری گیٹ سے باہر پرہنگامہ سڑکوں سے گزرنا اور اردو بازار سے ہو کر جانا پڑتا جو چھٹی کے وقت بے شمار گدھا گاڑیوں، بیل گاڑیوں، ریڑیوں اور لوڈر ویگنوں ، رکشاؤں، سائیکلوں، راہگیروں اور دکانوں کے باہر فٹ پاتھ پر پڑے کتابوں، کاپیوں اور کاغذ کے گھڑوں سے اٹا ہوتا۔"(113)

لاہور کی مقامی ثقافت کا بیان اس کے کھیل، مشاغل، فنون لطیفہ کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ لاہوری خوش خوراک اور خوش مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف مشاغل میں بھی اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔ لاہور کی ثقافت کے ساتھ پتنگ بازی کا کھیل اور تہوار بھی مخصوص ہیں۔ پتنگ بازی لاہور میں محض کھیل ہی نہیں اس کی ثقافت کا اہم جزو ہے۔ جسے باقاعدہ تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ کھیل ہی کھیل میں لاہوری گھروں کی دیواروں سے نکل کر چھتوں کا رخ کرتے ہیں۔ موسم بہار میں اس تہوار کو منایا جاتا ہے۔ ناول نگار نے اس اہم تہوار کا بھی تذکرہ ناول میں مختصراً کیا ہے۔ مقامیت کی بات اس کے بغیر ادھوری ہی ہے۔ یہ ان لوگوں کی تفریح کا ذریعہ بھی ہے اور ایک کھیل کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

"وہ بدری چائے والے کی دکان کے باہر بینچ پر بیٹھا تھا۔ بلے گڈی فروش کے ساتھ چائے پیتے ہوئے اگلی پسند کے لیے جو مہینہ بھر بعد میں شروع ہونے والی تھی۔ پتنگوں اور غریب بازروں کی بابت گفتگو کر رہا تھا۔" (114)

لاہور کی مقامی ثقافت کے ساتھ جڑا ایک اہم مقام ہیرامنڈی ہے۔ لاہور کی ثقافت میں یہ جگہ نمایاں مقام رکھتی ہے۔ یہ جگہ محض جسم فروشی کا بازار ہی نہیں بلکہ لاہور کی ایک اہم ثقافتی مرکز بھی بن گیا۔ جہاں باذوق افراد، موسیقار جمع ہوتے ہیں اور بازار بھی آباد ہوئے۔ وقت کی رفتار نے اس بازار کو معدوم کر دیا ہے۔ ناول پرانی ثقافت کے مٹنے کا نوحہ بھی پڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ بازار لاہور کے مقامیت میں ایک اہم مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں موسیقی شعر و شاعری فنون لطیفہ کے ساتھ ساتھ ایک اہم کاروباری مرکز بھی بن گیا۔ ہیرامنڈی کے ارد گرد بننے والے بازار اہم معاشی سرگرمیوں کا بھی مرکز بن گئے ہیں۔ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ یہ تمام قدریں ختم ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس بازار کے حوالے سے یاسر جواد رقم طراز ہیں کہ:

"ہیرامنڈی لاہوریوں پر مسلسل اپنے نغمے نچھاور کرتی رہی۔ شام کے وقت یہ مقام خوش طبعی اور قہقہوں کا مرکز بن جاتا۔ سورج غروب ہوتے ہی لوہاری دروازے کے باہر انارکلی کی گزرگاہوں پر جہاں بہت سے ریسٹورنٹ اور شراب خانے واقع تھے۔ ٹانگوں کی قطاریں لگ جائیں جو نشاط پرستوں کو ان کی منزل تک پہنچاتے۔" (115)

ناول نگار اس کا بیان ماضی کے پیرائے میں ضرور کرتا ہے جبکہ نئی نسل کو ثقافت کے آنے سے ان گانے بجانے والوں کی وہ پرانی وضع قطع تبدیل ہو گئی۔ جہاں جسم فروشی جیسے مکروہ دھندہ تو اب بھی درپردہ ہوتا ہو گا لیکن وہ مخصوص ثقافت وہ مروت و لحاظ وہ رکھ رکھاؤ باقی نہ رہے اور باقی رونقیں اور محفل ختم ہو گئی ہیں۔ ناول میں اندورن لاہور کے بیان میں ناول نگار مقامی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ وضع داری رکھ رکھاؤ اس ماجد ان کی بھرپور عکاسی ان مکینوں کے ہاں اب بھی ملتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ عزت و احترام کے رشتے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔

ناول میں جہاں مقامی ثقافت کا بیان ہے وہیں اس کے معدوم ہونے کے خدشات/اثرات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔عاصم بٹ اس ناول دائرہ کا اصل موضوع ہی یہی ہے۔معدوم ہوتی ثقافت تہذیب میں پرانی وضع داریاں ختم ہو رہی ہیں۔جدیدیت کے پیرائے میں زندگی نئے مسائل سے ہمکنار ہو رہی ہے۔تہذیبوں کے بدلاؤ سے انسان اپنی شناخت بھی گم کر رہا ہے۔عالمگیریت نے اس کو اس کے اصل شناخت سے بھی محروم کر دیا ہے۔راشد کا کردار جدید انسان کا نمائندہ کردار ہے یہ کردار تمام مادی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود بھی اپنی شناخت کو کم گم کر دیتا ہے۔ڈاکٹر کامران عباس کاظمی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

"راشد ایسا کردار ہے جو شناخت کے بحران کا شکار ہے اور جب فرد سماج میں کوئی شناخت ہی نہ رکھتا ہو تو زندگی اس کے لیے بے معنویت معاشرت اجنبیت کا مجموعہ بن جاتی ہے۔دراصل یہ ایک کردار نہیں بلکہ سماج کا نمائندہ کردار ہے ۔جو مابعد جدید صورتحال میں فرد فرد سے کٹ چکا ہے اور اپنی مرکزی حیثیت سے نبرد آزما ہے۔"(116)

مابعد جدید نقطہ نظروں سے ناول میں مقامی ثقافت کا بیان تفصیلاً سے ملتا ہے۔ناول میں موجود کردار یہاں کی ثقافت کے مختلف پہلوؤں سے اب بھی جڑے ہوئے ہیں۔قدیم لاہور کے باسیوں کے ہاں اب بھی پرانی ثقافت کے نمونے ملتے ہیں۔تاہم جدیدیت کے آنے سے فرد فرد سے کٹ رہا ہے اور اپنی ثقافت سے بھی محروم ہو رہا ہے۔جہاں بڑے پیمانے پر ہونے والی تبدیلیوں میں فرد کی ذہنی کشمکش نے اس کو مزید الجھا دیا ہے۔یہ ناول اس حوالے سے ایک اہم حوالہ ثابت ہوتا ہے۔جہاں اپنی مقامی ثقافت کا بیان کرتا ہے وہیں۔جدید انسان کا رویہ بھی قابل غور اور قابل ذکر ہے ۔جس نے اپنی ثقافت کو خود ہی معدوم کر کے ایک ایسی ثقافت کا حصہ خود کو بنالیا ہے۔جہاں وہ خود بھی آسودہ نہیں ہے ۔پلٹ کر اپنی مقامی ثقافت کی طرف ہی دیکھتا ہے۔

دائرہ کی طرح بھید میں بھی عاصم بٹ نے لاہور کی مقامیت کو بیان کیا ہے۔لاہور کی ثقافت کو ماضی حال کے خوبصورت سے امتزاج سے بیان کیا گیا ہے ۔ایک طرف پرانی تہذیب کے معدوم ہونے کا نوحہ ہے تو دوسری طرف نئی نسل کے مزاج کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔عاصم بٹ نے بھید کا سراغ پانے کی کوشش کی ہے۔ناول کا موضوع لاہور کی مقامی ثقافت کا بیان ہے۔ ناول کا پلاٹ بے ربط ہے۔ناول کے کرداروں کا تعلق لاہور کے عموماً متوسط طبقے سے ہے۔زیادہ تر نوجوان کردار ہیں۔جو اپنی ثقافت کے آئینہ دار ہیں۔یہ نوجوان آنے والی زندگی سے کسی حد تک غیر مطمئن اور اضطراب میں مبتلا ہیں۔ان کرداروں میں زندگی کی بے یقینی بے چینی دیکھی جا سکتی ہے ۔نوجوانوں کا اضطراب ان کو نہ صرف زندگی سے بے زار کر رہا ہے۔ بلکہ وہ اپنی دھرتی سے بھی دور جانے تیار ہیں۔ مستقبل کی بے یقینی ان کو ایسا کرنے پہ اکساتی ہے۔ناول نگار نے جدید عہد میں ہونے والے ان مسائل کا مقامی کرداروں کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔ خصوصاً ایسے معاشرے جہاں معاشی حالات غیر مستحکم اور سیاسی عدم استحکام

ہیں وہاں کی نوجوان نسل اپنی مستقبل کی غیر یقینی صورتحال کے پیش نظر اپنے ملک وطن معاشرے کو چھوڑنے کو تیار ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ اس بات سے بھی واقف ہیں کہ اس ہجرت میں ان کے لیے بہت سی مشکلات بھی کارفرما ہیں۔ بعض تو ایسے ہیں جو غیر قانونی راستوں سے بیرون ملک جانے کی تگ و دو میں اپنی زندگیوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ تاہم وہ اس سوچ کے تحت کہ اگر وہ کسی صورت میں کامیاب ہو گئے تو ان کے آنے والی نسلیں اس کرب سے نہ گزریں گی جس سے وہ گزر رہے ہیں۔ معاشی حالات کی بہتری ان کو اپنی دھرتی سے بھی جدا کر رہی ہے اور بالآخر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جب وہ معاشی طور پہ تو خوشحال ہو جاتے ہیں۔ تاہم ان کا ذہنی اضطراب اور شناخت کے بحران کا مسئلہ جنم لیتا ہے۔ وہ اپنی شناخت کو بھی گم کر بیٹھتے ہیں۔ وہ ذہنی اذیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ناول میں متوسط طبقے کے کرداروں کے ذریعے سے اس مقامیت کے مختلف خدوخال کو واضح کیا گیا ہے۔ جہاں مستقبل غیر یقینی بھی ہے۔ جہاں ثقافتی رنگ بھی ہیں قدیم اور عہد جدید تہذیب کا ملاپ بھی ہے اور اسی میں زندگی کا سامان بھی ہے۔ لاہور شہر کی زندگی کو ایک بار پھر بھید میں عاصم بٹ نے بھرپور طریقے سے ان کرداروں کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔ عرفان احمد رفیق کے الفاظ اس پوری فضا کو واضح کرتے ہیں۔ جس کی عکاسی عاصم بٹ نے اپنے مقامی کرداروں کے ذریعے سے کی ہے۔

> "وہ اپنی زندگی کو ڈاکومینٹ کرنا چاہتا ہے اور اپنے عہد کی گواہی بھی بنتا ہے اور گواہ بھی۔۔۔ جتنے بھی مسلط کیے گئے سیاسی نظریات اور مذہبی الیے ہیں وہ لاہور شہر کی گلیوں، محلوں، مکانوں تھڑوں، فٹ پاتھوں پر رینگتے دوڑتے بے سدھ پڑے انسانی نہیں کرداروں کے الیے ہیں اور یہی الیے زندہ رہنے کی تحریک بھی اور موت سے رومان کا جواز بھی۔ وہ ریاض مودے کی کہانی ہے۔ الیاس مندریاں والی کی زندگی ہے۔ حمید چائے والے کا ٹھیہ ہے۔ انسانوں کی اس بھیڑ کا بھید اس ہجوم میں ہے۔"(117)

ناول میں لاہور کی مقامیت کو جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مابعد جدید نقطہ نظر کا حامل یہ ناول نہ صرف لاہور کی ثقافت کا ترجمان ہے۔ اس معدوم ہوتی ثقافت کے خدشات کا اظہار بھی ہے۔ متوسط طبقے کے یہ کردار جو اس مقامیت کے رکھوالے اور اس کے امین ہیں داخلی بحران کا شکار ہیں۔ ان کا یہ داخلی بحران اس مقامی ثقافت کے زوال کا ذریعہ بن رہا ہے۔ ناول کے مختلف کرداروں میں زندگی کی بے چینی دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ وہ اس مقامیت کے نمائندے اور علمبردار بھی ہیں تاہم اس کے باوجود ان کا معاشرتی نظام ان کو اس مقامیت سے منحرف کر رہا ہے۔ وہ بجائے اس کے کہ اپنے مقامیت کا ارتقاء کا سلسلہ جاری وساری رکھیں۔ وہ اس ایک بڑے نظام کا حصہ بننے کے متلاشی اور خواہش مند ہیں۔

> "ناول نگار نے کرداروں کے حالات اور ماجرے کے تجربات میں زندگی اور اس کی ماہیت کا بھید بھاؤ اس طرح کیا ہے کہ حقیقت میں رمز اور ماجرے میں علامت کی جہت کامیابی سے پیدا ہوئی اور قائم رہی ہے۔"(118)

ناول میں متوسط طبقے کرداروں کے ذریعے سے لاہور کی مقامی ثقافت دکھائی دیتی ہے مابعد جدیدیت جن میں مقامی ثقافتوں کے بیانیے کی بات کرتی ہے۔ ناول میں اس کے تمام عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ مقامیت ان کرداروں کے ذریعے سے واضح ہوتی دکھائی جاتی ہے۔ لاہور کی ثقافت میں لوگوں کا گٹھ جوڑ عموماً ہوٹلوں، ڈھابوں پہ ہوتا ہے۔ یہ پہلوان کی معاشرتی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے۔ ناول نگار نے جہاں نئی نسلوں کا داخلی بحران بیان کیا ہے وہیں پہ آج بھی لاہور کے مقامی ثقافت کے نمونے بھی موجود ہیں۔ مقامی ثقافت میں ان ہوٹلوں پہ بیٹھے یہ لوگ مختلف موضوعات پہ گفتگو بھی کرتے ہیں اور ان ہوٹلوں کی رونق بڑھاتے ہوئے لاہور کی زندہ دلی کے شاہد اور گواہ بھی ہیں۔

"اعظم ٹی سٹال کے علاوہ بھی صحافیوں کی ٹولیوں کی ایک پناہ گاہ تھی۔اور وہ تھا ٹیمپل روڈ کا تھڑا ریسٹورنٹ۔"(119)

اندرونی لاہور میں لاہور کی مقامی ثقافت کے رنگ پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہیں۔ تنگ و تاریک گلیوں میں رہنے والے لوگ آپس میں ایک مخصوص نظام کے تحت جڑے ہیں۔ ان کی جڑت مقامی نوعیت کے رسم و رواج سے روایت کی بنا پر ہے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھ خوشی غمی میں بھرپور شریک ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں دکھ، خوشی دونوں بانٹنے سے ہی بہتر طور پہ گزاری جاسکتی ہیں۔ مقامی شادی بیاہ کی رسوم و رواج بھی مخصوص مقامی ثقافتی رنگوں سے مزین دکھائی دیتے ہے۔ ڈھول پنجاب کا خاص ساز ہے۔ اس میں مقامی ثقافت جھلک پوشیدہ ہے۔ ایک شادی کے بیان میں ان لوگوں کا آپس میں خلوص اور مروت دکھائی دیتا ہے کہ یہ ایک ایسے معاشرتی نظام کا آج بھی حصہ ہیں۔ جہاں آپس کا ایک گہرا سماجی بندھن اور قلبی رشتہ ہے۔ جو ایک دوسرے کی خوشی غمی میں اچھے طریقے سے شامل ہوتے ہیں۔ قدیم آبادیوں میں آج بھی اس کی رمز باقی ہے۔ جدید ہاؤسنگ کالونیوں کے رہائشی علاقے کبھی اس کیفیت سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ بلکہ وہ مغربی طرز کے حامل سکون کے متلاشی ایسے مکین ہیں کہ جن کو اس بات سے خبر ہی نہیں کہ ان کے آس پاس میں کون رہ رہا ہے۔ یا ارد گرد کا فرد کس حال میں ہے جبکہ ان اندرون شہر کی قدیم گلیوں میں بسنے والے لوگ آج بھی اپنی قدیمی روایات اور ثقافت کے تحت اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں۔

"وہیلے کو سنہری تلے والے اچکن پہنائی گئی۔ سر پر پگڑی اور چہرے پر پھولوں کی ٹریوں والا سرا سجایا گیا۔ پندرہ، بیس لونڈے اکٹھے ہوئے اور ایک بارات کی صورت میں ترتیب دی گئی۔ ایک لڑکا کچھ گاتا ہوا آگے چلا۔ کوئی ڈھول بجا رہا تھا۔ باقی سبھی ناچ رہے تھے۔ جب کہ درمیان میں وہیلا دکھا پنے سر جھکائے چلا جاتا تھا۔ اس بارات میں بھاٹی چوک تک پہنچتے پہنچتے کتنے مرد، بچے اور عورتیں شامل ہو گئیں۔ یہ مختصر بارات اس علاقے میں جلوس کی صورت اختیار کر گئی۔"(120)

عاصم بٹ لاہور کی ثقافت کو بیان کرتے ہوئے کسی بھی پہلو کو نظر انداز کرنے کو تیار نہیں ہے۔ عاصم بٹ تمام تہواروں، رسم و رواج کو بیان کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ جو اس مقامیت کی وجہ تسمیہ ہوں۔ لاہور کے

ذکر میں پتنگ بازی (بسنت) کا ذکر نہ ہو تو اس کا ذکر ادھورا ہی معلوم ہوتا ہے۔ لاہوریوں کی زندگی میں نوجوانوں کے مشاغل میں سے قدیم روایتی مشغلہ پتنگ بازی ہے۔ کہیں محض کھیل، تفریح تک، تو کہیں جنوں کی حد تک موجود ہے۔ گھروں کی چھتوں پہ پتنگ اڑاتے یہ نوجوان، بوڑھے، بچے سبھی اس میں شامل ہوتے ہیں۔ بہار کے موسم میں آنے والے اس تہوار کو بھرپور طریقے سے منایا جاتا ہے۔ جدید دور میں جہاں بہت سی رسومات اور چیزوں کا خاتمہ ہو رہا ہے وہیں اس کھیل کو بھی زوال آ چکا ہے۔ جہاں اس کھیل میں بہت سی قباحتیں شامل ہوئی ہیں وہیں موبائل فون کے آنے سے نوجوان نسل اب کھیلوں اور میدانوں کا کم ہی رخ کرتی ہے۔ ان کے شب و روز کا زیادہ حصہ موبائل پہ ہی گزرتا ہے۔ ناول نگار نے اس کھیل کی باقیات کو بیان کر کے اس مقامی ثقافت کے پہلو کو ایک جلا بخشی ہے۔ اس کھیل کو باقاعدہ تہوار کی صورت میں منایا جاتا تھا جو لاہوریوں کی مقامی روایت کا ایک اہم حصہ ہے۔ ناول میں نوید کے کردار کے ذریعے سے اس کا کچھ احوال ناول میں کچھ اس طرح سے بیان ہوا۔

> ان سب کچھ کے درمیان ہر نمبر کی ڈور، پتنگیں، گڈے پریاں رکھی ہوئی تھیں۔ جن میں سے بیشتر کو اس نے ادھر ادھر سے لوٹا تھا۔ اپنے کمرے اور دوستوں کی صحبت کے علاوہ دن کا بڑا حصہ وہ پتنگ بازی کے شوق کی نذر کرتا۔ چھت پر چڑھا رہتا۔ آسمان کو تاکتا پتنگیں اڑاتا کم تھا۔ ان کے پیچ پڑھتے دیکھنے اور انہیں لوٹنے کا شوق زیادہ تھا۔"(121)

لاہور کی مقامیت میں طوائف کا کردار بھی ایک اہم کردار ہے۔ بازار حسن (ہیرا منڈی) کا تذکرہ بھی اس کی ثقافت کا ایک اہم حصہ بن گیا ہے۔ یہ محض جسم فروشی کا ایک بازار ہی نہیں لاہور کی مقامی ثقافت میں ایک اہم مقام کی حیثیت ااختیار کر چکا ہے۔ عاصم بٹ کے ناول دائرہ میں اس تناظر میں تفصیل سے تذکرے موجود ہیں۔ ناول نگار نے اس مختصر تذکرے سے ہی صحیح اس طرف اشارہ ضرور کیا ہے۔ اس کا اہم کردار طوائف ہی ہے۔ ناول نگار کا باریک مشاہدہ اس تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں بھی ایک مکمل نظام موجود ہے۔ اس بازار میں رہنے والے بھی اپنی روایتی رسموں کے نظام کے تحت چلتے ہیں۔ اس کی رسموں کے ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "معلوم ہوا لڑکی کی نتھی اتارنے کی رسم ادا ہونے کو تھی۔ بڑی بولی لگانے والے کے ہاتھ ہی نگینہ آئے گا۔"(122)

ناول میں متوسط طبقے کے مسائل بھی ہیں۔ ان کے ذریعے مقامیت کو بیان کیا گیا ہے۔ متوسط طبقے کے نوجوانوں کے ضمن میں ان کے اندر پلنے والے رجحان کو جدید دور کے تقاضوں کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ جدید نسل ذہنی ہیجان میں مبتلا ہے۔ اکیسویں صدی کا جدید انسان خصوصاً زیادہ تذبذب کا شکار ہے۔ جدید سہولیات سے مزین زندگی نے اس کے داخلی کرب کو بڑھایا ہے۔ معدوم ہوتی ثقافت اور فرد کی تنہائی کا مسئلہ اہم موضوعات ہیں۔ دائرہ کی طرح بھید میں بھی فرد کی شناخت کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے۔ بڑی تہذیبوں کے غلبے میں انسان اپنی تہذیب و ثقافت سے

بھی ناطہ توڑ رہا ہے۔ وہ ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں اکیلا رہ جاتا ہے۔ مابعد جدیدیت مقامی ثقافتوں کی بازیافت کی بات کرتی ہے۔ بھید میں ایسے کردار بھی ملتے ہیں جو اپنی شناخت بدلنے کو بھی تیار ہیں تاہم مجموعی طور پر لاہور کی مقامیت ابھی بھی کسی حد تک قائم ودائم ہے۔ مبین مرزا اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

"محمد عاصم نے اس ناول کی فضا اور کرداروں کے احوال میں شہر لاہور کی خاص ثقافتی زندگی کے نقوش کو بڑے سلیقے سے برتا ہے۔"(123)

ناول میں لاہور کی مقامی ثقافت کا بیان تو تمام جزئیات کے ساتھ موجود ہے۔ تاہم آنے والے وقت میں اس بدلاؤ کا بھی مصنف اشارہ دیتا ہے۔ ناول نگار نے اس تہذیب و ثقافت کے معدوم ہونے کے صدمے سے بھی دوچار ہے۔ جدید عہد میں ہونے والی تبدیلیوں سے نہ صرف آگاہ ہے بلکہ اس پر پریشان بھی ہے وقت کے دھارے میں روایتی ثقافت و تہذیب بھی بہتی جارہی اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے :

"یہ شہر مسلسل اپنی صورت بدلنے کے خبط میں مبتلا معلوم ہوتا ہے۔ کوئی شے زیادہ دیر ویسی نہیں رہ پاتی جیسی کچھ دیر پہلے ہوتی ہے۔ تو ایسی ہی کسی تبدیلی یا خبط کا شکار ہوا تھا۔ یہ محلہ بھی اور اس کا نام بدل کر محلہ چوراہیاں کر دیا گیا۔"(124)

ترقی اور خوشحالی انسان کا فطری حق ہے اور اس حق استعمال کرتے ہی انسان آج جدیدیت کی اس انتہا پہ بھی پہنچا ہے۔ انسان ہر آنے والے دن کے ساتھ اپنے حال کو بہتر بنانے کے لیے تگ ودو کرتا ہے۔ شہروں میں ترقی کی رفتار قدرِ زیادہ ہے۔ اور جدید دور میں اس کی رفتار بہت حد تک بڑھ گئی ہے۔ اس جدید زندگی نے انسان کی زندگی کو جہاں سہل بنایا ہے وہیں بہت سے ایسے معاملات بھی ہوئے ہیں کہ جس سے اس کی زندگی میں کافی مشکلات بھی پیدا ہوئی ہیں۔ شہروں میں ہونے والی پے در پے تبدیلیوں نے شہروں کی زندگی کو یکسر بدل کے رکھ دیا ہے۔ شہروں کے لوگوں میں تبدیلی کی آمادگی زیادہ ہوتی ہے۔ جس کے پیش نظر یہاں کے ثقافتی ورثے اور ثقافتی اقدار بڑی حد تک معدوم ہو رہے ہیں۔ لاہور شہر کا شمار پاکستان کے بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔ یہاں پنجاب اور ملک بھر سے لوگ آباد ہوتے ہیں۔ یہاں آنے والے اپنی ثقافت کی آبیاری کے بجائے نہ تو مقامی ثقافت کو اپناتے ہیں بلکہ وہ جدیدیت کے راستے پہ چلتے ہوئے ایسی وضع قطع اختیار کر رہے ہیں کہ اپنی ثقافت اور دھرتی سے یکسر کٹ رہے ہیں۔ رہائش کا طرز ہو یا لباس یا خوراک، ہر طرز میں دوسری ثقافتوں کا غلبہ ان مقامی ثقافتوں پہ زیادہ ہو رہا ہے۔

مجموعی طور پر لاہور کی مقامیت کا بیان مابعد جدید کے تصور مقامیت کا حامل ہے۔ ماضی اور حال کے تقابل سے نسلوں اور افراد کے تجربے سے ناول نگار نے لاہور کی مقامی ثقافت کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔ لاہور کی ثقافت تمام جزئیات کے ساتھ موجود ہے۔ لاہور ایک بڑا ادبی اور ثقافتی مرکز ہے۔ اس مقامیت میں بڑے ادیبوں نے جنم لیا اور اپنی

تحریریں لکھیں تاہم جس جزئیات نگاری سے عاصم بٹ نے یہاں کی مقامیت کو واضح کیا ہے۔اس میں نہ صرف اس مقامیت کا عروج بلکہ آنے والے وقت میں اس کے زوال کے امکانات کو بھی ناول نگار نے زیب قرطاس کیا ہے۔

نو لکھی کوٹھی نو آبادیاتی عہد کا نمائندہ ناول ہے۔جو مختلف حوالوں سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔علی اکبر ناطق کا یہ ناول جہاں نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی عہد کی عکاسی کا بیان ہے تو وہیں مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر کا مقامیت کے تناظر میں بھی اہم حوالہ ہے۔ناول میں وسطی پنجاب کی مقامی ثقافت کا بیان ہے۔ناول کے کردار، پیشے مقامی نوعیت کے ہیں۔یہ کردار پنجابی سماج کے چلتے پھرتے نمائندے ہیں۔ناول میں مقامیت کے مختلف عناصر کی فراوانی ہے۔ثقافتی پہلوؤں کو جابجا دیکھا جا سکتا ہے۔جس سے اس مقامی بیانیے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ناول نگار کا تخلیقی شعور اس قدر پختہ ہے کہ وہ بہت نازک مسائل کو بھی ناول میں زیر بحث لاتا ہے۔ناول نگار نے پنجاب کی مقامی ثقافت کے بیان سیاسی معاملات تقسیم اور اس کے بعد ہونے والے واقعات کو فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ خود اس سارے عمل سے گزرے ہوں۔ناول کے آخری حصے میں ناول نگار خود کو ناول میں شامل کر لیتا ہے۔ناول نگار کا خاندان بھی اسی علاقے کا مکین تھا اور ہجرت کے تجربے سے گزرا۔صباحت عروج اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

"ان کا خاندان فیروز پور انڈیا سے پاکستان ہجرت کے لیے روانہ ہوا تھا تو کم و بیش 70لوگ قافلے میں شامل تھے ۔جو خاندان کے لوگ تھے۔مگر جب ہیڈ سلیمانکی کے راستے پاکستان پہنچے تو تقریباً بیس لوگ بچ گئے جو اپنی جان بچا کر اور راستے کی مشکلات سے نبرد آزما ہو کر پاکستان پہنچے پاکستان پہنچنے پر ناطق کا خاندان اوکاڑہ کے قریب ایک گاؤں میں بس گیا۔"(125)

ناول میں وسطی پنجاب کی ثقافت کو تمام جزئیات، زبان و بیان اور کرداروں کے ذریعے سے بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں مقامی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی ملتی ہے۔غلام حیدر اور سودھا سنگھ اس عہد کے نمایاں کردار ہیں ۔ان کرداروں کی خاص حیثیت ہے جس کے گرد تمام معاشرت گھومتی ہے۔زمیندار، لڑائیاں، انا، عزت تمام مقامی رسم و رواج موجود ہیں۔ناول کا آغاز نو بادیاتی عہد میں ہوتا ہے۔جب پنجاب کے عوام خستہ حالی کا شکار ہیں۔ان کی زمینوں پر بھاری لگان وصول کیے جا رہے ہیں۔مقامی اعتبار سے تمام لوگوں کا تعلق کسی نہ کسی صورت زمین سے ہی جڑا ہے۔اسی زمین کے تحفظ اور ناموس کی خاطر یہ لوگ معمولی جھگڑوں سے بڑی لڑائیوں تک بھی گریز نہیں کرتے۔ان کی تہذیب میں لڑائی جھگڑا کرنا اپنی عزت ناموس اور انا کی حفاظت کرنا تمام معاملات سے زیادہ ضروری اور اہمیت کا حامل ہے۔سودھا سنگھ اور شیر حیدر کی لڑائی محض معمولی بات سے شروع ہوئی لیکن اس کا انجام کئی اموات کی صورت میں ہوتا ہے۔ناول میں مقامیت کے اس رویے کو بھی مقامی کرداروں کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح یہ لوگ اپنے فیصلے خود کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

"پھر دشمنی تو مردوں کا گہنا ہوتی ہے۔ نیتو۔ ویر کے بغیر مرد ایسی ہی ہے جیسے اکھاڑوں میں ناچنے والا کھسرا جس کے سارے یار ہی ہوتے ہیں۔"(126)

دشمنیاں ان مقامی لوگوں کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں ہوتی۔ اکثر ان دشمنیوں کی وجہ بھی مقامی نوعیت مثلاً بیل دوڑ کشتی کبڈی میچ میں شکست اور اس طرح کے کھیل تماشے کسی بڑے سانحے کا باعث بن جاتے ہیں۔ یہ دشمنیاں پھر کئی سالوں تک چلتی رہتی ہیں۔ اثر رسوخ والے افراد اپنے ماتحتوں کو انہی سازشوں کا شکار بناتے ہیں اور ان کی انا اور غصے عزت کی بھینٹ یہی رعایا چڑھتی ہے۔ ان معمولی جھگڑوں کی نوعیت خواہ کوئی بھی ہو لیکن ان جھگڑوں میں فتح حاصل کرنے کے لیے دونوں حریف سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں چاہے اس دوران کتنا ہی مالی یا جانی نقصان کیوں نہ ہو جائے۔ اس نوعیت کے جھگڑے اس مقامی ثقافت میں کوئی غیر معمولی بات تصور نہیں کی جاتی۔

"اس ناول کا اصل موضوع متحدہ ہندوستان کے وسطی پنجاب کے حالات، تہذیب و ثقافت اور پھر تقسیم کے نتیجے میں ہونے والے فسادات قتل و غارت اور جائیداد کی ملکیت کے لیے بااثر افراد کا بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا فرض عین کے طور پر دکھایا گیا ہے۔"(127)

ناول میں وسطی پنجاب کی ثقافت بھرپور انداز میں دکھائی گئی ہے۔ مجلسی زندگی ہو یا انفرادی ہر سو مقامی ثقافت مختلف طور سے نمایاں کی گئی ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں مقامی ثقافت نے اپنی شناخت کو برقرار رکھا ہوا تھا بلکہ کئی نو آبادکار بھی مقامی ثقافت میں اس طرح سے مدغم ہو گئے کہ وہ اسی سے ثقافت کا حصہ بن گئے۔ ولیم کے دادا نے نولکھی کوٹھی کی تعمیر اور اس کے گرد باغات لگوائے۔ حتی کہ جانوروں کے باڑے بھی بنوائے۔ تمام حوالوں سے اس مقامی انداز کو اپنایا۔ ولیم کے کردار میں جہاں مقامی ثقافت کا بول بالا کیا گیا ہے وہیں اس رویے کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ کس طرح سے باہر سے آنے والے حاکموں نے بھی مقامی نوابین کی طرز کو اپناتے ہوئے اپنی زندگیوں کو انہی بنیادوں پہ استوار کیا اور دوبارہ ان سرد اور برفیلے علاقوں میں جانے کے بجائے انہی علاقوں میں غلامی کا طوق ان مقامی لوگوں کے گلے میں ڈال کہ پہ ان پہ اپنی اجارہ داری یہاں قائم کی تاہم اس ناول میں ولیم کے کردار میں بعض مقامی پہلو بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ مقامی ثقافت کو ان آبادکاروں کے ضمن میں بھی بالاتر دکھایا گیا ہے:

"بابا ہندوستان کو کسی قیمت چھوڑنے پر راضی نہ تھے۔ خاص کر وسطی پنجاب کے سبز سبز میدانوں کو۔ بٹیر لڑانے کا شوق تو دادا کو بھی تھا جھکے کا لپکا بھی انہی سے لگا۔"(128)

مقامی ثقافت میں لوگوں کا سماجی میل جول بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مقامی لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت و احترام ان کا خاصا تھی۔ سماجی رسم قانون سے زیادہ مضبوط جہاں ایک دوسرے کی عزت و ناموس اور جائیداد کی تکریم کی جاتی تھی۔ گاؤں میں تمام لوگوں کا دکھ درد سانجھا تھا۔ گاؤں میں تمام لوگ دوسروں کے دکھ میں شریک ہوتے۔ یہ تمام پہلو اس مقامی ثقافت کو مزید مضبوط تر کرتے ہیں اور اس کا

مضبوط پہلو لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ ناول میں بھی مقامی کرداروں کے ضمن میں ایسے کئی موقعوں کا ذکر کیا گیا ہے، جہاں ان مقامی لوگوں کے ان خواص کا بیان ملتا ہے:

"گاؤں میں پردے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ اس لیے مولوی کا گھر بھی گاؤں والوں کی طرح ہر لحاظ سے کھلا تھا۔ نہ کسی کو تانک جھانک کی عادت تھی اور نہ ہی اس طرح کا ابھی خیال پیدا ہوا تھا۔ جو جب چاہتا ہر گھر میں اپنے ہی گھر کی طرح داخل ہو سکتا تھا۔ ہر کوئی دوسرے کی ماں بہن کو اپنی ماں بہن سمجھنے کی سواء اس وقت دوسرا تصور بھی نہیں لاتا تھا۔"(129)

ناول کے اس بیان میں جہاں مقامی لوگوں کے رسم و رواج کا پتہ ملتا ہے وہیں قانون سے زیادہ ایک ایسے نظام کی وضاحت بھی ملتی ہے جہاں باہمی رضامندی سے طے کیے گئے اصولوں کو اس قدر اہمیت دی جاتی ہے کہ وہاں قانون بھی ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی پاسداری اس قدر رکھی جاتی ہے کہ نہ تو کسی تھانے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی کسی کچہری یا وکیل کی۔ لوگ باہمی رضامندی سے اپنے وضع کردہ اصولوں کے مطابق ایک بہترین اور مثالی معاشرے کی تشکیل دیتے ہیں۔

ناول میں مقامی ثقافت کے مختلف عناصر کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ لوگوں کے مقامی کھیل تماشے، رہن سہن، ان کے پیشوں اور فصلوں کا بیان بھی ملتا ہے۔ پنجاب کے روایتی کھانوں، فصلوں اور کھیلوں کا بیان ناول میں اس مقامیت کے پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ وسطی پنجاب کے لوگوں کا رکھ رکھاؤ، مہمان نوازی کھیتوں میں مرد و خواتین کا یکساں کام کاج کرنا اس مقامی ثقافت کا خاصا ہے۔ ناول میں ان پہلوؤں کا اطہ مقامی کرداروں کے تناظر میں کیا گیا ہے۔ مقامی بولی اور ان مقامیوں کی مہمان نوازی، رشتوں کا لحاظ جو اس مقامیت کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ناول میں ایسے کئی واقعات کا مقامی کرداروں کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔ خالص مقامی رنگوں میں رنگ یہ کردار اپنی مقامیت کا بھرپور تعارف کراتے ہیں۔

"ولیم کے رویے کو دیکھ کر ایک بڑھی عورت نے جس نے گھگرا پہن رکھا تھا، نے آگے بڑھ کر اپنے میلے ہاتھوں سے ولیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولی آپت بیٹھ۔ گڑ کھاروہ لسی وی ہیگ آ۔ لون والی آ، مٹھی وی ملے جاؤ۔ گر و دی رکھ آپت گڑ شکر بہت آمینوں لگدا پُت تو وڈا تھانیدار آ۔ سویرے سویرے کنھو کو پھڑن چلے آ؟ لگدا کسے وڈے باغی نوں کن پھڑوان دا ارادہ کیتا (پھر سنتریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پت تسی وی بہہ جاؤ، جو کھانا وا کھاؤ۔"(130)

مندرجہ بالا بیان میں محض ایک بوڑھی کسان خاتون کا رویہ ہی نہیں ہے۔ اس پوری مقامیت کا ایک روشن چہرہ ہے کہ جہاں اپنے اور پرائے کی تخصیص کیے بغیر مہمان نوازی کا پہلو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ محض ولیم کے عہدے یا اس کے سے حلیے ہی سے اس کی تکریم نہیں کی جارہی بلکہ ایسا سلوک ہمیشہ اجنبی اور مہمانوں کے ساتھ کیا جاتا۔ دھان

پنجاب کی اہم فصل ہے۔ اس سے گڑ بنانا دیہاتوں میں عام ہے اور یہ مقامی سوغات بھی ہے۔ پنجاب کے ان سر سبز کھیتوں میں کام کرنے والے اور والیاں اس دھرتی کا حسن قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان سادہ لوح لوگوں کے ہاں انسانیت کا احترام باقی چیزوں سے بڑھ کر ہے۔ تبھی تو انہوں نے چند انگریزوں کے سامنے عاجزی ظاہر کر دی اور مقامی اشرافیہ بھی ان کی سادہ لوح طبیعت سے فائدہ اٹھانے لگی۔ ناول میں مقامی آبادی جو سکھوں اور مسلمانوں کے اکثریت پہ مبنی تھی، جو مشترکہ تہذیب کے علم بردار تھے۔ دونوں کے حالات کا احوال مختلف کرداروں کے ذریعے سے ملتا ہے۔ مذہبی رسومات کے علاوہ، رہن سہن، کھیتی باڑی ایک جیسا تھا۔ ناول میں دونوں کی مشترکہ ماحول کی عکاسی ملتی ہے صباحت عروج اس ضمن میں لکھتی ہیں کہ:

"ایک معاشرت کا بیان اور کردار اس طریقے سے بیان کیے گئے ہیں کہ ایک ایک چیز کی ہو بہو تصویر اتاری ہے۔"(131)

ناول میں تقسیم سے قبل کے حالات و واقعات قدر تفصیل سے بیان ہوئے ہیں یعنی تقسیم سے قبل کا زمانہ زیادہ تفصیل سے ناول میں بیان ہوا ہے۔ اس کا اصل موضوع بھی یہی ہے۔ ناول میں جلال آباد تحصیل کا بطور خاص تذکرہ ملتا ہے جہاں کی مقامی دیہی زندگی کے ساتھ ساتھ انتظامی، نظام اور لوگوں کے حالات کا جائزہ بھی بیان ہوا ہے۔ مقامی لوگ زیادہ خوشحال ہیں۔ زرعی خطے میں ٹیکسوں کی بھرمار نے لوگوں کے وسائل کو محدود کر دیا ہے۔ تاہم ثقافت اپنے پورے جوبن کے ساتھ موجود ہے۔ معاشرتی زندگی اپنی رنگینیوں کے ساتھ نمایاں ہے۔ ناول نگار نے جلال آباد کے بازار کے تذکرے کے ذریعے مقامی زندگی کا ایک اور رنگ دکھایا ہے۔ مقامی کھانوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے ۔ ثقافتی رنگوں کا بھی اور وہیں پہ ان مقامی لوگوں کے محدود وسائل کا بھی اندازہ ہوتا ہے ۔ نہری نظام نے جہاں انگریزوں کے لیے زیادہ ٹیکس کی وصولی کے حصول کو ممکن بنایا وہیں مقامی لوگوں کی زندگیوں میں بھی کسی قدر خوشحالی آئی۔ ولیم جیسے کئی افسروں کی ذاتی دلچسپی کے باعث پنجاب کا سرسبز و شاداب علاقہ مزید ہریالی اور خوشحالی کا نمونہ بنا۔

"دکانوں میں روز مرہ کی چیزیں اور چھوٹی موٹی کھانے کے اشیاء مثلاً دیسی شکر، گڑ، نمک، مصالحہ جات ڈانگر، میدے کی برفی اور کھانڈ کے چوسنے والی گولیاں، چاول، دال اور اسی طرح کی دیگر چیزیں کھلے منہ بوریوں میں پڑی رہتی۔۔۔ان کے علاوہ ایک حلوائی تھا۔ بس ایک پھٹے پرانے شمیانے کے نیچے دو چولوں کے اوپر دو کڑائیاں رکھ کر ایک میں جلیبی اور دوسرے میں پکوڑے تل تل کر پراتوں میں ڈھیر لگاتا۔"(132)

ناول میں مقامی ثقافت کو مقامی کرداروں کے ضمن میں مختلف حوالوں سے اجاگر کیا گیا ہے۔ مقامی لوگوں پہ اس وقت انگریزوں کی حکومت تھی۔ نوآبادیاتی عہد میں بھی ان لوگوں نے اپنی ثقافت کو قائم رکھا اور اپنے رسم و رواج سے جڑے رہے۔ نوآبادکاروں نے ان کو اپنا حقیقی غلام بنایا۔ ان لوگوں کے وسائل پہ قابض ہو کر ان کو ہی اتنا محکوم بنایا

کہ وہ اپنی ہی چیزوں کے لیے ترسنے لگے۔ان مقامی لوگوں کو نفرت کا نشانہ بھی بنایا جاتا تو دوسری طرف ان کے مقامی انداز ہی اپنائے جانے لگے۔اپنے اقتدار کو طول دینے اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے ان لوگوں نے اپنا رعب اس طرح جمایا تھا کہ ان کو بنیادی حقوق سے محروم کر دیا۔ایک طرف تو ان کے وسائل پہ قابض ہوئے اور ایسی ہی نوابوں جیسی شاہانہ زندگی گزار رہے ہیں تو دوسری طرف ان سے بات کرنا بھی ہتک محسوس کرتے ہیں۔نوآبادیاتی عہد میں اس مقامیت کے عناصر سے مقامی ثقافت کی وضاحت کی گئی ہے۔

"ناول نگار نے متحدہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت اور ان کی ذہنی سازشوں کو بے نقاب کیا ہے کیونکہ انہوں نے بظاہر خیر خواہی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے لیکن ان کے اندر مقامی باشندوں کے لیے زہر بھرا ہوا تھا۔"(133)

مقامی ثقافت میں حویلیوں اور وڈیروں کا تذکرہ کیے بغیر مقامی ثقافت کو مکمل طور پہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پنجاب کے دیہاتوں میں ایسے ڈیرے عوامی مراکز کا درجہ رکھتے ہیں۔زمیندار چودھری اس ثقافتی مرکز کے سربراہ ہوتے ہیں۔ان مراکز پہ مقامی سیاسی، سماجی مسائل کا حل ہوتا ہے یہ ثقافتی مرکز کی بھی حیثیت رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ یہ مقامی ڈیرے بادشاہوں کے درباروں سے مختلف نہیں جہاں چودھریوں کی پنچایتیں بھی لگتی ہیں اور مقامی رعایا کی مسئلے مسائل بھی سنے ہیں جاتے اور ان کا حل اور ان کی سزاؤں کا نفاذ بھی انہی ڈیروں پہ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ جہیز کا ثقافتی رواج بھی ناول میں بیان ہوا ہے۔دیہاتوں میں والدین اپنی حیثیت کے مطابق اپنی بیٹیوں کو جہیز کے برتن اور سامان دیتے ہیں۔بعض اوقات اس کی صورت زمینوں اور جانوروں کی بھی ہو سکتی ہے۔ناول نگار نے اس مقامی پہلو کو بھی ناول کے مقامی کرداروں کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

"رواج کے مطابق ہر والدین اپنی بیٹی کو ایسی دھاتوں کے برتن دینا اپنا فرض خیال کرتے تھے۔۔۔جب بیاہ کے وقت ان برتنوں کو ساتھ لانے والی دلہنیں اسی گھر میں زندگی کے تیس، چالیس سال گزار کر پوتوں اور نواسوں والی ہو جاتی ہیں تو پھر وہ اپنے نواسوں اور پوتوں پوتیوں کو ایک ایک برتن کے بارے میں تفصیل سے بتاتیں۔"(134)

ناول کا رورانیہ 1929ء کے قریب سے 1990ء تک ہے۔وسطی پنجاب کے مقامیت کا بیان ناول کا اصل مدعا ہے۔ناول میں تقسیم سے قبل وسطی پنجاب کا تذکرہ صراحت سے ملتا ہے۔ناول نگار نے مقامی کرداروں کے ذریعے پنجاب کی مقامی ثقافت کے عروج کا زمانہ بیان کیا ہے۔جب اس ثقافت کو پروان چڑھانے والے لوگ اپنی اصل حالت میں موجود تھے۔مذہبی فرق کے باوجود دونوں ایک ہی دھرتی کے بیٹے اور ایک ہی ثقافت کے نمائندے تھے۔ ناول کی خاص بات یہ ہے کہ محض دیہات نگاری نہیں کی گئی بلکہ مقامی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ایسی مقامی ثقافت جو اپنے اندر تمام عناصر کو سموئے ہوئے ہے۔ان کی خاص مقامی زبان و بیان یا سماجی زندگی

حتی کہ تاریخ اور سیاسی واقعات کی اس مقامیت کے تناظر میں تفصیل ملتی ہے۔مابعد جدیدیت کا تصور مقامیت کے اعتبار سے نمایاں میں ناول ہیں۔اس مقامیت کا عروج وزوال پورے تفصیل سے بیان ہوا ہے جہاں مابعد جدید دنیا میں گلوبلائزیشن نے بہت سی ضمنی ثقافتوں کو ان کی شناخت سے محروم کر دیا ہے۔پنجاب کی ثقافت ابھی بھی بہت حد تک موجود ہے اور ناول نگار نے اس کے ماضی میں جھانک کہ اس ثقافتی اور تاریخی ورثے کو محفوظ کر کے رکھ دیا ہے۔جہاں اس ثقافت سے کٹنے والے افراد بھی اپنے ماضی کے گزشتہ احوال میں اپنی اصل ثقافت کی بازیافت کر سکتے ہیں۔

غلام باغ اردو کے روایتی ناولوں سے ہٹ کے ہے۔ناول میں مختلف تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ناول کا کینوس بین الاضلاعی ہے۔ناول میں کسی ایک ثقافت کا بیانیہ نہیں بلکہ مختلف ثقافتوں کا بیان ملتا ہے۔مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر کے مطابق اس ناول میں مختلف مقامی ثقافتوں کا بیانیہ ہے۔ان ثقافتوں کے مختلف عناصر ان میں بیان ہوئے ہیں۔سماجی، ثقافتی معاملات کو بیان کیا گیا ہے۔ناول کا زیادہ تر قصہ شہر میں ہی چلتا ہے۔تاہم شہر میں موجود کردار مختلف ثقافتی گروہوں کے نمائندے ہیں۔ناول کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں کسی مہابیانیے کی کوئی حتمی صورت نظر نہیں آتی۔فلسفیانہ انداز میں مختلف پہلو اس میں ملتے ہیں۔ناول کے تمام اہم کردار اپنا نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ناول کے تعارف کے حوالے سے شاہد نواز لکھتے ہیں کہ :

"یہ ناول قدیم اور جدید فکشن کی مختلف تکنیک کی آمیزش پیش کرتا ہے۔ناول روایتی تکنیک خط مستقیم کے بجائے دائروی تکنیک کے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔" (135)

ناول کا دائرہ کار خاصا وسیع ہے۔مختلف ثقافتوں کا بیان ماضی حال کی آمیزش، نئی نسلوں کا قصہ، پرانے لوگوں کے ساتھ شہری، دیہاتی زندگی اس کے مختلف پہلو ناول میں انتہائی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔پڑھے لکھے افراد کی ذہنیت کے ساتھ ساتھ ماضی اور حال کی ضعیف الاعتقادیاں تمام عوامل ناول میں موجود ہیں۔موجودہ نسل جہاں جدید تقاضوں سے ہم آہنگ اور نئی سوچ کی آبیاری کرتی ہے وہیں اگر وہ کسی بات کا رد بھی کرتی ہے تو اس کا جواز ضرور فراہم کرتی ہے۔ناول کے کردار محض جدیدیت کا پرچار نہیں کرتے بلکہ وہ اپنی اصل کے ساتھ بھی بیک وقت جڑے دکھائی دیتے ہیں۔بقول ڈاکٹر سہیل احمد خان :

"غلام باغ بہت وسیع دائرے کا ناول ہے۔اس ناول کے بیانیے میں ماضی کی ایسی پرچھائیاں، حال کی بے ترتیبی، مستقبل کا الجھاؤ ایک دوسرے سے متصادم دکھائی دیتے ہیں۔"(136)

ناول کا ابتدائیہ ہی خاصا دلچسپ ہے۔ناول کے آغاز میں ابتدائی حصہ میں ارزل نسلوں کی اساطیر کے نام سے ناول کا دوسرا باب ہے۔ناول نگار نے مانگر جو (ارزل نسل) کا بیان کیا ہے۔ناول نگار نے ان کے بیان میں مقامی ثقافت کو اجاگر کیا ہے۔سماج میں لوگوں کو طاقتور نے ہمیشہ ان کا استحصال کیا اور ہنوز کیا جا رہا ہے۔ان کی گردنوں پہ پاؤں رکھ کر منزلیں طے کرنے والوں نے ان کو جانوروں کی طرح سمجھا۔ان کی وفاداری کے بدلے ان کو اتنا دیا جاتا کہ وہ محض

اپنے جسم و روح کا رشتہ قائم کر سکیں۔ ان کا یہ رویہ قدیمی ہے۔ ان کے تسلط کو توڑنے والوں کو نشان عبرت بنایا جاتا ہے تاکہ باقی لوگ عبرت حاصل کریں۔ آئندہ کوئی ان کے سامنے کھڑا ہونے کی جرات نہ کر سکے۔ ان وڈیروں چودھریوں اور بعد ازاں سامراجی حکمرانوں نے اسی طریقہ کار کو اپنائے رکھا۔ یہاں محض استحصال ہی نہیں بلکہ ایک ایسی نسل کا بیان ہے جو انسانیت کے معیار سے بھی کم درجہ خیال کی جاتی ہے۔ جس کی خوراک بھی جنگلی جانور ہیں اور جن کا مذہب کے ساتھ بھی کوئی خاص واسطہ نہیں گردانا جاتا اور اگر ان میں سے کوئی پڑھ لکھ کر کسی اچھے مقام پہ پہنچنے کی کوشش کرے یا اپنی ان غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرے تو ایسے میں سامراجی قوتیں اس کو اپنی اوقات یاد دلانا از حد ضروری خیال کرتی ہیں۔

"ان سرداروں کا کہنا ہے کہ کبھی کبھی ان مانگر لوگوں میں کوئی پاگل ہو کر ان کی برابری کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے کیونکہ ان کے کھیتوں اور ان کی عورتیں ان کے گھروں میں بھی کام کرتی ہیں۔ جو کوئی ایسی دیوانگی کا شکار ہوتا ہے۔ اس کا علاج وہی کرتے ہیں۔ جو پاگل کتے کا ہوتا ہے یعنی موت لیکن کتے کے برعکس مانگر کو بڑی اذیت دے کر مارا جاتا ہے۔"(137)

مندرجہ بالا اقتباس ایک انگریز محقق کے ازل نسلوں کی تحقیق کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ جو اس نے مقامی لوگوں سے معلومات حاصل کر کے لکھا۔ ان مقامی لوگوں میں سے ہی ارزل نسل کے لوگوں کو اس قدر ذلیل اور کم درجہ خیال کیا جاتا کہ ان کو انسانیت کے درجے سے بھی نیچے سمجھا جاتا۔ ان کو غلاظت کی تصویر اور علامت کے طور پہ بیان کیا جاتا ہے اور انہیں موت بھی ایسی اذیت ناک دی جاتی ہے تاکہ دوسرے کوئی بھی ان کے خلاف کھڑے ہونے کی جرات نہ کر سکیں۔

عالمگیریت کے کلچر کے فروغ سے قبل سامراجی قوتوں کی عملداری سے قبل بھی مقامی طور پر ایسے رویے موجود رہے ہیں اور ہنوز باقی ہیں۔ ذات پات اونچ نیچ کا تصور دراصل اس غلبے کی آبیاری ہی تو ہے۔ جو طاقتور نے قائم کر رکھا ہے۔ ان رتبوں طبقوں کا طوق ان کے گلے میں ایسا ڈالا گیا کہ نچلے طبقے کو کبھی اس بات کی آزادی نہیں کہ کوئی نیا جہاں تخلیق کرے یا اس کے تخیل میں جائے۔ ان رسوم بد کو ثقافت کا حصہ بنا دیا جاتا ہے۔ جہاں اس طبقے کے افراد کو وہی کام تفویض کیے جاتے ہیں جو موروثی طور پر ان کا مقدر ٹھہرائے جاتے ہیں۔ ان کی جان مال عزت و آبرو ہر چیز ان کی ملکیت ہوتی ہے۔ ملکیت کا احساس انسان کو خود سر بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے اس احساس برتری کو جتانا اپنا فرض خیال کرتا ہے۔ نچلے مظلوم طبقے کی عورتوں کے ساتھ جنسی تعلق کوئی انوکھی بات تصور نہیں کی جاتی بلکہ اخلاقی زوال کے اس سے بڑھ کے مثال کیا ہو گی کہ ایسا عمل بھی ان کے لیے قابل فخر تصور کرایا جاتا ہے کہ کم از کم ان کی عورتوں کو شرف قبولیت تو حاصل ہوا۔ مانگر جو قبیلہ اسی استحصال کا شکار تھا۔ معاشی طور پہ تباہ حال طبقہ خوراک کے لیے حرام جانوروں تک کا گوشت کھانے پہ مجبور ہے۔ ایسے میں جسم کا استحصال معمولی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے اس اخلاقی گراوٹ

کا قصور وار محض ان لوگوں کو نہیں قرار دیا جا سکتا کہ جو مرداروں کو اور ناپاک جانوروں کو کھاتے ہیں بلکہ ان کی تربیت ہی اس طرح سے کی جاتی ہے ان کے وسائل کو اس طرح سے تنگ اور محدود کیا جاتا ہے کہ وہ خود کو بھی انسان تصور کرنے سے گریزاں ہیں۔ مقامیت کے تناظر میں اس نسل کی وضاحت ناول میں موجود ہے۔ ایک قدیم اور معدوم ہوتی نسل جس کے بارے میں ناول کے آغاز میں انگریز محقق کا حوالہ بھی ناول میں موجود ہے۔ اس نسل کے تناظر میں ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "جڈو مانگر بلی کا گوشت کھا رہا تھا اور بھاگا کو بھی کھلا رہا تھا اور افضل کا چھرا اور سراج پگل نے انہیں پکڑ لیا اور بڑی بڑی ہاکیوں سے جھڈو کو مار مار کر اس کی ہڈیاں توڑ دیں۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور ساتھ ہی ادھ پکی ہوئی بلی پڑی تھی۔ بھاگاں بین کرتی انہیں گندی گالیاں دیتی تھی اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے بھاگاں کا منہ تو عورت کا رہا اور جسم کسی کتیا کا ہو گیا اور پھر اس کو دیکھتے ہی دیکھتے وہ کا چھرا اور پگل بھی دو ننگ دھڑنگ کتے بن گئے اور بھاگوں پہ چڑھ پڑے مانگر مرد و عورت شور مچاتے رہے مگر آگے نہ بڑھے کتوں کے منہ کون لگے۔"(138)

طاقتور طبقہ اس طبقے کو اپنا زر خرید غلام سمجھتا ہے۔ جن کی عزت و آبرو، جوان عورتیں ان کی ملکیت ہوتیں۔ وہ جب چاہتے جسے چاہتے اپنے تصرف میں لا سکتے تھے۔ بھلا ان کی برابری یا ان سے پوچھ گچھ کرنے والا کوئی ہو سکتا تھا۔ ناول میں زیادہ تر حصہ شہر کی زندگی کے شب و روز میں گزرتا ہے۔ ناول کے کردار وہی ہیں جن کے ساتھ ساتھ کہانی کبھی شہر میں اور کبھی ان کے مقامی علاقوں میں چلی جاتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر کے مطابق چھوٹی ثقافتوں کے بیانیوں کو بھی آواز ملتی ہے۔ جہاں اس مقامیت کے مختلف عناصر موجود ہیں۔ ناول میں دوسری مقامی ثقافت کا تعلق خطہ پوٹھوہار سے ہے۔ خطہ پوٹھوہار مخصوص جغرافیائی خصوصیت کا حامل ہے جہاں الگ ثقافت موجود ہے۔ سنمیال گاؤں کے بیان کے تناظر میں پوٹھوہار کی ثقافت رہن سہن فنِ تعمیر جغرافیائی حالات رسم و رواج حتی کے مذہبی تصورات اور عقائد کو بھی ناول نگار نے بیان کیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار کبیر مہدی اسی گاؤں کا باشندہ ہے۔ اس کا کردار کے تناظر میں ناول نگار نے اس خطے کی ثقافت کو بخوبی واضح کیا ہے۔

سنمیال کے لوگ سادہ لوح دیہاتی لوگ ہیں۔ جن کا ذریعہ معاش دیہاتوں کی طرح کھیتی باڑی ہے کچھ کا ذریعہ معاش کان کنی ہے۔ پوٹھوہار میں مختلف معدنیات خصوصیات کوئلہ، نمک کثرت سے موجود ہیں۔ بعض جو کچھ پڑھ لکھ جائیں فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں۔ سرکاری ملازمت کے خوبصورت تصور سے ان کی آنے والی زندگی کی معاشی تحفظ کے احساس کی تکمیل کے لیے ان کے لیے پرکشش ملازمت ہے۔ یوں وہ اپنے آنے والی نسلوں کو شہر کی زندگی کے بارے میں بھی میں تیار بھی کر لیتے ہیں۔

سنیمال گاؤں میں اپنے محدود دائرہ کار کے اندر زندگی قدیم طرز پہ اپنی روایات ثقافت اور سماجی مندروں میں جڑی رواں دواں ہیں۔ جہاں اب بھی پرانی رسم و رواج ہو یا عقائد تمام کا پاس و لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ان کے اصلیت چاہے جیسی بھی ہو اس سے فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی اس تقدس کو توڑنے کی جرات جو ان کے بقول ان کی امیدوں کے محور ان کی ثقافتوں میں کسی نہ کسی حال میں شامل رہے ہیں ہنوز شامل ہیں۔ ثقافتی عوامل کو وہ مذہبی رسومات کا درجہ دے دیتے ہیں اور ان کے تقدس کے پردے میں یہ معاملات مذہبی عوامل پہ حاوی ہو کر مستقل ان کی ثقافت کا خاصہ بن جاتے ہیں۔

"چٹا سائیں کبھی غار سے باہر نہیں آتا۔ وہ غار کے اندر اندھیرے میں ہی رہنا پسند کرتا ہے لوگوں کو یقین ہے کہ چٹا سائیں مرادیں پوری کرتا ہے مگر تم اس سے کچھ مانگو تو وہ اندر سے گالیاں دے گا۔"(139)

ان پہاڑی علاقوں میں چٹا سائیں جیسے بہت سے درویشوں کی کرامات اور ان کے ساتھ جڑی مختلف اساطیری کہانیوں کا بیان ملتا ہے۔ کبیر مہدی کے گاؤں میں قیام کے دوران جہاں اس کے فلسفیانہ نظریات کی عکاسی ملتی ہے۔ وہ شہر کی زندگی کے بجائے سکون کی تلاش میں اس قدرتی ماحول میں آ جاتا ہے وہیں اس خطے کا جغرافیائی ماحول اور اس کی ثقافتی زندگی کا بیان بھی ملتا ہے۔ گھروں کی تعمیر مقامی کھانے مقامی رہن سہن کا بیان تفصیل سے ناول میں ملتا ہے ۔ جہاں اس مقامی ثقافت کی وضاحت بھی ہوتی ہے اس مقامی ثقافت میں رشتوں کا پاس اور لحاظ محبت خلوص ایک اہم وصف کے طور پہ دکھائی دیتا ہے۔

ناول کے آخری حصے میں مانگر جاتی نسل کا بیان بھی ثقافت کے ضمن میں آتا ہے۔ جب خادم حسین کی پوتی، یاور حسین عطائی کی بیٹی اپنے باپ کی اصل کو تلاش کرنے کے لیے نکلتی ہے۔ زہرہ کی شخصیت مابعد جدید رویے کی عکاسی ہے کہ بالآخر فرد لوٹ کر اپنے اصل کی جانب لوٹتا ہے۔ زہرہ اپنے باپ کی نسل اس کی اصلیت کو جاننے کیلئے مانگر جو نسل کے کچھ افراد باقی ہیں۔ جو آج بھی صدیوں پرانی بے بسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ باقی ماندہ چند افراد کو آج بھی طاقتور طبقے کی طرف سے وحشیانہ سلوک کا سامنا ہے۔ زہرہ ان باقی ماندہ افراد کے ذریعے اپنی نسل کی بازیافت کرتی ہے ۔ ان لوگوں کی حالت ایک سماجی المیہ کی داستان ہے۔ جہاں آج بھی طاقتور طبقہ اپنے لیے حالات کے مطابق ان لوگوں کا استحصال کر رہا ہے۔ سیاست کا کھیل ہو یا زمینوں کا قبضہ ہر حوالے سے ان کا بس ان کمزور لوگوں پہ ہی چلتا ہے۔ جو ان کو مٹا کر اور کبھی ان کو استعمال کر کے اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی ان کا بیان کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ :

وہاں انسانیت کی تذلیل اپنی انتہا پر ہے۔ ان بے کس لوگوں کو خشک بیابانی علاقوں میں دھکیل دیا گیا ہے۔ جہاں تھوہر، آک، بھنگ تھورے کے پودوں اور چھپکلیوں گیدڑوں اور کتوں کا راج ہے۔ انہوں نے ایک ایسی بستی کا منظر دیکھا جو اجڑ چکی ہے۔ سراسیمہ کر دینے والا منظر چھوٹے چھوٹے گھروں کے مٹتے آثار، جن میں یاور عطائی کی

> نسل کبھی گزر بسر کرتی رہی ہوگی۔آگے جہاں، ببول ککر، جھنڈ، پھلائی اور کری کی جھاڑیوں کا جنگل تھا اور ویران سوسکھڑ نہر تھی وہاں سے انسانی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔یہ ایک مٹتے ہوئے وحشی قبیلے کے چند افراد کا پڑاؤ تھا۔"(140)

ان کے لیے اب دو وقت کی روٹی کا حصول ممکن نہ تھا۔آج بھی وہ بڑے چودھریوں، پگلوں کے جنگل میں اتنے ہی الجھے ہوئے تھے۔ان کی عورتیں آج بھی ان کی ملکیت، اب بھی ان کی لنگروں پہ ملنے والا کھانا ان کا ایک حسین خواب تھا۔ بھوک اور افلاس سے اب بھی ان کو ان کے درد کا محتاج بنا رکھا تھا۔وہ ہر طرح سے ان کا استحصال کر رہے تھے اور کرتے کرتے اب ان کو مٹا دینے کے قریب تھے کہ اس غلاظت کو وہ اپنے معاشرے سے مٹا دے جو ان کے ترقی یافتہ سماج میں اب ایک بد نما داغ معلوم ہوتے ہیں۔ناول کے اس بیانیوں میں اس نسل اور ایسی کئی نسلوں کی ترجمانی کی گئی ہے جن کے مقدر میں صدیوں کی غلامی کا احساس تاحال موجود ہے۔خوراک تک سے محروم یہ لوگ امیروں کے کچروں کے ڈھیروں میں سے اپنی زندگی کی بقا تلاش کرتے ہیں۔ان کے بچے کچرے کے ڈھیروں میں اپنی خوراک تلاش کر رہے ہیں جہاں انسانیت اپنی زندگی کی آخری سانسوں کو پورا کر رہی ہو وہاں کسی ثقافت کسی تہذیب کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے۔

> "جھنڈ کے کانٹے دار جھاڑی کے نیچے وہ ایک پھٹے ہوئے غلیظ سے اخبار پر کچھ چیزیں بچھائے، ارد گرد کچھ بیٹھے کچھ کھڑے تھے اور ان کی گہری انہماک حرکتیں بتاتی تھی کہ وہ کچھ کھانے میں مشغول ہیں۔زہرہ اور کبیر ان کے دستر خوان کو دیکھنے کے لیے درختوں کی آڑ میں دبے پاؤں آگے بڑھے۔حیرت، بے یقینی اور ابکائی کے احساس نے یک دم اندر سے اٹھ کر زہرہ کے حلق میں ٹھوکر سی لگائی ہاتھ منہ پر رکھے غور سے ان چیزوں کو دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔کیچڑ اور مٹی میں لتھڑا ہوا ایک شاپنگ بیگ۔ایک آدھا کھایا سیب جس کے چبائے ہوئے بھورے حصے پر سگرٹ بجھانے کے نشانات نظر آتے تھے۔جام کی ٹوٹی ہوئی بوتل کے ٹکڑوں کے ساتھ چپکا ہوا سنگترے کا مارملیڈ۔ابلے ہوئے انڈوں کی پیلی گیندوں جیسی دو زردیاں۔سوکھی گاجریں، سارڈین مچھلی کا کٹا ہوا ڈبہ، دانتوں سے کاٹے ہوئے یا چھری سے کاٹے ہوئے ہاتھ سے توڑے ہوئے کچے سڑے ہوئے سبزی مائل پھپھوندی زدہ ڈبل روٹی کے بے شمار ٹکڑے۔چھوڑی ہوئی مرغ کی ٹانگیں اور چانپیں جن کے ساتھ غالباً گوشت کے کچھ ریشے بھی چپکے باقی تھے۔مکی کے بھٹے اور ایسی ہی چھوٹی موٹی بہت سی چیزیں جنہیں زہرہ کی نظر پہچان نہ پائی تھی۔"(141)

ایک طرف انسان چاند تک رسائی حاصل کر چکا ہے، انسان جدیدیت کی انتہا پہ ہے۔جہاں نت نئی ٹیکنالوجی نے انسان کو ایک گلوبل ویلیج میں مقید کر دیا ہے۔جہاں وہ سینکڑوں، ہزاروں میل دور بیٹھے لوگوں تک رسائی حاصل کرتا ہے اور ایک طرف ایسے انسان بھی موجود ہیں جو اس بچے کچے کچرے میں پھینکے گئے کھانے میں سے اپنی زندگی کی بقا تلاش کر رہے ہیں۔انسانیت کا معیار اس سے اور کیا گر سکتا ہے اور اس ارزل نسل کی قسمت اب بھی ویسی کی ویسی ہی

ہے۔ جن کے آباؤ اجداد اجہاں حرام خور جانور، حرام جانور کھاتے تھے۔ آج ان کی ہی نسلیں اس کچرے میں سے گلے سڑے کھانے پہ اپنی زندگی کا ارتقاء جاری رکھنے پہ مجبور ہیں۔

مندری اس مختصر قبیلے کا سربراہ ہے جس سے کبیر اور زہرہ کی ملاقات ہوتی ہے۔ مندری اس بچے کچھے قافلے کا سالار ہے۔ وہ ان باقی ماندہ لوگوں سے معاملہ فہم اور سمجھدار ہے۔ مندری ان کو اس قبیلے کی تباہی اور ان کے ساتھ ہونے والے سلوک کی تفصیل بتاتا ہے۔ انعام گڑھ کے وڈیروں نے کس طرح مانگروں کو تباہ و برباد کر دیا۔ مندری نے ہی کبیر اور زہرہ کو اس قبیلے کی داستان غم سنائی کہ بہت سے مر کھپ گئے ہیں اور کچھ پگلوں اور کاچھروں کے ظلم سے تنگ آ کے یہاں سے دور چلے گئے ہیں۔ یہاں باقی رہنے والے سخت بھوک اور افلاس کا شکار ہیں۔ اس پہ ان پگلوں کا ظلم وستم برداشت کرتے یہ چند لوگ بھی یا تو یہاں سے کوچ کر جائیں گے یا بہت جلد ان کا وجود صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا ۔یوں غلاظت کا ڈھیر سمجھا جانے والا یہ قبیلہ اپنا وجود کھو دے گا۔ ان کی بستیاں ان کی غلاظت سے پاک ہو جائیں گی۔ جسے وہ اپنے لئے ایسا خیال کرتے ہیں۔

وہی طاقتیں کبیر و زہرہ کو بھی موت کے گھاٹ اتارنا چاہتی ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے حملہ بھی کیا گیا لیکن وہ خوش قسمتی سے بچ جاتے ہیں۔ کبیر ان کی آنکھوں میں اس لیے کھٹکتا ہے کہ کہیں وہ ان کو بے نقاب نہ کر دے مابعد جدیدیت کے تحت لکھے گئے اس ناول میں مختلف مقامی ثقافتوں کا بیان ملتا ہے۔ ان کا بیانیہ کوئی عالمگیری نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی مقامی ثقافتوں کا بیانیہ ہے۔ ناول نگار نے مانگا جو جیسی پنچ اور ذلیل خیال کی جانے والی نسل کا بیان کر کے اردو ادب میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ ان ثقافتوں کی اپنی ایک روایت اور تاریخ ہے۔ جس میں مختلف عناصر شامل ہیں۔ ان ثقافتوں کے سماجی نظام سے لے کر اس مذہبی عقائد تک ان کے اپنے تصورات موجود ہیں۔ اس بیان سے نہ صرف مقامی ثقافتوں کو اجاگر کیا گیا بلکہ بہت سی پوشیدہ باتوں کو بھی عیاں کیا گیا۔ مابعد جدیدیت بھی کسی ایک بیانیہ یا معنی تک مودو نہیں ہے بلکہ تکثیریت کی حوصلہ افزائی کرتی ہے جس کے نقطہ نظر کی بھرپور نمائندگی ناول میں ملتی ہے۔ ناول میں مختلف طبقوں، قوموں اور ثقافتوں کا بیان اس دعوی کی دلیل ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اس سے قبل بھی مقامی ثقافتوں کے ضمن میں ناول تحریر کیے ہیں۔ بہاؤ جیسا ناول قدیم عہد کے تناظر میں مقامیت کا ایک حیرت انگیز بیان ہے۔ ناول نگار مقامیت کے نہ صرف خارجی بلکہ داخلی پہلوؤں کو بھی بخوبی سمیٹنا جانتے ہیں۔ "خس و خشاک زمانے "اکیسویں صدی کے ناولوں میں نہ صرف ایک اہم اضافہ ہے۔ مقامیت کے بیان میں ایک اہم تحریر کے طور پہ سامنے آیا ہے۔ ناول کا زمانہ ارتقائی دہائیوں پہ پھیلا ہوا ہے۔ ناول نگار نے تین نسلوں کے اس ناول میں مقامیت کی تشکیل اور بیان بہترین انداز میں کیا ہے 1930ء کے لگ بھگ ناول کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ پنجاب کی مقامی ثقافت کا اہم عہد قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسا عہد جہاں ہر طرف امن و آشتی ہے۔ مختلف

مذاہب کے لوگ اپنے اپنے عقیدوں کے احترام اور تحفظ کے ساتھ ساتھ دوسروں کے عقیدوں کے معترف اور احترام کرتے ہیں۔ان کے درمیان مقامی ثقافتی تعلق سب سے زیادہ اہم ہے۔یہ لوگ اپنی دھرتی کے بیٹے ہیں۔ایسے بیٹے جو مختلف مزاج اور طبقوں کے ہونے کے باوجود بھی اپنی ماں سے محبت کا پہلو تمام دوسرے امور سے زیادہ ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔مقامی ثقافت کا ایک ایسا عہد ہے جو اپنے تمام ثقافتی رنگوں کے ساتھ موجود ہے۔ناول میں مقامیت کی صحیح انداز میں نمائندگی ملتی ہے۔

مقامی کرداروں میں سماجی نظام اس قدر مضبوط ہے کہ مقامیت کی فضا ایک پر کشش تاثر قائم کرتی ہے۔تین نسلوں کے قصے میں بھی مرکزیت مقامیت ہی کو حاصل ہے۔ناول کے کرداروں کو متحرک دکھایا گیا ہے۔یہ کردار مقامی ثقافت کے نمائندے ہیں۔ان کی زبان و بیان، رسم و رواج دیگر ثقافتی پہلوؤں کو ہر لحاظ سے مقامیت کا نمائندہ قرار دیا جاسکتا ہے۔مقامیت کے تمام داخلی اور خارجی پہلوؤں کی وضاحت ملتی ہے۔مقامی ثقافت کے نمائندہ کردار اپنی ثقافت کے ان مٹ نقوش رقم کرتے ہیں۔ناول میں تاریخی سماجی شعور بھی ملتا ہے۔ناول نگار نے زمانی ارتقا کے ساتھ مقامی ثقافت کو ہر دور میں بیان کیا ہے۔

"مصنف نے مشاہدہ اور تاریخی شعور سے کام لیتے ہوئے مختلف مذاہب کے مزاج، تہذیب اور ثقافت کو نئی نسل کے تبدیل ہوتے رویوں کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ہجرت در ہجرت مسلمانوں اور سکھوں کے تعلقات شہری اور دیہاتی ثقافت اور بدلتے ہوئے سماج میں تیزی سے تبدیل کے عمل کو موضوع بنایا ہے۔"(142)

ناول نگار نے مقامی کرداروں کے ذریعے سے مقامیت کے مختلف ثقافتی پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔یہ کردار مقامی رسم و رواج روایات سے خاص بندھن میں بندھے ہیں۔ان کے لیے ثقافت سب سے زیادہ مقدم ہے۔ثقافت کے اثرات اس مقامیت میں اس قدر اثر انگیز ہیں کہ مذہبی عقیدے بھی ان ثقافتی پہلوؤں کی لپیٹ میں آجاتے ہیں ۔ڈاکٹر شاہد نواز مقامیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"خس و شاک زمانے میں راکھ کی نسبت مقامیت کی دل آویزی بہت غالب ہے۔تقسیم ہند سے قبل کی مشترکہ مقامیت کے رنگ و روپ ہوں یا پھر تقسیم کے بعد منقسم شدہ مقامیت کی شکلیں ہوں بہت نمایاں رنگ میں اس ناول میں پیش کی گئی ہیں۔"(143)

ناول میں گجرات کے گرد نواح میں موجود دیہاتوں کی مقامیت کا بیان ہے۔اکیسویں صدی کے کئی ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی مقامیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔تین نسلوں تک پھیلا ہوا یہ ناول مقامیت کے بیان سے مزین ہے۔ناول نگار نے اس مقامیت کے مختلف عناصر کی وضاحت تفصیل سے بیان کی ہے۔ناول کا آغاز 1930ء کے قریب ہوتا ہے ایسا وقت جو برصغیر کی تاریخ میں ایک اہم سیاسی دور بھی تھا۔اس مقامی زندگی پہ شہروں کی پر ہنگامہ زندگی کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے یہ لوگ اپنی مقامی زندگی میں اس قدر گم تھے کہ ان میں سے اکثر تو شہر کے محض

تصور سے واقف تھے۔ پنجاب کے دیگر علاقوں کی طرح کھیتی باڑی ان مقامی لوگوں کا ذریعہ معاش کا اہم وسیلہ تھی۔ لوگ ایک سماجی بندھن میں اس طرح بندھے ہوئے تھے۔ ان کی زندگیاں ایک دوسرے سے جڑی ہیں۔ مقامی ثقافتی پہلوؤں کو باقی تمام رسم و رواج پہ فضیلت حاصل تھی۔ ناول نگار نے مقامی کرداروں کے ذریعے مقامیت کو بھرپور انداز میں بیان کیا ہے۔ مقامیت کے بیان میں یہ کردار اپنی ثقافت کے امین ہیں۔ ان کے قول و فعل سے اس ثقافت کی توثیق ہوتی ہے۔

چودھری بخت جہاں لیناسنگھ ان مقامی کرداروں کے نمائندہ کردار ہیں۔ سروہانسی، امیر بخش جیسے مقامی کردار اس مقامی ثقافت کو مزید واضح کرتے ہیں۔ جاٹ قوم پنجاب کی بڑی قوموں میں سے ایک ہے۔ زمینداری ان کا اہم ذریعہ معاش ہے۔ زمین ان کا زیور اور ان کا مان ہے۔ سکھ اور مسلمان جاٹ دونوں کے درمیان ایک قدر مشترک جاٹ ہونا ہے۔ اس لیے دونوں مختلف مذاہب سے ہونے کے باوجود بھی جاٹ ہونے کی وجہ سے ایک تھے۔ دونوں کی قربت کی مشترکہ وجہ ان کا نسلی تفاخر تھا۔ لیناسنگھ اور بخت جہان کی دوستی میں اس مقامی ثقافت کے اس پہلو کی بھی ناول میں خوب وضاحت ملتی ہے۔ ثقافتی تہوار کئی مذاہب کے ایک جیسے یا ایک ساتھ ہوتے۔ مذہبی تہواروں پر بھی مقامی ثقافتی رنگ نمایاں ہوتا اور ایک دوسرے کے تہواروں میں لوگ بلا تامل شریک ہوتے۔ لیناسنگھ اور بخت جہاں کی دوستی دراصل اس پورے مقامی ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔ جو مقامی ثقافت کے نمائندہ بھی ہیں اور دونوں مذاہب کی ہم آہنگی کے امین بھی۔ یہ دو مقامی کردار اس عہد میں اس مقامیت کے ثقافت کے ایک اہم نمائندے کے طور پہ ابھرتے ہیں۔ ان کرداروں کے ضمن میں ناول نگار نے مختلف میلوں، ثقافتی مراکز اور تہواروں کا تذکرہ کیا ہے۔

> "ایمن آباد کی بیساکھی کے میلے میں جب وہ دونوں للکارتے ہوئے داخل ہوتے تو ایک لمحے کے لیے تو پورا میلہ چپ اور سائیں سائیں ہو جاتا تھا۔ جھولے رک جاتے تھے۔ ڈھول خاموش ہو جاتے اور بولیاں بولنے والے بولیاں بھول جاتے تھے۔ کسی کی جرات نہ ہوتی کہ ان کے ساتھ ڈانگ سوٹا کر سکے۔ وہ ایک دوسرے کے لیے بنا جھجک جان دینے والے ایک دوسرے کی عزت کے رکھوالے تھے۔"(144)

ان مقامی جٹوں میں تفکر اور تکبر موجود ہے۔ ان کی زمین ان کا مان ہے جس کے سینے پہ پلتے بھی اور اسی کے دم سے اکڑتے بھی ہیں۔ مال مویشی پالنا اور زمین میں ہل چلانا جاٹوں کے لیے فخر کی بات ہے۔ وہ تعلیم یا کاروبار کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ناول میں اس مقامی پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ قوم اپنے مقامی ثقافتی رویہ کو چھوڑنے کو ہرگز تیار نہیں ہے۔ ان کی نزدیک ان کے رسم و رواج جن کا خاصہ ہیں۔ اسی عزت و بڑھائی کا مان رکھتے ہوئے وہ نچلے طبقوں کا احساس بھی رکھتے ہیں۔ آخر کار وہ ان کے سربراہ جو ہوئے۔ گھوڑے پالنا مویشی پالنا اور اونچی پگڑیاں ان کے فخر کا باعث ہیں۔ اس پگڑی کو اونچا کرتے کرتے وہ اکثر اپنا نقصان بھی کر بیٹھتے ہیں۔ ناول نگار نے ان مقامی چودھریوں اور جاٹوں کے منفی اور مثبت دونوں رویے دکھائے ہیں۔ بخت جہاں اپنے اسی بھرم کو قائم رکھنے کی

خاطر اپنی چودھراہٹ کی دھاک بٹھانے کی خاطر اپنے بھائی کو قرضوں کے بوجھ تلے دبا دیتا ہے۔ مقامی لوگوں میں عزت کا مقام پانے کے لیے وہ ان کی کھلے دل سے آو بھگت کرتا ہے۔ بخت جہاں ہی پہ کیا موقوف ان مقامی چودھریوں کی اکثریت اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنے کے لئے مجرے اور ایسے تماشے ضرور کراتے ہیں جو ان کی دریا دلی کو ظاہر کر سکے چاہے اس کے بدلے ان کو سود یا قرض کی رقم ہی کیوں نہ لینی پڑے۔

"چوکھٹ کے اندر دو دھائے ہوئے صحن میں ماچھی، جولاہے، لوہار، ترکھان براوے، تیلی، نائی اور کچھ کشمیری سب کے سب مہمانوں کی آو بھگت میں دوہرے ہوتے جاتے تھے۔ انہیں نہ صرف ایک معقول انعام ملنے کی بلکہ باہر گلی میں چڑھی، دیگوں میں پکتے پکوانوں میں سے کچھ حصہ ملنے کی آرزو بھی تھی۔"(145)

مقامی ثقافت کے بیان میں ناول میں بخت جہاں کی حویلی میں منعقدہ مجرے کی داستان بھی اس ثقافت کے کئی پہلوؤں کو نمایاں کر گئی ہے۔ شہروں اور بڑے نوابوں کی دولت خانوں پہ ایسے تماشے ہونا کوئی انوکھی بات نہیں انہی کا طرز اپناتے ہوئے مقامی چودھری جن کا حلقہ احباب اور دھاک کئی شہروں میں قائم ہوتی ہے۔ اپنی اس دھاک اور برتری کے احساس میں وہ بھی نوابوں کا انداز اپنا لیتے ہیں۔ مقامی اشرفیہ کے تمام نمائندے اس مجرے میں ناول نگار نے بخش جہاں کی حویلی میں جمع کر دیے ہیں۔ ان میں مختلف پیشوں اور طبقوں کے امراء موجود ہیں۔ کمی کمین اپنے چودھری کے مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگے ہیں۔ گاؤں کے لوگ چھتوں سے اس منظر کو ملاحظہ کر رہے ہیں۔ مجرے میں امرا کی اپنی حیثیت کے دھاک بٹھانے کے لیے حسب توفیق طوائفوں پہ دولت نچھاور کر رہے ہیں۔ گویا یہ مجرا ان امرا کی ساکھ قائم کرنے کا ایک امتحان بھی بن گیا ہے۔ گیتوں کی اکثریت بھی مقامی زبان سے تعلق رکھتی ہے۔ مقامی ثقافت کے بیان میں کسی لمحے بھی مقامی پہلو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ طوائفوں کے لیے بھی ناول نگار نے مقامی زبان کے الفاظ کنجری کا استعمال کیا ہے۔

"مجرے کے مقامی آداب کے مطابق شراب جو کوئی بھی پیے اور جتنی بھی پیئے اور خوراک جس نوعیت کی بھی کھانا چاہے اور جتنی بھی کھانا چاہے اس کی ذمہ داری میزبان کی ہوا کرتی تھی۔ جبکہ مجرہ کرنے والی اور اس کے سازندوں کو ویلیں دینا چاندی کے روپیوں کی پوٹلیاں نچھاور کرنا یا حیثیت ہو تو گانے والے کی خدمت میں سونے کا کوئی زیور پیش کرنا اس میزبان کے یاروں اور دیگر تماشائیوں کا فرض تھا۔۔۔ اور وہ یہ فرض بڑھ چڑھ کر ادا کرتے تھے کہ یہ نیک نامی کا باعث بنتا تھا۔ دیہات میں برسوں کسی ایسے شخص کے قصے سنائے جاتے تھے جس نے کسی کنجری کی ایک ادا پہ گھر بار لوٹا دیا۔"(146)

مقامی قوموں اور مختلف طبقوں کے کردار بھی ناول میں موجود ہیں۔ پنجاب کی مقامی زندگی ثقافت میں ان کا بھی اہم کردار ہے۔ خوشی کے موقعوں پہ بھانڈ بھی آجاتے ہیں۔ جو اپنے فن کا مظاہرہ کر کے خوشیوں میں رچے ان لوگوں سے انعام و اکرام وصول کرتے ہیں۔ بخت جہاں دوسرے کمی کمین لوگ اور خوفزدہ ہو کر محض اپنے فرائض

میں جٹے ہوتے ہیں تو یہ زبان دراز ہنسی مذاق میں بے باک بھی ہو جاتے ہیں۔ مسند پہ بیٹھے شخص کے قصائد پڑھنا پرانی روایات میں سے ہے اور اس کے بعد انعام واکرام حاصل کرنا ان کا اصل مدعا تھا:

"باہر پھاٹک کے باہر بہت دیر سے منتظر صدائیں دینے دعائیں دیتے مراثیوں اور بھانڈوں کو بالآخر اذن باریابی مل گیا اور وہ ڈفلیاں بجاتے ایک دوسرے کو چمڑے کے چھتروں سے مارتے، جگتیں کرتے اس چکا چوند میں آ گئے جس میں بخت جہاں دولہا بنا بیٹھا تھا۔"(147)

چودھری بخت جہاں کے گھر ہونے والی اس محفل کے ضمن میں ناول نگار نے مقامی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو ایک جگہ یکجا کر کے رکھ دیا ہے۔ جہاں ان لوگوں کا رکھ رکھاؤ ہوتا وہاں تہذیب و ثقافت کو گہرے مشاہدے کے ذریعے سے بیان کیا گیا ہے تو دوسری طرف جاٹ قوم کے تفکر کی کئی مزید وجوہات اور اسباب ناول نگار نے سامنے لائی ہیں۔ ناول میں مقامی زندگی اور اس بڑی نسل کے لوگوں کا مختلف کرداروں کے ذریعے سے کردار ملتا ہے۔ ناول میں ان کرداروں کے ذریعے مقامیت کے پہلو نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ پنجاب کی اس قدیم اور بڑی ذات کے لوگوں کا بھی تفصیلاً ذکر موجود ہے۔ اپنے نسلی تفاخر کو برقرار رکھنے کے لیے مردانگی کو ثابت کرنے کے گھر سے وہ مخالفین کی گھڑیاں کھول لاتے۔ جوان کے لیے شرمندگی نہیں بلکہ عزت و فخر کا باعث بنتا۔ مقامی ثقافت میں ان جاٹوں کے بارے میں ناول میں مختلف موقعوں پہ ایسے بیانات قلب بند کیے ہیں۔ اپنی نسلی برتری کو ثابت کرنے کے لیے اپنے دشمنوں پہ فتح حاصل کرنے کی غرض سے وہ مختلف حربے استعمال کرتے ہیں۔ مردانگی کا مظاہرہ کرنے کے لیے وہ دشمنوں کے جانور کھول لاتے اور دوسروں میں ہمت نہ ہوتی کہ وہ واپس اس کی طلبی کا مطالبہ کرتے بلکہ وہ اس بات پہ صبر کر جاتے کہ اس نے اپنے زور بازو پہ ایسا کیا ہے۔

"ادھر جاٹوں کے لیے دوسروں کی گھوڑیاں کھول لانا۔۔۔ ڈنگر چرانا جی داری اور مردانگی کی اعلیٰ ترین علامتیں تھیں اور ایک جاٹ کی پگڑی کا شملہ اتنا ہی بلند اور پر تفاخر ہو جاتا جتنا اس نے یا اس کے حواریوں نے دوسروں کے مویشی کھولے ہوں گھوڑے چرائے ہوں پر انہیں کوئی نہ پوچھتا۔"(148)

ناول میں ان بیانات سے جہاں مقامی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت ملتی ہے وہاں اس طرح کے متعدد بیانات سے قاری اس شک میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے کہ شاید وہاں لوٹ مار اور چور بازار گرم تھا۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ناول نگانے کسی قدر مبالغے سے بھی کام لیتے ہوئے ان واقعات کو مختلف حوالوں سے کثرت سے بیان کیا ہے۔ تاہم مقامیت کی اصل بنیاد رسم و رواج اور اصول سے ان اصولوں کی بنیاد پہ ہی معاشرے کا توازن قائم تھا۔ مردانگی کے جوہر دکھانے کے لیے بسا اوقات ایسی ہی مثال بھی دیکھنے کو مل سکتی ہے مگر ایسا ہرگز نہیں ہے کہ مردانگی کی مثال قائم کرنے کے لیے وہ چوری اور ڈاکے کا سہارا ہی لیتے تھے۔ کبڈی کے میدان ہو یا کھیل تماشے وہاں پہ بھی مردانگی کے جوہر اور ہمت دکھائے جاتے تھے۔ مقامیت کے نظام کے مطابق ایسا کرنا جرات اور بہادری تصور کیا

جاتا تھا۔ مقامی ثقافت کے اس پہلو کو بیان کرتے ہوئے ناول نگار نے مقامی جاٹوں چودھریوں کے اس مقامی پہلو کو بیان کیا ہے۔ مقامی ثقافت کے مطابق یہاں کے رسم و رواج اور قانون کا درجہ رکھتے تھے اور لوگوں کے درمیان روایتی سلسلہ اس قدر مضبوط ہے کہ وہ تھانے کے ذریعے سے حل کر لیا جاتا تھا۔ مقامی زندگی اس مخصوص دائرے کے گرد گھومتی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل تک یہ مقامی زندگی انہی اصولوں پر اپنی روایت کے مطابق چل رہی تھی۔ نسل در نسل روایت آگے بڑھتی چلی جاتی اور یہ اصول بھی موروثی صورت میں آگے اگلی نسل تک منتقل ہو جاتے۔ اس مقامیت کا تسلسل اسی طرح سے جاری ساری رہتا ہے۔ مقامی لوگ انہی مقامی روایات کے تحت زندگی گزارتے اور اس کے ارتقاء کا سلسلہ جاری اور ساری رکھے ہوئے تھے۔ اس عہد میں اس مقامیت کے تناظر میں مختلف حوالوں سے مقامی مسائل اور مقامی ثقافتی پہلوؤں کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک دوسرے پہ فتح حاصل کرنا اور برتری ثابت کرنا یہ انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ البتہ ہر علاقے ہر مقامیت میں اس کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ کہیں عورتوں پہ فتح حاصل کرنا عزت کا مقام سمجھا جاتا ہے تو کہیں بہادری کے جوہر دکھانا مذکورہ مقامیت میں زمینداری ایک اہم پیشہ تھا۔ بہت سارے معاملات اسی کے گرد گھومتے تھے بیلوں اور گھوڑیوں کا رکھنا بڑے چوہدریوں کی شان کے مطابق ہوتا تھا۔ اسی لیے ان کی برتری ان کی فضیلت کی علامت بھی انہی سے جڑی تھی۔

"یہ وہ زمانے تھے جب دریائے چناب کے کنارے جو گھنے جنگل اور بیلے اور دیہات تھے وہاں چوری کو معیوب نہیں بلکہ کسی حد تک معزز سمجھا جاتا تھا۔ کسی نوجوان کے سر پر چودھریوں والی پگڑی تب باندھی جاتی جب وہ شریکوں کا کوئی مویشی کھول کر لاتا تھا اور تب وہ شادی کے قابل سمجھا جاتا تھا۔"(149)

مندرجہ بالا اقتباس سے اس سے قبل بیان کردہ ناول کے واقعات سے پیدا ہونے والے ابہام کا کسی حد تک ازالہ ہوتا ہے۔ چوری کا مطلب محض لوٹ مار ہی نہیں کرنا بلکہ ایسے رقیب یا حریف جن کے ساتھ کوئی دشمنی یا لڑائی جھگڑے کا معاملہ ہوتا۔ ان کے ہاں سے مال مویشی کھول لانا بہادری کی علامت سمجھا جاتا کہ وہ خطرے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بھی اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھی ایسا جرات اور بہادری کا کام کرنا بنیادی طور پہ ان مقامی لوگوں کا رسم و رواج اس طرح سے جڑا تھا نہ کہ اس کا یوں مطلب لیا جا سکتا ہے کہ وہاں چور بازاری کا بازار گرم تھا۔ وہ لوگ تو ایک دوسرے کی پگڑیوں کا عزتوں کا خیال رکھتے تھے اور دوسروں کا احترام کرتے تھے۔ دوسروں کی عزتوں کو اپنی عزت سمجھتے تھے نہ کہ ان کی عزتوں کی پامالی کو وہ کسی بھی صورت میں قبول کر سکتے تھے۔ اس کا ہرگز مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ لوگوں کے جان مال عزت غیر محفوظ سے اور یہ لوگ سرعام ایک دوسرے کا مال کھاتے تھے بلکہ عموماً ایسا رویہ اپنے مخالف کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا۔ اس کی گھوڑی کھول لی جاتی یا اس کے کھیتوں میں ہل چلانے والے بیل کھول لیے جاتے تاکہ اپنی برتری کو ثابت کیا جا سکے۔ مقامی علاقوں میں تھانہ کچہری کے آنے سے قبل بھی لوگ اپنے روایتی قانون کے ذریعے ایسے نظام میں جڑے تھے جن میں رشتوں کا لحاظ اور پاس بھی تھا۔ چودھریوں کا کام محض اپنی زندگی

پر تفاخر کرنا ہی نہیں ماتحت قوموں کی ذمہ داری بھی ان کے اوپر عائد ہوتی تھی۔ وہ ان کے مسائل کا ازالہ کسی حد تک ضرور کرتے تھے۔اس مقامی زندگی میں زمینداری بنیادی پیشہ یا ذریعہ معاش تھا۔ تقسیم کے قبل کے زمانے میں دونوں مذاہب مسلمان اور سکھ مقامی رشتوں کا پاس بھی رکھتے تھے۔دونوں کا نسلی طور پر ایک ہونا بھی ان دونوں کے درمیان ایک بھائی چارے کی وجہ تھی۔ جاٹ قوم کے لوگ خواہ وہ کسی بھی مذہب کے ہوتے اپنے ثقافتی سماجی بندھن کا پاس اور لحاظ ضرور رکھتے تھے۔ تقسیم کے وقت بھی مقامی لوگوں نے اپنے لوگوں کی حفاظت کی قربانی کی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ تقسیم کے فسادات میں بھی انہوں نے اپنے مقامی لوگوں کو چاہے وہ دوسرے مذہب کے کیوں نہ ہوں۔ان کی عزت اور ناموس کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے بھی پیش کیے۔ جب مقامی لوگ اپنے مقامی لوگوں کی نفرت اس اگ سے بچانے میں پیش پیش تھے۔ ناول نگار نے مقامیت کے بیان میں ان تقسیم کے سانحے کو بھی مقامیت کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔مقامی لوگ اپنے ثقافتی ویسے کو بچانے کے لیے کوشاں ہیں۔ مقامی ثقافت میں اہم اور اس وقت آیا۔جب تقسیم ہند کا معاملہ ہوا۔ ناول نگار نے اس مقامیت کو اس تاریخی ارتقاء سے بھی گزارا ہے۔ تقسیم کے وقت ہونے والے فسادات اس مقامیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔مقامی لوگوں نے اس کے باوجود بھی اپنی مقامی روایت اور ثقافت کو برقرار رکھا۔ لوگوں کے درمیان سماجی بندھن آخر دم تک قائم رہتا ہے۔ مقامی لوگوں نے غیر مذہب اپنے دوسرے لوگوں کی ہر طرح سے مدد کی ان کی فصلوں مویشیوں کا خیال رکھا۔ یہاں تک ان کی حفاظت کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش کر دیا۔مقامی لوگوں کی ایک بڑی تعداد نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ مٹی میں مل گئے اور کچھ اپنی مٹی سے دور ہو گئے۔

> "دیر نہ کریں چاچا۔۔۔آپ اور کتنے روزان کو آن پانی پہنچائیں گے۔ان کے کھیتوں کو پانی دیں گے۔ڈنگروں کی دیکھ بھال کریں گے اور ان کی بھینسوں کا دودھ دوکران کو پہنچائیں گے۔ کب تک ان کی رکھوالی کریں گے آپ کو گردوارے میں پناہ لینے والوں کو کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکال کر گجرات پہنچادیں۔ جہاں سے وہ کسی نہ کسی طرح پار چلے جائیں۔"(150)

مٹی میں شامل وفاداری بھائی چارے کا پہلو اس موقع پر بھی دکھائی دیتا ہے۔ مقامی لوگوں نے فسادات کے وقت بھی اپنے ان مقامی لوگوں کی ہر طرح سے مدد کی کچھ اپنا مال واسباب ان کی امانت کر کے لوٹ گئے۔

مقامیت کی جیل میں ایک نمایاں پہلو اپنی مٹی اور دھرتی سے جدائی کا بھی ہے۔یہ مقامی سکھ لوگ کسی طور پہ بھی اپنی اس مٹی سے دور ہونے کو تیار نہ تھے۔حالات کے جبر نے ان کو ان کے شناخت سے محروم کر دیا۔یوں شناخت کے بحران کا مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ یہ لوگ دوسرے علاقوں میں جا کر اور یہاں پر دوسرے لوگ آباد ہو کر بھی مہاجر کے لقب سے سرفراز ہوئے اس کی مثال لہنا سنگھ کی کچھ عرصے بعد اپنے آبائی علاقے میں رات اندھیرے میں بخت جہاں کے پاس آمد میں دیکھی جاسکتی ہے۔ان لوگوں میں اپنی مٹی سے دوری کا قلق ہمیشہ رہا۔ تو دوسری طرف اکبر جہاں

کینیڈا میں ایک صاحب حیثیت ہونے کے باوجود بھی روح کی بے چینی کا شکار ہے۔اس کی بے قراری کا سبب کچھ اور نہیں اپنی ثقافت اور مٹی سے دوری ہے۔وہ ان علاقوں میں زندگی گزارنے کے باوجود بھی اپنی دھرتی اور ثقافت سے دوری کو برداشت نہیں کرپایا۔بحران ان کی زندگیوں کو کسی طور پر بھی پر سکون نہیں ہونے دیتا۔

"زیر بحث ناول کا زمانہ پاکستان بننے سے تقریباً دو دہائی پہلے کا ہے 1929ء کے قریب شروع ہونے والے اس زمانے میں جو سماج دکھایا گیا ہے۔اس میں ہندو مسلمان اکٹھے ہیں اور مختلف نسلوں گروہوں اور قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔جو خوشی غم اور تکلیف میں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں لین دین تجارت رکھ رکھاؤ اور تہذیب میں ایک دوسرے کی خوشیوں کا احترام کرتے ہیں۔"(151)

ناول نگار نے مقامی ثقافتی نمائندوں کو وقت کے ساتھ ساتھ اس ثقافت کو ارتقاء عمل سے بھی گزارا ہے۔ ناول میں تین نسلوں کا قصہ ہے۔ان تین نسلوں میں مقامی ثقافت ارتقاء کی عمر سے گزر رہی ہے۔اکبر جہاں دوسری نسل کا اہم کردار ہے۔یہ کردار اپنی مقامی سے ہزاروں میل دور ایک نئی زندگی کی بنیاد رکھتا ہے۔وقت اور ماحول کے مطابق اس نے ثقافت کے اثرات کو قبول ضرور کیا تھا۔تاہم اس کے باوجود اس کی روح اپنے اصل سے جدا نہ ہو سکی۔اس کی اولاد ایک چینی خاتون اور ایک بنگالی عورت سے ہے جو کینیڈا کی پیدائش ہونے کے باوجود بھی اپنی مقامیت کے کسی نہ کسی طور پر نمائندہ ضرور بنی ہے۔ناول نگار نے اس حصے میں اگرچہ مختلف پہلوؤں کا بیان کیا ہے جیسا کہ مشترکہ ثقافت اور ثقافتی گھٹن کا احساس آنے والی نسلوں کی بے رخی پہ کڑھنا۔اس کے باوجود اہم پہلو اپنی مقامی ثقافتوں کی باقیات بھی ہے۔بخت جہاں کا کردار اپنی مقامیت کا نمائندہ کردار ہے۔وہ کبھی اپنے آبائی علاقے میں لوٹتا تو نہیں تاہم اس کے باوجود وہ اپنی ثقافت اور ثقافتی حیثیت کو شکست نہیں دے پاتا۔وہ ایک نیا جہاں تخلیق کرنے کے باوجود بھی اپنے اصل جہاں کا نمائندہ بن جاتا ہے۔اپنی بیٹی سیرت کی شادی ایک سکھ کے ساتھ ہونے کے سانحے کو وہ برداشت نہیں کرپاتا۔اپنی ثقافتی حیثیت سے مجبور جب کچھ نہیں کرپاتا تو وہ موت کو گلے لگالیتا ہے۔ہانسی نسل کے موتی کو وہ اس دیار غیر میں اپنا دوست/عزیز خیال کرتا ہے کہ دونوں کے درمیان قربت بھی ان کی مقامیت کی وجہ سے ہے۔دونوں کے مقامی جذبات ایک جیسے ہی ہیں جو بالآخر اپنے اصل کی طرف ہی سکون محسوس کرتے ہیں۔اکبر جہاں اپنے ملک سے بہتر معاش اور خوشحالی کی غرض سے دیار غیر میں جابستا ہے۔جہاں وہ ایک کامیاب اور خوشحال زندگی تو گزارتا ہے لیکن اس کا داخلی کرب قائم رہتا ہے۔اس کرب کا مداوا،اس کی اپنی دھرتی میں ہے۔اس کی زندگی میں اسے اس کا موقع نہیں مل پاتا۔مابعد جدید نقطہ نظر سے گلوبلائزیشن کے تحت مقامی ثقافتوں کا زیر عتاب آجانا ایک اہم مسئلہ ہے۔وہ بڑی ثقافتوں کے تحت آلہ اپنے وجود کو کسی قدر گم کر بیٹھتی ہیں۔اس کے باوجود وہ لوگ تنہائی کا شکار رہتے ہیں۔ وہ بڑے گروہ کا حصہ بنتے ہوئے بھی اس کا حصہ نہیں بن پاتے کیونکہ ان کا داخلی بحران کسی صورت بھی چین نہیں لینے دیتا۔

"موتی تم بھی سن رہے ہو کہ نہیں۔۔۔ مجھے پہچانتے بھی ہو کہ نہیں۔۔۔ اگر نہیں بھی سن رہے تو کسی اور کو کیسے سناؤں نہیں پہچانتے تو نہ سہی۔۔۔ میں اس کڑی یاوے ملک میں کس کے آگے اپنا کلیجہ کھول کر اس پر لگے گھاؤ دکھاؤں، کسے اپنے رنج میں شریک کروں۔ چودھری بخت جہاں کی سگی پوتی ایک سکھڑے کے ساتھ شادی کر لے۔ بے شک کرے۔ تب کرے۔ جب میں اپنی اس جھیل میں ڈوب مروں، جس کے پانیوں پر چار ایسی مرغابیاں تیرتی تھیں جن کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔ یا پھر وہاں۔۔۔ جہاں رچرڈ اور بخت جہاں کی ماؤں کی قبریں ہیں۔ ندی کنارے کے قبرستان میں۔۔۔ وہاں ایک اور قبر کھودی جا رہی ہو جس میں۔۔۔ میں اپنے ہاتھوں سے اسے سیرت کو دفن کر رہا ہوں۔"(152)

ناول کے اس حصے میں مابعد جدید کے مقامی/چھوٹی ثقافتوں کے بیانیے کی توثیق ملتی ہے۔ اکبر جہاں کی طرح اس خطے کینیڈا میں کئی مقامی علاقوں خصوصاً مشرقی ممالک سے آ کر بسنے والے لوگوں کی اکثریت ہے۔ جو ان علاقوں میں آ کر اس کو اپنی آماجگاہ بنا لیتے ہیں۔ ان کی اکثریت خود کو اس بڑی ثقافت میں ضم کر دیتے ہیں۔ اس کے باوجود کچھ لوگ اپنی مقامی ثقافت سے دور رہ کر بھی اس کے نمائندے بن جاتے ہیں۔ اپنی اصل مقامی شناخت میں وہ پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ ان کو اپنی شناخت کے معدوم ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ وہ مختلف مقامی ثقافتوں کی یہ نمائندے بیرون ملک مقیم ہونے کے باوجود اپنا مسکن بنانے کے باوجود اپنے ہوٹلوں دکانوں زمینوں کے نام بھی وہی رکھتے ہیں۔ جو ان کی اصل شناخت اور پہچان ہوتی ہے۔ زیر مطالعہ ناول میں مابعد جدیدیت کے اس نقطہ نظر کی بھرپور وضاحت ملتی ہے۔ کئی نسلوں اور قوموں کے لوگوں کو ایک جگہ لا کر جمع کرنا اور اس کے باوجود اپنی مقامیت کی نمائندگی کرنا اس نقطہ نظر کی وضاحت کرتا ہے۔

"سیرت اور دھیان سنگھ اگرچہ انہی خطوں میں پلے بڑھے تھے۔۔۔ جوان ہو کر بوڑھے ہو چکے تھے لیکن ان کے اندر پنجاب کی خو اور مہک کا تسلسل چلا آ رہا تھا۔ ان کے آباؤاجداد نے جو مدتوں پہلے ان منجمد خطوں میں رزق ، روزگار کی خاطر اپنے نصیب آزمائے چلے آ رہے تھے، اپنی زبان اور ثقافت اور روایات کو سنبھالے رکھا تھا اور ان تک منتقل کر دیا تھا۔۔۔ مولوی چراغ دین۔۔۔ وہ اپنی جس آبائی ثقافت سے بیگانہ رہا تھا۔ اس کا تعارف جب بسنت اور دھیان سنگھ جیسے سرداروں سے کروایا تو اسے احساس ہوا کہ وہ اب تک بھٹکتا رہا ہے۔ اپنی جڑوں سے اکھڑ رہا ہے۔ اس نے اپنی قدیم ذات اور روایت کا پودا ان خطوں میں آ کر بویا۔"(153)

ناول نگار نے امیر بخش اور عزیز جہاں کی اولادوں کا نہ ہونا جہاں ان کی تہذیب اور ثقافت کی آبادی کو معدوم کیا ہے تو بخت جہاں کے پوتے، بخت جہاں کی صورت میں اس مقامی ثقافت کو پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ اس ختم ہوتی ثقافت کے نقوش مٹنے سے قبل ان کو پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ ناول نگار نے مقامی کرداروں کا تسلسل ناول میں تین نسلوں تک قائم رکھا ہے۔ تیسری صدی تک پھیلے اس ناول میں مقامیت کو اپنی مخصوص اوصاف کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس مقامیت میں عالمگیریت کے مقابلے میں اپنی شناخت کو قائم رکھنے کا حوصلہ اور تصور موجود ہے۔ بخت جہاں

کے پوتے کا اپنے اصل کی طرف لوٹنا اور اپنی دھرتی ہی میں رہ جانا اس مقامیت کے دوام کی دلیل ہے۔ اکیسویں صدی کے عالمی منظر نامے پہ نگاہ دوڑائی جائے تو ثقافتی یلغار سے چھوٹی، قومیں اور ثقافتیں بڑی تعداد میں اپنی شناخت گم کر کے ان بڑے گروہوں میں ضم ہو رہی ہیں۔ وہیں کچھ اپنی شناخت کو قائم رکھنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ شناخت کے بحران میں بہت سی ثقافتیں مرکزی ثقافتوں کے درمیان بھی اپنے وجود کو نہ صرف برقرار رکھے ہوئے ہیں بلکہ اپنی اہمیت کو منوا بھی رہی ہیں۔" خس و خاشاک زمانے" بھی اسی طرح کا مثبت رجحان دیکھنے کو ملتا ہے کہ یہاں کی مقامیت بڑی ثقافتوں کی یلغار میں جانے کے باوجود بھی اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ بخت جہاں کے پوتے کی واپسی درحقیقت اس بات کا اشارہ بھی ہے کہ بڑی ثقافتوں کا حصہ بننے والے افراد بالآخر اپنے بقاء کی جنگ لڑتے لڑتے اور اپنے بقاء کی خاطر اپنے اصل ثقافت کی طرف انحراف کرنے میں ہی عافیت خیال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شاہد نواز اس تناظر میں لکھتے ہیں کہ

"اس ناول کی معراج بھی یہ ہے کہ مقامی کو عالمگیریت کے مقابلے کمزور نہیں دکھایا گیا بلکہ عالمگیریت کو قبول کرتے ہوئے مقامیت کی شعوری طور پر دل آویز تشکیل کی گئی ہے۔"(154)

ناول کا آخری حصہ اکیسویں صدی کے بدلتے عالمی تناظر کے حوالے سے اہم ہے۔ اکیسویں صدی کا ہنگامہ خیز آغاز مختلف حوالوں سے ایک نیا منظر نامہ لے کر ابھرا۔ نائن الیون کے سانحے نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں ایسا لیا کہ ایک نیا منظر نامہ وجود میں آیا۔ عالمگیریت کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔ ثقافتی بحران کے مسئلے نے جنم لیا۔ عالمی طاقتوں کے غلبے کی وجہ سے مقامی ثقافتوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ ایک طرف تو مقامی لوگ اپنی ثقافتی پہچان کو ترک کرنے پہ مجبور ہوئے تو دوسری طرف بڑی ثقافتوں کو اپنانے والوں پہ بھی حقیقت آشکار ہوتی چلی گئی۔ وہ اپنے اصل کی جانب لوٹنے لگے۔ عالمگیریت نے پوری دنیا کو ایک عالمی گاؤں بلکہ ایک عالمی منڈی کا روپ دے دیا ہے۔ اس پرکشش نعرے میں غلبہ پھر بھی بڑی طاقتوں ہی کا ثابت ہوا۔ نئی نسل ذہنی کشمکش اور احساس کمتری میں ایسی مبتلا ہوئی ہے کہ وہ اس پرکشش فریب زدہ نعرے کا حصہ بننے لگے۔ گاؤں اور دیہاتوں کے لوگوں کے لیے بھی شناخت کسی قدر باعث شرمندگی بننے لگی ہے۔ اس تمام صورتحال کے باوجود ناول میں اس حوالے سے مثبت اشارے ملتے ہیں۔ بخت جہاں کے پوتے بخت جہاں کا اپنے اصل کی جانب لوٹنا ایک حوصلہ افزاء اشارہ ہے۔

اکیسویں صدی میں بیرون ملک میں مقیم لوگوں کی مجبوریوں کا بھی ناول میں تذکرہ ہے۔ مجبوریاں ان لوگوں کو اپنی مقامیت سے دور کر دیتی ہیں۔ مشرقی ممالک کی خستہ حالی اور کمزور معاشی صورتحال ان کو اپنے آبائی علاقوں سے دور کرنے کا باعث بھی بنتی ہے اور دوسری طرف بڑی طاقتیں مضبوط معیشت کے دعویدار، جن کی ترقی میں دراصل انہی لوگوں کی محنت کا دخل ہے۔ پرکشش طریقے سے ان مقامی لوگوں کو اپنی جڑوں سے الگ کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

ناول نگار نے موتی اور اکبر جہاں کے کرداروں کی صورت میں مقامیت کے علمبرداروں کا تذکرہ کیا ہے۔ جو اپنا مسکن تبدیل کرنے کے باوجود بھی اپنے اصل سے جڑے ہیں تو دوسری طرف موجود سلیمان شاہ کا کردار جو اپنا اصل گم کر دیتا ہے۔ ان کی اولادیں اپنی ثقافت تہذیب کو دفن کر کے اس پہ ایک ایسی عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہیں اور کافی حد تک کامیاب بھی ہو جاتی ہیں جو عالمگیریت کی پروردہ ہوتا ہے۔ جو اپنے مقامی علاقوں میں رہنے کے باوجود اپنی مقامیت کو عروج دینے کے بجائے اس کے زوال کا باعث بنتے ہیں۔ بیرون ملک مقیم لوگ اپنی مٹی کے لیے ترستے ہیں اور دوسری طرف یہاں بسے ہوئے لوگ بھی اپنے مقامی رسم ورواج کو ترک کر کے دوسروں کی تہذیب وثقافت کے نمائندے بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ لوگوں کا دوغلا پن مقامیت کی شناخت کو معدوم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور یہی ان عالمی طاقتوں کا آلہِ کار بنتے ہیں۔ جو ان کی ثقافت کو اپنی ثقافت پہ ترجیح دیتے ہوئے ان کے رسم ورواج کی نہ صرف آبیاری کرتے ہیں بلکہ اپنی ثقافت کو کم تر ثابت کرنے میں کوئی بھی کسر نہیں اٹھار کھتے۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو بڑی ثقافتوں میں کسی مجبوری کے تحت جا کہ بھی وہاں کسی نہ کسی صورت نے اپنی ثقافت کی بازیافت کرتے ہیں اور اپنی مٹی کے لیے ترستے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ناول نگار نے دو مختلف گروہوں کے کرداروں کی تخلیق کے ذریعے دونوں رجحانات کا بہترین تقابل پیش کرتے ہوئے دونوں رجحانات کی تفصیل بیان کی ہے۔

> "بخت جہاں ہم اس اداس سرد دھرتی کے آبائی بیٹے نہیں ہیں۔ بے شک اس نے ہمیں اپنے سینے سے لگا کر اپنا لیا ہے لیکن اس کے سینے کی گرمی سے ہم پگھل نہیں سکے ہم پاکستان کی مٹی کے بوٹے ہیں۔ کس بوٹے کا دل جی چاہتا ہے کہ اپنی مٹی کے پاتال تک اتری اپنی جڑیں خود اکھاڑے اور پھر کسی دور دراز کے سرد خطے میں اپنے آپ کو بودے۔ جب کہ اس میں نابود ہو جانے کا خدشہ بھی موجود ہوتا ہے۔ جڑوں کے سوکھ جانے کا مردہ ہو جانے کا امکان بھی ہوتا ہے لیکن جب اپنی دھرتی میں ہر جانب بھوک، ناداری اور ناانصافی بو دی جائے، ہر جانب تھور اور آک کے زہرناک پودے تمہارا دم گھوٹنے لگیں تو بوٹا اپنے آپ کو اکھاڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

ناول کا وسیع تناظر دو صدیوں کے عرصے اور کئی نسلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اصل موضوع اور مرکز تو وسطی پنجاب کی مقامی ثقافت ہے۔ اس کے نمائندہ کردار بڑے شہروں سے لے کر بڑے ملکوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اکبر جہاں، موتی کینیڈا میں اپنی مقامیت کی آبیاری کر رہے ہیں تو دوسری طرف انعام اللہ امریکہ میں اس وقت قیام پذیر ہے جب نائن الیون کا سانحہ پیش آیا۔ اس سانحے کے بعد ایک خاص مذہب اور قوم کے لوگ زیر عتاب آئے۔ مسلمان خصوصاً مشرقی ممالک کے لوگ اس نفرت کا شکار ہوئے۔ ناول میں مقامیت اور ثقافت کے ضمن میں چند دوسری مقامیت کا بیان بھی ملتا ہے۔

انعام اللہ کے کردار کے ضمن میں ناول نگار نے امریکہ جو اقوام عالم کا سربراہ اور بڑی قوت کا دعوی دار ہے۔ ان لوگوں کی زندگیوں کے بے چینی داخلی انتشار اس بڑی ثقافت کے پیرائے میں بیان ہوئی ہے۔ ترقی پذیر اور تیسری

دنیا کے ممالک سے تعلق رکھنے والے لوگ امریکہ میں مقیم تھے۔ان کی زندگیاں مشکلات کا شکار ہوئیں مشرق بھی اس سے بہت حد تک متاثر ہوا ہمارے مقامی معاشرے بھی ان اثرات کو قبول کیے بغیر نہ رہ سکے۔ڈاکٹر کامران کاظمی ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

"نائن الیون کے بعد یک قطبی ہو جانے والی دنیا مزید امریکی سامراج کے عزائم کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔اس صورتحال میں" پاکستانی سماج بالخصوص عالمی و علاقائی حالات سے شدید متاثر ہو رہا ہے۔"(156)

انعام اللہ اور شباہت کے کردار ایسے طبقے اور زمانے کے نمائندے ہیں جو شناخت کے بحران کا شکار ہیں۔سانسی نسل کے موتی اور بنگالی مسلمان عورت کی اولاد سیرت اپنے اصل کی متلاشی ہے۔وہ اپنے اصل کو جاننے کے لیے پاکستان آتی ہے۔تاہم اس کا چچا اور اس کی اولاد تو خود اپنے اصل سے منحرف ہو چکے ہیں۔وہ اپنی شناخت گم کر چکے ہیں۔وہ اپنی ذات کے اضطراب کو ختم کرنے کے لیے بے چین ہے۔یہ دونوں کردار اکیسویں صدی کے ان نوجوان نسلوں کی نمائندے ہیں جو اپنی تہذیب سے دور ہیں۔ان کے والدین نے غیر ملکوں میں کسی وجہ سے رہائش اختیار کی ۔وہ نہ تو مکمل طور پر اس نظام کا حصہ بن سکے اور نہ قدیمی روایتی ساخت کسی نہ کسی طرح ان کی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہیں۔تو دوسری طرف اپنی اصل کو بھی لوٹ نہیں سکتے کہ ان راستوں کے بارے میں وہ خود بھی بے خبر ہیں۔

"کہانی کا دورانیہ 11 ستمبر 2001ء کے بعد تک پھیلانے کا مقصد شناختی بحران اور جینیاتی (Genetic) تسلسل رکھنا ہے۔تیسری نسل کو فائدہ، زبان، ثقافت اور زمین گنوا کر اجنبی ملکوں میں بسنا پڑ رہا ہے زمانے کے جبر نے ان کو ہمہ گیر ثقافت سے جدا کر کے رائیگانی کے راستے پر ڈال دیا ہے۔وہ باطنی روحانی کرب سے تہی ہو گئے ہیں۔"(157)

خس و خاشاک زمانے مقامیت کی ذیل میں لکھے جانے والے ناولوں میں ایک اہم ناول ہے۔ناول کا وسیع تناظر میں اس مقامیت کو تین نسلوں کا ارتقائی عمل سے گزار کر مقامیت کو تین مختلف ادوار میں بیان کیا گیا ہے۔ناول نگار نے تین نسلوں میں مقامیت کو بیان کیا ہے۔ناول نگار نے ثقافتی اعتبار سے ناول کے آغاز سے انجام تک تیسری نسل تک مقامی عناصر کی فراوانی دکھائی دیتی ہے۔ناول میں مقامیت کا بیان محض کسی خاص عہد تک نہیں بلکہ ارتقاء کی منازل طے کرتا ہے۔ناول کی ابتداء میں بخت جہاں کا پوتا اپنے دادا کی پگڑی سر پر رکھ کر اور حقے کے کش لگا کر اس مقامیت کے ارتقائی سلسلے کو پھر رواں دواں کر دیتا ہے۔امیر بخش، عزیز جہاں، روشن کے مرنے اور ان کی نسل کے آگے نہ بڑھنے کا یہ مطلب ضرور ہو سکتا ہے کہ مقامیت مر رہی ہے۔عالمگیریت کے تناظر میں مقامی ثقافتوں کی شناخت معدوم ہو رہی ہے۔کہیں نئی نسلیں ان کے سوانگ میں آگئی ہیں تو کہیں ان علاقوں پہ بڑھتے ہوئے شہروں نے ان مقامی علاقوں کو ان کی اصل سے جدا کر دیا ہے۔بخت جہاں کا واپس اپنے اصل کی طرف لوٹ کر آنا اس عالمگیریت

سے فرار کی وہ کوشش ہے۔ جو مقامی ثقافتیں اس ثقافتی گھٹن میں کر رہی ہیں۔ عالمگیریت کے فریب سے اپنی مقامی ثقافتوں کی طرف سفر طے کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

شہر خالی کوچہ خالی کرونا وبا کے ضمن میں لکھا گیا یہ ناول واحد متکلم کا بیان ہے۔ ناول کا اکلوتا کردار اپنے روز وشب کے تناظر میں اس وبا کی ہولناکی کو بیان کرتا ہے۔ انسان ایک سماجی مخلوق ہے چاہے وہ کسی بھی نئے نظام کا حصہ بن جائے ایسے معاشرے کا جہاں سماجی رشتہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جہاں رسم ورواج کی پاسداری زیادہ نہ ہو اجتماعی سے زیادہ انفرادی زندگی کا تصور ہو تب بھی انسان اکیلے نہیں رہ سکتا اور اگر رہتا ہے تو نفسیاتی طور پہ مطمئن نہیں ہو سکتا۔

ناول کا کردار لاہور کی مقامیت کا ایک فرد ہے۔ ناول کا کردار ایک ایسے پوش علاقے کا رہائشی ہے جہاں پر آسائش مکانات اور وسیع و عریض سڑکیں ہیں۔ ناول کے اس کردار میں وبا کے ساتھ ساتھ شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادیوں ان کی فطرت کے حسن کو پہنچتے والے نقصانات کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ ناول کے کردار کا پرندوں، جانوروں کے ساتھ فینٹسی مکالمہ دراصل اس موجودہ صورتحال کا نوحہ ہی ہے شہروں کی آبادی حد سے تجاوز کر رہی ہیں۔ ان آبادیوں میں اب ایسی نئی بستیاں وجود میں آگئی ہیں جو اپنے طور پہ ایک الگ دنیا ہیں۔ جنگلی حیات کا ناپید ہو جانا، اس کے باعث ہے اس مقامی علاقے میں جہاں زرعی کلچر اس کی پہچان وشناخت تھی اب وہاں بڑی بڑی ہاؤسنگ سوسائٹیوں نے لے لی ہے۔ زرعی زمینیں ان کا شکار ہو کر پختہ مکانوں اور تارکول کی سڑکوں کی صورت میں ڈھل گئی ہیں۔ یہاں آباد ہونے والے ان گھروں کے مکین گھاٹ گھاٹ کے انداز لیے آتے ہیں۔ اس کے بعد اپنی پرانی وضع بھول جاتے ہیں۔ ناول نگار نے ان مکالموں کے ذریعے جہاں جنگلی حیات اور فطرت کو پہنچنے والے نقصان کا بیان کیا ہے وہیں پرانی ثقافتوں کے مٹنے کے شواہد بھی بیان کیے ہیں۔ یہ نئی آبادیاں پرانی ثقافتوں کی نہ تو عکاس ہیں اور نہ ہی ان کے ذریعے کسی ثقافت کو بقا ملتی ہے۔ یہ تو پرانی مقامی ثقافتوں کی ضد کی تصویریں ہیں۔ انسان نے اپنی آسائشوں کی تلاش میں فطرت کے حسن کو پامال کر دیا۔ ناول میں ناول کے کردار کا ہرن کے ساتھ مکالمہ اسی طرف اشارہ ہے۔ اپنی ثقافتوں کے خاتمے کے ساتھ ساتھ انسان نے نظام فطرت کو بھی متاثر کر کے ان کی جگہ پر آسائش آماجگاہیں تعمیر کر لی ہیں۔ کرونا وبا میں انسانوں کی بستیاں بھی اجڑ گئیں۔ شہروں کی رونق ماند پڑ گئی۔ ہر طرف سناٹا اور ہو کا عالم ہے۔ انسان اپنی تمام تر ترقیوں تمام تر ٹیکنالوجی کے باوجود بے بس ہوا بیٹھا ہے کہ آخر وہ اس وبا کا جواز کہاں سے تلاش کرے؟ کس طرح اس سے نبرد آزما ہو کہ اس مشکل سے نکل سکے۔ اس کی تمام تر فراست جامد ہو کر رہ گئی۔ فطرت کے رنگ پھر سے ابھرنے لگے۔ ہرن اور پرندوں کی اساطیر ناول میں اس بات کی ترجمانی کرتی ہے کہ انسانوں کا وبا کے دنوں میں محدود ہونا فطرت کی طرف ایک قدم بھی ہو سکتا ہے اور فطرت کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی وجہ سے فطرت بھی انسان کے اس ظالمانہ رویے پہ خوش دکھائی دیتی ہے۔

"آج تمہارے شہر ویرانے ہو گئے ہیں۔ بستیاں سنسان ہو گئی ہیں اور تم لوگ خوفزدہ چوہوں کی مانند اپنے اپنے گھروں کے پنجروں میں بند ہو چکے ہو۔۔۔ اپنے اوپر نازل ہونے والی وبا کے جواز کو بھی سائنس کی کتابوں میں تلاش کرتے ہو اور کبھی مقدس صحیفوں کا سہارا لیتے ہو اور جانتے ہی نہیں کہ تم نے جو ظلم کمایا ہے یہ اس کا نتیجہ ہے۔ اس وبا نے ہماری بددعاؤں سے جنم لیا ہے۔۔۔ تم وہاں ہوا کرتے تھے اپنی بستیوں کی فصیلوں کے اندر اور ہم ان کے باہر تھے اپنے جنگلوں کی عافیت میں پھر تم نے سوروں کی مانند بچے جننے شروع کر دیئے۔ اتنے بچے کی بستیوں میں گنجائش نہ رہی اور تم ہمارے جنگلوں اور صحراؤں پر قابض ہو گئے۔" (158)

مقامیت کے ضمن میں اگرچہ ناول میں زیادہ تفصیل تو نہیں ملتی مگر ناول نگار نے شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی اور شہروں کے مختلف نوعیت کے نئے شہروں کے اہم مسئلے کو ضرور موضوعِ بحث بنایا ہے۔ جو نہ صرف اپنے ثقافتی ورثے سے کٹ رہے ہیں بلکہ فطرت کے خلاف بھی برسرِپیکار ہیں۔ ناول میں کرونا وبا کی صورتحال کی عکاسی ہے۔ اس ضمن میں مذہبی ثقافتی رسم و رواج کے زوال کی داستان بھی ہے۔ کرونا نے ملکی سے بین الاقوامی سطح پر تمام پرانے تصورات اور مہابیانیوں کا رد بھی کیا ہے۔ اس صورتحال میں مہابیانیوں کے بت بھی ٹوٹ گئے ہیں اور لوگ انفرادیت اور مقامیت کی طرف چلنے کے لیے شہروں کی گنجان آباد زندگیوں اور بندشوں نے لوگوں کو اس حد تک عاجز کر دیا کہ ایک بڑی تعداد تو اپنے آبائی علاقوں کی طرف کھلی فضا میں سانس لینے کی متلاشی نکل پڑی۔

"کرونا وبا نے کئی مہابیانیوں کی قلعی کھول کہ رکھ دی ہے۔ جب خود انسان کو اپنی معدومیت کے خطرات لاحق ہیں تو پھر اس کے قائم کردہ نظریات و بیانات کیوں کر قائم بالذات رہ سکتے ہیں۔" (159)

کرونائی صورتحال کے حوالے سے ناول میں چند اہم امور کا تذکرہ ملتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ناول میں مختلف طبقات کی نمائندگی کم ہیں۔ ناول میں معاشرتی حوالے سے زیادہ واحد متکلم کے گرد ناول کا دائرہ گھومتا ہے ناول نگار نے ایک کردار کے شب و روز میں کرونا کی صورتحال مجموعی طور پر چند عوامل کی نشاندہی ضرور ہوتی ہے اس دوران مابعد جدیدیت کا تصور تکثیریت واضح انداز میں ابھرتا محسوس ہوتا ہے۔

3-3 سیاسی بیانیے

مقامیت کا ایک اہم عنصر سیاسی بھی ہے۔ جاگے ہیں خواب میں سیاسی پہلو کا بھی پتا دیتا ہے۔ ہر مقامی ثقافت اپنے داخلی اور خارجی عوامل کو ترتیب دینے کے لیے ان کا انتظام کرنے کے لیے خاص نظام کی تشکیل وجود میں لاتی ہے۔ یا وہ اپنے معاملات کو چلانے کے لئے ایک خاص سیاسی روایت کی پاسداری کرتی ہے۔ مقامیت پہ سیاسی ماحول کا اثر بھی ہوتا ہے۔ سیاسی نظام کی نوعیت اور ہزارہ کی ثقافت بھی الگ ہے۔ بعض اوقات بڑے سیاسی فیصلے بھی مقامی سطح کی تہذیب پہ اثرانداز ہوتے ہیں۔ مختلف ادوار کے سیاسی نظام نے ہزارہ کی ثقافت پہ بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اشوک کا زمانہ ہو یا انیسویں عیسوی صدی میں ہونے والی سکھ گردی کے واقعات، سکھوں کی حکومت سے لے کر سید

احمد بریلوی شہید کی تحریک کے اثرات کو اس مقامیت نے قبول کیا ہے۔ان بڑے نظاموں کے اثرات کو اپنے اندر جذب بھی کیا ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار پہ محیط اس ناول میں مختلف ادوار کے سیاسی نظام کا تفصیلاً ذکر ملتا ہے۔سید احمد بریلوی کے اثرات اور انگریزوں کی آمد ان کے عملداری کے اثرات بھی ہزارہ کے مقامیت پہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ان تمام اثرات کے باوجود بھی ہزارہ کی تہذیب اپنی انفرادیت برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔سید احمد بریلوی کے آنے سے ان قبائلی لوگوں میں جذبہ حریت اور جہاد پیدا ہوا اور انھوں نے اپنی حریت اور عزت و وقار کے لیے اپنی جانوں کا نذانہ تک پیش کیا۔ان قبائل نے سر سید احمد شہید کا ساتھ دیتے ہوئے سکھوں کا مقابلہ کیا اور بعد ازاں انگریزوں کی حمایت بھی حاصل کی۔نور خان ان میں سے ایک تھا جس نے انگریزوں کے ساتھ مفاہمت کا آغاز کرتے ہوئے اپنی نسلوں اور علاقے کے لوگوں کی ترقی کے دروازے کھولے۔یوں اس طرح عملی سیاست کے ساتھ اس ثقافت کی جڑت کا آغاز بھی ہو گیا۔اس تابعداری کا مقصد محض ذاتی نوعیت کا نہیں تھا بلکہ اس کے اثرات علاقے کی عوام کو بھی ملے یوں اسے جدید عملی سیاست کا پہلا زینہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس ضمن میں جیمز ایبٹ کا نام ہزارہ کی تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے۔استعماری قوت کا نمائندہ جیمز ایبٹ زیرک اور نرم لہجے کا مالک تھا۔ایبٹ نے مقامی لوگوں کی حمایت حاصل کر کے اس علاقے کے حالات کو پر سکون کیا۔مقامی لوگوں کی دلی حمایت سے اس نے انگریزی اقتدار کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔نور خان جیسے آدمی کو اپنے حسن سلوک سے اس نے متاثر کیا اور اس کے قبیلے کے ماتحت لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ناول میں جہاں نو آبادیاتی عہد کے مختلف حربوں کا بیان ملتا ہے وہیں ان نو آبادیاتی حربوں کی ذیل میں مقامی لوگوں کو ملنے والے نفع اور نقصان کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ نو آبادیاتی عہد میں ان لوگوں کو ہی نوازا گیا جو لوگ ان کی تابعداری کرتے تھے اور یہ سب ان کے اقتدار کو مستحکم کرنے کا ذریعہ تھا۔جبکہ بعض جگہوں پہ ایسا بھی دیکھنے میں آیا جیسا کہ ہزارہ کے ضمن میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔یہاں انگریزوں کی آمد سے مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان لڑائیوں کا خاتمہ ہو گیا۔سکھ گردی کے خاتمے کی وجہ سے علاقے کی ترقی اور خوشحالی کا ایک نیا باب کھل گیا۔جیمز ایبٹ جیسے کردار بھی استعماری کرداروں میں شامل تھے۔جو محض اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے لوگوں کی گردنیں کاٹنے کے بجائے ان کے ساتھ مفاہمت کا رویہ اختیار کرنے پہ ترجیح دیتے۔یہ عمل ان کے لیے زیادہ تقویت کا باعث بنتا ہے۔ان کے اقتدار کو دلی طور پہ تسلیم کرانے کا بھی باعث بنتا ہے۔نور خان سے اس نے جو گفتگو کی وہ عمومی طور پہ حاکموں کے رویے کے برعکس تھی۔ان کے رویے میں واضح فرق موجود تھا۔جس کا لب و لہجہ حاکمانہ نہیں بلکہ عاجزانہ تھا۔

"میں تو نور آباد تو نہیں گیا۔ مگر اس کے کہیں آس پاس ہی سے گزر کر مار گلہ کی پہاڑیوں پر گیا تھا۔ سکھ افواج کے پنڈی میں ہتھیار ڈالنے کا منظر دیکھنے کے لیے۔ سکھوں نے آپ لوگوں پر بہت ظلم ڈھائے۔ اس وقت اگر ہماری کمپنی کے حکومت ہوتی تو یقیناً ایسے حالات پیدا نہ ہوتے اور ہم خلیفہ صاحب کو بھی بخوشی کشمیر جانے دیتے بلکہ ہم ان کی حفاظت کے لیے فوج کا ایک دستہ بھی ساتھ بھیجتے۔ ہم نے آج تک شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر کا احترام ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ وہ بھی ہمارا احترام کرتے ہیں۔ ایبٹ کوئی وقفہ دیے بغیر بولتا چلا گیا۔"(160)

نور خان کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے نے جیمز ایبٹ سے کیا ہوا باپ کا وعدہ وفا کیا۔ یوں وہ انگریز حکومت کے قریب ہو گئے اور اس کے ثمرات سے حظ اٹھانے لگے۔ نور آباد اور اس پورے خطے کی سیاسی اور معاشرتی نظام میں ایک اہم موڑ آیا اور یوں مقامی سیاست کا ڈھنگ بھی تبدیل ہو گیا۔ گاؤں کا سردار انگریزوں سے براہ راست تعلقات استوار کرنے لگا۔ اس کے بعد ایک نمایاں شخصیت بن گیا۔ اس معاہدے کے تحت فوائد بھی ملے یوں مقامی زندگی میں تبدیلی بھی رونما ہوئی۔ اس مقامیت میں اس اہم سیاسی فیصلے کے بعد اس عہد کی جدید سہولتوں کا آغاز بھی ہوا۔ سڑکوں کی تعمیر سے ان دور افتادہ پہاڑی لوگوں کا رابطہ باہر کی دنیا سے آسان ہو گیا۔ سکولوں کی تعمیر سے مقامی زندگی میں مختلف سطحوں پہ تبدیلی بھی آئی۔

"مجھے فخر ہے کہ میں نے ابا حضور کے وعدے کا پاس رکھا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ انگریز سرکار نے علاقے میں سڑکیں بچھادی ہے۔ حالاں کہ اس پہاڑی علاقے میں ایک ناممکن سی بات تھی۔ جب یہ کام مکمل ہو گا تو اس علاقے میں انقلاب آجائے گا۔ نور آباد میں اسکول کے لیے زمین منتخب کی جا چکی ہے۔"(161)

انگریزوں سے تعاون ہزارہ کی مقامیت میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ جو انگریزوں کی مفاہمت سے نہ صرف امن قائم ہوا بلکہ مقامی لوگوں کی زندگیوں میں تعمیر و ترقی برپا ہوئی۔ زندگی کا ارتقاء پھر سے شروع ہوا اور سکھوں کی قتل و غارت کی وجہ سے جو بے چینی اور بے سکونی تھی اس کا خاتمہ ہوا۔ اس طرح مقامی پہاڑی علاقوں میں موجود قبائل کو جدید مقامیت کے تناظر میں سیاسی نظام یا بیانیے کی بات کی جائے تو براہ راست زیادہ پیچیدہ سیاسی نظام کی آویزش نہیں ملتی۔ سیاسی حوالے سے اہم دور انگریز کی آمد و انتظام و انصرام کا وقت تھا۔ ناول نگار نے اس عہد کو بطور خاص بیان کیا ہے۔ اس سے ہمیں مقامی سطح پہ ہونے والی تبدیلی کا بھی کہیں زیادہ اندازہ ہو جاتا ہے۔ مابعد جدید نقطہ نظر کی توثیق میں ہمیں سیاسی بیانیوں کے تناظر میں بھی ملتی ہے۔ مقامی قبائل اپنے انداز سے ایسا مخصوص سیاسی نظام وضع کرتے ہیں کہ مقامی سطح پہ سردار ہی تمام قبائل کا سربراہ اور سیاسی قوت کا مالک ہو جاتا ہے۔ ان کے حکم کے تحت ہی فیصلے ہوتے ہیں اور اس نظام کے تحت ہی وہ اپنے اندرونی مسائل خود حل کرتے ہیں۔ اندرونی طور پر کسی بھی فیصلے کا اختیار سردار کو ہی ہوتا ہے اور اس سردار کا انتخاب بھی قبائلی لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ اندرونی طور پر کسی بھی فیصلے کا اختیار اسی سردار کو حاصل

ہوتا ہے یوں مقامی سطح پر رسم ورواج کو قانون سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور اس کی سربراہی بھی اس مقامی سردار ہی کو دی جاتی ہے۔

جندر میں ہزارہ کی مقامی ثقافت کا بیان تفصیل سے ملتا ہے۔اختر رضا سلیمی کے پہلے ناول "جاگے ہیں خواب میں "کی طرح جندر میں بھی اسی کا تسلسل ہے۔ مگر نمایاں فرق اتنا ہے کہ جندر کا زمانہ ارتقاء کم ہے جبکہ جاگے ہیں خواب میں تاریخ میں کہانی گردش کرتی دکھائی دیتی ہے۔اختر رضا سلیمی کی اس ناول میں پہلے ناول کی نسبت سیاسی بیانیہ بہت کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔مقامی سطح پہ کسی مخصوص سیاسی نظام کا تذکرہ نہیں ملتا۔ ناول کا مرکزی کردار عمومی مقامیت کے بیان میں ناول کا قصہ چلتا ہے۔تاہم اس بیان میں ماضی کے جھروکوں سے مقامی حکومتی نظام یا حکمرانی کے تصور کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ جندر جس کے عنوان اور جس کے گرد پورا ناول چلتا ہے۔اس کی بنیاد کی کہانی میں قدیم مقامی تہذیب کے احوال میں مقامی سیاسی نظام کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔ جندر کے پاٹ مقامی راجہ کی ملکیت ہی تھے جسے بعد ازاں ولی خان کے دادا کے دادا کو ان کی بہادری اور جواں مردی کے سلے میں دے دیا گیا تھا۔ راجوں کی حکومت میں عموماً ذات برادری کا تصور زیادہ پختہ تھا۔ موروثی نظام حکومت کے تحت وہ نسل در نسل ان لوگوں پہ حکمرانی کرتے تھے۔ راجہ کے مزاج اور مرضی منشاہی قانون کا درجہ رکھتی ،ذات پات کا تصور طاقت کا نشہ یہ تمام تصورات ان حکمرانوں کے مد نظر تھے۔ ناول کے اس بیان میں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہزارہ کے مسلمان قبائل یہاں مختلف علاقوں سے آکر آباد ہوئے اور ان کی عددی تعداد بھی غیر مسلموں کے مقابلے میں کم تھی۔ ہندو راجے ہی حکمرانی کے منصب پہ فائز تھے۔

مصنف نے اس کا تاریخ حوالہ بھی دیا ہے۔ 1841ء کے سیلاب کا حوالہ جندر کے پاٹ پانی میں بہ گئے یعنی اس دور کی بات جب راجاؤں کی حکمرانی قائم تھی۔ مصنف نے اس ضمن میں ذات پات کے قدیم ہندو تصورات کو بھی بیان کیا ہے کہ ولی خان کے دادا کو اگرچہ بہادری کا صلہ بھی ملا لیکن ان کو دوسرے لوگوں کے ساتھ کھانے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ ہندوؤں کا مذہبی ذات پات کا تصور ان کے مد نظر تھا۔

> "جب کھانے کی میز پر بیٹھنے کی باری آئی تو انہوں نے ان دونوں بھائیوں کو کھانے کے بڑے کمرے میں بٹھانے کے بجائے برآمدے میں بٹھایا اور خصوصی طور پر پکائے گئے پکوان کے بجائے انہیں لسی میں پکا ہوا سرسوں کا ساگ اور مکئی کی چند روٹیاں دے دی۔"(162)

اس کے علاوہ ناول میں مقامی سیاسی نظام کی زیادہ وضاحت نہیں ملتی تاریخ اعتبار سے بھی سیاسی منظر نامے کا بیانیہ ناپید ہے۔ زیادہ توجہ سماجی زندگی اور ثقافتی اقدار تک مرکوز رکھی گئی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ولی خان مقامی ثقافت کے بیانیے کو ہی ناول کا نوحہ بیان کرتا رہتا ہے۔

ناول ادھ ادھورے لوگ بہاولپور کی مقامیت کے ضمن میں لکھا گیا ہے۔ناول میں بہاولپور کی مقامی شناخت کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔اس معدوم ہوتی ہوئی شناخت میں سیاسی فیصلے کارفرما تھے۔ناول نگار نے جہاں اس مقامیت کے بیان میں مقامی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ مقامی لوگوں کی شناخت کے مسئلے اور اس کے پیچھے سیاسی محرکات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔وہیں ان اثرات کا بھی بیان ملتا ہے۔ بہاولپور کے لوگوں کی شناخت کے بحران کا مسئلہ پیدا۔یہ بھی ایک سیاسی فیصلے کے نتیجے میں ہوا تھا۔ریاست بہاولپور کے سیاسی نظام کے حوالے سے اور بعدازاں پاکستان کے سیاسی حالات کا احوال ناول میں ملتا ہے۔ہندوستان کی تقسیم کے وقت ریاست کے مقامی لوگ پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہتے تھے۔ مسلم اکثریتی ریاست ہونے کے ناطے ان کے قلب واذہان پاکستان کی طرف تھے۔ مگراس کے باوجود وہ اس بات پہ بھی راضی نہ تھے کہ ان کی اپنی شناخت کو اس طرح سے روند دیا جائے کہ ان کا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ ختم ہو کے رہ جائے۔ان کی اپنی مخصوص پہچان اور شناخت ختم ہو جائے۔

> "فیاض سمیت ریاست کی پوری نئی نسل کا خواب تھا کہ بہاولپور پاکستان کا حصہ بنے ہوں جہاں وہ اپنی لسانی، ثقافتی اور تہذیبی پہچان کے ساتھ اس نوزائدہ ملک کی تکڑائی کا باعث ہوں گے۔"(163)

ناول میں پاکستانی سیاست میں ہونے والے فیصلوں کا مقامی سیاسی نظام اور پورے علاقے کے عوام پہ اثر پڑا۔پاکستان کے قیام کے بعد سیاسی مسائل عروج پہ آگئے۔ان کا اثر مقامی لوگوں کی زندگیوں پہ بھی پڑا۔ریاست کے لوگ جو اپنی شناخت کے متلاشی تھے اور نئے نئے مسائل کا شکار ہونے لگے۔ مغربی اور مشرقی پاکستان جیسے قانون سے مقامی لوگوں کی شناخت کا مسئلہ زیادہ سنگین ہو کے رہ گیا۔ریاست بہاولپور جو محض ایک خطہ یا علاقہ ہی نہیں بلکہ ایک منفرد ثقافتی ورثے کا حامل تھا،اپنی اس ثقافتی پہچان اور شناخت سے محروم ہو گیا جس کا باعث ایک سیاسی فیصلہ بنا جس میں بہاولپور کے مقامی لوگوں کی مرضی ومنشاء کا عمل دخل نہیں تھا۔

> "سات دسمبر 1954ء کو پاکستان کے وزیراعظم چودھری محمد علی نے نواب بہاولپور کی گردن پر پاؤں دھرتے ہوئے بہاولپور کے صوبہ مغربی پاکستان میں شامل کیے جانے کے معاہدے پر دستخط کرالیے۔پوری ریاست کی مقامی آبادی اس جبری شمولیت پر باقی ماندہ چھوٹی قوموں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھلی مخالفت پر آگئی۔"(164)

ان فیصلوں سے ریاست بہاولپور کے مکین اپنی مقامی شناخت سے محروم ہو گئے۔ناول میں اس تاریخی سانحے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ پاکستانی سیاست کی ہل چل نے اس مقامیت کو اپنی شناخت سے محروم کر دیا۔ناول اس حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔اکیسویں صدی میں ناول میں مقامی ثقافتوں کی طرف جہان میں اضافہ ہوتا جارہا۔ بہاولپور کی مقامیت کے اسباب مختلف سہی مگر شناخت سے محرومی کا تجربہ وہی ہے۔مقامی لوگ اپنی شناخت سے محروم ہو گئے۔ پاکستان کے سیاسی نظام میں مسلسل تبدیلیوں اور ہلچل اور مخصوص لوگوں کی عملداری کی وجہ سے ریاست

بہاولپور کا مقدمہ صحیح انداز میں نہ تو لڑا جا سکا اور نہ ہی اس نے اس کی طرف کوئی توجہ دی گئی۔ ریاست پاکستان نے نئے نئے مسائل میں گھر کے ان مسائل کی طرف توجہ نہ دی۔ یوں بہاولپور کے مقامی لوگ آج بھی اس بات کے متلاشی ہیں کہ ان کی ایک الگ شناخت قائم کی جائے جو قبل از پاکستان قائم تھی۔ ان کو اسی ریاست کی صورت بحال کیا جائے جیسے وہ پاکستان سے قبل تھے۔ اس سیاسی مسئلے کا حل دراصل ان کی مقامی شناخت کا مسئلہ ہے جس کی نسبت وہ جانے جاتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ صوبہ پنجاب کا حصہ بنا دیئے گئے۔ اس طرح ان کی مقامی پہچان بڑی ثقافت کے پردے میں ثانوی حیثیت اختیار کر گئی۔

> "یہ ناول تقسیم کے وقت ریاست بہاولپور کے آئینے میں ہی دیکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے تقسیم اور فسادات پر لکھے جانے والے افسانوں اور ناولوں میں یہ پہلا ناول ہے جس میں تقسیم کے وقت ریاست بہاولپور میں پیش آنے والے حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے اور ناول کے مطابق ریاست کی شناخت پر آخری حملہ اس وقت ہوتا ہے۔ ریاست پنجاب میں ضم کر دی جاتی ہے۔"(165)

قیام پاکستان سے قبل ریاست بہاولپور ایک الگ شناخت اور سیاسی نظام کے ساتھ موجود تھی کہ قیام پاکستان کے بعد پنجاب کا حصہ بنا دیا گیا یوں پاکستان میں بہاولپور کے بجائے پنجاب کا حصہ ہی تصور کیا جانے لگا۔ ناول میں فیاض کے کردار میں مقامی سیاسی سطح پر اینٹی ون یونٹ کی سرگرمیوں کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ بہاولپور کے وہ نوجوان جو اس مقامی شناخت کو کھو بیٹھے اس تحریک میں شامل ہوئے۔ وہ اس کی سرعام مخالفت کرنے لگے جو ان کا جائز حق بھی تھا مگر حکومتی نظام نے ایسے نوجوانوں کو معمولی مقدمات میں جیلوں میں ڈال دیا جو کئی برس پابندِ سلاسل رہے۔ اس جیسے کئی نوجوان لاوارث قیدیوں کی طرح جیلوں میں سڑتے رہے یوں بہاولپور کی مقامی شناخت کا مسئلہ اسی طرح سے پسِ پشت چلا گیا۔

انواسی مقامی تاریخی تناظر میں لکھا گیا ناول ہے۔ اٹھارویں صدی میں انگریزی اقتدار مزید مستحکم ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے برصغیر میں بڑے پیمانے پر تجارتی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ جس کا مقصد صرف اور صرف یہاں کے وسائل کو اپنے زیر تسلط لانا تھا۔ انگریزوں نے برصغیر کے وسیع و عریض خطے میں اپنے مفادات کی غرض سے ریلوے کا جال بچھایا۔ ان کا مقصد خام مال برطانیہ پہنچانا اور تجارتی سرگرمیوں میں تیزی لانا تھا۔ ریاست بہاولپور میں بھی دریائے ستلج کے مقام پر ہیڈ سلمان کی کو بند کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ مقامی نوابین اس بات سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ انگریزوں کے ساتھ پورا تعاون بھی کر رہے تھے۔ اس منصوبے کی آڑ میں مقامی لوگوں کے گھروں زمینوں کی بھی پرواہ نہ کی گئی۔ مقامی لوگ جو اپنی دھرتی، ثقافت اور روایات میں جکڑے ہوئے تھے وہ کسی طور پہ بھی اپنے اس ورثے کی قربانی دینے کو تیار نہ تھے۔ ریاستی پولیس اور وسائل بھی ان کے مددگار تھے۔ ایسے میں عام عوام بے یار و مددگار رہ گئی۔ انگریزوں نے اپنے منصوبے کے راستے میں آنے والی ہر قسم کی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لانے کی ٹھان لی۔ یہاں تک کہ

راستے میں آنے والے ایک قبرستان کی بھی ملحوظ خاطر نہ لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ان کی طاقت کے مقابلے میں مقامی لوگوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے بزرگوں کی یادوں کو کیسے مٹنے دے سکتے تھے۔دوسری طرف انگریز تمام وسائل کو استعمال کر کے اپنی برتری کو ثابت کرنے پہ تلے تھے۔بستی آدم واہن کے تناظر میں اس علاقے میں ریلوے لائن بچھانے کے لیے طاقت کا استعمال کیا گیا۔ناول میں بستی آدم واہن کے پیرائے میں ایسے واقعات کی مجسم تصویریں سامنے آتی ہیں۔مقامی طاقتور کرداروں کی مدد کرتے رہے اور یوں عام عوام کے حقوق سلب ہوتے رہے۔سیاسی نظام میں ہلچل قبرستان سے ریلوے ٹریک گزارنے کے بعد ہی آتی ہے۔مولوی کا مقامی کردار ایک طرح سے سیاسی نمائندہ بھی ہے۔ مولوی مذہبی حیثیت کا حامل تو ہے دوسری طرف وہ انگریزوں اور مقامی لوگوں کے درمیان رابطے کا ایک ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔مولوی وقت اور حالات کے مطابق اپنے فیصلے بدلتا ہے۔مقامی لوگوں کی بھاگ اس کے ہاتھ میں آجاتی ہے کہ وہ ان کو اپنے طور پہ کنٹرول کرنا شروع کر دیتا ہے۔مولوی اپنے مفادات کی خاطر اپنے فتوے سے رجوع کرتا ہے۔جو اس نے انگریز حکومت اور ریل کے خلاف دیے تھے۔اولاً وہ لوگوں کو جہاد کی تلقین کرتا ہے اور بعد ازاں انگریزوں سے مفاہمت کے تحت اس بات سے ہٹ جاتا ہے۔

"یہ تمام لوگ بہاولپور سے ملتان تک کے مدارس کے نیک اور پارسا علماء ہیں۔ان کے نزدیک انگریز سرکار کی عوامی فلاح کے منصوبوں میں رخنہ اندازی کسی صورت طور پہ بھی لائق ستائش نہیں ہے۔ان کا اجتماعی مطالبہ ہے کہ میں اپنے فتوے سے رجوع کروں جو کسی طور پر بھی عامتہ الناس کے مفاد میں نہیں۔"(166)

مولوی کا کردار مقامی لوگوں تک براہ راست رسائی کا ایک وسیلہ ہے۔مقامی نوابین ہوں یا نواب نوآبادیاتی حاکم دونوں نے اس طرح کے کرداروں کے ذریعے اپنی حکومتوں کی راہ ہموار کی ہے۔ مولوی کے بعد اس کا بیٹا بھی انگریز حکومت کا کام کرتا ہے۔ریلوے کمپنی کے انجنیر اور آفیسر اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ کس طرح ان مقامی لوگوں پہ حکومت کرنی ہے۔مقامی سیاسی نظام میں نوآبادکاروں کی سیاسی نظام کا بیان بھی ناول کے کرداروں کے ضمن میں ملتا ہے۔مذہبی اثر ورسوخ ہو یا مقامی وڈیرے اور زمیندار دونوں ہی عوام کے لیے اس قدر قابلِ احترام سمجھے جاتے ہیں کہ ان کی بات کو ماننا از حد ضروری خیال کیا جاتا ہے۔اس کی ایک وجہ ان کی پسماندگی اور خستہ حالی بھی ہے۔جس کا فائدہ ہمیشہ طاقتور طبقہ ہی اٹھاتا ہے۔مقامی لوگوں کے وسائل کو قبضہ کر کے ان کے معاشی حالات کو اس قدر تنگ کیا جاتا ہے کہ بعد ازاں ان میں سے ہی چند لقمے ان کو دے کے ان کو اپنا ہم نوا بنا لیا جاتا ہے۔

"ولیم گالوے نے داروغہ کو بلا کر کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ بستی میں اب پتا بھی ہلے تو مولوی صاحب کی منشاء کے بنا نہیں۔ہر رپورٹ اور ہر حکم اب انہی کا چلے گا۔داروغہ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔اس نے دونوں ایڑیاں جوڑ کر اتنی مستعدی سے مولوی صاحب کو سلوٹ کیا کہ وہ خود سر سے ایڑیوں تک مستی میں ڈوب گیا۔اس کی آنکھیں نہیں کھل رہی تھی۔وہاں سے رخصت ہوتے بس اس کے کانوں میں اتنی سی مودبانہ گزارش پڑی کہ بستی کے

لوگوں کو اجازت دے دیجیئے کہ وہ پل بنانے کی مزدوری میں شامل ہو جائیں۔ ہم ان کو اچھا معاوضہ دیں گے اور آپ کے لیے نذرانہ آپ کی توقع سے بڑھ کر ہو گا۔"(167)

انگریزوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے اور اپنے فیصلوں کے نفاذ کے لیے مختلف حربے آزمائے۔ ان کامیاب حربوں میں مقامی لوگوں میں سے ہی باثر افراد کو اپنے زیر اثر کرنا۔ ان حربوں میں مقامی لوگوں کے وسائل کو مقامی لوگوں پہ خود تقسیم کرنا بھی شامل ہے۔ اپنے مددگاروں کو نوازنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مقامی لوگوں پہ مقامی لوگوں کو مسلط کر کے ان کو اپنا محکوم بنانا ان کا کامیاب حربہ رہا ہے۔ بستی آدم واہن ایک مولوی کی کہانی نو آبادیاتی عہد میں ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے علاقے کی کہانی ہے۔ مقامی لوگوں کے ذریعے مقامی لوگوں کو قابو کرنا ان کے لیے زیادہ آسان اور قابل عمل تجربہ رہا۔ اگر کسی کو نقصان ہوا بھی تو مقامی لوگ ہی اس کے نقصان اٹھانے کے ذمہ دار ہوں گے، ڈاکٹر عبدالسلام اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ

"برطانوی لبرل ازم پر قائم ہندوستانی جمہوریت ظاہری طور پہ مذہب پرست فوجی آمریت اور سیاسی انتشار پر برصغیر پہ سامراجی اقتدار بنا۔"(168)

ریلوے کمپنی کے انجینیرز اپنی کمپنی کے مفادات کو ہر صورت مقدم رکھتے تھے۔ ان کے لیے اپنے کام کو بروقت اور کم خرچ میں مکمل کرنا سب سے اہم تھا۔ اس کے لیے ان کو ہر صورت اپنے تمام وسائل بروئے کار لانے تھے۔ بستی آدم واہن کا قبرستان اجاڑنے سے لے کر مقامی لوگوں کی قتل تک انہوں نے کسی چیز کا پاس ولحاظ نہ رکھا تھا۔ اس بستی کو جانی اور نفسیاتی نقصان پہنچانے کے باوجود ان کا جسمانی استحصال بھی کیا گیا۔ بالآخر وہی ریلوے لائن جس کے نیچے ان کے بزرگوں کی ہڈیوں کا سرمہ دفن ہوا، اس کی ملازمت کرتے ان انگریزوں کے منصوبوں کو پایا تکمیل تک بھی پہنچانا پڑا۔

"اس ناول میں سیاسی انتشار اس وقت سامنے آتا ہے جب یہاں کے مقامی لوگوں کو ان کے گاؤں اور مقامی جائیدادوں سے بلا معاوضہ فارغ کیا جارہا تھا۔ اس سیاسی انتشار میں اس وقت کے مولوی اور دوسرے سیاسی رہنماؤں نے بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ اس میں وقت کے مولوی اور دوسرے سیاسی رہنماؤں نے بھرپور کردار ادا کیا تھا۔"(169)

مقامیت کے ترجمان اس ناول میں مقامی سیاسی نظام کو اس بستی کے تناظر میں پوری ریاست کے نظام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مقامی سیاسی نظام نے بھی انگریزوں کی تابعداری کی اور ان کو ہر ممکن سہولت فراہم کی۔ "انواسی" میں مقامی بستی کے گرد گھومتا یہ ناول نہ صرف اپنے مقامی بیانیے کا آئینہ دار ہے بلکہ اس میں انگریزوں کے سیاسی نظام کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ جان برٹن ایک انگریز انجینیر ہی نہیں ایک ایسے نظام کی تہذیب کا نمائندہ بھی ہے۔ اس کردار کے تحت ان کے نظام کی وضاحت ملتی ہے۔ وقت آنے پر اس کا بیٹا بھی اس کے

خلاف کھڑا ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک قرابت داری سے زیادہ اپنے مسلک /ادارے کی بقاء اور مفادات کا حامل ہے۔ وہ کمپنی کے مفادات کو ذاتی مفادات پر ترجیح دیتے ہیں۔ جبکہ مقامی معاشرے کے افراد ذاتی مفادات کو ترجیح دینے کی وجہ سے ملک وملت کا خیال یہ اکثر بھلا دیتے ہیں اور یوں ان پہ دوسری قومیں مسلط ہو کر ان کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔

نیلی بار میں مقامی ثقافت کا بیان بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ اس مقامیت کے مختلف عناصر کے بیان میں ناول میں سیاسی پہلو بھی شامل ہیں۔ اس خطے کے لوگ جو جاگیر داروں کے ماتحت ہیں وہ اس بات سے سروکار نہیں رکھتے کہ ان کے حقوق کس حد تک سلب کیے جا رہے ہیں یا ان کے حقوق ہیں کیا؟ وقت اور حالات کی رفتار ان کے تصورات کو تبدیل کرنے سے قاصر ہے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ان کی فکر بہت کم یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ اپنے عقائد و تصورات میں اس قدر راسخ ہیں کہ کوئی چاہے بھی تو ان کے ذہنوں میں موجود ان حاکم و جاگیر داروں کی عظمت کے پردے میں لپٹے وہ تصورات ان کے ذہن سے محو نہیں کر سکتا۔ ایک زمانے میں لوگوں نے سرکاری عہدے داروں کے ساتھ اپنا تعلق اثر ورسوخ کے ذریعے سے بنایا۔ بعد ازاں خود عملی سیاست میں کود پڑے اور ایسا کرنا ان کے لیے کوئی مشکل بھی نہ تھا۔ ان کی رعایا کا ان کے نام پہ انگوٹھے لگانا، ان کے نشان کو مہر زد کرنا ان کے نزدیک باعث شرف تھا۔ ان معاملات میں مذہبی لوگ بھی اسی رو میں بہ نکلے۔ انہوں نے بھی اپنا اثر رسوخ اختیارات بڑھانے کی غرض سیاست میں بھی نام کمانا شروع کر دیا۔ اس طرح ان کی کمائی کے ساتھ ساتھ شہرت اور اختیارات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ملکی سیاسی حالات اس خطے پہ بھی پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں کا اپنا مخصوص سیاسی نظام ہے۔ اس نظام میں جمود ہے کیونکہ اس میں تغیر لانے والے لوگ ان کے حق میں نہیں ہیں۔ ناول میں مقامی سیاسی انتظام کا یہاں بیان ملتا ہے۔ یہ لوگ بھی الیکشن میں حصہ لیتے ہیں ان کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں کن کے ووٹ کی اہمیت کیا ہو سکتی ہے۔ وہ تو اس بات کو جانتے ہیں کہ بس ان کا جاگیر دار، وڈیرا، زمیندار ہی کامیاب ہونا چاہیے۔ ناول میں اس مقامی ثقافت کے پیرائے میں سیاسی گہما گہمی کا بیان بھی ہے۔ ناول نگار نے پاکستان کے مختلف خطوں کی مقامی ثقافت کے ساتھ ساتھ ہیں ان علاقوں میں سیاسی نظام کی بھی وضاحت کی ہے۔

> "علاقے میں الیکشن کا ہنگامہ تھا۔ گوبر کے ڈھیروں اپلوں کے گوہروں کچے کوٹھوں، ذرا، ذرا سی کچی کوتاہ قد ہٹیوں، اپلے تھپی، دیواروں کی پکی کوٹھڑیوں پوسٹروں اور تصاویر نے لپیٹ رکھا تھا۔ کئی بار ایک دوسرے بینرز پھاڑے گئے۔ اس لیے لیکن نمائش ہوئی پٹاخے چلے، علاقے کی فضا سنسنی خیزی اور انتظار کی کیفیت سے بوجھل تھی۔"(170)

ناول میں مصنفہ نے مقامیت کے نمائندہ کردار تخلیق کیے ہیں جو اثر ورسوخ کے مالک ہیں۔ ان کی طاقت ایسے لوگ ہیں جو نسل در نسل ان کی خدمت گزار ہیں۔ انہیں اس بات سے غرض نہیں کہ ریاست کیا بلا ہے؟ سیاست کیا بلا ہے؟ وہ تو اپنے مالک کو ہر صورت فتح مند دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس کی فتح کے جشن میں کئی دن تک ان کے ڈیروں اور

حویلیوں میں انواع واقسام کے کھانے پکتے ہیں۔ ایسے کھانے جو کبھی کبھار ہی انہیں میسر آتے ہیں۔ وہ بھی بالخصوص کسی جاگیر دار کی خوشیوں کے موقعے پر۔ ناول نگار نے اس مقامی نظام سے ملکی نظریات تک کی وضاحت کی ہے۔

ناول کا کینوس خاصا وسیع ہے کہ ہمیں پاکستان کے بعد سے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک مشتمل ہے۔ اسی تناظر میں ناول نگار نے اس مقامیت کے اپنے سیاسی نظریات اور سیاسی فضا کو بھی بیان کیا ہے۔ جاگیر داروں کی یہ نسلیں آنے والے وقت کے ساتھ ساتھ مفاد پرست اور موقع پرستی کی عمدہ مثالیں ثابت ہوتی ہیں۔ فوجی حکومتوں سے جمہوری حکومتوں تک مقامی سیاستدانوں اور وڈیروں اور ملکی پیمانے پر بڑے کرتا دھرتا سب کو یکجا کر دیتے ہیں۔ جاگیر دارانہ نظام نے سیاست میں بھی موروثی نظام کو جاری رکھا۔ جو نسل در نسل انہی کے گھر کی لونڈی ثابت ہوتی ہے۔ ایوب اور بھٹو کی زرعی اصلاحات سے خوفزدہ یہ جاگیر دار کچھ عرصے کے لیے خوفزدہ ضرور ہوئے۔ ان کی بادشاہت میں کوئی بھی دراڑ نہ ڈال سکا۔ یہاں مصنفہ نے نہ صرف مقامی جاگیر داروں بلکہ ملک میں ان جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کے اثر رسوخ کے ساتھ حکومتوں میں ان کے اثرات کا پردہ بھی چاک کیا ہے۔

"ملک عبدالرحمان کی جیت کی خبر تو دن 11 بجے ہی سنا دی تھی۔ جشن کی تیاری مکمل تھی ٹریکٹر ٹرالیاں اور سائیکلیں ہر گاؤں میں سجی تھیں۔ مبارکبادیاں دینے والوں کے ٹھٹ لگے تھے۔ بڑے ملک صاحب سے بھی زیادہ لیڈ کے ساتھ صاحبزادہ صاحب جیتیں گے۔ خود گدی مبارک سے بھی فتوی جاری ہو گیا تھا کہ بھٹو کو ووٹ دینا کفر ہے۔ جن کو شک وشبہ تھا وہ بھی دور ہو گیا۔"(171)

اس مقامی سیاست کا رخ مفادات کو دیکھ کر متعین ہوتا ہے۔ مفادات جہاں نظر آئیں وہیں اتحاد کر لیا جاتا۔ اگر کوئی ایسا حکمران بر سر اقتدار آ جائے جن سے ان کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو وہ اس کا رد کر دیتے ہیں۔ مقامی وڈیروں کی نشستیں تو سال ہا سال سے پکی ہیں۔ انہوں نے تو اتحاد کرنا ہے، محض اپنے مفادات کی خاطر ان مقامی حکمرانوں کی حکومت میں مرکزی حکومتوں کے لیے بننے یا بگڑنے کا زیادہ اثر نہ ہوتا۔

"سارے ملک میں انقلاب برپا ہو لیکن ان کی ریاست اور حکومت کو کبھی مار نہ سکے گا"(172)

ناول میں مقامی سیاست کا نمائندہ کردار سجادہ نشین پیر اسرار احمد شاہ کا بھی ہے۔ اس کردار کے ذریعے ناول نگار نے طاقت کے گٹھ جوڑ کا ایک اور واقعہ زیب قرطاس کیا ہے۔ اس مقامیت میں جہاں ایک طرف جاگیر دارانہ سماج ہے تو دوسری طرف حد سے زیادہ توہمات پرستیاں اور ضعیف الاعتقادیاں بھی ہیں۔ جاگیر دارانہ اور استحصالی نظام میں ایک اہم کردار یہ مذہبی رہنما بھی ہیں۔ ان کی طاقت تو جاگیر داروں سے بھی بڑھ کر ہے۔ ان کی حفاظتی دیوار کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ جہاں مذہب کی مہر لگی ہے لوگ عقیدت کے پھول اس حد تک نچھاور کرتے ہیں کہ اپنی جان، مال، عزت و آبرو ان کی راہ میں بچھا دیتے ہیں۔ ان کے سامنے تو جاگیر داروں کے سر بھی نگوں ہو جاتے ہیں۔ اس کردار کے ذریعے مصنفہ نے مقامیت کے اس پہلو کو بیان کیا ہے۔ کس طرح ان لوگوں نے اپنا اثر ورسوخ بڑھایا۔ اپنی مقامی حکومتوں

سے بڑھ کر ملکی حکومتوں میں شامل ہوئے۔ خود وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ان کے مریضوں کے لیے گناہ عظیم ہے۔ وہ پھر بھی ان سے بخشش کے طالب ہیں۔ ان کے لئے یہ جنت کے ٹکٹ کے حصول کے مترادف ہے۔ ناول میں اس کی ترجمانی کچھ ان الفاظ میں ملتی:

"سجادہ نشین پیر اسرار احمد صاحب جن کے لاکھوں مریدین کسی بھی حلقے میں انتخابی نتائج کو تبدیل کرنے کی طاقت رکھتے تھے جو اشارہ ابرو کی سیدھ میں ٹھپے لگاتے اور چوم کر پرچی صندوقچی میں ڈالتے جیسے ان پرچیوں پر پیر صاحب کا مقدس نام درج ہو سینوں پر ہاتھ باندھ کر پچھلے قدموں پولنگ بوتھ سے باہر نکلتے کہ وہ نہیں دیکھ رہے پر ان کے اعمال تو دیکھتے ہیں جن کے غیبی وجود ہمیشہ ان کے ہمراہ رہتے ہیں۔"(173)

اس مقامیت کا سیاسی نوحہ تو یوں ہی دکھائی دیتا ہے جیسا عموماً دیہاتوں میں ہوتا ہے۔ جاگیرداروں اور مذہبی رہنماؤں کی دسترس کسی بھی سطح پہ کمزور نہیں پڑتی۔ تعلیم، علم کو ان مقامی رعایا کی دسترس سے دور رکھا جاتا ہے۔ ان کی ضعیف اعتقادیوں کو مزید مستحکم کیا جاتا ہے کہ اسی میں تو ان کی فلاح و بقاء ہے اور پیروں کی اولادیں ان کی وارث بنی ہیں۔ ان کی رعایا بھی ان کو وراثت میں مل جاتی ہے جس کو وہ اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا بخوبی استعمال کرتے ہیں۔ اس مقامیت میں وقت کے مطابق تبدیلی نہیں آتی۔ اکیسویں صدی کا سفر شروع ہونے کے باوجود بھی ان کی سوچوں کا جمود برقرار ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"لوگوں کے ذہن میں اب تک اشرافیہ، جاگیرداروں، پیروں اور سجادہ نشینوں کی برتری و فضیلت بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ خاندان اس کی شرافت اور موروثیت پر یقین رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چونکہ یہ خاندان اور اشرافیہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کے پاس دولت جائیداد اور اثر رسوخ ہے اس لیے وہی ان کی صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں۔ یہ قدامت پسندانہ سوچ، انھیں قدیم روایت کے تحفظ کی طرف لے جاتی ہے اور یہ رہنما ان کے سرپرست اور مربی بن کر ابھرتے ہیں۔"(174)

نیلی بار میں مقامی سیاسی نظام کی قدرے تفصیل سے وضاحت ملتی ہے۔ مقامیت کے پیرائے میں مقامی جاگیرداروں سے زیادہ گدی نشینوں کے گٹھ جوڑ ان کے سیاسی نظریات کی عکاسی ملتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر کے حامل اس ناول میں مقامیت کے سیاسی منظر نامے کو ان مقامی کرداروں کے ذریعے سے خوب واضح کیا گیا ہے۔ یہ مقامیت کے نمائندہ کردار ہیں جو اپنے اندر پوری عاجزی، سماجی تصویر سمیٹے ہوئے ہیں۔ طاقتور کا آپس کا گٹھ جوڑ اس رعایا کی غلامی کے تصور کو مزید مستحکم کرتا ہے جو کسی بھی صورت میں اپنے حقوق حاصل نہیں کر پاتے ان تمام کا خلاصہ ناول کے اس اقتباس سے کچھ ان الفاظ میں ہوتا ہے۔

"اوئے پاگلو! یہ سب بڑے لوگ اندر سے ملے ہوئے ہیں۔ جیسے بوڑھے ون اور برگد شاخیں پھنسائے داڑھیاں ملائے اندر ہی اندر سرنگیں بنائے اک مک ہوتے ہیں اور نئے پودوں کو سانسیں نہیں لینے دیتے سارا پی جاتے ہیں اسی طرح یہ بڑے زمیندار اور وڈیرے بھی۔۔۔"(175)

نیلی بار طاہرہ اقبال کا مقامیت کی ذیل میں لکھا گیا ناول ہے۔ ناول نگار نے مقامی عناصر کی وضاحت میں ملکی سیاسی نظام اور اس مقامی سیاسی نظام کو اس پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ان مقامی سیاسی نظاموں کا عمل دخل ملکی سیاست میں بھی نظر آتا ہے اور ملکی سیاست کا عمل دخل اس مقامی سیاست میں بھی نظر آتا ہے۔ دونوں کے گٹھ جوڑ ہمیشہ اپنے مفادات کی بنیاد پہ ہوتے ہیں۔ مقامی لوگوں کا استحصال ابھی بھی اسی طرح سے کیا جا رہا ہے جس طرح سے قدیم زمانے میں کیا جاتا تھا۔ یہی جاگیر دار اب سیاست میں بھی شامل ہو چکے ہیں اور مذہبی لوگوں نے بھی اپنے اثر رسوخ کو بڑھانے اور اپنے نام اور اختیارات میں اضافے کے لیے سیاست کا رخ کیا ہے۔ کہانی وہی پرانی ہے محض طریقہ کار بدل گیا ہے۔

دائرہ میں ابتداء میں ملک کے حالات مخصوص معاشی تناظر میں ایسا رویہ دکھائی دیتا ہے۔ جہاں نوجوان طبقہ جو مستقبل کے بہتر خواب آنکھوں میں سجائے ڈگریاں حاصل کرتے ان کی مایوسی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ آصف کا کردار بھی اس قسم کے حالات کے عکاسی کرتا ہے۔ متوسط اور غریب طبقہ ہر عہد میں مایوسی کا شکار رہا ہے۔ وہ اپنی پریشانیوں کا مداوا ان حکومتی رویوں کا تذکرہ کر کے ہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مقامی نوعیت کی بدانتظامی، سفارشی کلچر اور اقرباء پروری کے مسائل میں گھرے لوگوں کا بیان بھی ہے۔ سرمایہ درانہ نظام کے اصول تو دوسری طرف حقدار کو ان کا حق نہ ملنا بھی بڑے سماجی بحران کو جنم دیتا ہے۔ ناول میں اسی سیاسی بدانتظامی پر بارہا ناول نگار نے طنز کیا ہے۔ لاہور کی مقامیت کے بیان میں ناول کے کردار اسی متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان متوسط طبقے کے گھرانے کے نوجوانوں کا اصل ہدف کچھ پڑھ لکھ کر اپنے لیے ایک معقول نوکری (ملازمت) کا حصول ہوتا ہے۔ جس سے وہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کی پرورش کر سکیں۔ اپنی زندگی کسی قدر آسانی سے گزار سکیں۔ تاہم حکومتی رویے اس معاملے میں آڑے آ جاتے ہیں۔ سیاسی مصلحت کے تحت حکومتی پالیسیوں میں تبدیلی آتی ہے۔ سیاسی عدم استحکام بھی اس میں اہم مسئلہ ہے۔ ایسی صورت حال میں تو عوام کے روزگار کے مسائل بڑھ جاتے ہیں۔ سیاسی طور پہ کیے جانے والے فیصلوں میں عوامی مفادات کے بجائے ذاتی مفادات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ایسی صورتحال میں جب نوجوانوں کو ان کا جائز حق نہیں مل پاتا، اعلیٰ تعلیم کے باوجود بے روزگاری ان کا مقدر ہوتی ہے۔ تو ان کے اندر بے دلی پھیلتی ہے اور بعض اوقات اس بے دلی کے تحت ہی وہ اس مقامیت سے کنارہ کشی اختیار کرنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ ناول نگار نے نوجوانوں کی ذہنی کشمکش کو ناول میں بیان کیا ہے جو اس غیر منصفانہ نظام کا گلہ شکوہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

> "یہ نظام ہی غلط ہے اور غیر منصفانہ کیونکہ اس کے ساتھ کسی سیاستدان یا بااثر ہستی کی سفارشی چٹھی نتھی نہ ہوتی۔ یہ نظام ہی غلط اور غیر منصفانہ تھا یہ اتنا گھناونا اور استحصالی تھا کہ اس کی اصلاح ممکن نہیں تھی۔ بس ایک ہی حل تھا۔ اسے تہس نہس کر دیا جائے اس کی جگہ ایسا انتظام لایا جائے جس میں ہر کسی کو اپنی لیاقت کے مطابق برابر کے مواقع ملیں اور کوئی صرف اس لیے نوکری حاصل کرنے سے محروم نہ ہو کہ اس کے ہاں کوئی تگڑی سفارش نہیں تھی۔"(176)

لاہور بڑا صنعتی و ثقافتی مرکز ہے۔ لاہور میں لاکھوں لوگ روزگار کے حصول کے لیے مختلف علاقوں سے سفر کر کے آتے ہیں۔ ہر شعبہ زندگی کے لوگوں کو بہتر مواقع ملتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی حکومتوں کے عدم استحکام اور سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے نوجوان طبقے میں مایوسی اور بے چینی پھیلتی ہے۔ اس عدم استحکام کی وجہ سے نوجوان بیرون ملک کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور معاشرہ ذہین اور قابل لوگوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ بڑے شہروں کی طرح لاہور کی مقامی زندگی بھی ان سیاسی ناہمواریوں اور افرا تفری سے براہ راست متاثر ہوتی ہے۔ مجموعی سیاسی صورتحال اس شہر کو متاثر ضرور کرتے رہے ہیں۔ پاکستان میں سیاسی عدم استحکام شروع سے ہی رہا ہے۔ پاکستان کی عوام نے آمریت ،جمہوریت اور جمہوری طرز کی آمریتوں کا سامنا کیا ہے۔ اس گھٹن اور حبس زدہ ماحول کا عالم ہے جہاں فرد ذہنی اذیت کا شکار نظر آتا ہے۔

آمریت کے ادوار اور کئی بار قوم نے برداشت کیے۔ ناول میں آمریت کے دور کی بھی ذرا سی جھلک موجود ہے۔ حکمرانوں نے کڑی نگرانی کا اصول اپناتے ہوئے آزادی اظہار رائے کو کس قدر سلب کیا۔ یہاں تک کہ اخبارات میڈیا کے علاوہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ کی تنظیموں، ڈراموں کو بھی سینسر کیا جاتا رہا۔ آمروں نے اپنی حکومت کے مخالف نظریات کے حامل طلبہ پہ پابندیاں اور ان کی پکڑ دھکڑ کی گئی۔ حکومتی رویے اس قدر نامناسب تھے کہ وہ اپنے اوپر کی جانے والی تنقید کو بھی برداشت نہ کر پائی۔ جمہوری حکومتوں میں بھی ایسے رویے دیکھنے میں ملتے ہیں۔ ماضی میں ہمارے ہاں ایسی روایت موجود تھی جہاں حکومتی اداروں اور عہدے داروں نے اپنے اوپر کی جانے والی تنقید کا مثبت جواب دینے کے بجائے اوچھے ہتھکنڈوں سے ایسے لوگوں کی زبان بند کرنے کی سعی کی۔ جو ان کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ ناول نگار نے اسی طرح کی انقلابی طلبہ تنظیموں کی بھی بازگشت کی ہے کہ کس طرح سے سیاسی ناہمواری کی وجہ سے اسکولوں اور کالجوں اور تعلیمی اداروں میں بھی اس کے اثرات پڑے۔ تعلیمی ادارے انھی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن جاتے ہیں اور بعض اوقات یہی سیاسی کارندے اور نمائندے طلبہ کو اپنی اس گندی سیاست میں گھسیٹ دیتے ہیں۔ جس سے آنے والی نسلوں کے ذہنوں پہ برا اثر پڑتا ہے نہ صرف ان کی پڑھائی کا حرج ہوتا ہے بلکہ معاشرے میں افرا تفری اور بے چینی بھی جنم لیتی ہے۔ ناول نگار نے مقامی کرداروں کے ذریعے مارشل لاء کے بیان میں لوگوں کو پیش آنے والے مسائل، آزادی اظہارِ رائے پہ لگنے والی قدغن کا بیان ناول میں کچھ اس انداز میں کیا ہے۔

> "ملک میں مارشل لاء نافذ تھا آزادی اظہار رائے پر قدغن تھی۔ اخبارات ٹی وی ریڈیو سٹیج غرض کے ہر جگہ پر جو عوام سے رابطے کا وسیلہ بن سکتی تھی سینسر شپ عائد تھی۔ نام نہاد اسلامائزیشن کے نام پر آئے دن میڈیا اور ٹی وی کو سرکاری کی طرف سے ایسے ایسے احکامات ملتے جو نفوعیت کے حدوں کو پھلانگتے معلوم ہوتے۔ ٹی وی ڈرامے کے ایک منظر میں ایک لڑکی کی لاش کئی دنوں کے بعد نہر سے برآمد کی جاتی ہے تو اس نے دوپٹہ اوڑھا ہوتا ہے

کیونکہ سرکاری حکم کے مطابق ٹی وی پر بے پردگی ممنوع تھی۔ راشد نے اس واقعے کو اپنے ایک ڈرامے میں علامتی انداز میں شامل کیا تھا۔"(177)

حکومتی پالیسیوں کے زیر اثر یونیورسٹی انتظامیہ بھی اپنے طور پر سینسر شپ قائم کرنے پہ مجبور تھی۔ بعد ازاں ایسا وقت بھی آیا جب علامتی طرز اظہار پر بھی پابندی لگادی گئی۔ حکومتیں اپنے اوپر، اپنی پالیسیوں پہ کسی صورت بھی طنز و تنقید پر برداشت نہ کرتیں۔ ضیاء الحق بھی دوسرے حکمرانوں کی طرح مغربی ہاتھوں میں کھیل رہا تھا۔ وہ خود بھی حقیقت سے نابلد رہا۔ مغرب کے اصولوں میں سے اہم اصول مقصد حاصل کرنے کے بعد اپنے ہی وفادار کو ختم کرنا شامل ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کا جمہوری دور ختم ہوا تو اس کی جگہ ضیاء الحق نے سنبھالی بعد ازاں اسے بھی قربان کر دیا گیا۔ ملکِ پاکستان میں شروع دن سے ہی بیرونی طاقتوں کی مداخلت سے پاکستانی معاشرے میں سیاسی نامواری ہے۔ اس سیاسی ناموار ی کی وجہ سے لوگوں کی ذہنوں اور زندگیوں پہ بھی منفی اثرات پڑ رہے تھے۔ ذہنی بے چینی اور افرتفری میں مبتلا یہ شخص معاشرے کے کارآمد شہری بننے سے قاصر رہتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار بھی ایسے ہی مسائل کا شکار دکھائی دیتا ہے۔

"یہ وہی جنرل ضیاء الحق تھا جو نہ صرف ملک بلکہ اس خطے کا ایک دہائی تک طاقتور ترین حکمران تھا۔ جس نے اس ملک کے ساتھ ساتھ پورے خطے کو مذہبی جذباتیت اور غیر منطقی اور حکمرانی کے جہنم میں جھونک رکھا تھا مگر عالمی طاقتوں کی سازش اور فطری اصولوں کو مدنظر نہ رکھ سکا۔"(178)

غیر ملکی طاقتوں کا آلہ کار بننے والے حکمران بعد ازاں خود بھی انہی سازشوں کا شکار ہو کر اپنے عزت اور حکمرانی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ تاہم کوئی بھی سبق حاصل کرنے کو تیار نہیں ہے اور ہر کوئی ایک دوسرے کی جگہ لینے پہ ہر وقت مستعد دکھائی دیتا ہے۔ مارشل لاء کے زمانے میں لوگوں کا آزادی اظہارِ رائے کی قدغن برداشت کرنا پڑی۔ آزادیِ اظہارِ رائے کا حق شہری کا بنیادی حق ہے۔ وہ اپنی رائے کا حق اس وقت کھو بیٹھتا ہے جب ہمارے ہاں جمہوریت کے بجائے آمریت اپنے مضبوط پنجے گاڑھ لیتی ہے۔ ناول میں راشد اور اس کے پیرائے میں ناول نگار نے حالات کا احاطہ کیا ہے۔ خصوصاً ایسے لوگ جو انقلابی ذہنیت کے حامل ہوں۔ ڈراموں، اخبارات پہ قدغن لوگوں کی آوازوں کو دبا دیا گیا۔ حکومت کی پالیسیوں کے مطابق ہونے والی گفتگو کو ہی اجازت نامے جاری کیے جاتے۔ یوں ایسے حالات میں نام نہاد انقلابی دب کر بیٹھ گئے۔ ضیاء الحق کے 10 سالہ طویل دور کے اختتام کے بعد جمہوریت پسند لوگوں نے سکھ کا سانس لیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آنے والے ادوار میں بھی مفاد پرستی، ذاتی مفادات کو ترجیح، رشوت، سفارش اقرباء پروری نے جمہوریت کی روح کو بھی قتل کر دیا۔ ذاتی مفادات پہ مبنی خود غرضی کے جذبات سے بھری حکومتوں نے ملک اور معاشرے کی ترقی کے بجائے ذاتی مفادات کو ترجیح دی۔ جس کی وجہ سے معاشرہ کبھی بھی درست سمت میں نہ جا سکا۔ فنکاروں کو بھی جیلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کو ہراساں کیا جاتا اور قید و بند کی صعوبتیں سے گزارا جاتا۔ حکومتی

اداروں کے خلاف جائز تنقید کا بھی حق نہیں دیا جاتا۔ حکومت کی غلطیوں کی نشاندہی کو بجائے اصطلاح کرنے کے اسے اپنے اور ملک کے خلاف سازش سمجھا جاتا ہے۔ اکیسویں صدی کے اوائل تک پاکستانی معاشرے میں ایسی ہی صورتحال دیکھنے میں ملتی ہے۔ جہاں آزادیٔ اظہارِ رائے پہ قدغن لگائی جاتی ہیں۔ ناول میں جمہوریت کے واپس لوٹنے کا اظہار ناول نگار نے کچھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ جب ضیاء الحق کے طاقتور اقتدار کا 10 سالہ ختم ہوا تو جمہوریت پسند لوگوں نے سکھ کا سانس لیا کہ ایک روشن دور کا آغاز ہونے والا ہے تاہم حقیقت اس کے برعکس ہی نکلی۔ لوگ عوامی رائے کے حق سے مستفید ہوتے ہیں۔

"آخر یہ طویل رات ایک اور روز ختم ہوئی۔ اچانک ہی ایک صبح انہیں پتہ چلا کہ جہاز تباہ ہوا تھا اور ایسا شدید دھماکہ ہوا کہ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ بس اسی راکھ سے کچھ چاننن بکھرا اور نئی جمہوری حکومت کا طلوع ہوا۔ اس حکومت نے روپوش سیاسی کارکنوں کے خلاف مقدمے واپس لینے کا اعلان کیا تو یہ گروپ پھر سے منظرِ عام پہ آکر متحرک ہو گیا۔"(179)

ناول میں جہاں حکومتی رویہ خصوصاً آمریت کے ادوار کا تذکرہ اور اس پہ طنز ملتا ہے وہیں نام نہاد انقلابیوں کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ جو محض نعروں تک لوگوں کو گمراہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور عملی میدان میں کودنے سے گریز کرتے ہیں۔ ذرا سی مشکل آنے پہ اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے یا تو ملک چھوڑ جاتے ہیں یا روپوشی اختیار کر لیتے ہیں۔ بے نظیر کی حکومت وجود میں آئی تو یوں طویل مارشل لاء کے بعد جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ یہ الگ بات ہے کہ حکومتوں کی نااہلیوں اور ناکامیوں نے معاشرتی حالات کو زیادہ بہتر ہونے کا موقع کم ہی فراہم کیا ، ناول میں مقامی سیاسی نظام کی پیچیدگی اور ان میں ہونے والے برتاؤ اور بدلاؤ کا اثر عام آدمی کی زندگی پر پڑتا ہوا بیان کیا ہے۔ خصوصاً 80 کی دہائی اور اس کے بعد کے سیاسی نظام کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ یوں مقامیت کے سیاسی منظر نامے کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ ناول نگار نے مقامیت کے بیان میں مقامی سیاسی منظر نامے اور ملکی سیاسی منظر نامے کا تذکرہ کیا ہے۔ عمومی طور پہ شہروں میں سیاسی منظر نامے وفاقی یا صوبائی سطح پہ ہونے والی تبدیلیوں کے زیرِ اثر ہوتے ہیں۔ ناول نگار نے مقامی کرداروں کے ذریعے اور سفارشی کلچر کی بھی قلعی کھولی ہے جہاں عام اور متوسط طبقے کے نوجوان احساسِ کمتری کا شکار ہو کر کسی بھی غلط سمت کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ بڑے شہروں میں ہونے والے فیصلوں کے اثرات چھوٹے علاقوں میں بھی منتقل ہوتے ہیں۔ بڑے شہروں کے لوگ ان سے براہ راست متاثر ہوتے ہیں۔

کوئی بھی عہد اپنے اندر سیاسی سماجی عمل کو جذب کیے بغیر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سیاسی نظام بالخصوص ایسی مقامی ثقافتوں میں جہاں کے لوگ پڑھے لکھے باشعور ہوں ان کی زندگیوں پہ کسی حد تک زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ بڑی ثقافتوں میں سیاسی نظام کا عمل دخل زیادہ ہو جاتا ہے۔ لاہور کا شمار بھی پاکستان کے بڑے شہروں کے ساتھ ساتھ سیاسی معاملات کے تناظر میں بھی اہم مراکز میں ہوتا ہے۔ صدیوں پرانا یہ شہر علم وادب، اہلِ ہنر لوگوں کی

آماجگاہ ہے یہاں کے لوگوں کا شعور بھی پختہ ہے۔سیاسی ہلچل جہاں ملکی منظر نامے پہ اثر انداز ہوتی ہے وہیں مقامی لوگوں کی زندگیوں پر بھی اس کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ناول میں انقلابی پروفیسر کے ضمن میں دراصل ناول نگار نے لاہور کی مقامی زندگی کا وہ پہلو بیان کیا ہے جہاں مفکرین اور فلسفی،انقلابی لوگ ایک انقلاب کا جذبہ لئے نہ صرف نظام کی تبدیلی کی خواہش مند ہوتے ہیں بلکہ وہ نامناسب حالات پہ رائے زنی کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔

سیاسی معاملات میں ہل چل میں ان نوجوانوں کی زندگیوں اور مستقبل کے فیصلے بھی ان کے سپرد ہوتے ہیں۔یوں معاشی لحاظ سے ناہمواری، مسائل ان لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کرتی ہے۔لوگ چائے خانوں،ڈھابوں پہ اپنے سیاسی مسائل کا تذکرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مصنف نے ناول میں مقامی ثقافت کے بیان کے ساتھ ساتھ لوگوں کی سیاسی بصیرت کا بھی احوال بھی بیان کیا ہے۔ناول نگار نے ناول میں جس طبقے کا انتخاب کیا ہے وہ متوسط طبقہ ہے۔جو اندرون شہر کا باسی ہے۔انہوں نے شہر کی تنگ وتاریک گلیوں اور چھوٹے مکانوں میں رہنے والے یہ لوگ چائے خانوں اور ڈھابوں کا رخ کرتے ہیں۔جہاں یہ کھلی فضا میں سانس لینے کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پہ گفتگو بھی کرتے ہیں۔ان موضوعات میں سر فہرست ادبی اور سیاسی اور سماجی معاملات زیر بحث آتے ہیں۔لوگ اپنی سیاسی اور معاشرتی بصیرت کے تحت مختلف ملکی اور مقامی معاملات پہ رائے زنی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

> "امریکیوں نے کیا ات مچائی ہوئی ہے، باؤ صاحب۔جاسوس بھی بھیج دیئے۔ہمارے جیسے ملک سے اس کا کیا مطلب۔کچھ نقطہ سمجھاؤ۔اپنی تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ہمارے پاس نہ کھانے کو پورا،نہ پینے کو۔بارشیں ہوں تو لوگ مارے جاتے ہیں۔نہ ہوں تو لوگ ہمارے جاتے ہیں۔ہمارا تو یہ حال ہے اور یہ ہمیں کس چکر میں پھنسا رہا ہے۔آپے ہی بناتا ہے۔پھر ڈرون مار کر بھاگتا ہے گراتا ہے۔اب خیر کرے۔ارادے ٹھیک نہیں ہیں امریکیوں کے۔اتنی "آخر" کس بات کی آئی ہوئی ہے اسے۔اس نے مرنا نہیں ہے کیا۔ ہمیں بھی تو کچھ نقطہ سمجھاؤ (180)"۔

اکیسویں صدی کے آغاز میں نائن الیون کے سانحے نے عالمی منظر نامے کو بہت حد تک تبدیل کیا۔امریکہ نے افغانستان پہ دہشت گردی کی آڑ میں چڑھائی کر دی۔جس کا ازالہ پاکستان کو بھی کرنا پڑا۔پاکستانیوں نے بڑی تعداد میں اپنی جانوں کا نذرانہ اس دہشت گردی کی لہر میں دیا اور ایک دہائی سے زیادہ دہشت گردی کی امریکہ کی لگائی گئی اس آگ میں پاکستانیوں کا بھی بہت حد تک نقصان ہوا۔پاکستانی معاشرے میں بھی افراتفری اور ذہنی اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی۔لوگ گھروں سے نکلتے ہوئے ڈرنے لگے۔مزارات،مساجد، تعلیم گاہیں کوئی بھی جگہ دہشت گردی جیسے ناسور سے بچ نہ سکی۔ایسی صورتحال میں لوگوں کی ذہنی کشمکش بھی بڑھتی گئی۔ناول نگار نے اس صورتحال کو مختصراً ہی صحیح لیکن ناول میں بیان کیا ہے کہ کس طرح سے لوگ اس معاملے میں اضطراب کا شکار ہیں۔

لاہور کی مقامیت میں ایسی نشستوں کی کمی نہیں، جہاں مختلف موضوعات زیر بحث آتے ہوں۔ مقامی لوگوں کے مزاج میں ان معاملات پہ نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ ان پہ بحث کا مزاج بھی پایا جاتا ہے لیکن ایسے افراد کی کمی ہے جو ان کے اس احساس کو درست سمت میں گامزن کر سکیں۔ جوان کو درست سمت میں چلائیں اس کی وجہ سے نوجوانوں بیزاری کا شکار ہو جاتے ہیں۔

"ہمارے ہاں فلسفیوں اور سماجی علوم کے ماہرین کی کمی ہے۔ یا کہا جائے کہ فقدان ہے۔ اس لیے یہاں کوئی شے نظریات، خیالات اور افکار تخلیق نہیں ہوتے اور معاشرہ قدیم روایات کو زندہ رکھتے ہوئے ان کی تقدس کا درجہ دے دیتا ہے۔ ذہنی پسماندگی اس وقت دور ہوتی ہے کہ جب قدیم روایات کو چیلنج کیا جاتا ہے اور ان کی جگہ حالات کے مطابق نئی روایات کو پیدا کیا جاتا ہے۔"(181)

پڑھے لکھے نوجوان طبقے کے علاوہ آدمی بھی سیاسی منظر نامے میں تبدیلی پر گہری نظر رکھتا ہے۔ کیونکہ ان سیاسی فیصلوں کا ان کی زندگی پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ ناول نگار نے مقامی لاہور کی مقامی فضا میں ان سیاسی مباحث کی جو تصویر کشی کی ہے یہ لاہور کی فضا کا حصہ ہے۔ جہاں لوگ ایسے موضوعات پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ ان رائے زنی کرتے ہیں۔ ناول نگار نے مقامیت کے بیان میں لاہور کے اس مقامی رویے کو بھی اپنے مقامی کرداروں کے ذریعے سے بیان کیا ہے کہ لوگ مختلف موضوعات کے ساتھ ساتھ سیاسی معاملات پہ بحث و مباحثہ کرتے ہیں اور اس حوالے سے دلچسپی بھی رکھتے ہیں کیونکہ مرکزی سیاسی نظام ان کی مقامی زندگیوں پہ بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

ناول نو لکھی کوٹھی کا آغاز نوآبادیاتی عہد میں ہوتا ہے۔ جو 1990ء کی دہائی تک آتا ہے۔ ناول میں وسطی پنجاب کی مقامی ثقافت کو بیان کیا گیا ہے۔ سیاسی اعتبار سے بھی مقامیت کو بیان کیا گیا ہے۔ انگریزوں اور مقامی اشرافیہ کے گٹھ جوڑ کے ذریعے مقامی سیاسی نظام کی وضاحت ملتی ہے۔ مقامی سیاسی نظام کو ناول نگار نے مقامی کرداروں کے ذریعے سے قدرے تفصیلاً بیان کیا ہے۔ نوآبادیاتی عہد میں بھی پولیس اور مقامی افسروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کی مثالیں ملتی ہیں۔ ناول میں مقامی زمینداروں، جاگیرداروں کے مقامی افسروں کی طرف داری ابتدائی دور کی کارستانیاں ہیں۔ انگریز افسروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اور مفادات کی پاداش میں مقامی لوگ انگریز افسروں سے اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ مقامی اشرافیہ کا گٹھ جوڑ نوآبادکاروں کے ساتھ واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

ناول کے مرکزی قصے غلام حیدر اور سودھا سنگھ کی دشمنی سیاسی عوامل کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ مقامی اشرافیہ بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں کے ہاتھوں کھلونا بنتی ہے۔ انگریز بھی اس مغالطے کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بھی مقامی نوابین کے ہاتھوں کھلونا بن کر ان کے مقاصد کی تعمیل کرتے ہیں ایسا کردار ہے جو اس علاقے میں نمایاں تبدیلی کرنے کا خواہاں ہے۔ وہ سیاست کی بصیرت استعمال کرتے ہوئے انتظامی معاملات چلاتا ہے۔ وہ مقامی لوگوں کا اعتماد بڑھا کر ان سے زیادہ کام لینا چاہتا ہے کہ جس کا فائدہ بہر حال اس سے اور اس کی حکومت کو ہی ہوتا ہے۔ تاہم مقامی

طور پہ جو سیاسی نظام موجود ہے اس میں برتری جاگیر داروں اور وڈیروں کی ہے۔ جن کا رعب اور دبدبہ اور جن کا کنٹرول مقامی عدالتوں اور پولیس تھانوں تک موجود ہے۔ وہ اپنی مرضی کے فیصلے کروا لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پچھاڑنے کے لیے وہ ہر جائز اور ناجائز حربہ استعمال کرتے ہیں۔ تاہم دونوں صورتوں میں تھانوں اور کچہریوں، عدالتوں میں واضح برتری ان جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کی ہی دکھائی دیتی ہے۔ ولیم کے کردار کے ذریعے سے نوآبادیاتی عہد میں ہونے والی اصلاحات کا تذکرہ ملنے کے ساتھ ساتھ مقامی وڈیروں کے رویے کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

"بطور حاکم یہ میرا پہلا کام ہے۔ یاد رکھو یہاں جگہ جگہ پپراگی ہوئی خودرو جڑی بوٹیاں اور سرکنڈے اگر عوام کے لیے مضر ہیں تو ہمارے لیے بھی مضر ہیں۔ یہاں کی پبلک بھوکی مرے گی تو ہم بھی زیادہ دیر گائے کے تازہ دودھ نہیں پی سکیں گے۔ گورنمنٹ اس بات پر یقین رکھتی ہے جس مٹی سے تم سو روپے نکالو اس میں سے بیس اس مٹی پر ضرور خرچ کرو تا کہ مزید سو روپے حاصل کر سکو۔"(182)

ولیم کا کردار نوآبادکاروں کا نمائندہ کردار ہے۔ اس کردار کے اس مقامیت پہ مختلف اثرات نمایاں ہیں۔ وہ مقامی لوگوں کو پڑھا لکھا اور خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں تا کہ اس کی حکومت کو بھی زیادہ ٹیکس حاصل ہو سکے تو دوسری طرف غلام حیدر اور سودھا سنگھ اپنے معاشرے کے نمائندہ کردار ہیں جو ہر آنے والے لمحے کے ساتھ تبدیل ہو رہا ہے۔ ان دونوں کی درمیان تناؤ کا باعث بن جاتی ہے۔ سودھا سنگھ کے قتل کے بعد غلام حیدر کا کئی برسوں تک روپوش ہو جانا اور پھر نواب کی مدد سے سیاسی اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے اس کی معافی ایک نئے مقامی سیاسی منظر نامے کی تکمیل کرتی ہے۔ ناول میں 1940ء کے بعد کا زمانہ مقامی سیاسی اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ غلام حیدر مقامی سیاست میں مسلم لیگ کا نمائندہ بن کر ابھرتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب مقامی لوگ عملی سیاست میں حصہ لیتے ہیں۔ لوگوں کی مختلف سیاسی پارٹیوں سے وابستگی نظر آتی ہے۔ یہ علاقہ بھی ہندوستان کی مجموعی صورتحال کی طرح سیاسی طور پر بیدار ہوتا ہے۔ مقامی لوگوں میں اپنی حیثیت کے مطابق سیاست کی عملی نظام میں شرکت دکھائی دیتی ہے۔ غلام حیدر اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے اپنے نواب کی خاطر سیاسی راہ ہموار کرتا ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے جلوس زوروں پہ پہنچ گئے۔ لوگ نئے سیاسی ماحول میں عملی طور پر شامل ہو گئے۔ غلام حیدر مسلم لیگ کا حمایتی تھا اور سکھوں اور کانگریس کے خلاف عملی مظاہرہ کر رہا تھا۔ یہ مقامی جاگیر دار اور سرمایہ دار بھی ان سیاسی پارٹیوں میں شامل ہو گئے کیونکہ ملک میں ایک جمہوری روایت کا آغاز ہونے والا تھا۔

"غلام حیدر کا حکم سننا تھا کہ جتنا بھی اس کا گروہ تھا۔ سب کانگرسی لیڈوں پر ٹوٹ پڑا۔ یہ جگہ ایسی تھی، جہاں ریت کی وجہ سے ان کی سواریاں زیادہ تر اونٹوں کی تھی۔ کانگریسی تعداد میں پچاس یا ساٹھ ہوں گے۔ ادھر پونے تین سو کا مجمع اور سب کے ہاتھوں میں گنڈاسے اور ڈانگیں تھی۔۔ کچھ اُونٹوں کو ڈنڈے مارنے شروع کر دیے

۔جس کی وجہ سے وہ اپنے سواروں کو بھی نیچے پھینک کر دوڑنے لگے۔اس ہنگامہ کانگریسی لیڈر سری واتر جی کی جیپ بھی وہیں رہ گئی، جس کا ٹائروں سے ہوا نکال کر اس کے پٹرول والی ٹینکی میں ریت ڈال دی۔"(183)

مسلم لیگ اور کانگرس کی جماعتوں کا زور اور ٹکر اس علاقے میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ لوگوں کی خاندانی دشمنیاں، دوستیاں اپنے سیاسی روپ میں نظر آنے لگیں۔ ان کی وابستگیاں سیاسی جماعتوں سے ہو گئیں۔ جس کے باعث مقامی سیاسی منظر نامے میں بھی تبدیلی ہوئی۔ مقامی زمینداروں اور جاگیر داروں نے عملی سیاست میں کود پڑے اور اپنے اثر ورسوخ اور مسلمانوں کے دیگر اختلافات کے ساتھ ساتھ اب سیاست کی سرگرمیوں سے ان کی باہمی ا ختلافات میں مزید اضافہ ہوا۔ دونوں قومیں اس نئے سیاسی منظر نامے کی وجہ سے مزید اختلافات کا شکار ہوئیں۔ اصل مسئلہ بھی یہی تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ پاکستان بننے کا مطالبہ جب زور پکڑ رہا تھا۔ مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ مقامی لوگوں کا مستقبل کیا ہوگا کون کس طرف جائے گا۔ اس طرح تقسیم کا سانحہ ایسا سوز اور غم لے کر آیا کہ دیکھتے دیکھتے صدیوں ساتھ رہنے والے ایک ہی مٹی کے باشندے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے۔ مسلمانوں کو مشرقی اور سکھوں کو مغربی پنجاب میں بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ یوں اس مقامیت کی تاریخ میں ایک ایسی تبدیلی آئی۔ جس کی بنیاد سیاسی تھی مگر اس ثقافت و تہذیب پر المیوں کے داغ رقم کر گئی۔ ناول کے آغاز میں مقامی جاگیر دارانہ کلچر دکھائی دیتا ہے اور اس کلچر میں اضافہ نوآبادیاتی نظام کا ہوا اور کچھ عرصے تک بیسویں صدی کے آغاز سے قبل تک دونوں مقامی سیاسی نظام اور برطانوی سیاسی نظام دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں مل کے ساتھ چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم بیسویں صدی کے انقلابات کے ساتھ ساتھ سیاسی منظر نامہ بھی تبدیل ہونے لگا اور مقامی وڈیرے اور زمیندار اس عملی سیاست میں شامل ہو کے ایک نیا منظر نامہ پیش کرنے لگے۔

ناول میں مجموعی طور پر مقامی سیاسی بیانیہ بھی ہے۔ روایتی پنجابی نظام سے تقسیم ہندوستان کے سیاسی نظام تک اس مقامیت میں سیاسی حوالے سے بھی ناول نگار نے نگاہ دوڑائی ہے۔ اس مقامیت کا اپنا سیاسی نظام بھی واضح ہوتا ہے۔ یوں اس مقامیت کی انفرادیت قائم ہوتی ہے جو ایک مکمل سیاسی سماج نظام کی حامل ہے۔

پاکستان بننے کے بعد کبھی سیاسی ماحول دکھایا گیا ہے۔ ایسی سیاست جس میں اثر ورسوخ کا بھی بیان ملتا ہے۔ تقسیم کے وقت اور اس کے بعد کس کی طرح اختیارات کے حامل افراد نے اپنے معاملات کی جنگ لڑی۔ اقرباء پروری نے اس نظام کو تباہ کیا۔ وہاں سے آنے والے لوگ ہاتھ ملتے رہ گئے۔ خاص کر جن کا کوئی بڑا حوالہ نہ تھا۔ مقامی لوگوں نے ملی بھگت سے جائیداد اور زمینیں اپنے نام کروالیں۔ مہاجرین ہاتھ ملتے رہ گئے۔ ناول میں مقامی سیاست سے ملکی سیاست کی منافقت دونوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ مقامی اشرافیہ نے انگریزوں اور پاکستان چھوڑ کر جانے والوں کے لئے نو دولتیوں پر کس طرح لوٹ مار کی حکومت اور مہاجروں کو سوائے نقصان کے کچھ اور نہ ملا۔ ناول نے مقامی

سیاست کے ساتھ ساتھ پاکستان بننے کے بعد مختلف سیاسی کرداروں کے ذریعے سے ملک میں سیاسی بحران کی نشاندہی بھی کی ہے کہ اس سیاسی عدم استحکام اور نہ ہمواری کی وجہ سے ہی مقامی لوگوں کے ذہنوں اور زندگیوں پہ برے اثرات پڑے۔

غلام باغ میں مختلف مقامی ثقافتوں کا بیان ہے۔ ناول میں مختلف علاقوں کی ثقافت مختلف پیرائے میں بیان ہوئی ہے۔ان تمام مقامی عناصر میں انفرادیت ہے۔سب سے دلچسپ معاملہ سیاست کے میدان میں نظر آتا ہے۔ناول کا مرکزی قصہ یاور عطائی اور اس کی بیٹی زہرہ، کبیر مہدی، ڈاکٹر ناصر، ہاف مین اور امبر جان کے گرد گھومتا ہے۔جن کو ناول نگار نے ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔اس کے باوجود اس کی انفرادیت موجود ہے، ماء سوائے سیاسی معاملات کے۔

یاور رعطائی کا ڈائننگ روم ایک علامت ہے۔ ملکی سطح پہ مفادات پرست ٹولے کی علامت جن کو ذاتی مفادات نے انہیں ایک مرکز میں جمع کر دیا ہے۔اشرافیہ اپنے مقاصد کے لیے ایک جگہ متحد ہو جاتے ہیں۔یاور عطائی کی ڈائننگ روم میں اپنی اپنی محرومیاں چھپانے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔طاقت کا یہ گٹھ جوڑ مفادات کا حصول ہے۔جس کا ایک اصول عام آدمی کا استحصال ہے۔ یاور کے پاس آنے والے اشرافیہ کے ان کرداروں کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے ۔طاقتور طبقہ مختلف حوالوں سے آپس میں گٹھ جوڑ کرتا ہے۔یہ سارے صاحبِ حیثیت لوگ ایک دوسرے کو مدد فراہم کرتے ہیں۔بلندیوں پہ چڑھنے کے لیے ایک دوسرے کو کندھا فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مفادات کا سودا بھی کرتے ہیں، اپنے مفادات کی خاطر یہاں پہ سب ہی ایک ہو جاتے ہیں۔ناول کے دوسرے/اختتامی حصے میں انعام گڑھ کا معاملہ تفصیل سے بیان ہوتا ہے۔انعام گڑھ سیاست کی اہم آماجگاہ ہے۔زہرہ اور کبیر جب اس علاقے میں جاتے ہیں تو وہاں کے سیاسی معاملات بھی آشکار ہوتے ہیں۔جب وہ اخبار کے نمائندے کے روپ میں انعام گڑھ جاتے ہیں تو ان کو اس علاقے کی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

> "ہم نے ڈاکٹر سے معذرت کی اور اجازت مانگی۔اس نے کہا"اچھا آپ نے جلسے کی کوریج بھی کرنی ہو گی۔ویسے یہ بڑا حساس سیاسی علاقہ ہے اور ثقافت، سائنس اور مذہبی امور کی وزارتیں اکثر ادھر کے بڑوں کو مل جاتی ہیں ۔اس دفعہ تو سنا ہے کہ زیادہ بڑے عزائم ہیں۔"(184)

مندری مانگر جو قبیلہ اور آس پاس کے دیہاتوں کے ہزاروں سادہ لوح اسے محض ایک جلسہ سمجھتے ہیں۔ان کے لیے سب سے اہم بات اس جلسے کے بعد دیا جانے والا لنگر، ایسا لنگر جس میں وہ سیر ہو کر کھانا کھاتے ہیں۔اپنے گھروں کے لیے لے جاتے ہیں۔ایسا کھانا جو انہیں کبھی میسر نہیں ہوتا اور وہ کھانا انہیں اس لنگر میں دے دیا جاتا ہے۔ ان میں سے تو اکثر ایسے ہیں جو یہ بھی نہیں جانتے کہ لاؤڈ سپیکر پر ہونے والی ان تقاریر کا مقصد و مطلب کیا ہے۔دوسری طرف انعام گڑھ کی مقامی سیاست میں مذہبی رہنماؤں کا بھی عمل دخل واضح ہے کہ کس طرح اپنی مذہبی وابستگیوں کو اپنے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔طاقت کے حصول کے لیے مختلف طرز کے لوگ خواہ وہ کسی بھی قماش کے ہوں۔مشتر

کہ مفادات کی وجہ سے اتحاد کر لیا جاتا ہے اور طاقت کے مزید حصول اور لوگوں پہ دھاک بٹھانے کے لیے وڈیرے چودھری اور مذہبی رہنما سیاست کے میدان میں بھی اتر آئے ہیں۔تاکہ مزید طاقت حاصل کر سکیں۔یہ انعام گڑھ کا مسئلہ نہیں پورے پاکستان کا مسئلہ بن چکا ہے۔سرمایہ دارانہ سوچ اور نظام نے دیہاتوں، شہروں دونوں کے حالات ابتر بنا دیے ہیں ان حالات کے تناظر میں اقبال آفاقی لکھتے ہیں۔

> اس وقت پاکستان کی انسانیت کا چھروں، پگلوں، مخدوم و چودھریوں، ملکوں اور خانوں کے محاصرے میں ہے۔یہ محاصرہ روز بروز تنگ ہو رہا ہے۔جہاں دیوار کمزور نظر آتی ہے وہاں سے وہ انسانیت پر حملہ آور ہو جاتے ہیں ۔آزادی کے بعد پرانی سماجی اقدار کی جگہ نئی مثبت اقدار کو لینا تھی۔لبرم ازم، خود مختاریت اور سب کا زندگی کے مسائل و سائل پر یکساں حق لیکن جمہوریت اور سماجی مساوات وانصاف کے دعووں کے باوجود صدیوں کی گندی ذہنیت کا مداوا نہیں ہو سکا۔ نفرت انگیزی، توہمات پرستی اور خود غرضی کی ہو تقویت ملی ہے۔دیہی معاشروں کی صورتحال شہروں کی صورتحال سے ابتر ہے۔وہاں تیتر تیتر نہ رہا نہ بٹیر بٹیر۔نئے معاشرتی ڈھانچے، سماجی تعصبات اور مذہبی انتہا پسندی نے ہر چیز کا توازن الٹ دیا ہے۔اب زمیندار گاؤں کا مکھیا نہیں، ایک کمینہ صفت کاروباری ہے اس کے پڑوس میں بے زمین مزارع یا کمی کاری کے لیے جگہ اس کے ظرف کی طرح تنگ ہو رہی ہو گی۔دیہات سے آبادیاں شہروں کی طرف رخ کر رہی ہیں۔(185)

درج بالا اقتباس کو ناول کے تناظر میں دیکھا جائے اور اس کو اپنی ملکی صورتحال سے موازنہ کیا جائے تو واقعی معاملات ایسے ہی نظر آئیں گے۔تاہم یہاں ہمارا موضوع مقامی سیاسی بیانیے مراد ہے۔اس لیے ملکی سطح کی سیاست تک جانا اہم نہیں ہے۔اہم بات یہ ہے کہ یہ مقامی نمائندے ملکی سطح پر کس طرح سے کردار ادا کرتے ہیں اور اس ذات پات اونچ نیچ کے تصور کو نام نہاد مذہبی رہنما بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔جو لوگوں کو ممبر پہ بیٹھ کے یکسانیت کا درس دیتے ہیں۔درگاہوں پہ بیٹھ کے انہی قول سے انحراف کر جاتے ہیں۔جہاں کم آمدنی والا مرید لائنوں میں لگا ہوتا ہے جبکہ زیادہ آمدن اور زیادہ چڑھاوے چڑھانے والا ان کے پہلو میں ان کے برابر براجمان ہوتا ہے۔مذہبی نمائندوں سے لے کہ سیاسی نمائندوں تک یہاں مقامی لوگوں کا استحصال آج بھی جاری وساری ہے جس کو کبھی زمانہ قدیم سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

انعام گڑھ کا طاقتور طبقہ وقت اور حالات کے مطابق اپنے حالات کو تبدیل کر لیتا ہے۔مانگر جو جیسے کئی قبیلوں پہ ان کا استحصال جاری ہے۔اس کا دائرہ کار سیاست کے ذریعے سے بڑھ کر ملکی سطح تک آ پہنچا۔مذہبی رہنما بھی اس میدان میں کود پڑے اور طاقت کے حصول کے لیے امبر جان جیسے اسمگلر کے ساتھ بھی تعلقات اس کے نقطہ نظر سے سیاسی نظام ان کے مقامی عوامل کے مطابق ہی پروان چڑھتا ہے۔ان کی سیاست کا رنگ وہی مقامی استحصالی نظام پہ استوار کیا جاتا ہے۔ان وڈیروں کے آباؤاجداد نے غریب لوگوں کو اپنا ماتحت بنا کر اپنی زمینوں کھیتوں میں کام کروائے

۔عورتوں کو گھر کی ملازمہ کا درجہ دیا اور حالات نے پلٹا کھایا تو نئے نظام میں انہی غریبوں کے ووٹوں سے اقتدار کی کرسیاں حاصل کی۔یعنی نئے دور میں استحصال کا طریقہ کار بدلہ ضرور لیکن بنیاد وہی رکھی گئی اپنی روایت ثقافت میں ترامیم کرکے اسی کو دستور العمل بنایا گیا۔

خس و خشک زمانے مقامیت کا نمائندہ ناول ہے۔ناول میں پنجاب کی مقامیت کا بیان ہے۔وزیر آباد اور گجرات کے ملحقہ دیہاتوں میں بسی اس مقامیت کا بیان تین نسلوں تک پھیلا ہوا ہے۔سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو ناول 1947ءمیں تقسیم کے وقت سیاسی حوالے سے پرامن لوگ ہیں۔جو کسی سیاسی معاملے سے واقف نہیں ہیں۔تاہم شہروں میں صورتحال اس کے برعکس تھی کہ لوگ آنے والے حالات سے باخبر تھے۔شہروں میں سیاسی ہلچل موجود تھی۔مقامیت کی سطح پہ یہ لوگ کسی بھی انتشار سے نابلد تھے۔فسادات کی لہر چلی تو ان لوگوں کو اس حوالے سے علم ہوا عملی طور پر یہ لوگ کسی خاص نظریے کے قائل نہ تھے کہ سیاسی سطح پہ کسی کا ساتھ دیتے یا کسی کی مخالفت کرتے ۔کسانوں کے زمینوں کے لڑائی جھگڑے میں اکثر مقامی پنچائیتوں میں حل کر لیے جاتے یا نمبر دار کی مہر سے کوئی مقدمہ چلتا تھا۔

ناول میں مقامی کرداروں کے ذریعے مختصر سیاسی احوال کا علم ہوتا ہے۔وہ مقامی کردار جو لاہور شہر میں مقیم تھے۔ان کے یہاں رہنے سے ان میں کچھ سیاسی سوجھ بوجھ پیدا ہو گئی تھی اور وہ اس بات کو سمجھ سکتے تھے کہ مسلم لیگ نام کی جماعت ان مقامی لوگوں کے لیے ایک الگ ملک بنانے جارہی ہے۔ان کرداروں کے ذریعے ناول نگار نے کچھ تلخ حقائق سے بھی پردہ اُٹھایا ہے ۔ایسے خدشات جو آنے والے وقتوں میں درست ثابت ہوئے ۔ناول نگار نے ان کرداروں کے ذریعے مقامی مافیا جو بعدازاں اس ملک کی تقدیر پہ مسلط ہو گئے کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔امیر بخش کے نظریات خالصتاً انقلابی اور حق پر مبنی ہیں۔پاکستان کے وجود کے وقت وڈیروں اور جاگیرداروں نے محض اپنی ساکھ کو قائم کرنے کے لیے سیاسی کھیل کھیلا۔یہی وہ لوگ تھے جو پہلے بھی عوام کا خون چوستے رہے۔نوآبادیاتی عہدے داروں سے گٹھ جوڑ کرکے اپنے اقتدار کو مستحکم کرکے مقامی لوگوں کے ساتھ ظلم و ستم کا رویہ قائم رکھا اور بعدازاں پاکستان بننے کے بعد بھی عملی سیاست میں کود پڑے۔یہی مذہبی اور سیاسی رہنما بعدازاں بھی پاکستان کے بڑے کرتادھرتا ثابت ہوئے اور لوگوں کو اسی طرح سے استحصال کا نشانہ بناتے دکھائی دیتے ہیں۔

ناول نگار نے مقامی کرداروں کے ذریعے سے موجودہ ادوار اور آنے والی صورتحال کو بیان کیا ہے کہ کس طرح اس زمانے میں بھی بڑے عہدوں والے لوگ عام لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔باحیثیت یہ لوگ نوآبادکاروں سے گٹھ جوڑ کے ذریعے مزید مضبوط ہو گئے۔جو ان کا آلہِ کار بن کے اپنی ذاتی مفادات کی تکمیل تو کرتے ہیں مگر ملک و ملت کا کچھ بھی فائدہ نہیں سوچتے اور نہ ہی اس طرح کی سوچ ان کو آتی ہے بلکہ وہ تو آنے والے وقت میں بھی ایسا نظام

چاہتے ہیں۔ جہاں مقامی لوگوں کا استحصال بڑے پیمانے پر کیا جائے۔ بلکہ کردار کے ذریعے سے ناول نگار نے اس سارے منظر نامے کی تصویر کشی کی ہے۔ جہاں مذہبی رہنما بھی ان وڈیروں یا جاگیرداروں کے ساتھ کھڑے ہیں اور آنے والے وقت میں پاکستان کی عوام کو اپنا ماتحت بنانا چاہتے ہیں۔

"چاہتا ہوں پر ایسا نہیں چاہتا جیسا وجود میں آنے کو ہے۔ ہم انگریز اور ہندو کی غلامی سے نکل کر ایک بڑی غلامی میں چلے جائیں گے۔ ہمارے پیچھے تھوتھنیوں سے جھاگ نکالتے، غراتے ہماری پنڈلیوں کا ہی نہیں ہمارے بدنوں کا ماسک بھی نوچ ڈالنے والے کتے وہی رہیں گے۔ ایک الگ ملک حاصل کرنا بیکار ہے جب تک کہ تم پہلے ان تمام باولے کتوں سے نجات نہیں حاصل کر لو۔ اب ان کو کچلا کھلا کر انہیں ہلاک نہ کر دو اور ان کے ساتھ اس مذہبی تعصب کو دفن نہ کر دو جو بالا آخر تمہیں پتھر کے زمانے میں لے جائے گا۔"(186)

ناول نگار نے مقامی کرداروں کے ذریعے اہم سیاسی مسئلے پر بھی عالمانہ نگاہ دوڑائی ہے۔ ان کرداروں کی گفتگو سے جہاں سیاسی منظر نامے کی توضاحت ملتی ہے اور ان کرداروں کی بصیرت کا بھی علم ہوتا ہے۔ مقامیت ان بڑے واقعات سے متاثر ضرور ہوتی ہے۔ یہ مقامی کردار شہر میں رہتے ہوئے ان سرگرمیوں سے واقف ہیں۔ اپنی مقامیت کے مستقبل کے بارے میں فکر مند بھی ہیں۔ ناول میں ناول نگار نے مقامی کرداروں کی نمائندگی ہر جگہ دکھائی ہے۔ مختلف موضوعات کو بیان کرتے ہوئے بھی مقامی کرداروں کا سہارا لیا ہے۔ اجتماعی بڑے سیاسی مسئلے کو بیان کرتے ہوئے مقامی کردار اس میں دور فہمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جاگیرداروں، سرمایہ داروں کی حکمرانی انگریز حکومت میں بھی قائم رہی اور بعد ازاں بھی قائم ہے۔ جس خدشے کا اظہار کیا وہ اس مقامیت کے موجودہ نظام کی قلعی کھولتا اور آنے والے وقت کی بھی آگاہی فراہم کرتا ہے۔ ناول کے کردار بصیرت کے حامل ہیں۔ جو اپنے اندر گہری حسیت رکھتے ہیں۔ جو آنے والے وقت کے بارے میں فکر مند ہیں اور اس بات کا خدشہ دراصل ہندوستان کے طول و عرض ہیں بسنے والے کئی مقامی لوگوں کا خدشہ ہے اور کسی حد تک درست بھی ثابت ہوا کہ ملکوں کی تقسیم کے بعد بھی عام آدمی کی زندگی میں خاطر خواہ فرق نہ پڑا۔ بلکہ آج بھی وہ کسی نہ کسی صورت میں تعصب کا شکار اور ذات پات کی تفریق میں منقسم ضرور ہے۔ پاکستان بننے کے بعد اگرچہ یہاں پر مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ تاہم آج بھی ہمارے معاشرے میں ذات پات کی قید بھی موجود ہے اور غریب اور امیر کی تفریق آج بھی معاشرے میں ناہمواری قائم کیے ہوئے ہیں۔

"مجھے باباجناح کی نیت پر کچھ شک نہیں ہے۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے عزیز کہ ہم مسلمانوں میں انصاف اور انسانیت پرست قانون کی حکمرانی چاہنے والے منظم اور تعصب سے پاک ایک ایسا شخص بھی پیدا ہو سکتا ہے لیکن اس کے سنگی ساتھیوں پر تو نظر کرو جو بقول اس کے سب کے سب کھوٹے سکے ہیں وہیں جو لوگوں کو ذلتوں سے مار دینے والے ہوتے ہیں۔۔۔ ہمارے پیغمبر کے انقلاب کے بعد جس کی بنیاد ہی مظلوموں اور مفلسوں پر رکھی گئی تھی۔ یزید اور شمر آ گئے تو مجھے خدشہ ہے کہ مسلم لیگ میں دھڑا دھڑ شامل ہونے والے وڈیرے، جاگیر دار فتح

مکہ کے بعد مصلحتاً ایمان لانے والے بابے جناح کے رخصت ہونے پر یزید اور شمر ہو جائیں گے اور ایک کربلا میں ہم جیسوں کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔"(187)

تقسیم ہند کے وقت کے اثرات مرکزوں میں ہی نہیں تمام چھوٹی مقامی ثقافتوں پہ بھی پڑے۔ مقامی ثقافت بھی ان کے زیر اثر آئی۔ اگرچہ یہ کہا جائے کہ ثقافتوں کے لئے ایک اہم دور تھا تو بے جا نہ ہو گا۔ اس فیصلے سے کچھ مقامی ثقافتیں اس قدر متاثر ہوئیں کہ وہ اپنا آپ گم کر کے کسی اور بڑے نظام کا حصہ بن گئیں۔ بعض نے اپنی مقامی شناخت کو برقرار رکھا۔ ناول میں مقامی سیاسی نظریات کے ضمن میں کوئی انفرادی سوچ یا نظام تو نہیں دکھائی دیتا تاہم مجموعی سیاسی صورتحال کا اثر اس مقامیت پہ پڑتا ضرور دکھائی دیتا ہے۔ علاقائی نظام کے تناظر میں ملکی اور بین الاقوامی سیاسی نظام مقامی کرداروں کے ذریعے سے واضح ہوتا ہے۔

9/ 11 کے بعد کے اثرات ایک نیا منظر نامہ لے کر ابھرے۔ مغربی اور مشرقی تناظر میں ناول نگار نے مختلف سیاسی معاملات کو بیان کیا ہے۔ ناول نگار کے ان کرداروں کے قیامِ پاکستان کے وقت جو مسائل دکھائے گئے تھے، اکیسویں صدی کے آغاز میں نائن الیون کے بعد بھی اس طرح کے مسائل سامنے آئے۔ سیاسی منظر نامے کی تبدیلی سے بھی مقامی لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ملکی سیاست سے لے کے مقامی سیاست تک اس سانحے کے بعد اثرات کو قبول کرنے پہ مجبور ہوئے۔ دوسری طرف مفاد پرست ٹولا محض اپنے مفادات کی تکمیل میں سرگرداں ہے چاہے اس کے لیے ان کو کچھ بھی قربان کرنا پڑ جائے۔ جس کا تعلق ملک سے ہو یا عوام سے سلیمان شاہ کا کردار سیاسی کردار ہے جو طاقتور ہے تو بڑے بڑے لوگ اس کے در کے سوالی ہیں۔ اس کردار کے ذریعے مقامیت کے اس نئے طرز کی طرف اشارہ ہے جب وقت اور حالات نے طاقت کو مرکز بنایا۔ اس طاقت اور اختیار سے لوگوں نے اپنی اصل شناخت اور پہچان کو بدل ڈالا۔ مگر ان کا مذہب، خاندان ان کی سیاست سب اس مرکز پہ آ کھڑا ہوا جہاں ان کے مفادات جڑے ہیں۔ ناول میں سیاسی تناظر میں مقامی اشرافیہ کے مکروہ چہرے کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ جس کا نمائندہ کردار سلیمان شاہ ہے۔ جو اثر اور رسوخ کا حامل ہے۔ اس حوالے سے اس کے رنگ نسل کی پروا کیے بغیر لوگ اس کے در کے سوالی ہیں۔ ایسے کئی مفاد پرست بھی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست میں عملی طور پر داخل ہوئے اور اپنے ذاتی مفادات کی سے ملک و قوم کو نقصان پہنچانے لگے۔

اس باب میں مقامیت کے تین بڑے عناصر مذہبی بیانیے، ثقافتی بیانیے اور سیاسی بیانیوں کو اکیسوویں صدی کے ناولوں میں تلاش کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے بات کی جائے مذہبی بیانیوں کی تو مذہبی بیانیے مختلف ناولوں میں موجود ہیں۔ ناول جاگے ہیں خواب میں مقامی مذہبی بیانیے موجود ہیں۔ جہاں مذہب کی مقامی رسم و رواج اور ثقافت کے تحت ایک الگ صورت پروان چڑھتی ہے۔ جہاں مزارات اور پیری مریدی کا سلسلہ عام ہے۔ لوگ سادہ لوح ہیں اور چھوٹی

موٹی کرشمات کو بڑے معجزے تصور کر کے نسل در نسل ان کی تابعداری کرتے ہیں۔جندر میں کسی بڑے مذہبی بیانیے کا بیان نہیں دکھائی دیتا۔انواسی اس حوالے سے نمایاں ناول ہے۔ جس میں ایک مذہبی کردار پورے معاشرے پہ اپنی اجارہ داری قائم کرتا ہے۔ وہ اپنی مذہبی حیثیت کی وجہ سے تمام لوگوں کو اپنی رعایا تصور کرتا ہے۔ مولوی جاراللہ کی متنازع شخصیت اپنے اثر ورسوخ کے ساتھ ناول کے آخر تک قائم رہتی ہے اور اسی خاندان کا والی وارث ناول کے اختتام تک موجود رہتا ہے۔اس کردار کے بیان میں ناول نگار نے اس علاقے کے مذہبی تصورات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ مقامی بیانیے مقامی مذہبی بیانیوں کے طور پہ سامنے آتے ہیں۔دائرہ اور بھید میں مذہبی بیانیے زیادہ نمایاں نہیں ہیں۔تاہم نیلی بار میں مذہبی لوگوں کی حیثیت اور ان کا روپ مقامی سماج کے تناظر میں دکھایا گیا ہے۔خس و خاشاک زمانے اور نو لکھی کوٹھی میں مسلمانوں اور سکھوں کے تناظر میں مذہبی بیانیے دکھائی دیتے ہیں۔اس سماج کی شناخت بھی ہیں اور ان مقامی لوگوں کی پہچان بھی مختلف تصورات کے حامل لوگ ثقافت کی یکسانیت کی وجہ سے بہت سی رسموں کو مشترکہ طور پر سرانجام دیتے ہیں یا ایک مذہب، دوسرے مذہب پہ ضرور اثرانداز ہوتا ہے۔شہر خالی کوچہ خالی کرونا وبا کے دوران لکھا جانے والا ناول ہے جو اس وباء کی ہولناکی کو بیان کرتا ہے۔اس وباء کی ہولناکی کے باوجود ناول نگار نے داتا صاحب کے دربار پہ لوگوں کے ہجوم کو بیان کر کے مقامی تصورات کو واضح کیا ہے اور اس مقامی مذہبی تصور میں کسی حد تک معاشی حیثیت کا بھی عمل دخل ہے کہ کمزور معاشی حیثیت کے لوگ آج بھی ان مذہبی درگاہوں کا رخ کرتے ہیں۔

سیاسی بیانیوں کی بات کی جائے تو بہاولپور کی مقامیت کو ناول نگار ادھ ادھورے لوگ میں بہت بہتر انداز میں بیان کیا ہے۔ بہاولپور کی مقامیت کی سیاسی اثرات سے متاثرہ زندگی دکھائی گئی ہے۔ ناول کی بنیاد ہی سیاسی واقع کی وجہ سے ہے۔ انواسی میں بھی اس کا شعور ملتا ہے کہ سیاسی معاملات چاہے وہ مقامی سطح کے ہوں یا نوآبادیاتی زمانے کے مقامیت کو کس طرح سے متاثر کرتے ہیں۔یہی صورتحال ہمیں جاگے ہیں خواب میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

ثقافت کی بات کی جائے تو ان تمام ناولوں میں مقامی ثقافت کے مختلف عناصر کے ساتھ ثقافت کی وضاحت بھی ملتی ہے۔ناول نگاروں نے اکیسویں صدی میں بطور خاص مقامی ثقافتوں کی طرف انحراف کیا ہے لیکن یہ انحراف محض بیانیاتی نہیں بلکہ داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پہ نظر آتا ہے۔ بعض مقامیتیں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے جتن میں مصروف ہیں اور بعض مقامی ثقافتیں معدوم ہو چکی ہیں۔ان کا محض بیان باقی ہے۔اس طرح کی مختلف صورتحال ناولوں میں دکھائی دیتی ہے۔خس و خاشاک زمانے میں ناول نگار نے ایک معدوم ہوتی ہوئی تہذیب کو پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ گراں میں پوٹھوہار کی ثقافت معدوم ہونے کے قریب ہے۔نیلی بار میں بھی یہی صورتحال دکھائی دیتی ہے

جبکہ ہزارہ کی مقامیت ابھی بھی حوصلہ افزا دکھائی دیتی ہے کہ وہاں کی مقامی زندگی میں ابھی بھی مقامی ثقافتی رنگ نمایاں ہے۔

سیاسی بیانیوں کی بات کی جائے تو بہاولپور کی مقامیت کو ناول نگار نےادھ ادھورے لوگ میں بہت بہتر انداز میں بیان کیا ہے۔ بہاولپور کی مقامیت کی سیاسی اثرات سے متاثرہ زندگی دکھائی دیتی ہے۔ ناول کی بنیاد ہی سیاسی واقع کی وجہ سے ہے۔انواسی میں بھی اس کا شعور ملتا ہے کہ سیاسی معاملات چاہے وہ مقامی سطح کے ہوں یا نوآبادیاتی زمانے کے مقامیت کو کس طرح سے متاثر کرتے ہیں یہی صورتحال ہمیںجاگے ہیں خواب میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

مجموعی طور پر ناول نگار ہوں کہ ہاں مقامیت کے عناصر کے ساتھ ان مقامی ثقافتوں کی بہترین انداز میں وضاحت نظر آتی ہے اور ناول میں مطلوبہ عناصر کو دیکھا جاسکتا ہے ثقافت کا محض بیان ہی نہیں بلکہ اپنی مقامی کرداروں کے ذریعے سے تمام عناصر دکھائی دیتے ہیں۔

مجموعی طور پر ناول نگار ہوں کہ ہاں مقامیت کے عناصر کے ساتھ ان مقامی ثقافتوں کی بہترین انداز میں وضاحت نظر آتی ہے۔ ناول میں مطلوبہ عناصر کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ثقافت کا محض بیان ہی نہیں بلکہ اپنی مقامی کرداروں کے ذریعے سے تمام عناصر دکھائی دیتے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ اختر رضا سلیمی۔ جاگے ہیں خواب میں (راولپنڈی: رومیل پبلشرز، نومبر2022ء)ص42

2۔ اختر رضا سلیمی۔جاگے ہیں خواب میں(2022ء)ص60

3۔ ایضاً، ص60

4۔ ایضاً۔، ص60

5۔ ایضاً، ص116

6۔ ایضاً، ص18

7۔ خالد محمود سمٹیا۔ اختر رضا سلیمی کے ناول ما بعدنو آبادیاتی مطالعہ(راولپنڈی: رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، 2020ء)ص49

8۔ رضا سلیمی۔ جندر (راولپنڈی: رومیل پبلشرز، فروری2020ء)ص19

9۔ اختر رضا سلیمی۔ جندر۔2020ء۔ص97

10۔ ایضاً۔ص101

11۔ محمد حفیظ خان۔ادھ ادھورے لوگ(جہلم: بک کارنر شوروم، اشاعت دوم2019ء)ص63

12۔ محمد حفیظ خان۔ انواسی ۔(جہلم: بک کارنر شوروم، اشاعت دوم دسمبر، 2019ء)ص16

13۔ محمد حفیظ خان۔ انواسی، 2019ء، ص14

14۔ ایضاً ۔ص17

15۔ ایضاً۔ص111، 112

16۔ ایضاً، ص139، 140

17۔ ایضاً ۔ص143

18۔ ایضاً۔ص52، 51

19۔ ایضاً، ص۔213

20۔ محمد طارق انصاری۔ حفیظ خان کے اردو ناول نواسی میں مقامیت کی تشکیل اور پیشکش ؛مشمولہ متن۔ جلد تین شمارہ دو جولائی تا دسمبر2022ء شعبہ اردو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور۔ ص، 121

21۔ **طاہرہ اقبال**۔ نیلی بار (**اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، اشاعتِ دوم 2020ء) ص 510**

22۔ **ایضاً۔ ص** 316

23۔ **ایضاً۔ ص** 318

24۔ **ساجدہ سلطانہ**۔طاہرہ اقبال کے ناول نیلی بارگاہ فکری وفنی جائزہ۔(**اسلام آباد: مقالہ برائے ایم فل اردو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز 2019ء) ص 75**

25۔ **طاہرہ اقبال**۔ گراں (**اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 2019ء) ص 58**

26۔ **طاہرہ اقبال**، گراں۔ **2019ء، ص 42**

27۔ **طاہر نواز**۔شہر مرگ (**راولپنڈی: اوزونک پبلشرز، 2020ء) ص 53، 54**

28۔ **محمد عاصم بٹ**۔ دائرہ (**لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2014ء) ص 10**

29۔ **محمد عاصم بٹ**۔ دائرہ (**لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2014ء) ص 154**

30۔ **محمد عاصم بٹ**۔دائرہ ۔**2014ء۔ ص 135**

31۔ **ایضاً۔ ص** 239

32۔ **ایضاً۔ ص** 102

33۔ **محمد عاصم بٹ**۔ بھید (**لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔2018ء) ص 33**

34۔ **محمد عاصم بٹ**۔ بھید۔**2018ء۔ ص 124**

35۔ **ایضاً۔ ص** 21

36۔ **علی اکبر ناطق**۔نو لکھی کوٹھی۔(**جہلم: بک کارنر شوروم۔اشاعت ہفتم 2021ء) ص 14**

37۔ **علی اکبر ناطق**،۔ نو لکھی کوٹھی ۔**2021ء۔ ص 24**

38۔ **ایضاً۔ ص** 131

39۔ **مرزا اطہر بیگ**۔غلام باغ۔**لاہور: الحمد پبلی کیشنز۔اشاعت ہفتم۔2021ء۔ ص 74**

40۔ **مرزا اطہر بیگ**۔ غلام باغ۔**2021ء۔ ص 180**

41۔ **اقبال آفاقی۔غلام باغ روایت سے ہٹا ہوا ناول۔ مشمولہ**:اردو ناول نئی توجیہات و تعبیرات اقبال (**راولپنڈی: صریر پبلشرز) 2020 ص 193**

42۔ **ڈاکٹر سفیر حیدر**۔غلام باغ مرکزی کرداروں کے داخلی بحران۔ **مشمولہ**: تحقیق نامہ (**لاہور: 2015 شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی 16 جنوری 2015ء) ص 153**

43۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خا شاک زمانے (لاہور: سنگ میل پبلشرز 2017ء) ص160

44۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خا شاک زمانے ۔2017ء، ص68

45۔ ایضاً، ص222

46۔ ایضاً، ص522

47۔ ڈاکٹر سجاد نسیم۔ شائلہ رزاق۔ محمد اویس۔ خس وخاشاک زمانے میں کرداری مطالعہ۔ مشمولہ: حرف و سخن ۔ جلد پانچ شمارہ 202130ء۔ ص355

48۔ مستنصر حسین تارڑ۔ شہر خالی کوچہ خالی (لاہور: سنگ میل پبلشرز۔2020ء) ص13

49۔ مستنصر حسین تارڑ۔شہر خا لی کو چہ خالی ۔2020ء۔ ص138

50۔ نون مشمولہ۔ماخذ۔ ص93

51۔ خالد محمود سانٹیہ۔ اختر رضا سلیمی کے ناول : ما بعد نو آبادیاتی مطالعہ (راولپنڈی: رومیل ہاوس آف پبلی کیشنز نومبر 2020ء) ص43

52۔ اختر رضا سلیمی۔جاگے ہیں خواب میں۔2022ء، ص59

53۔ ایضاً، ص89

54۔ ایضاً، ص95،96

55۔ اقبال آفاقی۔ اردو ناول نئی تو جیہات و تعبیرات۔2020ء۔ ص216

56۔ اختر رضا سلیمی۔ جاگے ہیں خواب میں۔2015ء، ص209،210

57۔ ایضاً، ص229

58۔ خالد محمود سانٹیہ۔ اختر رضا سلیمی کے ناول : ما بعد نو آبادیاتی مطالعہ۔2020ء۔ ص49

59۔ اختر رضا سلیمی۔ جندر۔2018ء۔ ص47

60۔ مشرف عالم ذوقی۔1980ء کے بعد اردو ناول نئے موضوعات۔ مشمولہ: اکا دمی ادبیات خصوصی ناول نمبر (اسلام آباد: جولائی تا دسمبر جلد اول۔2020ء) ص57

61۔ اختر رضا سلیمی۔ جندر۔2018ء۔ ص27

62۔ ڈاکٹر شاہد نواز۔اکیسویں صدی کے اردو ناول میں مقامیت کی دل آویز تشکیل ۔مشمولہ :اکا دمی ادبیات خصوصی ناول نمبر (اسلام آباد: جولائی تا دسمبر جلد دوم۔2020ء) ص114

63۔ اختر رضا سلیمی۔ جندر۔2018ء۔ ص65

64۔ ایضاً۔ ص101

65۔ ڈاکٹر شاہد نواز۔ اکیسویں صدی کے اردو ناول میں مقامیت کی دل آویز تشکیل ۔ص۔114

66۔ اختر رضا سلیمی۔ جندر ۔2018ء۔ ص102،103

67۔ ایضاً، ص41

68۔ ایضاً۔ ص114

69۔ ڈاکٹر شاہد نواز۔ اکیسویں صدی کے اردو ناول میں مقامیت کی دل آویز تشکیل ۔ص114،115

70۔ ایضاً۔ ص113

71۔ اختر رضا سلیمی۔ جندر ۔2018ء۔ ص108

72۔ محمد حفیظ خان۔ادھ ادھورے لوگ(جہلم: بک کارنر شوروم،اشاعت دوم2019ء)ص46

73۔ ایضاً۔ ص99

74۔ ایضاً۔ ص89

75۔ ایضاً۔ ص74

76۔ ایضاً۔ ص75

77۔ ایضاً۔ ص218

78۔ کومل شہزادی۔ بازگشت(تحقیقی و تنقیدی مضامین)(اسلام آباد:ادب، سماج،انسانیت پبلی کیشنز،2023ء)ص42

79۔ محمد وسیم شاہد۔ ناول ادھ ادھورے لوگ۔وقت ملاحظہ:13دسمبر2023 humsab.com.pk/

80۔ منیر فیاض۔عالمی افسانوی بیانیے کا اجمالی ارتقا اور انواسی: مشمولہ:اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ۔(اسلام آباد: ناول نمبر جنوری تا جون سہ ماہی ادبیات جلد دوم۔2020ء)ص355

81۔ محمد حفیظ خان ۔ انواسی ۔(جہلم: بک کارنر شوروم،اشاعت دوم2019ء)ص25

82۔ منیر فیاض۔عالمی افسانوی بیانیے کا اجمالی ارتقا اور انواسی۔2020ء، ص356

83۔ محمد حفیظ خان۔ انواسی ۔2019ء۔ ص62

84۔ محمد طارق انصاری۔ حفیظ خان کے اردو ناول میں مقامیت کی تشکیل اور پیشکش۔ مشمولہ؛ متن(بہاولپور: جلد تین شمارہ دو شعبہ اردو اسلامیہ یونیورسٹی جولائی تا دسمبر2022ء)ص121

85۔ محمد حفیظ خان۔ انواسی ۔ص64

86۔ منیر فیاض۔عالمی افسانوی بیانیے کا اجمالی ارتقا اور انواسی: 2020ء،ص354،355

87۔ محمد حفیظ خان۔ انواسی (جہلم: بک کارنر شوروم،اشاعت دوم2019ء)ص227

88۔ ایضاً۔ص329

89۔ محمد ہارون عثمانی۔ طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار۔وقت ملاحظہ: سات نومبر2023ء

Www.humsub.com.pk / 271142 /dr.haroon.usmani

90۔ طاہرہ اقبال۔نیلی بار (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز۔اشاعت دوم2020ء)ص13

91۔ ایضاً۔ص78

92۔ ایضاً۔ص95

93۔ ایضاً۔ص240

94۔ ساجدہ سلطانہ۔نیلی بار کا فکری وفنی جائزہ۔مقالہ ایم فل اردو(اسلام آباد؛ نیشنل یونیورسٹی اف ماڈرن لینگویجز2019ء)ص84

95۔ طاہرہ اقبال۔نیلی بار ۔2020ء۔ص291

96۔ ایضاً۔ص310

97۔ ایضاً۔ص518

98۔ نازیہ پروین۔طاہرہ اقبال۔مشمولہ:تحقیق نامہ(لاہور: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی شمارہ29جولائی تادسمبر 2021ء)ص158

99۔ طاہرہ اقبال۔ گراں(اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز۔2019ء)ص24،23

100۔ ایضاً۔ص51،50

101۔ ایضاً۔ص42

102۔ ایضاً۔ص51

103۔ نازیہ پروین۔طاہرہ اقبال۔مشمولہ:تحقیق نامہ ۔2021ء ص158

104۔ طاہرہ اقبال۔ گراں۔2019ء۔ص85

105۔ عبدالعزیز ملک۔گراں پٹھواری تہذیب کی شکست اور ایک کا نوحہ۔وقت ملاحظہ سات نومبر2023ء

Hamariweb.com / articles / 136648

106۔ جواد حسین بشیر۔مہنامہ افکار افق شہر مرگ۔نومبر2020ء

107۔ طاہر نواز۔ شہر مر گ۔(راولپنڈی:ازونک پرنٹرا اینڈ پبلشرز۔2020ء)ص45

108۔ ایضاً۔ص46

109۔ فرید حسینی۔روزنامہ افق۔ مضمون ناول شہر مرگ نوابدیات سے مابعد نوآبادیات تک(اسلام آباد سوموار نومبر2020ء)

110۔ طاہر نواز۔شہر مر گ (راولپنڈی:ازونک پرنٹرا اینڈ پبلشرز۔2020ء)ص23

111۔ ڈاکٹر کامران عباس کاظمی۔ اردو ناو ل میں عصر یت(لاہور:الوقار پبلشرز۔2023ء)ص551

112۔ روبینہ سلطان۔اردو کے تین نئے ناول نگار (لاہور:دستاویز۔2012ء)ص214،213

113۔ محمد عاصم بٹ۔ دائر ہ ۔2014ءص38

114۔ ایضاً۔ص17

115۔ یاسر جواد۔لاہور کی عظمتوں کی کہانی گناہوں کی داستان(لاہور:ارائے پرنٹرز2016ء)ص72

116۔ ڈاکٹر کامران عباس کاظمی۔ اردو ناو ل میں عصر یت(لاہور:الوقار پبلشرز۔2023ء)ص552

117۔ عرفان احمد عرفی۔عاصم بٹ کے دو ناول و نہ تمام اور بھید بارے کچھ تاثرات(اسلام آباد:ادبیات جلد اول 2020ء)ص84

118۔ مبین مرزا۔ اکیسویں صدی کے دو عشروں میں اردو ناول پہ اجمالی نظر(اسلام آباد:سہ ماہی ادبیات؛ناول نمبر جلد اول،2020ء)ص75

119۔ محمد عاصم بٹ۔ بھید(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز۔2018ء)ص111

120۔ ایضاً۔ص188،187

121۔ ایضاً۔ص52

122۔ ایضاً۔ص96

123۔ مبین مرزا۔ اکیسویں صدی کے دو عشروں میں اردو ناول پہ اجمالی نظر۔ص75

124۔ محمد عاصم بٹ۔ بھید(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز2018ء)ص196

125۔ صباحت عروج،علی اکبر ناطق کی ادبی جہات۔مقالہ برائے ایم۔فل(لاہور:منہاج یونیورسٹی، 2019ء)ص3

126۔ علی اکبر ناطق۔نو لکھی کوٹھی۔2020ء،ص133

127۔ راشدہ۔نازیہ راحت۔نولکھی کوٹھی تحقیقی وتنقیدی جائزہ۔ مشمولہ:متن(بہاولپور:اسلامیہ یونیورسٹی،جلد 3،شمارہ2023،20ء)ص۔۔

128۔ علی اکبر ناطق۔نو لکھی کو ٹھی۔2020ء،ص12

129۔ ایضاً۔ص67

130۔ ایضاً۔ص185

131۔ عروج صباحت،علی اکبر ناطق کی ادبی جہات۔2019ء۔ص112

132۔ علی اکبر ناطق۔نو لکھی کو ٹھی ۔ص260،261

133۔ راشدہ۔نازیہ راحت۔ نو لکھی کوٹھی تحقیقی و تنقیدی جا ئزہ۔ مشمولہ: متن (بہاولپور:اسلامیہ یونیورسٹی،جلد،شمارہ2023،20ء)ص76

134۔ علی اکبر ناطق - نولکھی کوٹھی۔ص198

135۔ شاہد نواز- پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ۔ص308

136۔ مرزااطہر بیگ۔غلام باغ(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،اشاعت ہفتم،2021ء)ناول فلیپ

137۔ مرزااطہر بیگ۔ غلام باغ(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،اشاعت ہفتم،2021ء)ص65

138۔ مرزااطہر بیگ۔غلام باغ۔ 2021ء۔ص88،87

139۔ ایضاً۔ص169

140۔ اقبال آفاقی۔اردو ناول توجیہات و تعبیرات۔2020ء۔ص191

141۔ مرزااطہر بیگ۔ غلام باغ۔ص،747746

142۔ رانی صابر علی،روبینہ ترین،ڈاکٹر۔اکیسویں صدی کا سماجی سیاسی سماجی منظر نامہ اور خس وخاشاک زمانے میں اس کا اظہار(ملتان:جنرل آف ریسرچ اردو بہاؤدین زکریایونیورسٹی جون۔2014ء)ص24

143۔ طاہر نواز۔اکیسویں صدی کے اردو میں مقامیت کی دل آویز تشکیل۔سہ ماہی ادبیات ناول نمبر2020ء۔ ص111

144۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خا شاک زمانے (لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز۔2014ء)ص73

145۔ ایضاً۔ص139

146۔ ایضاً۔ص146

147۔ ایضاً۔ص140،139

148۔ ایضاً۔ص162

149۔ ایضاً۔ص215

150۔ ایضاً۔ص306

151۔ رانی صابر علی،روبینہ ترین،ڈاکٹر- اکیسویں صدی کا سماجی سیاسی سماجی منظر نامہ اور خس و خاشاک زمانے میں اس کا اظہار۔2014ء ص240

152۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خا شاک زمانے(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔2014ء)ص522

153۔ ایضاً۔ص476

154۔ شاہد نواز۔اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں مقامیت کے دل آویز تشکیل۔اسلام آباد: ص111

155۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خا شاک زمانے ۔2014ء۔ص73

156۔ ڈاکٹر کامران عباس کاظمی۔ اردو ناو ل میں عصر یت۔لاہور: الو قار پبلشرز۔2023ء۔ص562

157۔ فرید حسینی۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناول خس وخاشاک زمانے "کا تہذیبی مطالعہ۔ مشمولہ: سہ ماہی ادبیات خصوصی ناول نمبر جلد دوم (اسلام آباد: جولائی تا جون 2022ء)ص250

158۔ مستنصر حسین تارڑ- "شہر خالی ،کوچہ خالی"(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،2020ء)ص75،74

159۔ ایضاً۔ص89

160۔ اختر رضا سلیمی۔جاگے ہیں خواب میں۔2022ء،ص74

161۔ ایضاً۔ص74

162۔ اختر رضا سلیمی- جندر۔2020ء۔ص32

163۔ محمد حفیظ خان۔ادھ ادھورے لوگ۔2019ء۔ص169

164۔ ایضاً۔ص166

165۔ صوبہ جنوبی پنجاب اور ایک ناول مسعود اشعر۔وقت ملاحظہ: 10 دسمبر 2023

Jang.com.pk/news/598131.masood.ashir.column.15.1.2019

166۔ محمد حفیظ خان۔انو اسی ۔2019ء۔ص69

167۔ ایضاً۔ص319

168۔ عبدالسلام۔اردو ناول بیسویں صدی میں (کراچی: اردو اکیڈمی۔1973ء)ص170

169۔ عقیل حیدر۔ انواسی کی کھوج میں (ملتان: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ ملتان، 2022ء) ص133

170۔ طاہرہ اقبال۔ نیلی بار ۔2020ء۔ص87

171۔ ایضاً۔ص127،126

172۔ ایضاً۔ص127

173۔ ایضاً ۔ص312

174۔ مبارک علی۔ پاکستانی معاشرہ (لاہور: فکشن ہاؤس، 2020ء) ص78،77

175۔ طاہرہ اقبال۔ نیلی بار ۔2020ء۔ص99

176۔ محمد عاصم بٹ۔ دائرہ ۔2014ء ص52

177۔ ایضاً۔ص141

178۔ نواز شاہد۔ پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ 1947ءتا 2007ء (فیصل آباد: مثال پبلشرز 2018ء) ص 288

179۔ محمد عاصم بٹ۔دائرہ ۔2014ء ص194

180۔ محمد عاصم بٹ۔ بھید۔2018ء۔ص93

181۔ مبارک علی، ڈاکٹر۔ پاکستانی معاشرہ۔2020ء۔ص55

182۔ علی اکبر ناطق- نولکھی کوٹھی۔ص147

183۔ ایضاً۔263،262

184۔ مرزا اطہر بیگ۔غلام باغ- 2021ء۔ص790

185۔ آفاقی اقبال۔اردو ناول نئی تو جیہات و تعبیرات۔2020ء۔ص192

186۔ مستنصر حسین تارڑ ۔خس و خاشاک زمانے 2014ء۔ص268

187۔ ایضاً۔ص269

باب: چہارم

اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں تاریخی پہلو

4.1 مقامیت پہ علاقائی تاریخ کے اثرات

برصغیر ایک وسیع و عریض خطہ ہے۔تاریخی اعتبار سے یہ خطہ مختلف ادوار میں تغیر پذیر ہوا ہے۔دنیا کی قدیم تہذیبوں پہ نگاہ دوڑائی جائے تو ہندوستانی تہذیب کے خدوخال بھی خاصے پرانے معلوم ہوتے ہیں۔دنیا کی دستیاب تاریخ اگرچہ اس قدر زیادہ وسیع اور قدامت کا احاطہ نہیں کرتی ،اس کے باوجود دستیاب تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو ہندوستان کی قدامت کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔بیسویں صدی میں موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے اثرات بالترتیب سندھ اور پنجاب میں دریافت ہوئے۔ماہرینِ آثارِ قدیمہ اور تاریخ دانوں کی دلچسپی کا مرکز بنے۔ان کا مشاہدہ اور تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ تقریباً4500سال پرانے آثار ہیں۔اس زمانے میں بھی ان آثار سے ایک ترقی یافتہ شہری زندگی کے اثرات ملتے ہیں جو جدید دور کے کئی تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔پختہ گلیاں، زرعی آلات سمیت کئی ایسی چیزیں دریافت ہوئیں جو ان کی مہارت اور ان کی تمدنی زندگی کا احاطہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔برصغیر کے یہ دونوں علاقے اپنے عہد کے ترقی یافتہ شہر تھے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگ کس قدر ذہین، یہاں کی ثقافت و تہذیب کس قدر ترقی یافتہ تھی۔نکاسی آب کا انتظام،700 کے قریب دریافت شدہ کنویں، غلہ محفوظ کرنے کی پختہ جگہیں یہ سب ان کی تہذیب کی نشانیاں ہیں۔ان علاقوں کی دریافت سے برصغیر میں قدیم اور ترقی یافتہ تہذیبوں کی موجودگی کی تصدیق ہوتی ہے۔جو اپنے عہد میں مثالی حیثیت کے حامل ہیں۔وادی سندھ کی تہذیب کو قدیم تہذیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔جہاں مصری، ایرانی تہذیب اور یونانی تہذیب اپنے دور کی مثالی تہذیبیں تھیں وہیں وادی سندھ کی تہذیب بھی خاصی وسیع اور ترقی یافتہ حالت میں موجود تھی۔

برصغیر کی تاریخ میں اہم دور دراوڑی دور ہے۔دراوڑ ہی اس خطے کے اصل باشندے اور اس تہذیب کے نمائندے کے طور پہ جانے جاتے ہیں۔یہ لوگ محنتی اور جفاکش لوگ تھے۔یہ لوگ پست قد اور سیاہ رنگت کے حامل تھے۔یہ بحری راستوں کا استعمال خوب جانتے تھے۔کچھ تاریخ دانوں کے مطابق یہ بھی برصغیر کے اصل باشندے نہیں تاہم دستیاب تاریخ کے مطابق شواہد کی اکثریت سے ان کو ہی برصغیر کا قدیم باشندہ قرار دیا جاتا ہے۔جنگ و جدل کے حوالے سے ان میں زیادہ شدت پسندی نہیں ملتی۔ان کے ہاں بہت سی ترقی یافتہ زبانیں بھی موجود تھیں جن کی باقیات ابھی بھی کئی نسلوں، زبانوں کی صورت میں موجود ہیں۔ان کی زبانوں میں تامل زبان آج بھی خاصی ترقی یافتہ زبان کی صورت میں موجود ہے۔یہ لوگ زمین سے فصلیں اگانے کا راز جانتے تھے۔زیادہ تر لوگوں کا پیشہ بھی غلہ بانی اور کھیتی

باڑی تھا۔ یہ لوگ دھاتوں کے استعمال سے بھی واقف تھے۔ یہ لوگ دھاتوں کو مختلف اوزاروں کی صورت میں ڈھالنے کا فن جانتے تھے۔ یہ لوگ دیہاتوں کی صورت میں رہتے تھے جس کا سر براہ ایک راجہ ہوتا تھا۔ دیہات کی زندگی کو ان لوگوں نے منظم کیا۔ سربراہ راجہ کو وہ اپنی کمائی یا فصل میں سے مخصوص حصہ بھی دیتے تھے۔ دراوڑ لوگوں کے مذہب کی بات کی جائے تو یہ دیوتاؤں کے قائل تھے۔ اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے اپنے عقیدے کے مطابق وہ جانوروں کی قربانیاں کرتے کہ اس سے دیوتا خوش ہوتے ہیں۔ بعد ازاں آریائی نسل کے آنے کے بعد انہوں نے بھی کئی مذہبی تصورات ان لوگوں سے لیے اور اپنے مذہب اور عقائد کا حصہ بنالیا۔ ان لوگوں کو بعد ازاں نسلی تضادات کا بھی سامنا کرنا پڑا کیونکہ آریاؤں کے مقابلے میں ان کی رنگت اور خدوخال مختلف تھے۔ گرم علاقوں میں رہنے کے باعث ان کی رنگت سیاہ ہو گئی تھی۔ تجارت کے قواعد اور رموز سے بھی یہ لوگ واقف تھے۔ ان کو بحری راستوں کے استعمال کا بھی بخوبی علم تھا۔ اس طرح یہ لوگ اپنے علاقے کی لکڑی، اوون اور اناج وغیرہ دوسرے علاقوں میں بھیجتے تھے۔ یہ لوگ امن پسند لوگ تھے ان کے ہاں جنگی ہتھیاروں ساز وسامان کی اس قدر فراوانی نہ تھی۔ اس کی ایک وجہ دور دراز اس خطے میں کسی بیرونی عملہ آور کے خطرے کا نہ ہونا تھا۔ اس عہد میں برصغیر دوسری اقوام کے لیے ایک دور دراز خطے کے تصور اور مشرقی ایشیاء کی ریاستوں کے لیے گرم علاقے کی حیثیت رکھتا تھا جس کے جغرافیائی حالات شاید ان کے لیے سازگار نہ تھے۔ مصر، ایران کی تہذیبوں کے دور میں یہ تہذیب بھی ترقی یافتہ تھی۔ یہاں کے جغرافیائی حالات اور قدرتی وسائل سے یہ لوگ مالا مال تھے۔ دراوڑوں کے اس عہد میں کئی ترقی یافتہ بڑے شہر موجود تھے۔ راجاؤں کا نظام رائج تھا دیہاتوں سے شہروں تک مختلف حیثیت اور مراتب کے لحاظ سے راجہ ہوتے تھے۔ جن کی اطاعت اور فرمانبرداری اور ان کے حکم کو حتمی خیال کیا جاتا تھا۔ اس کی اطاعت لازم تھی۔

قدیم ہندوستان کی تہذیبوں میں وادی سندھ کی تہذیب اور دراوڑی تہذیب قابل ذکر ہیں۔ یہ تہذیب اپنے عہد کی دوسری ترقی یافتہ تہذیبوں کے ہم پلا تھی۔ دراوڑی تہذیب کے ترقی یافتہ پہلوؤں کی بات کی جائے تو اس عہد کی بڑی تہذیبیں بھی بعض مقامات پہ ایسے ہنر سے ناواقف تھیں جن سے دراوڑی آشنا تھے۔ یوں ہندوستان کی تاریخ پہ لکھنے والی ایسے افراد کی نفی ہو جاتی ہے جو اس علاقے کو فرسودہ، غیر مہذب اور جاہل تصور کرتے تھے۔ جن کے خیال میں آریاؤں سے قبل کا ہندوستان پتھر کے زمانے کا تھا۔ آریاؤں نے اس علاقے کو فتح ضرور کیا۔ ان کے اثرات مقامیت نے قبول کیے۔ اس کے باوجود دراوڑی تہذیب کا ارتقاء بھی جاری وساری رہا۔ وہ اس تہذیب کو مٹا نہ سکے۔ دونوں کے اختلاط سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

آریائی عہد:

برصغیر کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ یا موڑ آریائی قوم کی آمد کا ہے۔اس قوم کا تعلق محققین کی مختلف آراء کے مطابق وسط ایشیا کے علاقے سے ہے۔اس قوم کا اصل وطن اسی جانب ہے۔ یہ قوم خاصی بڑی تعداد میں آباد تھی۔ خشک پہاڑوں، جغرافیائی سخت موسمی حالات کا مقابلہ کرتے کرتے ایران اور بعد ازاں ہندوستان کے علاقوں کا رخ کیا اور پنجاب تک پہنچ گئے۔ مختلف محققین کے مطابق ان کے آبائی وطن کے بارے میں بھی مختلف آراء موجود ہیں۔ کچھ کے خیال میں ایشیائے کوچک سے ترکی اور افغانستان کے علاقوں سے ایران اور کچھ کے خیال میں براہ راست ایشائے کوچک سے ترکی اور افغانستان کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے۔تاہم یہ بات طے ہے کہ یہ لوگ کچھ ایران اور بعد ازاں اسی جانب سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ان کی نقل مکانی کی وجہ ان کے آبائی علاقوں میں سرد موسم کی مشکلات اور وسائل کی کمی تھی۔ یہ لوگ اپنے مویشیوں کی چراگاہوں اور وسائل کی تلاش میں اپنے آبائی علاقہ کو خیر آباد کہتے ہیں۔ان کے اصل وطن کے حوالے سے ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں:

"تقریباً سب جدید محققین لسانیات اس چیز پر متفق ہیں کہ آریاؤں کے وطن کی تلاش وسطی ایشیا کے علاقوں میں کرنا پڑے گا۔"(1)

تقریباً 2500 قبل مسیح آریائی ایران میں آباد ہوئے اور بعد ازاں ہندوستان میں داخل ہوئے۔ جہاں دراوڑوں کے ساتھ ان کی لڑائی ہوئی۔ آبائی آریائی خاصے جنگجو لوگ تھے۔ مقامی آبادی دراوڑوں پر مشتمل تھی۔ دراوڑی زراعت اور تجارت سے منسلک تھے یہ لوگ جنگی اعتبارے مضبوط نہ تھے نہ ہی اس سے قبل ان کا واسطہ کسی ایسی قوم سے پڑا تھا۔ اس کے باوجود داروڑوں نے ان کے ساتھ بھرپور مقابلہ کیا؛ اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی مگر آریائی ان سے زیادہ طاقتور اور مضبوط تھے۔ وہ ان لوگوں پہ فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ آریاؤں نے ان کے وسائل پہ قبضہ کرلیا۔ رنگ ونسل کے اعتبار سے ان کو کمتر خیال کیا۔ دراوڑی ان کے زیر اثر آگئے۔ آریاؤں نے ان کو بے دخل کرکے ان کو جنوبی ہند کے علاقوں میں دھکیل دیا۔ یہ علاقے دور دراز پہاڑی علاقے تھے۔ ان سب کے باوجود قابل غور بات یہ ہے کہ اب آریاؤں کے قبضے کے باوجود بھی دراوڑی تہذیب کا ارتقاء جاری رہا۔ یہ ہند آریائی تہذیب کے آغاز کا دور تھا۔ دراوڑی تہذیب نے آریائی تہذیب کے اثرات قبول کیے۔ اسی طرح آریائی تہذیب نے بھی ان کے اثرات قبول کیے۔ یوں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ایک ایسی تہذیب کا آغاز جہاں دونوں کی کچھ مشترک قدریں بھی رائج ہوتی ہیں۔ آریائی قوم نے اس برعظیم میں ایک نئی تہذیب کا آغاز کیا۔ دراوڑی تہذیب کا ارتقاء جاری رہا آج بھی اس نسل کے لاکھوں افراد جنوبی ہند کے علاقے میں موجود ہیں۔

"پنجاب سے آریا لوگ وادی گنگا کی طرف بڑھے بظاہر ترقی کی رفتار سستی اور انہیں ملک پر قبضہ کرنے میں بہت عرصہ لگا جن لوگوں نے مزاحمت کی ان کو آریاؤں نے تباہ و برباد کردیا۔ جن لوگوں نے اطاعت قبول کرلی انہیں

سوسائٹی کے ادنٰی ترین درجہ میں داخل کر لیا لیکن دولت اور ثروت نے خود ان کے اپنے کریکٹر اور تہذیب میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی ان کا مذہب زیادہ تر رسومات کا مجموعہ بن گیا اور پجاریوں اور برہمنوں نے اقتدار پکڑنا شروع کیا ابتداء زمانہ کے قبائل کی سیدھی سادی زندگی قصہ ماضی بن گئی۔"(2)

آریائی ہندوستان کے وسیع و عریض حصے پر قابض ہو گئے۔ یہاں کی مقامی دراوڑی قوم کو ایک طرف دھکیل دیا لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بعد ازاں جب ان کے قبیلے بڑھے تو ان کی بھی اپنی روایتی حیثیت برقرار نہ رہی۔ یہ لوگ اپنے مذہب کلچر میں اس قدر پختہ نہ رہے۔ انہوں نے مقامی رسومات تہذیب کو اپنے اندر جذب کیا۔ بہت سی مقامی رسومات ان کے مذہب تک میں شامل ہو گئیں۔ ہند آریائی تہذیب ہندوستان کی تہذیب اور تاریخ میں ایک اہم موثر ثابت ہوا اس کے اثرات اور اختلاط سے ہندوستان کی تہذیب کا ارتقاء کئی مراحل سے گزرا۔

سکندر اعظم کا حملہ:

آریاؤں کے ہندوستان میں حملے اور سکونت کے بعد 327 قبل مسیح میں یونان کے نوجوان بادشاہ سکندر نے مصر، ایشیائے کوچک، ایران اور افغانستان کو فتح کرنے کے بعد ہندوستان کے وسیع خطے کا رخ کیا۔ ہندوستان میں اس وقت کئی حکومتیں حکومت کر رہی تھیں ملک مختلف ریاستوں میں منقسم تھا۔ پنجاب جیسا بڑا علاقہ ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا آپس کے لڑائی جھگڑوں میں مصروف تھا۔ سکندر یونانی نے داراسوم کو شکست دے کر ایران کی بڑی سلطنت کو تسخیر کر لیا۔ افغانستان کے بہادر لوگوں نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر وہ زیادہ دیر اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ جو ماہر اور کثیر فوج کے ہمراہ حملہ آور ہوا تھا۔ ٹیکسلا کے راجہ نے وسطی پنجاب کے راجہ پورس کی مخالفت اور اسے قابو کرنے کے لیے سکندر اعظم کی نہ صرف اطاعت قبول کی بلکہ اس کا خیر مقدم اور بھرپور خاطر داری کی۔ یوں سکندر کو یہاں کی حمایت حاصل ہو گا۔ جن علاقوں کی فوج، اقوام اور قبائل نے اس کی اطاعت قبول نہ کی ان میں سوات اور ملاکنڈ کے موجودہ علاقے شامل ہیں۔ انہوں نے دلیری سے اس کا مقابلہ کیا مگر یہاں بھی فاتح سکندر ہی رہا۔ ٹیکسلا کے راجہ کی اطاعت کے بعد اسے مزید کسی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ دریائے جہلم کے کنارے راجہ پورس سے جنگ کے لیے آ پہنچا۔ دریائے جہلم میں پانی کے بہاؤ کی زیادتی کی وجہ سے دریا عبور کرنا مشکل تھا اور وہ دوسری جانب پورس اپنی فوج سمیت سکندر کا منتظر تھا۔ پورس ایک بہادر اور محب وطن بادشاہ تھا۔ اس کا اہم ہتھیار لشکر میں موجود ہاتھی تھے۔ یونانی فوج کے لیے دریا عبور کرنا اور ہاتھیوں کی فوج سے مقابلہ کرنا ایک نیا تجربہ تھا۔ تاہم وہ 16 میل دور سے دریا عبور کر کے اس کی فوج کے مد مقابل جا کھڑا ہوا۔ سیلاب اور بارش کی وجہ سے زمین میں کیچڑ سے پورس کی فوج میں موجود ہاتھی پھسلنے لگے اور بالآخر بدحواس ہو کر بھاگنے لگے۔ اس طرح اس کی اپنی فوج کا بہت بڑا نقصان ہوا۔ پورس شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ جنگی حکمت عملی، بہادری جیسے اوصاف سے متاثر ہو کر پورس کو سکندر نے اپنا نمائندہ مقرر کیا اور اس

کے مضافات میں اضافہ کر کے اسے واپس لوٹا دیا۔فوج کے انکار اور تھکاوٹ کی وجہ سے وہ مزید پیش قدمی نہ کرتے ہوئے کچھ عرصہ قیام کے بعد واپس لوٹ گیا۔راستے میں بابل شہر میں محض 33 سال کی عمر میں یہ کامیاب کمانڈر دنیا سے چل بسا۔اس کی موت کے بعد جہاں یونانی سلطنت مختلف حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ محض چند سالوں بعض روایات کے مطابق سات سالوں کے بعد یونانیوں کا ہندوستان سے قبضہ مکمل ختم ہوگیا۔

جب بھی کوئی فاتح کسی علاقے کو فتح کرتا ہے اپنے مذہب، ثقافت، زبان اور دوسرے عناصر کی ترویج کرتا ہے ۔سکندر کا حملہ محض بڑے مراکز تک محدود رہا۔اس کے علاوہ وہ یہاں اپنے نمائندے مقرر کر کے واپس چلتا بنا۔یعنی یونانیوں کا براہ راست مقامی زندگی کے خدوخال پہ زیادہ اثر نہ پڑا۔ چھوٹے علاقوں، ثقافتوں کو انہوں نے متاثر نہ کیا ایک کی مانند آکر محض اپنی تابعداری کا عہد لے کر چلتا بنا۔ ہندوستان کی مقامی تہذیب و ثقافت اس حملے سے زیادہ متاثر نہ ہوئی۔دوسرا اہم پہلو ہندوستان کے وسیع و عریض علاقے میں محض ایک طرف عملداری قائم کرنا بھی اپنی تہذیب کی آبیاری کرنے کے لیے نہ کافی تھا۔

ہندوستان میں مسلم تہذیب کا ارتقاء مختصر جائزہ :

ہندوستان کا وسیع خطہ جسے قدرت نے ہر طرح کی دولت سے مالامال کر رکھا ہے۔جب سے بیرونی دنیا میں اس کا بھید کھلا۔ یہ حملہ آوروں کے نشانے پر رہا، ہر کوئی ان وسائل پر قابض ہونے کی جستجو لیے ان پر حملہ آور ہوتا رہا ۔ان میں سے کچھ اقوام محض اس غرض سے آئیں اور کچھ نے مستقل اسے اپنا وطن بنالیا۔ جن قوموں نے اس کو مستقل اپنے وطن کی حیثیت دی وہ اس کے طول و عرض میں پھیل گئیں اور اس کی ثقافت، مذہب اور تہذیب پر اثرانداز ہوئیں اور کچھ اثرات اس مقامیت کے بھی قبول کیے۔ہندوستان کی تہذیب ان ارتقائی مراحل سے بارہا گزری۔آریاؤں کے بعد مستقل سکونت کے اعتبار سے مسلم تہذیب کا ارتقاء ہندوستان کا اہم تہذیبی موڑ ثابت ہوا۔ہندوستان کے اس خطے کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنایا۔اس طرح ہند اسلامی تہذیب کا آغاز ہوا مسلمانوں کی سینکڑوں سالہ حکومت کے بعد ان کے گہرے تہذیبی ثقافتی اور مذہبی اثرات اس مقامی تہذیب نے قبول کیے۔

مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں بدھ مت کا عروج رہا۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت اس کا زوال ہو چکا تھا۔بدمت کے پیروکار دور دراز بھاگ گئے یا ان کو مار دیا گیا۔اس صورت حال میں ان کی کثیر تعداد ہندو مت میں تبدیل ہوگئی۔ ہندھ مت کا عروج ہو گیا۔ چھٹی صدی عیسوی سے بارہویں صدی عیسوی تک راجپوت ریاستوں کا عروج رہا۔ہندوستان میں بیشتر راجپوت ریاستیں قائم تھیں مگر ان کی باہمی نااتفاقی اور ایک دوسرے پر برتری ثابت کرنے کی کشمکش بھی جاری رہی۔ یہ لوگ جنگ کے ماہر تھے ان کے بقول ان کی رگوں میں خالص آریائی نسل کے خون کی آمیزش تھی۔سیاسی حوالے سے ان کی بصیرت تنگ نظری کا شکار تھی۔آپس کی لڑائی جھگڑوں تک خود کو محدود کر لیا

تھا جبکہ باہر کے حالات سے ناواقف اور اصل وجہ ناکامی آپس میں اتفاق کی کمی تھی۔ کوئی باقاعدہ ایسا نظام یا سلسلہ نہ تھا جو ان راجپوت ریاستوں کو ایک پرچم تلے جمع کر سکے جبکہ اس کے مقابلے میں مسلمانوں میں اتفاق کی فراوانی تھی ۔مذہب کے نام پہ فدا ہونے والے ہزاروں جانثار تھے۔ایک جھنڈے تلے مختلف اقوام، قبائل، رنگ و نسل کے لوگ اسلام کے پرچم تلے جمع تھے۔یہی ان کی کامیابی کا راز اور راجپوتوں کی ناکامی کی بڑی وجہ بنی۔

سبکتگین کی صورت میں شمال کی طرف سے پہلا حملہ آور ہندوستان پہ حملہ کرتا ہے۔اس نے دو بار راجہ جے پال کو شکست دی۔اس کے بعد اس کا بیٹا محمود غزنوی تخت نشین ہوا۔جس کی نگاہ برصغیر پر مستقل جمی رہی۔اس نے یکے بعد دیگر 17 حملے کر کے ہندوستان کے علاقے فتح کر لیے ۔ محمود غزنوی نے ہندوستان کو فتح کر کے ہی دم لیا۔1012ء کے قریب پنجاب غزنوی سلطنت کا حصہ بنا۔ ہندوستان ایک نئے تاریخی دور سے گزرا۔ یہاں کا لسانی کلچر بھی تبدیل ہوا۔ غزنوی کی فوج میں ترک، عربی، فارسی بولنے والے سپاہیوں کی صورت میں ایک مضبوط فوج تھی۔ سکندر کی طرح افغان مسلمانوں نے ہندوستان پہ محض لشکر کشی نہیں بلکہ اس کو مستقل اپنی حکومت کا حصہ بنایا ۔فاتح قوم نے اپنے کلچر اور مذہب کی ترویج کے لیے غزنی سے علماء اور مشائخ کو بھی بلایا۔ سپاہیوں کی اکثریت بھی مختلف زبانوں کے بولنے والے اور مختلف ثقافتی نمائندے تھے۔پنجاب غزنوی حکومت کے بعد غوری حکومت کا مرکز بنا۔ ان حکومتوں نے محض پنجاب ہی نہیں شمالی ہند کے تمام علاقوں کو اپنی تہذیبوں سے بہت متاثر کیا۔ بڑے مراکز میں ہونے والی تبدیلیاں محض علاقوں یا ثقافتوں میں بہر حال کسی حد تک ضرور منتقل ہوئی۔اس امر نے برصغیر میں اسلامی تہذیب کا آغاز اور ہند اسلامی تہذیب کے ملاپ سے ایک مشترکہ تہذیب سامنے آتی ہے۔ 1193ء میں دلی غزنویوں کے عہد میں فتح ہوا۔ 1201ء میں قطب الدین ایبک نے اپنی حکومت بادشاہت کے ساتھ ہی دارالحکومت لاہور کے بجائے دلی میں منتقل کیا۔ برصغیر کا مرکز اور شمالی ہند کا علاقہ ان حکمرانوں کا دارالحکومت بنا۔ایک بڑے مرکز میں اکر انہوں نے نہ صرف اپنی ثقافت کی آبیاری کی بلکہ مفتوح علاقے اس کی اثرات سے متاثر ہونا شروع ہوا۔اس طرح مسلمانوں کی حکومت باقاعدہ طور پر ہندوستان پر قائم ہو گی۔ ثقافتی، تہذیبی اور لسانی سطح پر ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔اسلامی تہذیب سینکڑوں سال کے ارتقائی عمل سے پروان چڑھی جس کے اثرات آج بھی موجود ہیں۔ مسلمانوں نے سینکڑوں سال کی حکومت کے بعد نہ تو مکمل طور پر اپنی دھاک بٹھائی اور نہ ہی ہندوستان کے قدیم لوگوں نے اپنی تہذیب کو خیر آباد کہا۔ وہ تو شروع سے ہی دوسری اقوام کی تہذیب کو جذب کرنے اور اثرات مرتب کرنے کے عادی تھے۔اب کی بار بھی یہی ہوا تھا مسلمانوں کا عرصہ حکومت خاصا طویل رہا۔ وہ یہاں رچ بس گئے۔ دو قومیں سینکڑوں سال ساتھ ساتھ رہیں۔اس طرح یکسر نئی مشترکہ تہذیب کا آغاز ہوا۔ مسلمانوں کے لشکر بھی کسی خاص قوم اور قبیلے سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ان میں ترک، عرب، افغان مختلف لوگ شامل تھے۔ان کے اختلاف سے لسانی سطح پر

بھی مختلف زبانیں وجود میں آئیں۔ان کے اثرات مقامی ثقافت نے قبول کیے یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حملہ آور ہمیشہ بڑے مراکز پہ حملہ کر کے فتح حاصل کرتے ہیں۔ حکومتیں بڑے مراکز میں قائم ہوتی ہیں۔ہندوستان ایک ایسا وسیع و عریض ملک جہاں سینکڑوں قبیلے زبان رنگ ذات پات کے لوگ موجود ہیں۔ جنوبی ہند کی مثال سامنے رکھتے ہوئے کہ اس علاقے کو بہت کم ہی تسخیر کیا گیا اس نے بیرونی اثرات کو کم ہی قبول کیا۔اس طرح بہت سی چھوٹی مقامی ریاستیں ایسی ہیں جو بڑے مراکز سے دور ہونے کی وجہ سے ان کی تبدیلیوں کے براہ راست اثرات سے محفوظ رہیں ۔ سینکڑوں سالہ مسلمان اقتدار کا زوال اس وقت شروع ہوا۔جب اورنگزیب عالمگیر کی وفات ہوئی۔اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں کے باہمی نفاق کی وجہ سے سلطنت مغلیہ کمزور ہو گی۔اتفاق کی وہ صفت جس سے مسلمانوں نے حکومت قائم کر کے صدیوں تک اسے کامیابی سے چلایا اب وہ صفت معدوم ہو گئی تھی۔دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی جڑیں مضبوط کر رہی تھی۔ یہ حالات اس کے لئے زیادہ سازگار ثابت ہوئے۔رفتہ رفتہ انہوں نے برصغیر کے اہم علاقوں پہ قبضہ کر لیا حکومتوں کے بدلنے کی وجہ سے حکومت کے عملداری کمزور ہو گئی۔مرہٹا گردی نے بھی سر اٹھایا 1803ء کے قریب ایسٹ انڈیا کمپنی دہلی تک اختیار حاصل کر چکی تھی۔بادشاہ کی حیثیت علامتی تھی۔1857ء میں جنگ آزادی جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا۔مقامی لوگوں کے ناکامی کے بعد تاج برطانیہ کی حکومت اعلانیہ طور پہ شروع ہو گئی۔اس سے قبل بھی انگریزوں نے عیسائی مشنریوں کی مدد سے برصغیر کے دور دراز علاقوں میں اپنے مذہب کی ترویج کی۔ فتح کے بعد آزادی کے امکانات معدوم ہوئے۔یوں مقامی تہذیب ایک نئے دور سے گزری،بہت سے مغربی تہذیب کے ہمنوا ہو گئے۔اینگلو انڈین تہذیب کا آغاز ہوا۔انگریزوں نے اپنی حکومت کے دوران ہر سطح پہ اپنی ثقافت،زبان،رسم و رواج کے عمل داری کی۔ مختلف زبانیں وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کو عربی و فارسی کو ختم کرنے کے لیے ترقی اور ترویج کے مراحل سے گزارا۔ادب،آرٹ،فنون لطیفہ،لباس اور خوراک ہر سطح پہ تبدیلی کے اثرات آئے جو مستقل ہندوستانی تہذیب کا حصہ بن گئے۔نوآبادیاتی عہد نے مقامی ثقافتوں کی تاریخ پر اہم اثرات مرتب کیے ہیں۔

عہد بہ عہد دیکھا جائے تو ذرائع نقل و حمل کی سست روی اور کمیابی کی وجہ سے کئی ایسے خطے ہیں موجود ہوں گے جو اپنی مقامیتوں سے باہر نہ نکلے۔ ضمنی ثقافتوں نے ان بیرونی حملہ آوروں کے اثرات کو اس قدر قبول نہ کیا ہو گا؛جو اپنی اصل حالت میں ارتقاء کے عمل سے گزری ہوں گی۔اس بحث کا مقصد بھی اس مہابیانیے کا جائزہ لینا ہے جو بڑے مراکز میں قائم ہوا۔ایسا بیانیہ جو محض مخصوص مراکز کا تھا۔ جس کا تعلق ضمنی ثقافتوں اور علاقوں سے نہ تھا،اس بحث کو مندرجہ ذیل نقاط کے ذریعے سمیٹ کر ار دو ناول نگاروں کے ہاں اکیسوی صدی تک کے سفر کو محض اپنی مقامی ثقافتوں

کے بیانیے تک سمیٹنے کے اثرات اسباب کا جائزہ لینا ہے۔ آخر ایسی کون سی وجوہات تھی جن کی وجہ سے ان کے بیانیے میں مقامی رنگ آیا، یا انہوں نے خود مقامی بیانیہ اپنایا۔

برصغیر بڑے جغرافیے میں ہے ---

برصغیر کی تاریخ میں شمالی ہند سیاسی و سماجی تناظر میں زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔ بیرونی حملہ آوروں کا رخ بھی اسی جانب رہا اور حکومتوں کے جوڑ توڑ بھی انہی علاقوں میں زیادہ رہے۔ جنوبی ہند کا کردار اس حوالے سے مختلف ہے۔ دور دراز پہاڑی سلسلوں میں گھرا یہ علاقہ زیادہ عرصہ خود مختار ہی رہا۔ ہندوستان میں آنے والے حملہ آوروں کی توجہ بھی اس جانب کم ہی رہی یا اس سے صرف نظر کرتے رہے۔ مرکزی حکومت دلی میں ہی رہی۔ دولت آباد چند برسوں تک دارالحکومت بنایا گیا مگر اس کے علاوہ کبھی مرکزی حکومت دلی سے نہ ہٹی۔ مرکزی بیانیہ دلی، شمالی ہند میں ہی رہا۔ برصغیر ایک بڑی مقامیت اور ثقافت ہے۔ بادشاہ دلی میں بیٹھ کر حکومت کرتا تھا۔ 1947ء کی بات کی جائے تو اس وقت بھی برصغیر میں 635 کے قریب ریاستیں موجود تھیں۔ زمانہ قدیم سے ہندوستان میں مختلف ریاستیں رہی ہیں۔ مرکزی حکومت دلی میں ہونے کے باعث اس کے اثرات چھوٹے گروہوں اور ریاستوں پر ضرور پڑے تھے۔ یہاں بھی دیکھا جائے تو بڑے مراکز ہی بڑے مراکز کو متاثر کرتے ہیں۔ دلی کی مرکزی حکومت ریاستوں کی مرکزی حکومت کو متاثر تو کرتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ تمام ریاستیں اس کے اثرات سے متاثر ہوں۔ ریاستوں کے عہد میں ایک راجہ بادشاہ کا والی یہ بوقت ضرورت دوسری راستوں کے ساتھ اتحاد کرتا، بیرونی حملے کی صورت میں مرکزی حکومت کو اپنی خدمات پیش کی جاتیں۔ تاہم اس بات کا ثقافت اور بیانیے کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو دیکھنا پڑے گا کہ کیا واقعی ان مرکزی بیانیوں نے مقامی بیانیوں کو بھی متاثر کیا اور کس حد تک کیا۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ بڑی تاریخ ہمیشہ چھوٹی مقامیت کو بھی کسی نہ کسی صورت میں متاثر ضرور کرتی ہے۔ یعنی بڑی تاریخ سے اثر ضرور قبول کیا جاتا ہے۔

اردو ناول کا ارتقا۔ مختصر جائزہ :

اردو ادب کے مراکز کی بات کی جائے تو بڑے مراکز بھی عموماً شمالی ہندوستان میں ہی ہیں۔ دکنی ادب اور جنوبی ہند کی اردو میں شراکت داری سے کسی کو انکار نہیں تاہم باقاعدہ نثری ارتقاء شمالی ہندوستان میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ دلی نہ صرف ادبی مرکز بلکہ حکومتی مرکز بھی رہا۔ یہاں کا بیانیہ بڑا بیانیہ تھا۔ مہابیانیہ کی بات کی جائے تو دلی کا بیانیہ مہابیانیہ تھا۔ اردو زبان وادب میں ناول کا آغاز اور ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو 1869ء میں مراۃالعروس کی صورت میں ڈپٹی نذیر احمد نے پہلا باقاعدہ ناول عطا کیا۔ اس ناول کا بیانیہ دلی کا بیانیہ ہی تھا۔ دونوں مرکزی کردار اور معاشرت دلی کی نمائندہ تھے۔ اس ناول کا تعلق ایک بڑے مرکز اور مہابیانیہ سے تھا۔ دوسرا ناول رتن ناتھ سرشار کی تخلیق فسانہ آزاد لکھنؤ کی معاشرت اس کے عروج و زوال کی داستان تھی۔ دہلی کی طرح لکھنؤ بھی اردو ادب کا ایک بڑا مرکز ہے۔ اس ناول کا

قصہ اور بیانیہ بھی مہابیانیہ کی ذیل میں ہی آتا ہے۔ان دونوں ناولوں کے بعد اردو میں داستان گوئی کی جگہ ناول نگاری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔اس کے بعد احسن فاروقی نے ناول نگاری کی روایت کو مزید آگے بڑھایا لیکن ناول کا مکانی کینوس نہ پھیل سکا۔1936ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا دوسری اصناف کی طرح ناول میں بھی ادیبوں نے اظہار خیال کیا۔ پریم چند نے خودمیدان عمل ،گؤ دان ،بازار حسن اور نرملا جیسے ناول تخلیق کیے۔پریم چند نے ناولوں کے میکانی کینوس کو وسیع کیا۔ترقی پسند نظریات کے تحت لکھے جانے والے یہ ناول شہری اور دیہاتی زندگی احاطہ کرتے ہیں۔ تقسیم کے موضوعات پہ ناول نگاروں نے خوب لکھا۔اس قدر کے آج اکیسویں صدی کی دودہائیاں گزرنے کے باوجود بھی ناول نگاروں کے ہاں ہجرت اور تقسیم کا سانحہ اہم موضوع کی صورت میں موجود ہے۔ تقسیم کے بعد قرۃ العین حیدر کا ناول آگ کا دریا وسیع زمانی تناظر کا ناول ہے۔جو برصغیر کی اڑھائی ہزار سالہ تاریخ کا احاطہ کرتا ہے۔اس ناول میں ہندوستان کی ثقافت کے مختلف ادوار کا احاطہ ملتا ہے۔اس کے علاوہ عبداللہ حسین کا اداس نسلیں،راجندر سنگھ مہدی کاایک چادر میلی سی،مستنصر حسین تارڑ کا بستی، بہاؤ ،قعلہ جنگی،شوکت صدیقی کا خدا کی بستی،خدیجہ مستور آنگن، شمس الرحمن فاروقی کا کئی چاند تھے سر آسماں جیسے ناول اردو میں تخلیق ہوئے۔ان ناولوں کی اکثریت میں مہابیانیہ کا تصور موجود رہا۔ بڑے مراکز میں بیٹھے ہوئے ادیبوں نے مہابیانیے کو ہی اپنایا۔

1971ء کا سانحہ پاکستان کی تاریخ کا ایک الم ناک سانحہ تھا۔اس کی وجہ سے پاکستان دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوا۔ عوام کا بڑا مالی اور جانی نقصان ہوا۔تاہم اس موقع پہ 1947ء کے واقعے کی طرح ادیبوں کا رجحان کم رہا۔اس سانحے سے متاثر ہو کر ادیبوں نے کسی مصلحت کے تحت یا غیر ارادی طور پہ اسے موضوع نہیں بنایا؛ شاید اس کی وجہ بنگال میں اردو کا بڑا مرکز نہ ہونا تھا۔تاہم یہ وجہ اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ادیب اپنے مشاہدے اور بصیرت کے تحت لکھتا ہے نہ کہ واقعات کی محض کہانی قلم بند کرتا ہے۔ بڑے مراکز میں بیٹھے ادیب بھی کسی بھی موضوع کو خاطر تحریر میں لا سکتے ہیں۔اس طرح سانحہ کارگل اور 2000ء کے بعد اور نائن الیون کا سانحہ اس کے پاکستانی معاشرے پر پڑنے والے اثرات کا بھی پاکستانی ناول نگاروں نے زیادہ اثر قبول نہ کیا؛ کوئی مصلحت ہے یا کچھ اور ان موضوعات پہ بڑے ادیبوں کا قلم بھی خاموش رہا۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول قلعہ جنگی کے علاوہ کوئی بڑا ناول نائن الیون کے بعد ہونے والی صورتحال کے حوالے سے منظر عام پہ نہیں آیا۔

اکیسویں صدی کے ناول نگاروں کے ہاں بڑے مراکز میں رہنے کے باوجود بھی اپنے علاقائی ثقافتوں کے بیان کا چلن زیادہ نظر آتا ہے۔اکیسوی صدی کے ناولوں میں موضوعاتی تنوع کو اپنی علاقائی ثقافتوں کے طرف موڑا گیا ۔ناول نگاروں کی اکثریت نے اس انداز کو اپنایا۔مہابیانیہ سے انحراف کی صورتحال نظر آتی ہے۔اس کی وجہ فرد کی تنہائی گلوبل ویلیج کے اثرات،جدیدیت کی انتہا،قدروں کا زوال کچھ بھی ہو یہ رجحان بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ایک وجہ

اور یہ بھی ہے کہ ان ناول نگاروں کی اکثریت کا تعلق مختلف نواحی علاقوں سے ہے۔ بالآخر وہ بڑے مرکز کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اپنی شناخت کو معدوم ہونے سے بچانے کے لیے اپنے اصل کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ تقسیم کے سانحے کے بعد ناول نے موضوعات کو سمیٹ کر رکھ دیا۔ناول نگاروں نے انسانیت سوز المیوں کے بیان تک خود کو محدود کر لیا۔اکیسویں صدی کے ناول نگاروں کے ہاں اس کی نفی ملتی ہے۔

مقامی ثقافتوں کے بیان میں ناول نگاروں نے محض خارجی امور کو ہی موضوع نہیں بنایا بلکہ اس مقامیت کی تاریخی ارتقاءاور تاریخ کے اثرات کا جائزہ بھی مختلف ناولوں میں ملتا ہے۔ہندوستان کی تاریخ کے مختلف ادوار کا مختصر جائزہ لینے کا مقصد بھی یہی ہے کہ بڑی تاریخ یا تاریخی واقعات کس طرح دوسری ثقافت اور مقامیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مقامی تاریخ پر بھی بڑے تاریخی اثرات ضرور پڑتے ہیں۔ بالفاظ دیگر بڑی تاریخ چھوٹی تاریخ کو ضرور متاثر کرتی ہے ۔کس دور میں مقامی ثقافت کو زیادہ متاثر کیا۔تاریخی ارتقاء نے کب اہم موڑ لیے۔ ہندوستان میں آنے والی تبدیلیوں نے مقامیت کو کس حد تک متاثر کیا۔ بڑے شہروں میں ہونے والی تبدیلیوں نے کس طرح مقامی زندگی کو متاثر کیا۔ برصغیر ماضی قریب میں نوآبادیاتی عہد سے گزرا۔انگریزوں نے پورے ہندوستان کو اپنا مطیع بنایا۔ یہاں کے طول وعرض میں ان کے اثرات موجود ہیں ۔ماضی کی حکومتوں کے برعکس یہ جدید مواصلاتی نظام بھی ہمراہ لائے۔ سڑکوں اور ریلوے کا جال بچھا کر طول وعرض میں اپنی رسائی اور عملداری ممکن بنائی۔اس طرح ان کے اثرات برصغیر کے ہر حصے میں پہنچے۔ مقامی ثقافتیں بھی اس سے متاثر ہوئیں۔زیر نظر باب میں منتخب ناولوں میں مقامیت پہ اپنی تاریخ کے اثرات کا جائزہ لیا جائے گا کہ مقامیت کسی تاریخی واقعہ سے متاثر ہوئی یا کس طرح اس مقامیت کو اس تاریخ نے متاثر کیا۔

جاگے ہیں خواب میں ہزارہ کی مقامی ثقافت کا بیان ہے۔ جس میں ثقافت کے تمام مقامی عناصر کی فراوانی ملتی ہے۔ان عناصر میں سب سے اہم اور زیادہ گہرا شعور تاریخی تناظر میں ہے۔ہر مقامی خطے کی ایک تاریخ ہوتی ہے یا اس کی تاریخ میں خاص واقعات رونما ہوتے ہیں۔ جو اس تاریخ میں اہم موڑ ثابت ہو جاتے ہیں۔ ناول اگرچہ مختصر ہے لیکن اس کے باوجود اس میں گہرا تاریخی شعور موجود ہے۔اس تاریخی بیانیے کا دائرہ اس مقامی علاقے کے گرد ہی گھومتا ہے۔اس علاقے کی تاریخ پہ مختلف ادوار میں ہونے والے اہم اثرات کے ساتھ ساتھ تاریخی ارتقاء کا شعور بھی ملتا ہے۔ اختر رضا سلیمی کے اس ناول میں ہزارہ کی تاریخ کے مختلف ادوار دکھائے گئے ہیں۔ اشوک کا اعظم تک کے دور میں مصنف تاریخ دور میں قاری کو گم کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ سید احمد بریلوی یا جیمز ایبٹ کا زمانہ اس مقامی ثقافت پہ ان تاریخی ادوار /واقعات کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ان تمام واقعات کا ان مقامی عوامل کے ساتھ گہرا تاثر ملتا ہے۔

دنیا کی دستیاب تاریخ اس قدر پرانی نہیں ہے جس قدر اس دنیا کی بنیاد، آغاز اور ارتقاء بہت سے علاقوں میں تو چند صدیوں قبل بھی باقاعدہ تحریری صورت نہیں ملتی بلکہ محض اساطیر اور مفروضوں پہ روایت چلتی ہے۔ہزارہ کی تاریخ کے بارے میں بھی ابہامات پائے جاتے ہیں۔تاریخی حوالوں سے اتنا ضرور معلوم پڑتا ہے کہ تاریخ کئی ہزار سال پرانی ضرور ہے۔اس خطے میں ہزاروں سال پہلے بھی انسان آباد تھے جو اس مخصوص علاقے کے جغرافیائی ماحول میں مخصوص انداز میں پروان چڑھتے تھے۔ہزارہ کی تاریخ کے حوالہ سے تاریخ ہزارہ میں مصنف کچھ اس انداز میں تاریخی پس منظر لکھتے ہیں:

"تاریخ ہزارہ مصنفہ ویس جو(WACE)1872ء کے بندوبست ہزارہ کا جنم تھا۔اس کی وجہ تسمیہ میں لکھتا ہے چونکہ اس کا علاقہ میدان ہری پور میں قوم ترک معروف بہ قارلق کا قبضہ ہے لہذا یہ میدان قارلق ہزارہ مشہور ہے۔حقیقت میں یہ علاقہ ترکوں کے نام پر مشہور ہے۔جن کو امیر تیمور نے خود یہاں چھوڑا۔یہ ایک ہزار کا لشکر قبیلہ قارلق از قوم ترک تھا۔لہذا اس ضلع کا نام قارلق ہزارہ ہو گیا۔اس امر کی تصدیق آئین اکبری سے بھی ہوتی ہے۔جہاں اس کا حدود اربع موسم کے حالات، زبان اور پھلوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔"(3)

مندرجہ بالا سطور سے اس کی تاریخ کے حوالے سے کچھ معلومات ہو جاتی ہیں۔ہزارہ کی وادی قدیم علاقہ ہے جہاں مختلف ادوار میں مختلف لوگوں کی حکومت قائم رہیں اور ان کے زیر سایہ ان کی مقامی ثقافت کا ارتقاء چلتا رہا۔حد بندیوں میں تبدیلی اور مختلف علاقوں سے الحاق کے باوجود اس مقامیت نے اپنی انفرادیت کو بہر حال کسی نہ کسی صورت میں برقرار رکھا۔قدیم تاریخ کے حوالے سے ڈاکٹر شیر بہادر پنی لکھتے ہیں:

"دوسری صدی عیسوی کا ساتویں صدی عیسوی تک یہ خطہ ہندوؤں کے زیر حکومت رہا اور مانگل مرحوم اس کا پایہ تخت رہا اور اس کی حدود دریائے سندھ تک رہیں۔مغلیہ دور حکومت اور درانیوں کے عہد میں کم و بیش حدود رہیں۔سکھوں کے عہد میں یہ سمٹ گئیں اور مذکرہ بالا حدود (بیان کردہ مہتاب سنگھ) یہی ہزارہ کے نام سے موسوم رہا۔"(4)

تاریخی اعتبار سے اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ ہزارہ کی مقامی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔جس نے مختلف ادوار اور تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ ارتقا کا سفر طے کیا ہے۔ان تاریخی واقعات کا بھی مقامی ثقافت پہ گہرا اثر پڑا ہے۔مذہبی رسوم، ثقافتی رسوم و رواج بھی عہد بہ عہد داخلی یا خارجی طور پر متاثر ہوتی ہے۔ان تمام واقعات کے باوجود بھی اس مقامیت نے اپنی انفرادیت کو کسی نہ کسی صورت برقرار رکھتے ہوئے ارتقاء کا سفر جاری رکھا۔بڑی تہذیبوں سے متاثر ہونا کوئی انوکھی بات نہیں۔تاہم اس کے باوجود اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس مقامی ثقافت کے عناصر میں اس قدر وسعت پذیری اور جان تھی کہ وہ کئی تند و تیز جھونکوں کو برداشت کر گئی۔

برصغیر میں انگریزوں سے قبل ہندوستان کی سیاسی اور سماجی حالت خراب تھی۔ مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے بعد تخت نشینوں کی ذاتی لڑائیوں نے حکومت کو دلی تک محدود کر دیا۔ امراءاپنے ذاتی معاملات میں الجھنے لگے تو وسیع و عریض ملک پر حکومت کی گرفت بھی ڈھیلی پڑنے لگی۔ مختلف ایسے قبیلے،اقوام جو مسلمانوں کی حکومت کے تابعداری مگر دل میں بدلے یا آزادی کا درد رکھتے تھے ایسے موقع پر بغاوت کا عالم بلند کر دیا۔ برصغیر میں مختلف ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ پنجاب جیسا وسیع عریض اور اہم صوبہ سکھوں کے قبضے میں چلا گیا۔ مرہٹا گردی نے بھی سر اٹھایا، کئی ریاستوں نے جنم لیا۔ ہندوؤں نے بھی پر پرزے نکالے۔ مسلمان تعصب و تنگ نظری کا شکار ہوئے۔ پنجاب اور ہزارہ کے علاقے میں سکھ گردی کے انسانیت سوز واقعات نے جنم لیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں پنجاب نے جہاں اپنے سیاسی استحکام کو مزید مضبوط کیا وہیں ہزارہ کی طرف مسلمانوں کا بھاری مالی اور جانی نقصان بھی ہوا۔ ہندو اور سکھوں کی حکومتوں نے تعصب کا معاملہ روا رکھا تھا۔

ناول جندر میں اگرچہ مقامی ثقافت کے زوال کا موضوع ہی اصل موضوع ہے۔ جندر میں چند ایک مقامات پر تاریخی حوالوں سے بھی بات کی گئی ہے۔ ناول نگار نے 1841ء کے دور کا ایک واقعہ قلم بند کیا ہے جب بارشوں اور سیلاب نے ان علاقوں کو متاثر کیا۔ اس وقت ہزارہ کے اس علاقے میں ہندو راجہ کی حکومت تھی۔ سید احمد بریلوی کی شہادت کے عرصے اور اس کے بعد کا مختصر تذکرہ ناول میں کیا گیا ہے۔

> 1841ء میں ہونے والی شدید بارشوں کے باعث ہزارہ میں بہنے والی دوسری ندیوں کی طرح اس ندی میں بھی شدید سیلاب آیا تھا جس کے باعث پانی نے جندر کو اس کے بھاری پاٹوں سمیت میں نہ صرف بنیادوں سے اکھاڑ پھینکا تھا بلکہ اس کا سارا ملبہ بھی اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔(5)

ناول میں تاریخ کے اعتبار سے زیادہ تفصیل یا اثرات کا بیان نہیں ملتا۔ ناول کا کردار مشینی دور سے متاثر اپنی مقامیت کا نوحہ پڑھتا ہے۔ مشینی دور نے ان کی روایتی ثقافتی زندگی کو مٹا کر رکھ دیا۔ سہولتوں سے مزین زندگی نے انسانی قدروں کو بھی زوال پذیر کیا۔ اجتماعیت سے زندگی نے انفرادیت کی طرف انحراف کیا۔ ناول کا کردار مشینی عہد کے ہونے والے منفی اثرات کا نوحہ پڑتا ہے۔ زمین کی اور آپس کی جڑت سے لوگ آزاد ہو گئے۔ اخلاقی قدریں زوال کا شکار ہو گئیں۔

> "ٹریکٹر اور اس سے وابستہ مشینوں نے آدمی کو پہلے زمین کی اور بالا خر آپس کی جڑت سے آزاد کر دیا ہر آدمی خود مختار تھا۔"(6)

جاگے ہیں خواب میں کی طرح ناول نگار نے ہزارہ کی مقامیت کو ہی موضوع بنایا ہے۔ تاہم اس ناول میں تاریخی اعتبار سے زیادہ شعور نہیں ملتا۔ جندر میں محض سرسری تذکرہ اور جدید مشینی عہد کے اثرات کے علاوہ مقامی تاریخ کے اپنی مقامیت پر یا بڑی تاریخ کے اس مقامی زندگی پر اثرات دکھائی نہیں دیتے۔

حفیظ خان کا ناول ادھ ادھورے لوگ اپنی تاریخ، مقامیت کے حوالے سے ایک اہم تحریر ہے۔ ناول کی بنیاد ہی 1947ء کے واقعے کو بنایا گیا ہے۔ ریاست بہاول پور ایک آزاد اور خود مختار یاست کی حیثیت کی حامل ایک ریاست موجودہ جنوبی پنجاب میں قائم تھی۔ ناول میں تاریخی واقعے کو فرضی کرداروں کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ ریاست بہاولپور کی تاریخ اڑھائی سو سال پرانی ہے۔ امیر صادق خان اول ان کے سربراہ تھے۔ عباسی خاندان اس کا حکمران تھا۔ جو مصر سے ہندوستان آئے تھے۔ بہاولپور کو اس ریاست کا صدر مقام بنایا گیا۔ بہاولپور شہر جس جگہ تعمیر ہوا اس بستی کا نام "جھوک سوڑھا" تھا۔

"یہ بہت پہلے 1748ء میں نواب بہاولپور خان اول نے اسے دارالسرور بہاولپور کے نام سے اپنے صدر مقام کے لیے منتخب کیا۔"(7)

ریاست بہاولپور برصغیر کی اہم ریاست تھی۔ اس کا عرصہ تقریباً اڑھائی سو سال تھا۔ ریاست بہاولپور کا شمار ہندوستان کی نمایاں ریاستوں میں تھا۔ ریاست کا انتظام بھی عباسی خاندان میں ہی رہا۔ صادق عباسی اس کا آخری حکمران ثابت ہوا۔ 1947ء میں تقسیم ہند کے موقع پر بہاولپور جغرافیائی تناظر میں ہندوستان اور پاکستان دونوں کے وسط میں تھی یہ بات تو یقینی تھی کہ اسے اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے کسی ایک ملک سے الحاق کرنا تھا۔ نہرو نے بھی نواب کو ہندوستان کے ساتھ الحاق کے لیے پیشکش کی اور اس کے بدلے خصوصی معاہدے کا بھی کہا دوسری طرف ریاست کی آبادی کی اکثریت کا بھی مذہب اسلام تھا۔ نہرو نے اس سلسلے میں وجے لکشمی کو نواب کے ہاں ملاقات کے لیے بھی بھیجا جس کا تذکرہ ناول میں بھی موجود ہے۔

"وجے لکشمی پنڈت جو نہرو کی بہن تھی نے نواب صادق محمد خان عباسی سے صادق گڑھ پیلس میں ملاقات کی۔ اس ملاقات میں وجے لکشمی پنڈت نے نواب بہاولپور کو ایک تجویز تجویز پیش کی اور کہا کہ اگر نواب صاحب اپنی ریاست بہاولپور کو پاکستان کے بجائے ہندوستان کے ساتھ معاہدہ کر لیا جائے تو ان کے ساتھ خصوصی معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔"(8)

نواب نے عوام کی امنگوں کے مطابق ریاست کا الحاق پاکستان سے کر دیا۔ جو یہاں کی آبادی کی اکثریت کی منشاء بھی تھا۔ بطور ریاست بہاولپور پاکستان سے الحاق طے پایا۔ نواب نے اس فیصلے کو ایک ذمہ دار مسلم ریاست ہونے کے تحت انجام دیا مگر یہی فیصلہ اس مقامیت کے لیے کہ اہم موڑ بھی ثابت ہوا۔ یہ سیاسی فیصلہ اس مقامیت کے لیے زیادہ دیر پا ثابت نہ ہو سکا۔ عوام پاکستان کے ساتھ اپنی مقامی شناخت کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔

"بالآخر نواب صاحب نے 13 اکتوبر 1947ء کو پاکستان سے الحاق کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ جسے 5 اکتوبر 1947ء کو پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے دستخط سے منظور و قبول کیا۔"(9)

بہاولپور کی جغرافیائی اور اس وقت کی موجودہ سیاسی صورتحال کا تقاضا یہی تھا۔ عوام کی اکثریت کا مذہب اور قلبی وابستگی بھی پاکستان کی طرف تھی۔ اس لیے ریاست کے لوگ اس فیصلے سے خوش تھے کہ وہ بطور بہاول پوری پاکستان میں شامل ہو جائیں۔ آنے والے سیاسی معاملات پہ اس سادہ عوام کا گمان بھی نہ تھا۔ بقول مصنف ریاست کی مقامی شناخت پہ حملہ اس وقت ہوا جب گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت بہاولپور کو صوبے کا درجہ دے دیا۔ یہ فیصلہ حکومت پاکستان کی جانب سے مقامی ریاست کے عوام اور نواب کا اعتماد میں لیے بغیر کیا گیا۔ اس فیصلے کا اصل حق بہاولپور کی عوام کا تھا۔ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں صوبے کی صورت میں ان کی اصل پہچان کے معدوم ہونے کا خدشہ تھا۔ اس سیاسی فیصلے سے عوام میں بے چینی بڑھنے لگی کیونکہ یہ ان کی علاقائی شناخت کا اہم مسئلہ تھا۔

> "گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین 1935ء کے گورنمنٹ ایکٹ آف انڈیا کے تحت بہاولپور کی ریاستی حیثیت کو ختم کر کے اسے صوبے کا درجہ دے دیا۔ ریاستی عوام جو پہلے ہی اپنی شناخت اور بقاء کی جنگ لڑ رہی تھی ان کے لیے یہ فیصلہ ظلم بالا ظلم ثابت ہوا۔"(10)

ریاست بہاولپور کی تاریخ کا اختتام اسی تاریخی تسلسل کے نتیجے میں ہوا۔ پاکستان کی داخلی سیاست قیام پاکستان کے بعد ہی سیاسی انتشار کا شکار تھی۔ حکومت نے ون یونٹ قائم کر دیا۔ مغربی اور مشرقی پاکستان پہ مشتمل دو حصوں میں منقسم ہونے سے چھوٹے صوبوں میں احساس محرومی پیدا ہوا۔ مقامیت جو اپنی مخصوص علاقائی شناخت کے حامل تھے۔ اس ون یونٹ کے قانون سے اپنی شناخت سے محروم ہو گئے۔ باقی صوبوں کی طرح بہاولپور کے عوام بھی بے چینی کا شکار ہوئے۔ جو پہلے ریاستی سے صوبائی اور اب صوبائی سے بھی ہٹ کر ایک بڑے مرکز کا حصہ تصور کیے جانے لگے۔ حکومت نے اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ ون یونٹ کے اختتام پہ صوبہ بہاولپور کو اصل حالت میں بحال کر دیا جائے گا۔ اس امید پر مقامی لوگوں کے دل کو کسی قدر تسلی تو تھی۔ آخر کار وہ اپنی مخصوص شناخت کو حاصل کریں لیں گے۔ ایوب خان کے دور کے اختتام کے بعد ریاست کے لوگوں کی امیدیں اس وقت ختم ہو گئیں۔ جب ون یونٹ کے اختتام کے بعد بھی صوبہ بہاولپور کو بحال کرنے کے بجائے اسے پنجاب میں ضم کر کے ڈویژن کی حیثیت دے دی گئی۔ ریاست بہاولپور کی عوام کے لیے اس صورت میں پرانی ریاست کا نقطہ انجام ثابت ہوا۔ وہ لوگ جو اس بات کی امید لگائے بیٹھے تھے کہ ان کی امیدیں ٹوٹی حکومت وقت نے صورتحال کے پیش نظر لوگوں کی مزاحمت کو دبانے کی کوشش کی۔ ریاست کی بحالی کی تحریکوں پر پابندیاں اور ان کے کارکنوں کو پابند سلاسل کیا گیا۔ اب اس کو ریاست کے عوام اپنی مقامی شناخت سے محروم کر دیے گئے۔ ان کی آواز کو دبانے کے لیے حکومت نے طاقت کا بے جا استعمال کیا۔ ناول کا مرکزی کردار بھی جو اپنی شناخت کا متلاشی تھا۔ اپنی شناخت کو تلاش کرتے کرتے بالآخر اسی جرم میں مار دیا جاتا

ہے۔ان کو واقعات بھی ناول نگار نے اصل تاریخ سے ماخوذ کیا ہے۔جو ریاست بہاولپور کے اختتام کے ساتھ مقامی تاریخ کا سیاہ باب ثابت ہوتا ہے۔ مسعود حسین شباب دہلوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ :

"بہاولپور کی تاریخ میں 24اپریل 1970ء کا دن بڑا خون آشام تھا۔انجمن داؤگان کا جلوس فرید گیٹ پہنچ گیا۔ اس پر پولیس نے لاٹھی چارج کر دیا پھر آنسو گیس بموں کے دھماکے ہونے لگے ایک بم عین سٹیج پر گرا۔خواتین کا ہجوم اسٹیج کے ہی گرد تھا۔ان میں بھگدڑ مچ گئی وہ سنبھلنے نہ پائے تھے کہ بندوق کی گولیوں کی سنسناہٹ سنائی دی۔اس کے بعد گولیاں چلتی رہیں۔"(11)

تاریخی اعتبار سے ناول نگار نے بہاولپور کی مقامیت میں اس اہم تاریخی واقعے کو ہی بنیاد بنایا ہے۔ بہاولپور کی مقامیت کس طرح سے سیاسی فیصلوں کی بھینٹ چڑھ کے معدوم ہوئی اور لوگ اپنی مقامی شناخت سے محروم ہو گئے۔ناول نگار نے بنیادی طور پر بہاولپور کی تاریخ میں پیش آنے والے موڑ کو ہی بنیاد بنایا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ہونے والے اس تاریخی فیصلے نے بہاولپور کے مقامیت کو متاثر کیا۔ بہاولپور کی مقامی شناخت کا بحران پیدا ہوا لوگ اصل مقامی شناخت سے محروم کر دیے گئے۔ کسی بھی علاقے کی مقامیت اس کی روایات ثقافت اس کی پہچان ہوتے ہیں ۔بہاولپور کی مقامیت بھی گلوبلائزیشن کی طرح متاثر ہوئی۔پنجاب میں ضم ہو کر لوگ اپنی مقامی شناخت سے محروم کر دیے گئے۔اس طرح صدیوں سے قائم بہاولپور کی ریاست کی سیاسی حیثیت ختم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی جغرافیائی اور ثقافتی حیثیت پہ بھی ایک بڑی ضرب لگی۔

انواسی ایک مقامی لفظ ماخوذ ہے۔ناول نگار نے اس ناول کو بھی ایک تاریخی واقع سے ماخوذ کیا ہے۔ایسا دور جو نو آبادیاتی عہد ہے۔ نواب آباد کاروں نے مقامی آبادی کو اپنی ترقی ، فہم و فراست اور طاقت سے مغلوب کیا۔ ذاتی مفادات کی غرض سے یہاں تعمیر و ترقی کے کام کیے۔اپنے منصوبوں کی تکمیل کو ہر صورت ممکن بنایا۔ناول نگار نے دریائے ستلج پر بننے والے پل کو بنیاد بنا کر اس مقامیت کے تاریخی تناظر میں تبدیلی کو موضوع بنایا ہے۔ برصغیر کے وسیع و عریض خطے میں برطانوی حکومت کی اہم پیشرفت ریلوے کا وسیع جال تھا۔اگرچہ اس نظام کی بنیاد میں ان کے سیاسی و کاروباری مفاد پوشیدہ تھے۔ جن کے فوائد و ثمرات مقامی لوگوں کو بھی ملے۔ مقامی لوگوں کو روزگار کے وسیع مواقع میسر آئے۔اس ناول میں اس قصے سے مختلف جہتیں تعبیر کی جاسکتی ہیں۔ مختلف عناصر جہاں مقامیت اور نو آبادکاروں کے درمیان ایک وسیع خلیج ؛ایک طرف تعصب ، غربت ، پسماندگی اور مقامی نوابوں کی ظلم کا شکار انسان ہے اور دوسری طرف اپنے عہد کے جدید ترین لوگ جن کی تجارت ایجادات آرائش و زیبائش کا کسی بھی صورت ان مقامی لوگوں سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ جن کی برتری کی دھاک بٹھانے کے لیے یہی پہلو کافی ہیں۔اس پہ مستزاد یہ کہ وہ ان فرسودہ نظاموں کے شکار پسماندہ لوگوں کے لیے حکمران بھی ہیں۔ جو ان کے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤ کرتے ہیں گویا ان کے جان و مال کے بھی مالک ہیں۔

انواسی ناول میں اس مقامی تاریخی دور کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ناول نگار نے تاریخی تناظر میں ناول کی بنیاد رکھی ہے۔تاریخ کا یہ دور اس مقامیت میں تبدیلی کا باعث بنا۔یہ تبدیلی جہاں مقامی ثقافت میں ایک نئے دور کا آغاز بھی ہے۔ناول نگار نے 1871ء کے قریب اس زمانے کا انتخاب کیا ہے۔جب ریلوے لائن بچھانے کا عمل جاری تھا ۔

1878ء میں دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر کوٹری سے سکھر براستہ دادو اور لاڑکانہ ریلوے لائن کو ٹرینوں کی آمد و رفت کے لیے کھول دیا گیا۔اسی سال لودھراں سے پنو عاقل تک 344 کلو میٹر لائن کا افتتاح ہوا (12)"۔

اس زمانے میں جب ریلوے لائن بچھانے کا عمل جاری تھا۔ دریاؤں پہ ریلوے پلوں کی تعمیر کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔لودھراں اور بہاولپور کے درمیان بہنے والے دریائے ستلج کے کنارے آباد ایک بستی آدم واہن کی مقامیت کو ناول نگار نے مقامی ثقافت کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ناول نگار نے اس مقامیت کا انتخاب کیا ہے۔جس کا ٹکراؤ ایک بڑی نو آبادیاتی حکومت سے ہوا۔ کمپنی نے ریلوے پل کی تعمیر کے دوران مقامی آبادی کے قبرستان کو اجاڑ دیا کیونکہ وہ اپنے فیصلے اور نقشے کو تبدیل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ان کا مقصد اپنے منصوبوں کی تکمیل کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ناول نگار نے اس کا تاریخی حوالہ کچھ اس طرح سے ناول میں بیان کیا ہے:

"سنڈی کمپنی کو 108 میل طویل کراچی تک کوٹری ریلوے ٹریک بچھانے کا فریضہ سونپا گیا جو اس نے مئی 1861ء تک مکمل کر لیا جبکہ دوسری جانب پنجاب ریلوے کمپنی نے لاہور کو ملتان سے جوڑنے کا منصوبہ بھی 1865ء کے خاتمے تک تکمیل کو پہنچا دیا۔اب معاملہ ملتان سے کوٹلی سے ملانے کا تھا۔اس کے واسطے جہاں 1871ء میں انڈس ویلی اسٹیٹ ریلوے کا قیام عمل میں لایا گیا۔وہاں ملتان کوٹری کو سکھر اور سکھر کو کوٹلی سے ملانے کے لیے ریلوے کے تین ڈویژن بنائے گئے اور ان تینوں ڈویژنز میں بیک وقت تعمیراتی کام شروع کر دیا گیا۔"(13)

یہ دور برطانوی حکومت کے لیے تو اس سے زیادہ اہمیت کا حامل اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اس وسیع و عریض خطے میں ریلوے لائن کا جال بچھا کر اپنی تجارتی سرگرمیوں کو تیز تر اور ذرائع آمد و رفت کو زیادہ وسیع اور تیز کریں۔اس جدیدیت کے نظام کے رائج ہونے اور اس کی تکمیل کے لیے مقامی ثقافتوں کو قربانی دینی پڑی۔زیر بحث ناول میں ایک چھوٹی مقامی بستی کے تناظر میں ناول نگار نے اس مقامیت میں اس تناظر میں ہونے والی تبدیلیوں کو ہی اصل موضوع بنایا ہے۔ کمپنی نے اپنے منصوبے کی تکمیل کی غرض سے ان مقامی لوگوں کے ثقافتی جذبات کے ساتھ ساتھ مذہبی جذبات کو بھی مجروح کیا۔ کمپنی کے منصوبے ماننے والے مقامی قبرستان کو بہ زور طاقت اجاڑ دیا جاتا ہے۔مقامی لوگ شکستہ دل کے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کی قبریں کھودنے اور ان کی باقیات نکالنے پر مجبور ہو گئے ۔مقامی نوجوانوں کی مزاحمت بھی ان کے کسی کام نہ آئی۔ لوگ ان کے حکم کو ماننے پہ مجبور ہو گئے۔یہ عہد جہاں تاریخی اعتبار سے مقامیت

کے لیے ایک نازک دور تھا اسی طرح مقامی لوگوں کی زندگیوں میں ایک سنگ میل بھی ثابت ہوا۔ مقامی جاگیر داروں کے ساتھ ساتھ ان آباد کاروں کے ستم کا بھی نشانہ بنے۔ اپنے مردوں کی باقیات جمع کر کے از سر نو دفن کرنے کے وہ اس کمپنی کی ملازمت اختیار کرنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کو نو آباد کار اپنے منصوبوں کی تکمیل میں افرادی قوت بننے پہ مجبور کر دیتے ہیں۔ مقامی نوابوں جاگیر دار اور مذہبی ٹھیکے داروں کے تسلط کے ساتھ ساتھ نو آباد کاروں کے تسلط کا بھی شکار ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگیوں میں رفتہ رفتہ مقامیت سے اس نئے جدید دور کی طرف انحراف کی صورتحال بھی دکھائی دیتی ہے۔ ناول کا اختتام اسی انداز میں ہوتا ہے جب سیلاب ان کے مکانوں کے ساتھ ساتھ ان کی ثقافت کے نقوش بھی مٹا دیتا ہے۔ نو آباد کار اس کو ٹینٹوں میں لا بساتے ہیں اس طرح یہ مقامیت ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہ مقامیت ایک نئے عہد میں قدم رکھتی ہے۔ نو آبادیاتی عہد کی قباحتیں اپنی جگہ مگر اس کے ساتھ ساتھ مقامی ثقافتوں کے فہم اور فراست میں بھی تبدیلی ضرور واقع ہوتی ہے۔ زیر بحث ثقافت بھی اسی پیرائے میں بیان ہوئی ہے۔ سیلاب کی علامت گویا یہ جدید ثقافتی یلغار ہے۔ جس نے پرانی ثقافت کی جگہ نئی ثقافت کو مسلط کر دیا ہے۔ اس مقامیت میں یہ تاریخ دور محض ایک ریلوے لائن ہی نہیں بلکہ اس مقامیت میں ایک اہم دور ثابت ہوتا ہے۔

نیلی بار میں پنجاب کا وہ علاقہ جو دریائے راوی اور چناب کے درمیان واقع ہے۔ اس کے کنارے گھنے جنگلات ہیں۔ جو انگریزوں کے دور میں نہری علاقوں میں لگائے گئے۔ ناول نگار کا خاندان بھی راولپنڈی کے علاقے سے ہجرت کر کے انگریزوں کی طرف سے دی گئی زمین کو سنبھالنے وہاں جا بسا۔ ناول نگار نے اپنے مشاہدے اور تجربات سے ثقافت کا نقشہ کھینچا ہے۔ ناول اگرچہ ملکی سیاست اور سماجی صورتحال کا بیان ہے تاہم اس کے کرداروں کے ذریعے سے اس مقامی ثقافت اور اس کی تاریخ میں آنے والے اہم واقعات کا بیان بھی ملتا ہے۔ یہ علاقے مخصوص جغرافیائی حالات کے تناظر میں اپنی زرخیزی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا ذریعہ معاش فصلیں اور مال مویشی ہیں۔ علاقائی کنٹرول مقامی جاگیر داروں، ذیلداروں اور زمینداروں کے ہاتھوں میں ہے ان کے قوانین اور عملداری کا خود ساختہ نظام ہے۔

ناول نگار نے اس مقامیت کی تاریخ میں ایسے دور کا انتخاب کیا ہے جب نو آبادیاتی عہد میں لوگوں کو اس طرف زمینیں مربع کے حساب سے دی گئیں۔ یہ گھوڑی پال مربع پنجاب کے اکثر علاقوں میں دیے گئے۔ مقامی لوگ ان جاگیر داروں کی چاکری کرنے لگے ان کی محنت کے بل پر بیرونی طور پہ مقیم زمیندار بڑے سے بڑے ہونے لگے۔ اس مقامیت میں باہر سے آنے والوں نے ان مقامی لوگوں کی زندگیوں کو متاثر بھی کیا جو اس قدر پسماندگی کا شکار تھے کہ مذہب کی تعلیم سے بھی نابلد تھے۔ ان کی اسی پسماندگی کا فائدہ مقامی زمینداروں کے ساتھ ساتھ باہر سے آنے والے ذیلداروں نے بھی اٹھایا۔ ان لوگوں کی عزت و ناموس بھی ان زمینداروں کی ملکیت تھی۔

اس مقامیت کی تاریخ میں پہلا اہم دور تو وہ ثابت ہوا جس میں انگریزوں کی طرف سے الاٹ کیے گئے مربعوں پہ بیرونی لوگوں کی آمد اور دوسرا دور تقسیم کے بعد آنے والے مہاجروں کی آمد کا زمانہ تھا۔ یہ مہاجر لوگ بھی ان مقامی لوگوں سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ تھے۔ مقامی لوگوں سے زیادہ جرات اور مند سلیقہ مند انھوں نے مقامی لوگوں کی زندگی کو بنیادی سہولتوں، ضرورتوں اور اصولوں سے آشنا کیا۔ گھوڑی پال مربع کی صورت میں الاٹ کی گئی زمینوں پہ باہر سے آنے والے یہاں ذیلدار کہلائے۔ جو مقامی زمینداروں کے ہم پلہ تھے۔ اس حوالے سے ناول میں مصنفہ ان کے بارے میں کچھ اس طرح سے لکھتی ہیں:

> "پہاڑوں سے اتر کر میدانوں میں آنے والے ان شلواروں اور قراقلیوں والے انگریز کے سپاہیوں اور وفاداروں کو گھوڑی پال، سانڈ پال، گائے پال اور بھیڑ پال مربعے الاٹ ہوئے تھے۔ بیس تیس مربعوں کے ٹینڈر آباد کرنے کے ملے تھے۔ ذیلدارنیاں، نمبردارنیاں، رئیس دارنیاں آزنریری عہدے اور القاب دیے گئے تھے۔ ان قدیمی باشندوں کو انھی مربع پال گھوڑیوں، گائے، بھیڑوں کی خدمت پر مامور کر دیا گیا جو آنکھوں پر کھوپے چڑھائے ایک ہی کولہو کے دائرے میں گھومنا سکھائے گئے تھے۔(14)

نیلی بار میں مصنفہ نے تاریخی ارتقاء کے ساتھ ساتھ مقامی سیاسی سماجی معاملات کو ملکی تناظر میں بیان کیا ہے۔ یہ مقامی مزارعے کس طرح آنے والے وقتوں میں بھی اپنے حالات کی تبدیلی کی کمزور امیدوں کو ٹوٹتا دیکھتے ہیں۔ مصنفہ نے تاریخ کے ساتھ ساتھ ناول کو بڑھایا ہے۔ ناول نگار نے اس حوالے سے مختلف تاریخی فیصلوں اور واقعات کا بیان بھی کیا ہے۔ مقامیت کو کس حد تک متاثر ضرور کرتے ہیں تاہم کسی بڑی تبدیلی کا باعث نہیں بنتے۔ ملک میں مجموعی طور پر ہونے والی حکومتی اور سیاسی تبدیلیوں نے بحیثیت مجموعی ان قدیم مقامی باشندوں کی حالت کو زیادہ متاثر نہ کیا۔ نائن الیون کا واقعہ ہو یا اس سے قبل بھٹو کی زرعی اصلاحات کا معاملہ مقامی آبادی پر اس کا اثر ضرور دکھائی دیتا ہے۔ تاہم مقامی ثقافت کے رسوم زیادہ تر اپنی اصل حیثیت میں ہی قائم رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی ذہن سازی اس طرح سے کی گئی کہ آنے والی نسلیں بھی اسی طرح سے ان ذیلداروں، زمینداروں، وڈیروں اور مذہبی رہنماؤں کی غلامی کو ہی اپنا فرض اولین سمجھتی دکھائی دیتی ہیں۔

گراں خطہ پوٹھوہار کی مقامیت کا بیان لیے علاقائی ثقافتوں کے ضمن میں لکھے گئے ناولوں میں ایک اہم اضافہ ہے۔ ناول نگار نے خطہ پوٹھوہار کی مقامیت کو باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ اس ناول کا موضوع پوٹھوہار کی مقامیت کا زوال ہے جو اکیسویں صدی کے کئی مقامی ثقافتوں کا روگ بن چکا ہے۔ اس مقامیت کے معدوم ہونے کے خدشات قوی ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے لوگ خود ہی اس سے پہلو چھڑانے کے درپے ہیں۔ "گراں" ناول میں اگرچہ ناول نگار کا اصل موضوع پوٹھوہار کی مقامیت سے دور ہوتے اس کے باسی ہیں جو اپنی اس مقامی ثقافت کا تسلسل برقرار رکھنے پہ راضی نہیں ہیں۔ جدیدیت نے ان کی زندگیوں کو سہل، رواں کرنے کے ساتھ ساتھ لاتعلقی سے بھی مزین کر

دیا ہے۔ یہ لاتعلقی اپنی مٹی، دھرتی اور ثقافت سے ہے۔ یہ لاتعلقی اپنی روایات اپنی جڑوں سے ہے۔ اس زوال کو ناول نگار اختصار اور بعض مقامات پہ محض اشاروں کے ساتھ مختلف ادوار کے تناظر میں بیان کرتا ہے۔ ناول میں پوٹھوہاری مقامیت پہ تاریخی اثرات کے جائزے کے لیے اسے تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جو اس مقامیت میں اہم موڑ ثابت ہوئے جن سے یہ مقامیت متاثر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ پہلا دور مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا دور ہے یہ وہ دور ہے جہاں مقامی لوگ مختلف مذاہب کے حامل ہونے کے باوجود مذہبی ہم آہنگی سے اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں۔ لوگ مقامی ثقافت کے پابند اور اس کے معمار ہیں۔ ان میں مذہب کی تخصیص کے باوجود مقامی ثقافتی عناصر کی فرمانبرداری نمایاں ہے۔ مقامی ثقافت کی قدریں مشترک تھیں۔ لوگ اپنی مقامی روایت اور حدود میں مقید تھے۔ باہر کی دنیا سے ان کا رابطہ کم تھا اس طرح بیرونی اثرات ان پہ نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہ مقامیت کا دور معراج یا ترقی یافتہ عہد کہلایا جا سکتا ہے۔ اس شہر میں مقامیت اپنے جوبن کے ساتھ موجود ہے۔ یہ مقامی دور خاص مقامی ثقافت کا نمائندہ ہے۔ مشترکہ تہذیب کا یہ مقامیت کے اعتبار سے نمایاں دور ہے۔ اس کی بازگشت ناول کے مقامی کرداروں کے ضمن میں سنائی دیتی ہے۔

"ہائے کیا ویلے تھے۔ ادھر ماسی کرتار کور کا چوکا روز نیل ملا کر چکنی مٹی کا پوچا پھرتی کانسی کے برتن مانجھ آرسی کر اور سی بنا پر چھتی پر سجاتی چاہے تو منہ دیکھ کر سیدھی چیر نکال لو۔ جب بھی گرداوری آتی سکھ اہلکاروں کے لیے وہی تو جھٹکا پکاتی۔"(15)

مذہبی ہم آہنگی نے اس مقامیت کو پروان چڑھایا۔ لوگوں کے درمیان مشترک قدر ثقافت تھی۔ "گراں" اس بات کا نوحہ ہے کہ پرانے کردار ان وقتوں کو یاد کرتے ہیں جب ان کی دھرتی اپنی ایک شناخت اور پہچان رکھتی تھی۔ یہ کردار مختلف مذاہب کے ہونے کے باوجود بھی ایک مشترکہ تہذیب کے علمبردار تھے۔ ان کا رہن سہن سب کچھ اس مقامیت کے زیر اثر ہے۔ تاریخی اعتبار سے مقامیت کا یہ عہد نمایاں عہد ہے۔ اس کے حوالے سے ناول کے کردار مزید اس کی وضاحت کرتے ہیں:

"ہائے بابا خزاں سنگھ کی ہٹی! چھ ماہی ادھار پر سودا چلتا، شادی بیاہ پر گڑ، پتاشوں کے تھال مفت بھیجتا۔ ہائے لوٹیاں پڑیں۔ ساگری لٹی، پنڈی سڑی۔ ہائے لوٹی۔۔۔ کیسی کیسی پھلکاریاں ہندوانیوں کے ہاتھ کی ریشم کی کڑھائی والی اتنی پیٹ دار کے کپڑا نظر نہ آتا۔ سو سو پھلکاری، ایک ایک گھر سے نکلی "جھلے اور گڑھے" کے ظلمی لوگ لوٹ کر لائے۔ پیتل کی گھاگریں کھیس، دریاں اور ریشم اور کھدر کی ساڑھیاں ہائے بیچاری ہندوانیاں اور سکھڑیاں گھٹے گھٹے مکانوں کے تھڑوں پر بیٹھی ساری دیہاڑی چرخا کاتتیں۔"(16)

مقامیت کی تاریخ میں دوسرا اہم دور نوآبادیاتی عہد ہے۔ اس تاریخ کا مقامیت پہ گہرا تہذیبی و ثقافتی اثر پڑا۔ نوآبادکاروں نے ہر نوآبادیات میں اپنے نظام کو مضبوط کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتے ہوئے مقامی وسائل

کو زیر استعمال لایا۔ خطہ پوٹھوہار نیم پہاڑی اور میدانی علاقہ ہے۔ جہاں پہاڑ بھی ہیں اور میدان بھی۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر اپنے نواحات تک محدود ہیں۔ ان کا ذریعہ معاش بھی مقامی نوعیت کے پیشوں تک محدود ہے۔ استعماری قوتوں کی گہری نگاہ ہمہ وقت اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مقامی وسائل کو مختلف نگاہ سے دیکھنے اور پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مادی وسائل کے ساتھ ساتھ مقامی افرادی قوت کو بھی اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے عمدہ طریقے سے کشید کیا۔ خطہ پوٹھوہار کے نوجوان جغرافیائی اعتبار سے ایسے خطے سے تعلق رکھتے جو عموماً دوسرے علاقوں کی نسبت سخت زندگی کے عادی تھے۔ انگریزوں نے ان لوگوں کے محدود وسائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہیں فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح ان کے مقاصد کا حصول بھی ہو گیا اور مقامی لوگوں میں تابعداری اور شکر گزاری کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا۔ اس کے دوران بھی انہوں نے مقامی لوگوں کے اندر ایسی تفریق ڈالی کہ وہ خود مختلف طبقات کا شکار ہو گئے اور ان میں خاص طبقہ ان کا حمایتی اور شکر گزار جوان کے لیے مزید فائدہ مند ثابت ہوا۔

> "فوج میں بڑی ذاتوں کے لوگ بھرتی ہوتے انگریز سرکار اپنے درباروں میں خاندانی لوگوں کو کرسی پیش کرتے۔ ہائے انگریز بڑی سیانی قوم تھی، ہائے ایسی ست بھائیاں کسی چیز کی کمی نہ ہوتی۔ زنانیاں سونے سے لدی رہتیں۔ انبار اناج سے خالی نہ ہوتے۔ مارشل ذاتوں کو عزت ملتی۔ سید، اعوان، راجپوت، پٹھان پانچویں کسی ذات کو وہ منہ نہ لگاتے۔"(17)

نو آبادیاتی عہد کے تاریخی دور نے اس مقامیت کو متاثر کیا۔ ان لوگوں کا ذریعہ معاش تبدیل ہوا سوچ میں تبدیلی آئی۔ باہر کی دنیا سے ان کا رابطہ قائم ہوا اس کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں میں فوج میں بھرتی ہونے کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ تو ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب پوٹھوہار مردوں سے خالی ہو گیا۔ ہر گھر میں ایک بندہ فوج میں حاضر یا ریٹائرڈ موجود ہوتا تھا۔ اس نئے سلسلے مقامیت میں تبدیلی کا ایک نیا باب شروع کیا۔

تیسرا دور 1980 کے بعد کا دور ہے یہ دور عمومی طور پر جدیدیت کا دور بھی کہلاتا ہے۔ اس عہد میں بیسویں صدی کے انقلابات میں اس قدر وسعت آچکی تھی کہ گلوبل ویلیج کا تصور رفتہ رفتہ مقامی ثقافتوں کو نگلنے لگا۔ لوگ ایک مرکز کی جانب جڑ کر اپنے اصل سے کٹنے لگے۔ سہولیات مقامی علاقوں تک آئیں۔ اس عہد کی نسل بیرون ملک کی طرف مراجعت کرنے لگی اور روزگار کے حصول کے لیے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو بعد ازاں ان کی آنے والی نسلوں نے خود کو اسی تہذیب میں ڈال کر اپنی تہذیب کو مٹانا شروع کر دیا۔ جو لوگ بیرون ملک گئے، انہوں نے کسی نہ کسی طور پہ بھی اپنی ثقافت اور مقامیت کو زندہ کرنے کی جتن کیے تاہم وہاں سے آنے والی دولت کی مرغوبیت نے ان کے ورثاء اور یہاں بیٹھی ان کی اولادوں کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ یہاں رہتے ہوئے بھی ان کی طرح رہائش، بود و باش اور زبان کو اپنانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ اس نازک عہد نے پوٹھوہار کی مقامیت کو زیادہ متاثر کیا اور آخر کار اس مقامیت کی معدومیت کے امکانات وسیع ہونے لگے۔ وہاں جانے کی تمنا میں بیٹھے یہ لوگ اپنے نظام سے منحرف ہو گئے

اور اگر یہاں رہے بھی تو بڑے شہروں کو مسکن بنایا۔ یہاں رہتے ہوئے بھی یورپ کے طرز زندگی کو مد نظر رکھا۔ مصنفہ نے اسی بات کا نوحہ پڑھا ہے کہ کس طرح یہ مقامیت زوال کے دہانے پہ کھڑی ہے۔

دائرہ میں لاہور کی مقامیت کو ناول نگار نے مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ ناول میں مقامی ثقافت کے مختلف عناصر کی فراوانی ہے۔ ناول میں مقامیت کی تاریخ کا براہ راست کوئی تعلق یا تذکرہ تو نہیں ملتا تاہم تاریخی اعتبار سے ایسے نقوش ضرور ملتے ہیں۔ جن کا لاہور کی مقامیت سے گہرا تعلق ہے۔ لاہور کی ثقافت صدیوں پرانی ہے۔ اس شہر کی ثقافت میں کئی اہم موڑ آئے۔ لاہور کی ثقافت میں مختلف واقعات رونما ہوئے۔ جو اس کی تاریخ میں اہم ہیں۔ سیاسی، معاشرتی، مذہبی حوالوں سے کئی ایسے قابل ذکر واقعات موجود ہیں۔ لاہور کا نام آتے ہی ایک تاریخی ثقافتی شہر کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ اس کی وجہ اس کے مزارات، بازار اس کی عمارتیں سبھی کچھ ہے۔ جو تاریخ کے سفر پہ آپ کے ذہن کو روانہ کر سکتا ہے۔ ناول میں سے ایسے مقامات کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ ضروری ہے۔ انار کلی کے بازار کے ضمن میں طاہر لاہوری اپنی کتاب سوہنا شہر لاہور میں لکھتے ہیں:

> "لاہور صدیوں سے خوبصورت نگری ہے علم و فضل کا ہو شہر ہے۔ خوب صورت، باغوں خوبصورت عمارتوں اور خوبصورت لوگوں کا شہر ہے۔ انار کلی بازار صدیوں سے اپنے حسن اور رعنائیوں کے ساتھ زندہ ہے گویا لاہور کا ڈیکوریشن پیس ہے۔ صدیوں پہلے یہاں پر قبرستان تھا۔ سیکرٹیریٹ سے انار کلی تک اب بھی بیسیوں پرانی قبریں اور مزار ہیں۔"(18)

لاہوری دروازے کا تذکرہ بھی ناول میں ملتا ہے۔ اس کا شمار لاہور کے 13 دروازوں میں ہوتا ہے۔ جو آج بھی موجود ہے۔ لاہور کے ایسے مقامات تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ لاہور کی ثقافت کے آئینہ دار بھی ہیں۔ اس دروازے کی تاریخ کے بارے میں کنال لال کپور اپنی کتاب تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں کہ:

> "جب سلطان محمود غزنوی کے چاچا نے راجہ جے پال انگپال کو لاہور سے بے دخل کر کے پنجاب کا علاقہ اپنے ماتحت کر لیا تو راجہ جے پال چند ماہ تک اسی علاقے میں محصور ہو کر لڑتا رہا۔ آخر بھاگ گیا۔ محمود نے شہر کو آگ لگا دی اور رعایا کو قتل کر دیا جس سے شہر ویران و برباد ہو گیا۔ کچھ بھاگ گئے چند سال تک شہر غیر آباد رہا۔ آخر جب ملک ایاز پنجاب کے انتظام کے لیے معمور ہوئے تو اس نے شہر کو دوبارہ آباد کرنا چاہا۔ سب سے پہلے آبادی شہر کے اسی محلے سے شروع ہوئی جس کو لاہوری منڈی کہتے ہیں اور سب سے پہلے یہی دروازہ تعمیر ہوا جس کا نام لاہوری دروازہ رکھا گیا ہے۔"(19)

لاہور شہر کے تذکرے میں ناول نگار نے جگہ جگہ ایسے تاریخی مقامات کا تذکرہ کیا ہے جو اس مقامی تحریک میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تاریخی عوامل سے اس مقامیت کی تاریخ اور ثقافت پہ خاص اثر پڑا۔ اندرون لاہور کا

بیان ہو یا قدیم اور جدید لاہور کا تقابلی بیان ناول نگار نے دونوں صورتوں میں اور کسی حد تک اس شہر پہ ہونے والے تاریخی اثرات کا ایک مختصراً جائزہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

نو لکھی کوٹھی مابعد جدید جیت کے تصورِ مقامیت کا حامل ناول ہے۔ ناول مقامی ثقافت کے مختلف عناصر کار فرما نظر آتے ہیں۔ ناول میں مقامی تاریخ کا بھی اہم حوالہ ہے۔ ناول کے قصے کا نو آبادیاتی عہد سے آغاز ملتا ہے۔ 1930 کے بعد کا سماج ہر لمحہ بدل رہا ہے۔ ہندوستان پہ قابض استعماری قوتیں جنگ عظیم اول، دوم میں مختلف محاذوں پہ لڑ رہی تھیں۔ مقامی لوگوں کے ساتھ ان کا سلوک کوئی ڈھکی چھپی کارستانی نہیں ہے۔ مقامی سطح پہ بھی ان کے قوانین نے مقامیت کو تبدیل کرنا جاری رکھا ہوا تھا تو عالمی لحاظ سے ان کے ہونے والی تبدیلیاں اور اثرات سے یہ مقامیت بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وسطی پنجاب کی تاریخ بھی ایک اہم موڑ سے گزری۔ 1930ء کے بعد کا سیاسی منظر نامہ اس مقامیت کو بھی مختلف حوالے سے متاثر کر رہا تھا۔ انگریزوں کا مستحکم اقتدار آب و تاب کے ساتھ جاری تھا۔ ہندوستان کے زرعی ملک اور پنجاب جیسے سرسبز اور زرخیز صوبے میں انگریز افسروں کی دلچسپی خصوصی تھی۔ انگریزوں نے اس علاقے میں اپنی زندگیاں نوابوں کی طرح گزاریں اور کئی تو یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ناول کا عنوان بھی اسی عہد میں تعمیر کی گئی ایک کوٹھی کے نام پر ہے۔ جو اوکاڑہ کے قریب واقع ہے۔ انگریزوں نے مقامی نوابین اور جاگیرداروں کی حمایت ضرور حاصل کی تاہم اس کا مقصد اپنے اقتدار کو مستحکم اور مضبوط بنانا تھا۔ وہ مقامی لوگوں کو خواہ وہ کسی بھی طبقے کے ہوں ان کے اور خود کے درمیان ایک حد فاضل قائم رکھتے اور اپنی برتری ثابت کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

"ولیم سودھا سنگھ کے آخری فقرے کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے مسکرا کر بولا،

"چلو یہ بات تو طے ہوئی کہ رنجیت سنگھ کا راج ختم ہو چکا ہے اور اب پنجاب پر ہمارا راج ہے۔"(20)

اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے ناولوں میں سے نو لکھی کوٹھی بھی ایک نمایاں ناول کے طور پہ سامنے آتا ہے۔ ناول میں مشرقی پنجاب کی مقامیت کے مختلف ادوار کا وضاحت سے بیان ملتا ہے۔ ناول نگار کا تخلیقی شعور بھی اسی مٹی سے گوندھا ہے۔ ناول نگار کا خاندان بھی مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان منتقل ہوا۔ ان کا خاندان بھی ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے تقسیم ہند میں اپنے جان مال کا نقصان برداشت کیا۔ ناول میں مشرقی پنجاب کے مختلف ادوار کا بیان ملتا ہے۔ ناول نگار نے اس کا آغاز ایسے عہد میں کیا ہے جو نو آبادیاتی عہد ہے۔ انگریز پوری شان و شوکت اور طاقت سے پنجاب میں حکومت کر رہے ہیں۔ پنجاب کی دو بڑی قومیں سکھ اور مسلمان اگرچہ ایک مشترکہ ثقافت کی حامل تھی۔ دیہات کی سطح پر زمینداری نظام کے تحت ہونے والے لڑائی جھگڑے اس کا معمول تھے۔ غلام حیدر اور سودھا سنگھ جیسے دو بڑے خاندان جو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان ہونے

والی لڑائی سے ناول کا ارتقاء چلتا ہے۔ یہ لڑائی بعد ازاں دونوں مذاہب کی لڑائی بن جاتی ہے۔ مگر پہلے حصے میں محض مقامی نوعیت کی لڑائی ہے۔ جہاں معمولی مذہبی فرق کے ساتھ بنیادی طور پہ جاگیر دارانہ نظام کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جہاں مقامی جاگیر دار آپس کے جھگڑوں میں مصروف ہیں۔ان کی ایک دوسرے پہ برتری حاصل کرنے کی کوشش ان کے زیر سایہ لوگوں کے ذہنوں میں وراثت کی صورت میں منتقل ہوتی ہے۔ان کی باہمی لڑائیوں میں ہونے والے نقصان کو بھی انہی لوگوں نے برداشت کرنا ہوتا ہے۔ ناول کے آغاز میں ہی ولیم کا کردار نوآبادیاتی کردار کے نمائندے کے طور پہ ناول میں نمودار ہوتا ہے۔ جو ناول کے آخر تک قائم رہتا ہے یہ کردار نوآبادکاروں کا نمائندہ کردار ہے۔ جو ہر صورت کمپنی کے مفادات کو مقدم رکھتے ہوئے۔اس کی رٹ مقامی لوگوں پہ قائم کرتا ہے۔اس عہد میں مقامی جاگیر داروں کی لڑائیوں اور عملداریوں کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی عہد کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے یہ عہد ایسا دور ہے جس میں مقامیت میں تبدیلی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ نوآبادیاتی عہد میں مقامی سطح پہ مختلف تبدیلیاں ہوئیں۔ پنجاب کے زرعی علاقے میں انگریزوں نے اپنے لگان کو بڑھانے کے لیے مقامی سطح پہ نہری نظام کو رائج کیا تاکہ فصلوں کو زیادہ کر کے حکومت کی آمدنی میں بھی اضافہ کیا جائے۔ اس طرح ایک بیرونی قوم سے مقامی قوم کے ساتھ مکالمے کا بھی آغاز ہو جاتا ہے۔ جس کی وضاحت الگ سے کی جائے گی۔

"ہٹلر نے گورنمنٹ برطانیہ کی ہڈیوں کا تمام گودا کھینچ لیا ہے اور اب ان کے پاس نوآبادیات میں اپنا اقتدار قائم رکھنے کی نہ طاقت ہے نہ ہی جواز۔"(21)

اس طرح 1940ء کے بعد حالات میں یکسر تبدیلی آئی۔ پنجاب کا علاقہ مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان ہونے والے معمولی جھگڑوں سے زیادہ شدت کی لڑائیوں میں منتقل ہو گیا۔ مقامیت اس تاریخی ارتقاء سے متاثر ہو رہی تھی۔ سیاسی جماعتوں کی فعالیت نے حالات کو مزید سنگین بنا دیا۔ دونوں قومیں اس مقامیت میں خاص مقام رکھتی تھی۔ اس سیاسی آویزش میں تقسیم کا سورج طلوع ہوا تو اس خطے کی مقامی تاریخ کو بدل کر رکھ دیا۔ جب ہر طرف خوف کے سائے منڈلانے لگے صدیوں پرانے مکین بے بسی اور لاچار ہونے کے ساتھ ساتھ پرائے ہو گئے۔ مقامیت کی تاریخ میں ایسا وقت آیا کچھ مار دیے گئے کچھ بے گھر کر دیے گئے اور کچھ دوسرے علاقوں میں سے آ بسے۔ پنجاب کا سرسبز علاقہ خون کی سرخی میں تبدیل ہو گیا۔ بڑا ثقافتی، شناختی بحران بھی وجود میں آیا۔ اپنی شناخت کے متلاشی مشرقی سے مغربی اور مغرب سے مشرقی پنجاب میں بڑی تعداد میں در آئے اور اس شناخت کو نئے مٹی میں جا ملے بغیر کسی نشانی کے اس طرح مقامیت کی تاریخ میں تقسیم کا سانح بھی خاصا اہمیت کا حامل ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ایک نئی تفریق کا آغاز ہوا۔ لوگ اپنی مقامی شناخت سے محروم ہو گئے۔ ایک مقامیت دو الگ حصوں میں تقسیم ہو گی۔ اس نئے سیاسی سانحے سے لوگوں کے درمیان مقامی پہچان مذہبی پہچان میں بدل گئی۔

خس و خاشاک زمانے اکیسویں صدی کا ایک اہم اور وسیع تاریخ تناظر کا ناول ہے۔ ناول کے دورانیہ 1929ء سے اکیسویں صدی تک محیط ہے۔ ناول نگار نے مقامیت کے بیان میں تاریخ کے بیان کو بھی ناول کے بیانیہ میں شامل کیا ہے۔ ناول میں تقسیم ہند سے قبل پنجاب کی مقامیت کا بیان ہے۔ اس مقامیت پہ پہلے اثرات 1947ء کی تقسیم ہند کے پڑے۔ مقامی لوگ امن و سکون اور مذہبی ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مذہبی تفریق کے باوجود بھی صلح صفائی کے ساتھ رہ رہے تھے۔ مقامی جاٹ برادری دو مختلف مذاہب کے باوجود یکجا ہو کر رہ رہے تھے۔ 1947ء کے واقعے نے لوگوں کو الگ الگ مذہب میں ایسا تقسیم کر دیا کہ کچھ تو ایک دوسرے کے خلاف خود کھڑے ہو گئے اور کچھ اپنے مقامی ساتھیوں کی حفاظت کرنے لگے۔ لوگ اپنے گھروں سے بے دخل کر دیے گئے۔ مقامی امن و امان کی صورتحال اس قدر خراب ہو گئی کہ لوگ اپنے ہی لوگوں کو پناہ دینے سے گھبرانے لگے کہ وہ بھی سزاوار ٹھہرائے جانے لگے۔ مقامی سطح پہ ہونے والی ان تبدیلیوں سے مقامی لوگ اپنے گھروں سے بے دخل ہو گئے اور مقامی علاقوں میں نئے لوگ آبسے جہاں ان لوگوں کو بے دخل کیے جانے کے بعد انہوں نے نئی ثقافتوں میں پناہ لی۔ تو اس مقامی ثقافت میں بھی نئے لوگ آکر ضم ہونے لگے۔

مقامیت کا یہ دور پر آشوب دور ثابت ہوا۔ وہاں سے آنے والے لوگوں نے یہاں سے چھوڑ گئے مکانوں کے تالے توڑ کر پناہ لے لی۔ ان نئے آنے والے لوگوں کے آنے سے بھی مقامی سطح پہ کئی اعتبار سے تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ نئے آنے والے اپنے علاقوں کے رسم و رواج رہن سہن کے طریقے ہمراہ لائے۔ نئے آنے والے زیادہ تر مقامی سطح کے اثرات کو قبول کرنے لگے۔ لہناں سنگھ کا کردار ان لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی دھرتی سے بے دخل کر دیے گئے۔ بعد ازاں معاشی آسودگی کے باوجود بھی وہ اپنی اصل شناخت کے لیے تڑپتے اور ترستے رہے مگر اب ان کے لیے واپسی کی کوئی صورت نہ رہی۔

> "یہ پاگل پن کا ایک وقتی ابال ہے چند روز میں ٹھنڈا ہو جائے گا اور پھر وہ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے تو امیر بخش نے سر اٹھا کر۔۔۔ جب اس کے سفید بالوں پر دیے کی مدہم لو پھٹکتی تھی، کہا نہیں چاچا" وہ اب کبھی اپنے گھروں کو نہیں لوٹیں گے۔۔۔ یہ جنون مدہم نہ ہو گا لوگوں کے بھاگ میں بے دخلی لکھی جا چکی ہے ان مٹ سیاہی سے جسے مٹانا ممکن نہیں۔"(22)

لہناں سنگھ کسی طرح چھپ کر بخت جہاں کے پاس آتا ہے جو اپنے گھر، حویلی کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اس مٹی کا بیٹا ہونے کے ناطے اس سے دور رہنا اس کے لیے مشکل ہے۔ اس مقامیت سے کٹ کر اس کی روایات، ثقافت سب کچھ مٹ گئے ہیں تاہم اس تاریخی تقسیم کے بعد وہاں نئی تہذیب کی نمائندے آبسے ہیں۔ جو خود بھی اس طرح اپنی مقامیتوں سے بے دخل کر دیے گئے ہیں۔ یہاں مقامیت ایک نئے تہذیبی دور سے گزری ہے جہاں کچھ لے اور دے کے اصولوں کے تحت مقامیت میں کچھ رسموں کا اضافہ اور کچھ اس میں سے خارج ہوئیں۔

"ٹھہر جا لہنیاں۔۔۔بخت جہاں وہیں ساکت ہو رہا تھا" وہاں۔۔اب کچھ بھی وہ نہیں رہا جو کبھی تھا۔۔۔تیری حویلی میں عجیب شکلوں والے پناہ گیر لوگ آن آباد ہوئے ہیں۔تجھے دکھ ہو گا۔۔۔نت کلاں کہ یہ نام ور گھروندے اور کچے مکان تجھے دکھائی دے رہے ہیں تو ان کے قریب جائے گا تو یہ معدوم ہو جائیں گے۔۔۔یہ ایک گزر چکے زمانوں کا سراب ہے اس کے قریب نہ جا۔۔یہاں سے آگے نہ جا۔۔کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تو نے نت کلاں کے بام و در دیکھ لیے۔۔۔تو قریب جائے گا تو یہ سب منہدم ہو جائیں گے۔"(23)

مقامیت سب سے زیادہ متاثر تو 1947ء کی تقسیم کے واقعے سے ہوئی۔ناول معنی 1971ء میں بنگال کی علیحدگی کا بیان بھی مختصراً ملتا ہے۔بخت جہاں کا سوتیلا بیٹا بھی اس سانحے میں مارا جاتا ہے۔ناول میں تاریخی واقعے کا مختصر تذکرہ ملتا ہے۔ناول نگار نے مختلف سیاسی، تاریخی اور عالمی واقعات کا بیان کرتے ہوئے اس مقامیت کے بیان میں عالمی تناظر کو بھی بیان کیا ہے۔اس کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے بیان میں نمائندگی مقامی کرداروں کو ہی دی گئی ہے۔

"تارڑ نے تاریخی و تہذیبی شعور میں ڈوب کر یہ کہانی تخلیق کی ہے ایک طرف تو صدیوں پر محیط تہذیب کے عروج و زوال کی کتھا بیان کی ہے اور زوال در زوال کے سفر کو عکس بند کیا ہے اور دوسرا تاریخ کو صحیح تناظر میں پیش کیا ہے۔"(24)

"خس وخاشاک زمانے" ایک وسیع زمانی تناظر میں لکھا گیا ناول ہے۔ناول میں پنجاب کی مشترکہ تہذیب سے تقسیم کے بعد کے حالات اور اس پہ مختلف تاریخی ادوار میں ہونے والے سانحات، اہم واقعات کا بیان ہے۔ناول میں اس مقامیت پر اثر انداز ہونے والے مختلف تاریخی ادوار کے ساتھ ساتھ اس مقامیت کو عروج سے زوال تک بیان کیا ہے۔اکیسویں صدی کے آغاز میں اس مقامیت کے کردار نہ صرف ملک کے بڑے شہروں بلکہ بیرونی ملک میں بھی قیام پذیر ہو گئے۔یہ کردار اپنی مقامیت سے باہر بھی اپنی مقامیت کے نمائندے ثابت ہوئے۔مصنف نے اس تاریخ کے نئے دور میں موجود ان مقامی ثقافت کے نمائندہ کرداروں کا ذہنی کرب بھی بیان کیا ہے یہ مقامی کردار بیرونی ملک رہ کر بھی اپنی قدروں کو بحال اور قائم رکھنے کے جتن میں مصروف ہیں۔تاہم ان کی آنے والی نسلیں ان جذبات سے عاری ہیں۔بخت جہاں کا بیٹا اس کرب سے گزرتا ہے جو مقامی مسائل سے عاجز آ کر اپنے ملک کو خیر باد کہتا ہے اس کے باوجود اس کے دل میں اس روایت کا پاس اور لحاظ رہتا ہے۔جو آنے والی نسلوں کے رویوں پہ کڑھتا دکھائی دیتا ہے۔اس کا کڑھنا فطری ہے کیونکہ انسان اپنی مٹی کی خصلت سے عاری نہیں ہو سکتا۔جس مٹی سے اس کا خمیر گوندھا گیا ہو اس کی روح اس کی جانب ضرور کھنچتی ہے۔

"میں نے پچھلی بار بھی آپ سے کہا تھا کہ محض مشرقی مروت کی ماری ہوئی ایک ایسی لڑکی ہوں جو اپنے ڈیڈی سے محبت کرتی ہے ورنہ۔۔۔میں بالغ ہوں اور اپنے فیصلے خود کر سکتی ہوں۔۔۔تو میں پارک سے بہر طور شادی کر رہی ہوں۔۔۔ہو سکتا ہے کہ آپ گرینڈ ڈیڈ بننے والے ہوں اب سے کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو گیا ہو۔۔دو ماہ گزر بھی چکے ہوں۔"(25)

اپنی مقامیت سے دوری اس نسل کا المیہ ثابت ہوئی۔ ایک طرف وہ بیرون ملک اپنی مٹی روایت کا نوحہ پڑھ رہے ہیں تو دوسری طرف یہاں مقیم نسلیں وہاں جانے کے جتن کر رہی ہیں۔ یہاں کے زمین اجڑ کر تھور اور آک اگا رہی ہیں۔ یہ عہد اس مقامیت کی تاریخ کا اہم دور ہے۔ جب مقامیت اپنی اصل شناخت سے محروم ہو رہی ہے جبکہ وہاں رہنے والے تنہائی اور کرب کی صورت میں اپنی زندگیوں کے دن پورے کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

"کوئی ایک شخص جو میرے دکھ سن لے جو میرے زخموں پر اور کچھ نہ سہی ایک گرم پھونک مار کر ان کی اذیت قدرے کم کر دے میں اسے خریدنے کی سکت نہیں رکھتا کہ دکھ کی شراکت کے لیے عزیزداری اور دوستی درکار ہے۔ دولت نہیں موتی تمہیں کیا خبر جس روز میں نے اس منحوس نسوانی شکل پر کاش سنگھ کو دیکھا ہے جس کے ساتھ سیرت لپٹی چلی آتی تھی میں اس روز ایک درخت کے تنے کو جپھا مار کر کیسے رویا ہوں کہ وہاں میرا دکھ بانٹنے والا کوئی نہ تھا۔"(26)

نائن الیون کا سانحہ اسلامی دنیا سمیت عالمی منظر نامے میں ایک ایسا واقعہ بن کر ابھرا جس نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ مغرب اور مشرق کے درمیان ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ مغرب جو روز اول سے مشرق کو انتہا پسند، قدامت پسند جیسے القابات سے نوازتا تھا اب اس نے ایک نئے بیانیے کی تشکیل دی جو خالصتاً مسلمانوں کے خلاف تھا۔ نائن الیون کے سانحے کے بارے میں جو عمومی رائے تھی وہ کچھ اس طرح سے ہے:

"The morning of September 11, 2001. The high jackers internationally crest two of the airlines in to the world trade centre in New York city resulting in the collapse of both building. Soon after and irreparable damage to nearby building .The high jackers crashed a third airline into the Pentagon" .(27)

اس سانحے کے بعد ایک ایسا مہا بیانیہ تشکیل دیا گیا جس سے مسلمانوں کو بطور خاص نشانہ بنایا گیا۔ پاکستان اس کے اثرات سے براہ راست متاثر ہوا۔ پاکستانی معاشرہ ہر سطح پہ اس سے متاثر ہوا۔ مقامی ثقافتیں ہوں یا بیرون ملک خود اس ملک میں ان ملکوں میں رہنے والے بھی کچھ عرصہ تک انتہائی تعصب کا نشانہ بنے۔ ان کے اثرات سے مقامی ثقافتیں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ مقامی کرداروں کے نمائندے ان ملکوں میں موجود تھے۔ جن کے تناظر میں ناول نگار وہاں کی مقامی صورتحال کو بھی بیان کرتا ہے۔

"امریکہ میں یکدم چھوت چھات کا نظام رائج ہو گیا تھا اور اچھوتوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔۔۔۔ بلکہ دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی موزلم آباد تھے وہ سب کے سب شودر ہو گئے تھے۔۔۔۔ ان ٹچ ایبل۔۔"(28)

ناول میں مقامی کرداروں کے ذریعے تاریخی سانحے کے اثرات بطور مسلمان قوم لوگوں کو اس کے اثرات برداشت کرنا پڑے۔ ناول میں موجود پنجاب کی مقامی ثقافت کے درمیان میں بھی اس مابعد جدید دور کے اثرات ملتے

ہیں۔ مقامی معاشرے بھی اس کے بعد ہونے والی معاشی معاشرتی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے۔ اکیسویں صدی میں اس مقامیت کے مٹنے کے کئی نئے در وا ہوئے اور کئی نئے رجحانات سامنے آئے۔

2019ء میں چین کے شہر وہان سے اٹھنے والی ہے وباء نے جلد ہی ایک عالمی وباء کی صورت اختیار کر لی۔ کرونا وئرس اکوڈ نائنٹین نامی اس بیماری نے تمام اقوام عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تاریخ کے اعتبار سے یہ وقت کئی حوالوں سے اہم ثابت ہوا۔ اس واقعے نے جہاں انسان کو خوف وہراس کا شکار کیا وہیں انسانی تاریخ کے کئی ایسے نئے موڑ نے جنم لیا۔ مقامیت کے اعتبار سے بھی اہم دور ثابت ہوا کہ بین الاقوامی طور پر قائم تصورات کا خاتمہ ہوا۔ بڑی ثقافتوں نے جو غلبہ چھوٹی ثقافتوں پہ قائم کر رکھا تھا وہ ختم ہو گیا۔ ٹیکنالوجی کے دعویدار بھی اس وباء کی لپیٹ میں گئے۔ زیادہ ترقی پذیر ملکوں سے بھی زیادہ آگے ان کی فراست ناکام ہو گئی۔ بجائے احتیاط کے کوئی چارہ نہ رہا۔ کمزور ملک اور معاشرے تو اس کی وجوہات کسی نہ کسی سے جوڑ کر اپنی تشفی کرتے رہے، کوئی اسے عذاب سے تو کوئی اسے اپنی غاصب طاقتوں کی سازش قرار دیتا رہا وجہ کوئی بھی ہو۔ اس وبا نے عمومی طور پر معاشرتی طور پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔

لاہور کے مقامیت کے تناظر میں ناول کا کردار بیان ہوا ہے۔ خارجی شواہد سے وہ لاہور کا ایک فرد ہے۔ جو پر آسائش جگہ پہ رہنے کے باوجود رسم ورواج کا قائل ہے۔ مشرقی معاشرہ نے اپنی روایتی قدروں کو زیادہ ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ ان کا مشرقی پن بہر حال کسی نہ کسی صورت قائم ضرور رہتا ہے۔ تاریخ کے اہم دور نے تمام اصولوں اور رسم ورواج کو مٹا دیا۔ اس مقامیت میں خوشی اور غمی کے موقعے پر دوسروں کی خوشی جو بھی میں شامل ہونا ایک اہم ثقافتی امر ہے۔ وبا کی ہلاکت خیزیوں کی وجہ سے انہیں بھی ترک کرنا پڑا۔ مقامیت کے یہ امور ختم ہو گئے مذہبی اعتبار سے بھی اس زمانے میں خاص ہدایات پر عمل ہو۔ الوگ عبادت گاہوں سے نکل کر گھروں میں عبادت کرنے لگے۔ کیا سکول اور کیا مساجد دونوں ہی خالی ہو گے۔ اجتماعیت جو اس مقامیت کا خاصہ تھی اب وہ نہ رہی۔ تنہائی میں مبتلا لوگ ذہنی کرب میں مبتلا ہوئے اجتمائی معاشرہ انفرادیت کی طرف بڑھا کاروبار اور زندگی کے دوسرے معاملات گھر بیٹھے ہونے لگے۔ اس کا تسلسل بعد از کرونا بھی جاری رہا۔ مقامیت میں آنے والی وقتی پابندیوں اور بندشوں نے بعد از کرونا بھی تسلسل جاری رکھا ہوا ہے اپنے کاروبار کے آن لائن ذرائع ہوں یا کمپیوٹر میں تنہائی میں کام کرنا جہاں کرونا کے وقت زندگی کے تسلسل کو جاری رکھنے کا یہ سبب بنی وہیں اجتماعیت کے مواقع پر بھی بہر حال اثرات ضرور پڑے اور بعد از اں کرونا کی صورتحال میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وبا کی وجہ سے اس مقامیت میں چند نئے پہلوں کا اضافہ ضرور ہوا۔ مقامی تحریک کے حوالے سے یہ دور اہم ثابت ہوا کہ اس میں ثقافتی معاشرتی اعتبار سے چند نئی چیزوں کا اضافہ ہوا اور پرانی قدروں کو زوال آیا۔

باب 4.2

II بیانیے اور سماجی روابط میں تاریخ کی اہمیت:

سماج افراد کا ایسا گروہ ہے جہاں لوگ مل کر کسی ضابطے کے تحت زندگی گزارتے ہیں اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل کرتے ہیں، کچھ اصول وضع کرتے ہیں۔ انہی اصولوں کے تحت وہ ایک سماجی زندگی کے روپ میں ڈھل جاتے ہیں۔ سماج کی بنیاد اور نوعیت مختلف ہو سکتی ہے۔ سماج کی تخلیق اور ترتیب بھی مختلف ہوتی ہے جس میں اس کے جغرافیائی حالات، مذہب اور مختلف پہلوؤں کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ سماج کی تشکیل اور اس کے عناصر کی وضاحت سے قبل سماج کی تعریف ملاحظہ ہو:

> "سماج لفظ سنسکرت زبان کے دو الفاظ سے مل کر بنا ہے۔ رسم اور رواج کے معنی اکٹھا یا ایک ساتھ اور رواج کے معنی متحد رہنا۔ یعنی سماج کے لغوی معنی ہیں ایک ساتھ مل کر رہنا اس خیال سے جہاں افراد ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں وہیں سماج بن جاتا ہے۔"(29)

ابوالاعجاز صدیقی کے مطابق:

> "سماجی تعلقات کا وہ نظام جس میں اور جس کے ذریعے ہم زندگی گزارتے ہیں۔ معاشرہ/سماج کہلاتا ہے۔ سماجی تعلقات کا یہ نظام بالفاظ دیگر ہمارا سماجی ماحول، ہمارے اوہام وعقائد، افکار و تصورات، ہمارے فلسفہ حیات اور ہمارے کردار کی تشکیل و تعمیر میں بہت حد تک دخیل ہوتا ہے۔"(30)

سماج افراد کا ایک منظم گروہ ہے جو باہمی اصولوں کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ انسان جہاں بھی رہیں گے کچھ نہ کچھ اصول وضوابط اپنی سہولت کی غرض سے ضرور وضع کریں گے۔ جس طرح سماج کے مختلف رسوم و رواج عقائد ہوں گے اسی طرح سماج کا ایک بیانیہ بھی ہوگا۔ اس بیانیے کی تکمیل سماج کے سیاسی، معاشی، تاریخی اثرات کے تحت پروان چڑھے گی۔ یہ تمام عوامل اس سماج کے بیانیے کی تشکیل کریں گے۔ اس بیانیے میں زیادہ پختہ بیانیہ عموماً مذہبی بیانیہ ہی ہوتا ہے۔ اس مذہبی بیانیے پہ بھی تاریخی اثرات ہو سکتے ہیں۔ تاریخی اور سماجی روابط میں کسی تاریخی واقعے کا بھی اثر ہو سکتا ہے یا تاریخی واقعہ بیانیے کی نوعیت کو تبدیل کر سکتا ہے۔ وہ مذہبی بھی ہو سکتا ہے اور سیاسی بھی۔ سماج تحریری اور زبانی بیانیے پہ چلتا ہے۔ تحریری صورت میں اگر قوی نہ ہو تو بھی زبانی بیانیہ کے تحت سماج کا بیانیہ چلتا ہے۔ سماجی بیانیے میں تبدیلی کسی بڑے واقعے کے بھی زیر اثر آتی ہے۔ وہ تاریخی اعتبار سے ہو یا کسی سیاسی انقلاب یا کسی مذہبی تبدیلی کی وجہ سے تاہم ہر صورت میں تاریخی دور اہم تصور کیا جا سکتا ہے کہ کسی خاص تاریخی عہد یا زمانے میں اس سماج کے بیانیے میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ پہ نگاہ دوڑائی جائے تو یہ خطہ عرصہ قدیم سے ہی مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا آئینہ دار رہا ہے۔ یہاں کی مٹی میں ہمیشہ بیرونی اثرات کو قبول کرنے کی صلاحیت رہی ہے۔ اس نے کئی بار اپنے بیانیے کو بیرونی

بیانیے کے ساتھ اختلاط کے ذریعے سے تبدیل کیا ہے۔اس حوالے سے تاریخ کے مختلف ادوار کا جائزہ لینے سے باآسانی اس امر کو سمجھا جاسکتا ہے کہ سماجی بیانیے میں کس طرح سے تاریخی پہلو اثر انداز ہوتے ہیں یا تاریخی واقعات کس طرح سے سماجی بیانیے کو متاثر یا یکسر تبدیل کر دیتے ہیں۔

1857ء سماجی بیانیہ کے حوالے سے ایک اہم تاریخی واقعہ ثابت ہوا۔انگریزوں کی مکمل عملداری سے مقامی بیانیے اور نو آبادیاتی بیانیے کا آغاز ہوا۔مقامی بیانیے نے نو آبادیاتی بیانیے کہ اثرات کو قبول کیا۔دونوں سماج کے بیانیے میں رابطہ قائم ہوا۔ادب نے بھی ان اثرات کو قبول کیا۔صنعتی انقلاب سے مقامی بیانیے میں کافی حد تک تبدیلی آئی۔ یہاں کے زرعی معاشرے میں صنعتی انقلاب کے آنے سے خود زرعی صنعت بھی متاثر ہوئی اور بیانیہ میں کافی حد تک تبدیلی آئی۔بیانیہ کی دوسری اہم صورت نو آبادیاتی بیانیے تھا۔نو آباد کاروں نے اپنا مخصوص بیانیہ قائم کیا اور اس میں بہت حد تک کامیاب ہوئے۔اس بیانیے کے زیر اثر انہوں نے مقامی لوگوں کی ثقافت،زبان مختلف ثقافتی اکائیوں یہاں تک کہ مذہب کو بھی کسی حد تک متاثر کیا۔نو آباد کاروں نے اپنے مذہب کی ترویج کے لیے بھی بہت تگ ودو اور محنت کی۔اس طرح سے مقامی بیانیے اور سماجی بیانیہ کے درمیان جو رابطہ قائم ہوا اس سے ایک اور بیانیہ تشکیل پایا جسے نو آبادیاتی بیانیہ قرار دیا جاسکتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے ان کے اختلاط سے مختلف نسلیں وجود میں آتی ہیں۔اس طرح بیانیے میں بھی تنوع یا تبدیلی ضرور آتی ہے۔شکست خوردہ قوم فاتح سے متاثر ہوتی ہے۔یہی وہ وقت ہوتا ہے۔جب فاتح اپنے سماجی سیاسی مذہبی بیانیے کی صحیح طور پہ آبیاری کر سکتا ہے۔

ماضی قریب میں ایک اور اہم واقعہ 1947ء کا واقعہ ہے۔تاریخی اعتبار سے سماجی روابط اور تاریخ کے اثرات کے طور پر تقسیمِ ہند کی مثال بھی ایک نمایاں مثال ہے۔1947ء میں ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ایک ہی جگہ کے مکین ایک ہی ثقافت کے لوگ دو حصوں میں منقسم ہو گئے۔ان کی تقسیم میں جو جذبہ کار فرما تھا۔وہ مذہبی ہی تھا۔دونوں ملکوں کے سماج نے بعد از تقسیم اپنے بیانیے کی بنیاد مذہبی عناصر پر رکھی۔یوں اس بیانیے میں تاریخ کے تناظر میں اہم موڑ آیا۔کئی اہم واقعات نے مقامی بیانیے کو متاثر کیا۔مقامی بیانیہ اس کے اثرات کو قبول کر کے اپنا رخ اس کے مطابق متعین کرتا ہے۔آنے والے صفحات میں اسی امر کے تحت بحث کی جائے گی کہ کس طرح تاریخ نے مقامی بیانیے اور سماجی روابط کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

تقسیم ہند میں مختلف پہلو کار فرما تھے۔جس سے مقامی بیانیے میں کافی حد تک تبدیلی واقع ہوئی۔مہاجرین کی آبادکاری دونوں طرف ہی ہوئی۔یہاں کے مختلف علاقوں سے مہاجرین ہجرت کر کے ہندوستان اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے پاکستان آئے۔یہاں وہ بغیر کسی مقامی شناخت کے ایک مذہب کی شناخت لے آئے۔

دوسرے علاقوں بس کر اور مقامی علاقوں میں ضم ہو کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ان میں سے غیر ارادی طور پہ بھی کچھ نہ کچھ رسومات اپنی مقامیتوں سے بھی ضرور ساتھ لائے تھے جس پہ انہوں نے اپنے نئے بیانیے کی بنیاد رکھی۔

دوسری صورت وہ تھی جہاں نئے آنے والے بڑے شہروں یا علاقوں میں آ کے آباد ہوئے اور مہابیانیے میں گم ہو کر اپنی مقامی شناخت کو بھلا بیٹھے اور اس بڑے مقامی مہابیانیے میں اپنے آپ کو ضم کر دیا۔ شہروں میں رہنے والے اپنی مقامی ثقافت اور اپنی اصل شناخت کو بھلا بیٹھے۔

جاگے ہیں خواب میں ہزارہ کی ثقافت کو تاریخی تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے ادب کے قاری کو ثقافت کی تمام باریکیوں تمام عناصر کے ساتھ واضح کیا ہے۔ ماضی کے جھروکوں سے جدید عہد تک کے اس ناول میں مقامی ثقافت کے مختلف ادوار دکھائی دیتے ہیں۔ان تمام عناصر میں ایک اہم جز ان مقامی لوگوں کے ہاں اپنی روایت ہے۔ جو صدیوں پہلے کا زمانہ ہو یا اکیسویں صدی کا زمانہ ناول میں موجود ہے۔ لوگوں کے ہاں اپنی روایات کی تقلید، وہی لحاظ اور پاس ملتا ہے۔ ناول نگار نے تاریخ کے مختلف ادوار میں ہزارہ کی اس مقامیت کا ارتقائی سلسلہ بیان کیا ہے۔ نوآبادیاتی عہد کی کسی قدر زیادہ تفصیل ملتی ہے۔ سکھوں کی مہم جوئی ہو یا سید احمد بریلوی کا بیان یا پھر میجر ایبٹ کا بیان ان مختلف تاریخی واقعات کا کسی نہ کسی صورت مقامی زندگی پہ گہرا اثر پڑا ہے۔

سماجی رابطے کے تناظر میں دیکھا جائے تو سید احمد بریلوی شہید کے مذہبی اثرات اس علاقے نے کافی حد تک قبول کیے جس کی وجہ سے مقامی علاقوں میں موجود بیانیے میں تبدیلی آئی اور مذہبی بیانیے کو زیادہ تقویت ملی۔اس مذہبی بیانیے کے اثر سے لوگوں نے اپنی بہت ساری روایتی رسمیں جو اسلام کے مذہب کے خلاف تھیں وہ ترک کر دیں اور مذہبی لحاظ سے بھی ان کے ہاں خارجی اور داخلی اعتبار سے کافی تبدیلی ہوئی۔اس سماجی رابطے کو ہزارہ کی مقامیت میں ایک اہم عہد کی حیثیت حاصل ہے۔

دوسرا اہم عہد نوآبادیاتی عہد ہے۔ میجر رابیٹ کے بیان میں ناول میں اس کی نمائندگی ملتی ہے۔ نوآبادکاروں نے اپنی ثقافت کی آبیاری کی۔ یہاں جدید سکولوں سڑکوں کا نظام بچھایا۔ جس سے مقامی ثقافت میں بھی اثر پڑا۔ مقامی بیانیے میں مذہبی کے بجائے سیاسی معاملات میں بھی جگہ بنائی۔ انگریزوں کی آمد سے اس علاقے میں ترقی کے کئی مواقع کھلے۔ اگرچہ اس کا مقصد ان کے اپنے مفادات تھے۔ مگر انھوں نے مقامی لوگوں کو کسی نہ کسی صورت سہولت فراہم کی اور ان کی ہمدردی سمیٹی لیکن سماجی رابطے کا یہ دور مقامی لوگوں کی زندگیوں میں کئی نئے در وا کر گیا۔اس لحاظ سے اس عہد کو اس تناظر میں اہم قرار دیا جا سکتا ہے جب اس علاقے میں خارجی طور پہ تبدیلی ہوئی اور مقامی بیانیے میں بھی کسی حد تک تنوع آیا۔اس سے قبل مذہبی عقیدت اور مذہبی بیانیے کا زور زیادہ تھا لیکن انگریزوں کے آنے سے اب سیاسی اور سماجی بیانیے میں بھی تنوع آیا۔

اس طرح سے صدیوں پرانی یہ روایت آگے چلتی رہتی ہے۔ اکیسویں صدی میں جہاں جدید دنیا کا ایک نظام رائج ہوتا ہے وہیں یہ ہزارہ کی مقامی ثقافت پہ بھی کسی نہ کسی طرح سے اثرات پڑتے ہیں۔ 2005ء کا زلزلہ بھی اس حوالے سے اہم قرار دیا جاسکتا ہے۔ جہاں مقامی بیانیے میں اب جدت اور وسعت آئی ہے۔ مقامی لوگوں کے باہر کے لوگوں سے تعلقات مزید بڑھ گئے۔ جدید ذرائع ابلاغ نے بھی مقامی بیانیے کو کسی نہ کسی حد تک متاثر ضرور کیا ہے ۔لوگوں کے جدید دنیا کے ساتھ تعلقات استوار ہوئے۔ لوگ روزگار کے حصول کے لیے باہر کے ملکوں اور شہروں میں جانے لگے۔ یوں مقامی بیانیے میں بیرونی اثرات کو قبول کرنے کے عناصر بھی شامل ہوگئے۔ محض مذہبی بیانیہ ہی نہیں بلکہ سیاسی اور سماجی بیانیہ میں بھی تنوع وقت کے ساتھ ساتھ ارتقاء پذیر ہوا۔ اس طرح سے ان، مندرجہ بالا ادوار کو مقامی تاریخ میں سماجی رابطے کے حوالے سے اہم قرار دیا جاسکتا ہے جس نے مقامی بیانیے میں کسی نہ کسی حد تک تبدیلی کے اثرات کو لازم قرار دیا۔

جندر ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ ہے۔ سماجی اعتبار سے اپنے پرکھوں کے جندر کے پارٹ حاصل کرنے کے واقعے کے علاوہ کوئی تاریخی سماجی رابطے کا واقعہ دکھائی نہیں دیتا۔ جندروئی کے داداؤں کا ایک راجہ کے علاقے میں آبسنا اور پھر ان سے مکالمہ اس سماج کا ایک ایسا موڑ ساثابت ہوا کہ وہ انعام کی صورت میں حاصل کیے گئے پارٹوں اور جندر کے لیے زمین کا ٹکڑا بطور انعام حاصل کرنے کے بعد اس سماج کا حصہ بن گئے۔ جن لوگوں کو اول اول ان لوگوں نے پنچ خیال کر کے ان کو پاس بٹھانے کو معیوب سمجھا۔ اہم بات یہ ہے کہ (چکی) جندر کے بننے کے بعد وہ انہی کی پسی ہوئی گندم کھاتے ہوں گے۔ عموماً چھوٹے ثقافتی گروہوں سے بڑے گروہوں تک ہندوستان کے طول و عرض میں مذہبی تصورات سماج میں حاوی رہے۔ ان مذہبی تصورات کے من گھڑت اور حسب منشاء تصورات سماج میں ایک عجب صورتحال پیدا کر دیتے ہیں۔ اس صورتحال میں ایک مخصوص سماجی ماحول پروان چڑھا اور سماج کے تصورات میں چھید لگانا اگرچہ مشکل کام ہے۔ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ ان کے تصورات کو کسی نہ کسی حد تک کمزور کیا جاسکتا ہے یوں انسانیت کا علم بلند ہو بھی جائے تو یہ تصورات کسی نہ کسی صورت باقی ضرور رہ جاتے ہیں۔

1947ء میں ریاست بہاولپور ایک نئے تاریخی دور سے گزری۔ ذاتی خود مختاری کے طور پہ قائم یہ مقامیت ایک بڑے ملک کا حصہ بنی۔ مقامی کے سیاسی پہلو اس مقامیت پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ تاریخ کے اہم ادوار اور سیاسی فیصلے بسا اوقات کسی مقامیت کے فروغ یا معدوم ہونے کا پیش خیمہ بھی بن جاتے ہیں۔ ادھ ادور ے لوگ میں تو نوحہ ہی اس بات کا ہے کہ مقامی لوگ اپنی شناخت کے متلاشی ہیں۔ ناول نگار نے بہاولپور کی تاریخ سے استفادہ کرتے ہوئے اس تاریخی سانحے کو مقامیت کی ذیل میں بیان کیا ہے۔ مقامی بیانیے اور سماجی روابط میں اہم موڑ بھی یہی تاریخی دور تھا۔ مقامی لوگوں میں سے کچھ تقسیم کے فیصلے کے بعد مذہبی تفریق کے باعث اس علاقے کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو اس

کے بدلے میں مہاجرین کی بڑی تعداد یہاں آباد ہوئی۔ جو اس مقامی آبادی سے نہ صرف تعداد بلکہ مہارت میں بھی زیادہ تھے کہ انہوں نے مقامی لوگوں کے کاروبار کو بھی سمیٹ کرر کھ دیا ہر جگہ ان کی اجارہ داری نظر آتی ہے۔

اس تاریخی واقعے کے بعد یہاں کی مقامیت میں نئے سماجی ڈھانچے کی بنیاد وجود میں آئی۔ یہاں آنے والوں میں ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے بھی شامل تھے جو مختلف زبانوں اور علاقوں کے لوگ تھے اور پاکستان کے کچھ بڑے علاقوں کے لوگ بھی یہاں بسے مقامی نوابین نے ان کو کھلے دلوں سے خوش آمدید کہا۔ ان کو زمینیں بھی الاٹ ہوئیں، اس طرح یہاں سے بلکہ مختلف ثقافتوں، علاقوں اور زبانوں کے نمائندے بھی آ گئے تھے۔ یہاں کے سماجی نظام میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔

مقامی بیانیے میں بھی تبدیلی آئی۔ مقامی الفاظ کے ساتھ ساتھ آنے والوں کی زبان کے الفاظ ہوں یا رسم و رواج بھی ان کی آمیزش سے بہاولپور کا مقامی بیانیہ بھی تبدیل ہوا۔ بہاولپور کا مقامی بیانیہ جو محض مقامی شناخت کا حامل تھا جس میں مذہب کی تخصیص کے بغیر ایک ثقافتی اکائی موجود تھی اس مقامی جغرافیے سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر اب ایک نیا سماجی ڈھانچہ وجود میں آ رہا تھا۔

سماجی بیانیہ میں مختلف اثرات کے ساتھ ساتھ مذہبی اثرات بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اس کا اثر زیادہ ہے۔ برصغیر کی تقسیم سے قبل سماجی بیانیے میں اور بعد از تقسیم بیانیے میں واضح فرق دیکھا جا سکتا ہے۔ تقسیمِ برصغیر کے نتیجے میں مقامی علاقے سے مقامی لوگوں کے خلاف اور بعد میں آنے والے مہاجروں کا تبادلہ ضرور ہوا۔ دونوں ملکوں کی تقسیم کی بنیاد مذہب کی تفریق ہی بنی۔ یوں اس کے بعد وجود میں آنے والے بیانیے میں اس کا واضح فرق دیکھا جا سکتا ہے۔ بہاولپور کی مقامیت ایک مذہب کے ساتھ مخصوص ہو گئی جبکہ مقامیت کی اصلی ثقافتی جڑیں بھی کمزور ہو گئیں اور مختلف تہذیبوں کے اختلاط سے ایک نیا سماجی ڈھانچہ ہی وجود میں آیا بلکہ ایک نیا بیانیہ بھی وجود میں آیا۔

بہاولپور کی مقامیت میں دوسرا اہم واقعہ اس کی جغرافیائی، سیاسی، تاریخی حیثیت میں تبدیلی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد اسے ریاست سے صوبہ اور صوبے سے ڈویژن میں ڈال کر ایک بڑے ثقافتی گروہ کا حصہ بنا دیا گیا، یوں سماجی بیانیہ میں اس کی کسک بھی موجود ہے۔ جو اس کے بعد مقامی لوگوں کے دلوں میں پروان چڑھی، سماج میں موجود زبانی اور نئے سماجی ڈھانچے سے تبدیلی واقع ہوئی۔ اس تاریخی واقعے کا گہرا شعور ہے۔ ایک طرف سماجی روایت میں تنوع ہے تو دوسری طرف مقامی بیانیہ، مہابیانیہ کے تصور میں گم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ مقامی سماجی بیانیے اپنے وجود کو کھوجنے کے جتن میں مصروف ہیں۔ جس کے لیے اول اول تو کوششیں تیز تھیں مگر سیاسی اور حکومتی فیصلوں کے نتیجے میں رفتہ رفتہ

یہ کوششیں دم توڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں بلکہ آئندہ آنے والی نسل تو اپنی شناخت سے بھی محروم ہو کے ایک بڑے مہابیانیے کی شناخت کی حامل بن چکی ہے۔

1871ء سے 1878ء کے درمیان کراچی روڑی ملتان اور پنجاب کے درمیان ریلوے ٹریک بچھایا گیا ۔ناول نگار نے اس تاریخی عہد کے تناظر میں اس مقامیت کو بیان کیا ہے۔ بستی آدم واہن اس مقامیت کی ایک نمائندہ بستی ہے۔ یہ بیانیہ محض اس بستی کا ہی نہیں ہے بلکہ برصغیر کی مجموعی صورتحال کا احوال بھی ہے۔ برصغیر میں کئی ضمنی ثقافتیں موجود تھیں اور ہنوز ہیں۔ ان میں سے ہر مقامیت ایک الگ تجربے سے دوچار ہوئی۔ بستی آدم واہن اور نوآباد کاروں کے درمیان مکالمے کی وجہ ریلوے ٹریک کے راستے میں آنے والا قبرستان بنا جوان دنوں تہذیبوں کا ٹکراؤ بھی ثابت ہوا۔ بیرونی آباد کاروں کی ترقی ان سے کہیں زیادہ ہے۔ مادی وسائل سے مالامال ہیں۔ ان کا یہ رعب ان کی برتری ثابت کرتا ہے وہ طاقتور ہیں۔ اس لیے ان کی طاقت اور فراست کے سامنے ان مقامی لوگوں کی ثقافت اور فراست کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس تاریخی عہد میں ایک پسماندہ اور ترقی یافتہ قوم کے درمیان سماجی رابطہ بھی قائم ہوتا ہے۔ ایک پسماندہ اور فرسودہ مگر ثقافتی اعتبار سے خوددار قوم ایک ایسی قوم سے آشنا ہوئی۔ جو فراست، مادی وسائل اور جدیدیت میں ان سے کہیں آگے ہیں۔ یہ مقامیت بھی اس کے اثرات سے متاثر ہوئی۔ منیر فیاض ان دونوں ثقافتوں کے حوالے سے قدرے تفصیل سے کچھ اس انداز میں رقم طراز ہیں کہ:

> "محمد حفیظ خان نئے تاریخ کے کیسے دور کا انتخاب کیا ہے جہاں ایک طرف ایک ایسا زرعی مشورہ ہے جس میں Primitive معاشرے کے انسان کی تہذیب کی باقیات دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ معاشرہ مذہبی توہم پرستی اور قبائلی طرز کے سماجی طاقت کے زیر اثر ہے۔ اس معاشرے میں مذہبی اشرافیہ بھی بہت طاقتور ہے دوسری طرف استعماری طاقتیں ہیں جو صنعتی قوت کے بل بوتے پر اس تہذیب کے وسائل کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ پہلی تہذیب کا cata phora (مابعد) آج کے صنعتی دور کا انسان درمیان میں انواسی ایسی جغرافیائی اور زمانیا کائی بنتا ہے جہاں ایک عہد دوسرے کو کچل کر آگے بڑھتا دکھائی دے رہا ہے۔ اکیسویں صدی میں یہ منظر نامہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔"(31)

دو مختلف ثقافتوں کے درمیان ایک نئے دور کا آغاز ہوا جہاں اس بات کی تفصیل کی زیادہ ضرورت نہیں کہ ان کے مثبت اور منفی پہلو کیا تھے مگر مجموعی طور پر اس مقامیت میں سماجی روابط کے اعتبار سے ایک تاریخی دور ثابت ہوا۔ اس تاریخی عہد میں دو مختلف رجحانات کے حامل تہذیبوں میں ایک کی بنیاد حاکم دوسری محکومی تھی۔ جہاں ایک مادی وسائل سے مالامال تہذیب دوسری پہ اپنی برتری ثابت کرنا چاہ رہی ہے۔ اس پر بیرونی قوت کی جدیدیت اس کی فراست سے باہر ضرور ہے جو اس کے احاطہ ذہن کے بند گوشوں میں شاید چرکے لگانے کی صلاحیت بھی نہ رکھتی۔ اس کے باوجود ایک نیا عہد ضرور شروع ہوا۔ اس کی بنیاد ان تمام واقعات کے تناظر میں تو اسی نقطے تک پہنچتی ہے کہ

مرعوبیت ہی اس مقامیت کا مقدر بنی۔ اس صورتحال میں بھی ایک نئے سماجی بندھن کا آغاز ہوا۔ ریلوے لائن بچانے کا معاملہ اس مقامیت کے لیے غیر معمولی ثابت ہوا اور اس مقامیت کو ایک نئے دور میں داخل کر گیا۔ نوآبادکاروں نے اپنی صنعتی ترقی کے بل بوتے پر اس مقامیت کو اپنے جڑوں سے دور کر دیا۔ پسماندہ لوگ اس کی مرعوبیت میں کھونے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ دور دراز کے اس علاقے میں اگرچہ جنگ وجدل نے زیادہ اثرات مرتب نہ کیے کیونکہ جو اپنی مقامی زندگی کا تسلسل کئی صدیوں سے قائم رکھے ہوئے تھے۔ دور دراز کے علاقے میں اگرچہ جنگ وجدل زیادہ اثرات مرتب نہ کیے ہوں گے جو اپنی مقامی زندگی کا تسلسل کئی صدیوں سے قائم رکھے ہوئے تھے۔ تاہم صنعتی انقلاب کے حامل افراد نے اسے بدل ڈالا۔ سماجی تبدیلی کے اعتبار سے تاریخ کے ان واقعات نے مقامیت کو بڑی حد تک تسلیم کیا اور مقامیت ایک نئے نظام کے زیر اثر پروان چڑھنے لگی۔

نیلی بار میں مصنفہ نے ایک ایسے عہد سے اس مقامیت کی تاریخ کا آغاز کیا ہے۔ جب مقامی آبادی کے ساتھ باہر سے آنے والوں کا تہذیبی اختلاط ہوا۔ ان باہر سے آنے والوں نے مقامیت کو متاثر کیا کہ ان کی اپنی ثقافت تھی اور مقامی لوگوں کی اپنی مخصوص شناخت تھی۔ مقامی لوگ ان کی بدولت بہت سے نئے پہلوں سے آگاہ ہوئے۔ ان مقامی لوگوں نے مہاجروں کی ثقافت سے اثرات قبول کیے۔ انگریزوں نے ان علاقوں میں لوگوں کو گھوڑی پال مربعے الاٹ کیے تھے جو بعد ازاں تقسیم کے بعد ان لوگوں کی ہی ملکیت بن گئی۔ ان بیرونی لوگوں نے بھی مقامی لوگوں کے اس استحصال کو جاری رکھا جو اس قبل ان کا ہو رہا تھا۔ ان کی حیثیت میں تبدیلی نہ ہوئی اور وہ مزارعے کے منصب تک ہی محدود رہے۔ ان کی زندگیوں میں زیادہ تبدیلی نہ آئی بلکہ وہ کم ذات ہی سمجھے گئے۔ تاہم ان لوگوں کا تعلق ان مہاجرین سے استوار ہوا تو وہ بھی چادر اور چار دیواری کے تصور سے آشنا ہوئے۔ ان بعد میں آنے والوں نے بھی ان کو پنچ خیال کرتے ہوئے ان کے گلوں میں پڑے غلامی کے پٹوں کو اتارنے کے بجائے ان کا تسلسل جاری رکھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی اس کا تسلسل جاری رہا۔ مرکزی حکومتوں میں ہونے والی تبدیلیاں اور اصلاحات کا حظ ان مقامی لوگوں تک نہ پہنچ سکا۔ مرکزی حکومتوں میں ہونے والی تبدیلیاں اور ان کے اثرات سے تو یہ لوگ واقف نہ تھے پر ان کے ذیلدار اور چودھری ان سے خوب واقف تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے آپ کو مزید طاقتور بنانے کے لیے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا کیونکہ ان کے لیے ووٹ حاصل کرنا کوئی مشکل نہ تھا۔ اگر ان کے اندر اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کی جرات پیدا کر بھی دی تو اسے اس طرح سے خاموش کرایا جاتا تھا کہ آیندہ کوئی ایسا کرنے کی جرات نہ کر سکے۔ مہاجروں کے آنے سے ان مقامی لوگوں میں بھی کچھ نہ کچھ سوجھ بوجھ پیدا ہونے لگی مگر ان کے مالکان کی فراست کے سامنے ان کی کچھ نہ چل سکی۔

"نہیں تھانیدار صاحب! یہ سب جدی پشتی ہمارے بردے غلام ہیں بے زبان رعیت ہیں۔انھیں گمراہ کیا گیا ہے ورنہ ان کی بدھی میں ایسی سکیم آ ہی نہیں سکتے یہ منصوبے آ ہی نہیں سکتے یہ توصرف خدمت گزاری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔خدا کو ان سے کوئی اور کام نہیں لینا ان سے تو نماز اور روزے کی بازپرس بھی نہیں ہوگی۔اس لیے تو انہیں پہلا کلمہ بھی نہیں آتا۔ان کے پیچھے مہاجروں کا شاطر دماغ ہے جو خود کو چودھری کہتے ہیں۔۔۔ان مہاجروں سے ناک کی لکیریں نکلوانا پڑیں گی۔ورنہ یہ فسادی اور چالاک پھر کسی فتنہ کو پیدا کر سکتی ہے لیکن ذرا طریقے سہج سہج کر زمانہ مارشل لاء کا ہے۔یہ بدمعاش گنڈا ریٹائرڈ فوجی ہے اور اوپر بھی ایک فوجی بیٹھا ہے۔"(32)

نیلی بار کے باشندوں کو ایک منصوبے کے تحت ایسی سوچ کا مالک بنا دیا گیا تھا کہ وہ اپنے زمینداروں سے ذیلدروں کی چاکری کرنا اپنا فرض سمجھ لیا گیا تھا۔ان کے تصورات کچھ بیانیے سے روشن کر دیا گیا تھا۔اس مخصوص بیانیے کی آبیاری نسل در نسل کی گئی۔بعدازاں ان کو مذہبی بیانیہ کے تحت اپنا غلام بنایا گیا۔مذہبی بیانیے کے زیر اثر بھی ان لوگوں کا استحصال کیا گیا یعنی کہ مذہبی تعلیم بھی اس قدر ادھوری تھی کہ اس کا فائدہ یہ لوگ خود اٹھاتے تھے۔بیرونی لوگوں کی آبادکاری سے اس مقامی بیانیے میں مجموعی فرق ضرور پڑا لیکن ان لوگوں نے اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر مذہبی بیانیوں کو پروان چڑھایا اور اس کے زیر اثر ان لوگوں کا استحصال کیا۔ناول میں اکیسویں صدی کے تناظر میں ہونے والے واقعات اور مذہبی کرداروں کے بیان میں اسی بیانیے کی وضاحت کی گئی ہے۔اس مذہبی بیانیے کے ثمرات اٹھاتے یہ لوگ اپنی زندگیوں کو دنیاوی عیش و عشرت کا سامان کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔نیلی بار کا مقامی مذہبی بیانیہ بعد میں اس کے سیاسی اور سماجی ماحول پر اثر انداز ہوا۔اس بیانیے کے تحت آمریت کا عہد ہو یا جمہوریت کا اکیسویں صدی کا ترقی یافتہ دور، بار کے لوگوں کو اس کے تحت کسی نہ کسی کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ضرور پہنے دکھائی دیتے ہیں۔

نیلی بار میں مختلف ادوار کا احاطہ کیا گیا ہے۔مقامیت کے پیرائے میں اسے مختلف تاریخی ادوار میں بیان کیا گیا ہے۔مختلف حکومتوں کے زمانے میں ان مقامی لوگوں کے حالات کے عکاسی ملتی ہے۔بھٹو کی زرعی اصلاحات کے موقعے پر بھی اس مقامیت میں خیال پیدا ہوا کہ شاید ان کی حالت سنور جائے مگر ایسا نہ ہو سکا۔

نائن الیون کا واقعہ دنیا کی تاریخ میں بہت گہرے اثرات مرتب کر گیا۔ناول میں مصنفہ نے اس واقعے کو بھی مقامیت کے درمیان سماجی رابطے میں ایک اہم واقعہ قرار دیا۔نام نہاد جہادیوں نے ان علاقوں میں بھی کیمپ لگائے سادہ لوگوں کو آخرت کے خوف دلا کر، اسے سنوارنے کے خواب دکھا کر ان کی اولادوں کو قابو کر کے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔مقامی لوگ اپنی اولادوں کو اپنی آخرت سنوارنے کی خاطر ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔اس مقامی مذہبی بیانیے کے تحت ایک دفعہ پھر استحصالی قوتوں نے اپنا فائدہ اٹھایا۔ناول "نیلی بار" مجموعی طور پر ان واقعات سے

بھرپور ہے جو اس مقامی تاریخ اور سماجی رابطے میں اہم ثابت ہوئے۔ اکیسویں صدی تک پھیلا یہ ناول ان لوگوں کی کہانی ہے جو بالآخر اپنے حقوق سے آگاہ ہوگئے۔ نسل در نسل غلامی کا شکار رہنے والے ان لوگوں کی آنے والی نسلوں میں شعور اجاگر ہو گیا وہ کسی حد آزاد اور خود مختار ہو گئے۔

گراں پوٹھوہار کی مقامیت کے بیان کا حامل ناول خطہ پوٹھوہار کی مقامیت کے ساتھ ساتھ اس کی تاریخ کے اہم ادوار کا بیان بھی ہے۔ ناول کے ارتقاء کے مطابق اسے تین تاریخی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جو اس مقامیت کے اہم تاریخی ادوار تھے بلکہ ان تینوں ادوار میں سماجی روابط کا بھی ایک نئے سلسلے کا دور تھا۔ جب مقامیت اپنی معراج پر تھی لوگ مختلف مذاہب کی تفریق کے باوجود بھی محض مقامی شناخت کے حامل تھے۔ ان لوگوں کا سماجی دائرہ کار بھی محدود تھا۔ پوٹھوہار کے دور دراز گاؤں، ڈھوکوں میں تقسیم یہ لوگ اپنے تہذیبی ورثے کو نسل در نسل سنبھالے زندگی گزار رہے تھے۔ اس دور میں مقامی لوگوں کا صدیوں پرانا رہن سہن تھا۔ مشترکہ لوگوں کا باہر کی دنیا میں زندگی سے کم ہی واسطہ پڑتا تھا۔

دوسرا دور نو آبادیاتی عہد کا ہے۔ انگریزوں کی اس خطے میں آمد کے ساتھ ہی ہندوستان کی مجموعی صورتحال کے ساتھ ساتھ ضمنی ثقافتیں اور مقامیت بھی متاثر ہوئیں۔ اس عہد میں نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا۔ اس طرح اس مقامیت کا براہ راست باہر کی دنیا سے سماجی رابطہ قائم ہوا۔ لوگ مختلف علاقوں میں فریضے کی غرض سے جاتے اور دوسری ثقافتوں سے بھی روشناس ہوئے۔ مقامیت میں پہلی تبدیلی کا دور اسی دور کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ پوٹھوہار کے نوجوان بڑی تعداد میں فوج کو ذریعہ معاش بنانے لگے۔ جہاں وہ باہر کی دنیا سے آگاہ ہوتے وہیں ان کی مقامیت میں ایک نئے باب کا آغاز بھی ہوا۔

تیسرا دور 1980ء کے بعد کا ہے۔ یہ عہد مقامی ثقافت کے حوالے سے ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ بین الاقوامیت کے نرغے میں اس مقامیت کے لوگ آنے لگے۔ لوگ اپنے ملک و قوم اور مقامی ثقافت سے دور ہونے لگے۔ صنعتی ترقی نے لوگوں کی زندگیوں کو سہل کیا تو ان کی سماجی جڑت میں بھی چھید لگا۔ لوگ اس مقامی جڑت سے آزاد ہونے لگے۔ باہر کی سماجی دنیا سے تعلقات استوار ہوئے تو مقامیت اپنی شناخت کو گم کرنے لگی۔ گلوبل ویلیج کے تصور نے اس مقامی سماجی ڈھانچے کو یکسر تبدیل کر دیا۔ لوگ اپنی شناخت کو اپنانے سے اعتراض کرنے لگے ان کے نزدیک ان کی قدامت کا باعث ہی یہ مقامیت ہے۔ جدیدیت کے نام پر لوگوں نے اپنے اصل سے انحراف کی راہ نکال لی۔

"ماڈرن کالجوں میں پڑھنے والے اس پانی کو unhygienic قرار دے چکے تھے۔ اس لیے پائپ کا پانی اور سوڈا واٹر پیتے تھے۔ پانی کے بدلے ہوئے اطوار دیکھ کر پرانی نسل کے لوگ سہمے سہمے رہنے لگے کہ جب پانی اپنی تاثیر بدلتا ہے تو بپھر کر سیلاب ہو جاتا ہے یا سوکھ نمک بن جاتا ہے۔ اس وقت زمین اپنی مٹھاس خود ہی چوس لیتی ہے اور جسم و جان میں تھور بھر جاتا ہے۔"(33)

ناول میں یہ آخری تاریخی دور مقامیت میں سماجی روابط کے حوالے سے اہم ہے۔ جدیدیت کی طرز فکر مراجعت نے اس مقامیت کو زوال سے دوچار کیا مقامی لوگوں نے ان آسائشوں کے ساتھ توازن کے بجائے اپنی مقامیت کے خاتمے کو ترجیح دی۔

نولکھی کوٹھی مشرقی پنجاب سے تقسیم ہندوستان ترقی کے تاریخی ارتقاء کا احاطہ کرتی ہے۔ پنجاب برصغیر کا ایک وسیع وعریض صوبہ اور ایک مکمل ثقافتی شناخت کا حامل خطہ تھا۔ جہاں دو بڑے مذاہب سکھ اور مسلمان آباد تھے۔ سماجی رابطے کے ضمن میں پہلا دور وہ تھا۔ جب انگریزوں نے یہاں پہ حکومت قائم کی۔ انگریزوں کی عملداری سے مختلف سطحوں پہ مقامی بیانیوں میں تبدیلی واقع ہوئی۔ انگریزوں کے آنے سے یہاں صنعتی انقلاب آیا۔ پنجاب برصغیر کے ان علاقوں میں سے خاص الخاص تھا۔ جہاں زرعی ترقی زیادہ تھی۔ جہاں کی مقامی آبادی کا زیادہ دارومدار زراعت پہ تھا۔ انگریزوں نے اس کو ترقی دینے کی غرض سے نہری نظام متعارف کرایا۔ جس کا فائدہ بالآخر ان کو ہی ہونا تھا کہ جتنی زیادہ فصلیں، اتنی زیادہ لگان حاصل کرنا تھا۔ اس طرح سے ایک صنعتی اور ایک زرعی معاشرے کے درمیان رابطے کا براہ راست آغاز ہوا۔ انگریزوں کے آنے سے قانون میں بھی تبدیلی ہوئی۔ انگریزوں نے ہر سطح پہ اصلاحات کیں۔ مقامی جاگیرداروں کو بھی اپنا دست نگر بنایا۔ ان کی حمایت کر کے محض اپنی طاقت میں اضافہ کرنا تھا ۔ دراصل وہ خود بھی ان کے ہی در کے سوالی تھے۔ مقامی بیانیے میں نوآبادیاتی بیانیے کے اضافے کے ساتھ ایک عہد کا آغاز ہوا مگر یہ عہد اپنے نصف النہار پر پہنچنے کے قریب ہی تھا کہ اس میں ایک اور موڑ آیا۔

اکیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں مقامی سیاسی جماعتوں کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا۔ جو رفتہ رفتہ شدت اختیار کرنے لگا یا سیاسی جماعتیں زیادہ بصیرت کی حامل ہوتی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی برصغیر میں تفریق کا بھی آغاز ہو گیا۔ آغاز میں تو انگریزوں نے پس پردہ دونوں گروہوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا لیکن بعد ازاں یہ ان کے اپنے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوئے۔ جنگ عظیم میں انگریزوں کی شکست نے ان کو اپنے اندرونی معاملات میں الجھا کر رکھ دیا اور رفتہ رفتہ برصغیر کی سیاسی جماعتوں نے بھی آزادی کے نعرے بلند کیے تاہم مقامیت کے تناظر میں اہم بات ان سیاسی جماعتوں کی بنیاد مذہب پہ ہونا تھا۔ یہ سیاسی جماعتیں محض سیاست ہی نہیں بلکہ مذہبی حمایت کی حامل تھیں اور ہندوستان میں دو بڑے مذاہب کا ٹکراؤ بھی ہوا۔ اسی عہد میں پنجاب کی مقامیت میں سکھ اور مسلمان جو ایک مقامی شناخت کے حامل تھے اب دو مذاہب کے نمائندے بن کر ابھرے۔ اس کے ساتھ ہی اس سرسبز و شاداب علاقے میں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ جوں جوں سیاسی معاملات آگے بڑھے تو مقامی لوگوں میں تفریق بھی بڑھتی گئی اور اس تفریق نے مقامیت کی شناخت کو پس پشت ڈال دیا۔ یہ دور مقامی تاریخ میں ایک اہم دور ثابت ہوا۔ سماجی رابطے کے حوالے سے بھی ایک نیا سماجی ڈھانچہ وجود میں آنے کا منتظر تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جب تقسیم کا عمل قریب آیا اور جب

تقسیم کا عمل شروع ہوا تو مذہب کی بنیاد پہ دونوں اطراف خواہ وہ مغربی پنجاب ہو یا مشرقی پنجاب دونوں مقامیتوں کے حامل لوگ اپنے گھر بار اپنی مٹی سے بے دخل کر دیے گئے۔ صدیوں ایک ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے اور لوگوں کی شناخت اس کی مقامی شناخت سے ہٹ کے مذہب کے پیرائے میں ہونے لگی۔ مشرقی پنجاب سے مغربی اور مغربی پنجاب سے مشرقی پنجاب میں لوگ ہجرت کر کے جانے لگے۔ ان مہاجروں کے دلوں میں جہاں اپنی مٹی کا درد تھا وہیں اپنی جان کا خوف بھی یہ جن علاقوں میں گئے۔ ان بڑے مقامی علاقوں کا ہی حصہ بن گئے اور اپنی مقامی شناخت کو بھلا بیٹھے۔ یوں شناخت کے بحران کا مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ تاہم ان میں سے زیادہ اپنی مقامیت اپنے مہابیانیوں میں گم ہو گئے۔ سماجی روابط کی تاریخ میں یہ اہم موڑ ثابت ہوا۔ تقسیم کے بعد اسی تفریق کی بنیاد پہ ایک نئے سماجی ڈھانچے کی تشکیل وجود میں آئی۔ جہاں مقامی بیانیے کو مذہبی رنگ میں رنگ دیا گیا۔ دونوں اطراف میں اسی بیانیے کا پرچار کیا گیا اور یہی لوگوں کی شناخت اور اصلیت کی صورت اختیار کر گیا سماجی روابط کی تاریخ میں یہ دور اہم ثابت ہوا کہ پاکستان کے بعد ہندوستان اور پاکستان دو مختلف مذاہب کی ترجمانی کرنے والے ملک بن گئے۔ مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کی حیثیت بھی مقامی مذہبی بیانیے کے ذریعے اثر پروان چڑھنے لگی۔ اس طرح سے مقامی بیانیے پہ مذہبی بیانیے کے رنگ غالب آیا اور مقامیت کی اصل شناخت کہیں دور گم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

شہر مرگ برصغیر کے ایک ایسے شہر کا تصور ہے جو نوآبادیاتی عہد کی جھلک ہے۔ ناول نگار نے شہر کا نام لیے بغیر برصغیر کے مجموعی حالات کی منظر کشی کی ہے۔ ناول نگار نے کسی مخصوص شہر کا نام لئے بغیر برصغیر کی مجموعی صورتحال کو بیان کیا ہے۔ بیسویں صدی میں آنے والے قحط بنگال کا بھی شبہ گزرتا ہے۔ جو حقیقت کے بہت قریب معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا عہد ہے جب اس مقامیت کو مختلف نوعیت کے مسائل کا سامنا تھا۔ نوآبادکاروں نے محض مقامی لوگوں پہ حکومت ہی قائم نہیں کی بلکہ مقامی لوگوں کو اپنی ثقافت، پہچان حتیٰ کہ مذہب کو بھی قائم رکھنا مسئلہ بن گیا۔ غربت اور افلاس کا مارا یہ طبقہ فوراً ان کے در کا سوالی بن جاتا ہے۔ شہر مرگ میں جس علاقے کا نقشہ کھینچا گیا ہے وہاں ان غریب لوگوں پہ قحط جیسی آفت بھی نازل ہوئی۔ یہ قدرتی آفت ان کی ہلاکت میں مزید تیزی کا باعث بنی۔

شہر مرگ میں اس بے نام مقامیت کے ایسے دور کا بیان ہے، جب انگریز یہاں مسلط ہیں ان کی حکومت محض عوام تک نہیں بلکہ عقیدوں پر بھی کنٹرول کرنے کی کوششیں جاری ہیں یہ عہد دونوں ثقافتوں بلکہ دونوں مذاہب کا سماجی رابطے کا دور ہے۔ عام لوگوں کے لیے خطرناک ثقافت اور نہ ہی مذہب کو برقرار رکھنا آسان تھا۔ ایک طرف ایسی قوم ہے جو جدید زندگی کی دعویدار ہے اور دوسری طرف ظلمت کا شکار وہ لوگ جو پہلے مقامی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ظلم کا شکار رہے اور رہتی کسر ان نوآبادکاروں نے نکال دی جنہوں نے انہیں مزید جہالت اور افلاس کے اندھیروں میں دھکیل کے ان کی سوچ، ان کا جسم اور ان کا خیال تک اپنے قبضے میں کر لیا۔

"اسی عرصے میں عیسائی مشنریاں بھی فعال ہو چکی تھیں۔۔۔پہلے جو کام محدود پیمانے پر ہوتا تھا اب اس کا دائرہ وسیع کر دیا گیا تھا۔۔۔لوگوں پر سر عام تبدیلی مذہب کی دعوت دی جانے لگی تھی۔۔۔اس دعوت کی قبولیت کی صورت میں راشن کی فراہمی کا وعدہ بھی تھا۔۔۔لوگ اس قحط سے تنگ آ کر ان کی دعوت قبول کرنے لگے تھے۔(34)

اس صورتحال کے تحت مقامی طور پر مذہبی بیانیہ میں بھی فرق آنے لگا۔ نچلے طبقے کے لوگوں کے عقائد ان کے پیٹ سے جوڑ دیے گئے۔ تعصب اور فلاس کے مارے ہوئے لوگوں کی زندگی کی سانسوں کو رواں رکھنے کے لیے عقیدہ بھی تبدیل کر لیا۔

اس مذہبی بیانیہ کی تبدیلی سے یہ اندازہ لگانا ناممکن نہیں کہ اس عہد میں اس مقامیت نے کس قدر بیرونی لوگوں کے اثرات کو قبول کیا ہوگا۔ ثقافت، کلچر تو ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب بنیادی تصورات بدل دیے جائیں تو ثقافت کو بدلنا زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ طاہر نواز نے شہر مرگ کے ذریعے سے بر صغیر کے طول و عرض میں پھیلے ان مصیبت زدہ لوگوں کی کہانی کو بیان کیا ہے جو ان نو آبادکاروں کا بطور خاص نشانہ بنے۔ جو اپنے بنیادی حقوق سے بھی محروم ہونے کے ساتھ ساتھ انسانیت کے معیار سے بھی گرتے چلے گئے تاریخ کا یہ دور اس مقامیت میں خاصہ اہمیت کا حامل ہے۔

خس و خشاک زمانے وسیع زمانی تناظر کا ناول ہے۔ ناول میں 1929ء کے قریب کا وہ زمانہ ہے۔ جب پنجاب اپنے تمام تر رنگینوں اور رعنائیوں کے ساتھ موجود تھا۔ پنجاب اپنی مخصوص ثقافتی پہچان کے ساتھ موجود تھا۔ یہاں کا مقامی بیانیہ بھی مقامی تھا۔ دو بڑے مذاہب اس مقامی بیانیے کے ساتھ رہ رہے تھے۔ دونوں کے مذہبی رسومات اپنے طریقوں سے ادا کرتے تو ہم اس کے باوجود وہ دوسروں کا مذہبی احترام بھی کرتے تھے۔ ثقافتی اعتبار سے ان کی قدر مشترک تھی۔ نسلاً بھی وہ ایک ہی تھے۔ جاٹ قوم کو اپنی نسل پر فخر تھا۔ پیشے کی رعایت سے بھی تمام ہی جاٹ زمین سے جڑے تھے۔ مقامی بیانیے میں کوئی فرق نہ تھا۔ محض مذہبی رسومات کے فرق سے تمام اقدار مشترک تھیں۔ تقسیم ہند سے قبل اس مقامیت میں تادیر حالات معمول کے مطابق چلے تقسیم سے چند روز قبل یہاں بھی تبدیلی کے اثرات پہنچے مقامی لوگوں میں افرتفری پھیلی پھر اس مقامیت میں بھائی چارہ قائم نہ رہا۔

1947ء کے واقعے میں یہ مقامیت تاریخ کے اہم اور نازک موڑ سے گزری۔ انگریزوں کے زمانے میں بھی جس مقامیت کو خطرہ لاحق نہ ہوا۔ وہ 1947ء کے سانحے میں عجیب مخمصے کا شکار ہوئی۔ لوگ پل بھر میں اپنے گھروں سے بے دخل کر دیے گئے۔ ان کو پناہ دینے والوں کو بھی دھمکیاں ملنا شروع ہوئیں۔ تاریخ کے اس دور میں مقامی بیانیے میں مذہبی بیانیے کے اثرات زیادہ واضح دکھائی دیتے ہیں۔ مذہبی بیانیے کو اس طرح سے بڑھایا گیا کہ لوگوں کے درمیان نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ اپنے سے بھی بے نیاز پیرائے سے بے نیاز ہو گئے۔

ان فسادات کے محرکات کا تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔یہاں محض یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ کس طرح اس مقامیت کے بیانیے میں تنوع آیا۔ تقسیم کے وقت تک دونوں مذاہب میں تفریق کی حد زیادہ بڑھ گئی۔اس پار سے لٹے پٹے آئے مسلمانوں کو سکھ دشمن محسوس ہوتا،یہی کیفیت یہاں کے سکھوں میں پیدا ہونے لگی۔ چند مقامات کے فسادات اور قتل وغارت نے تمام لوگوں کو اس آگ میں جھونک دیا۔

مابعد تقسیم پنجاب کی دھرتی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔مذہبی اعتبار سے اس کا بیانیہ تشکیل پایا۔ہندوؤں اور سکھوں کے بیانیے کے بعد ان کی جگہ آنے والے مسلمان تھے۔لہذا مقامیت کا بیانیہ مذہبی اثرات سے متاثر ہوا اور بعد ازاں ملک پہ قابض جاگیردار اور مذہبی حیثیت کے مالک لوگوں نے اس کو مزید مستحکم کر کے اپنے الو سیدھے کیے۔1965ء تو 1971ء کے سانحات کا سرسری تذکرہ ناول میں موجود ہے۔تاہم ان تاریخی واقعات کا زیادہ اثر اس مقامیت پہ نہ پڑا۔البتہ 1980ء کے بعد بیرون ملک بڑے شہروں کی جانب جانے کے رجحان نے اس مقامیت کو نئے دور میں لا کھڑا کیا۔جدیدیت کے نام پر پرانی قدریں معدوم ہونے لگیں۔بخت جہاں کے بیٹے کے کردار کے ضمن میں ناول نگار نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ کس طرح مقامیت ایک بنجر مٹی کی صورت اختیار کر کے اپنی شناخت سے محروم ہونے کے قریب ہے۔البتہ ناول نگار آخر میں بخت جہاں کے پوتے کی واپسی کی صورت میں اس مقامی کو زوال پذیر ہونے سے بچا کر پھر سے اسے جانب متحرک کر دیتا ہے۔

چودھریوں،میراثیوں،ہانسیوں سب کے نشان تاریخ کے اوراق میں گم ہو جاتے ہیں۔وقت کی گرد ہر شے کو دھندلا کر مٹا دیتی یا بے وقعت ضرور کر دیتی ہے۔نسل در نسل نقوش مٹ جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے کردار آ جاتے ہیں۔کرداروں کا یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔جدیدیت کے پیرائے میں تو سب کچھ تیزی سے بدل رہا ہے اور نئی قدریں ان کی جگہ لے رہی ہیں۔پرانی تہذیبوں کے آثار بہت جلد مٹ کے ان کی جگہ نئی عمارتیں کھڑی ہو رہی ہیں اور شاید وہ اس سے بھی زیادہ جلدی مٹ جائیں گی۔اس مقامیت کی خاص بات یہ ہے کہ مختلف تاریخی سانحات سے گزر کر بھی اس کے نقوش مٹتے نہیں ہیں۔اس کا احیاء کسی نہ کسی صورت ہو جاتا ہے۔ہر عہد میں اس کے کردار وقت کے دھارے میں بدلتے رہے۔اس کے باوجود اس کی اپنی شناخت کسی طور قائم رہی۔

"دنیا پور سے جو کچا راستہ اس قبرستان کے کنارے پر سے گزر کر پیر کوٹ تک جاتا تھا اسے ایک پکی سڑک میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔بخت جہاں کے اوپر تارکول بچھ چکا تھا اور وہ اس کے تلے گمنام ہو چکا تھا۔اس کی قبر کا نام و نشان باقی نہ رہا تھا۔اس کے بس میں ہوتا تو اپنی بوسیدہ ہڈیوں کو مجتمع کر کے ایک بار پھر گرج کر کہتا اوئے کون ہے کڑی یا ہوا۔۔جو میری ڈیری کے اوپر ایک سڑک بچھاتا ہے۔"(35)

ماحول میں مختلف تاریخی ادوار کے بعد مقامیت کی طرف دوبارہ اس کے کردار پلٹتے ہیں۔جوان کی موت کے بجائے اس کی حیات ثابت ہوتے ہیں۔بخت جہاں کے پوتے کا لوٹنا تیسری نسل کا اپنی مقامیت کی طرف آنا اسی بات کی

علامت ہے۔ مصنف نے اس ناول میں عالمگیریت کے ساتھ مقامیت کا تقابل بھی کیا ہے۔ وہ عالمی اثرات کو بھی اس تنا ظر میں دکھاتا ہے۔ کہیں بھی اس میں احساس کمتری کا پہلو نہیں دکھائی دیا۔ ناول کی خوبصورتی ہی یہی ہے کہ موجودہ دور میں عالمگیریت کے غلبے میں آنے سے بہت ساری ثقافتیں معدوم ہو رہی ہیں؛ یا زوال پذیر ہیں۔ مگر ناول نگار بخت جہاں کی صورت میں اس مقامیت کو پھر از سر نو زندہ کر دیتا ہے۔

اس باب میں ناولوں میں اپنے مقامی تاریخ کے حوالے سے ہونے والے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کچھ ناول ایسے ہیں جن میں اپنی مقامی ثقافتوں پہ تاریخ کے کسی اہم واقعے کا اثر ہے۔ مثلاًادھ ادھورے لوگ میں بہاولپور کی ثقافت پاکستان بننے کے بعد اب اپنی شناخت گم کر بیٹھی سیاسی فیصلے کے نتیجے میں ہونے والی تقسیم میں مقامی لوگ اپنی شناخت سے محروم ہو گئے۔اسی طرح خس و خاشاک زمانے 1947ء کے اہم دور سے گزرااور اس کے بعد ناول میں دوسرا اہم واقعہ نائن الیون کے بعد ہونے والی صورتحال کا ہے۔ان دونوں ناولوں میں ان تاریخی واقعات کا گہرا اثر ہے۔اس کے علاوہ نیلی بار میں آباد ہونے والے لوگوں کے آنے کے بعد حالات کی تبدیلی کا بیان کیا گیا ہے۔اس طرح سے مختلف ناولوں میں تاریخ کے ادوار کے ساتھ ساتھ ہونے والی تبدیلیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

انواسی میں بھی نو آبادیاتی زمانے میں ہونے والے تاریخی دور کا تذکرہ ہے۔ایسا تاریخی دور جو ایک جدید ترین مقامیت کا ایک پسماندہ مقامیت کے ساتھ مکالمہ ہے۔ جس کے مقامی زندگی پہ گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ انگریزوں نے اپنی فراست اور اپنے وسائل سے مقامی لوگوں کو شکست دی۔ مقامیت کی ذیل میں ان ناولوں میں تاریخی عناصر کا جائزہ لینے سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ مقامیت تاریخی ادوار سے گزر کر یا کسی تاریخی سانحے سے گزر کر یا متاثر ہو کر بھی اپنی شناخت یا حالت میں تبدیلی لاتی ہے۔ بڑے تاریخی سانحے کا مقامیت پہ گہرا اثر ہوتا ہے۔

حوالہ جات

ا۔ مسعود حسین خان۔مقدمہ تاریخ زبان اردو(علی گڑھ:اردو ایجوکیشنل بک ہاؤس2008ء)ص4،3

2۔ ویدویاس: مترجم ،عبدلقادر ،سید۔ تاریخ ہندوستان (لاہور: اسلامیہ یونیورسٹی کالج نوجیوان پریس پبلشرز س۔ن)ص18

3۔ شیر بہادر پنی۔تاریخِ ہزارہ(لاہور:مکتبہ جمال اردو بازار2006ء)ص33،32

4۔ ایضاً۔ص38

5۔ اختر رضا سلیمی۔ جندر (راولپنڈی:رومیل پبلشرز،فروری2020ء)ص31

6۔ ایضاً۔ص103

7۔ محمد طاہر۔ریاست بہاولپور کا نظم مملکت(ملتان:بزم ثقافت2010ء)ص109

8۔ محمد قمر الزماں عباسی۔بہاولپور کا صادق دوست(لاہور:1992ء)ص31،30

9۔ محمد آصف رضا۔ تشکیل ۔ شعبہ اردو یونیورسٹی آف جھنگ(جھنگ: جلد 2شمارہ:1جنوری تا جون 2024ء)ص51

10۔ ایضاً۔ص52

11۔ شہاب دہلوی۔ حسین مسعود۔بہاولپور کی سیاسی تاریخ(بہاولپور:مکتبہ الہام۔1977ء)ص138

12۔ Pakmay.meet / history.phb 3 paid 178وقت ملاحظہ:12اگست2024ء

13۔ محمد حفیظ خان۔انواسی ۔(جہلم:بک کارنر شوروم،اشاعت دوم دسمبر،2019ء)ص21،20ء

14۔ طاہرہ اقبال۔نیلی بار (اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،اشاعتِ دوم2020ء)ص14

15۔ اقبال،طاہرہ۔ گراں(اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،2019ء)ص20

16۔ ایضاً۔ص22

17۔ ایضاً۔ص41

18۔ طاہر لاہوری۔سوہنا شہر لاہور(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز2014ء)ص116

19۔ کنال لال کپورتاریخ لاہور(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،1990ء)ص67

20۔ علی اکبر ناطق۔ نو لکھی کوٹھی(جہلم:بک کارنر شوروم۔اشاعت ہفتم2021ء)ص93

21۔ ایضاً۔ص343

22۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خاشاک زمانے میں(لاہور:سنگ میل پبلشرز2017ء)ص306

23۔ ایضاً۔ ص377

24۔ فرید حسینی۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناول خس خاشاک زمانے میں کا تہذیبی مطالعہ۔ مشمولہ:سہ ماہی ادبیات (اسلام آباد: خصوصی ناول نمبر جلد دوم جنوری جون2020ء)ص245

25۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خا شاک زمانے میں۔2017ء،ص518

26۔ ایضاً،ص519

27۔ Www.wikipedia.org / September 11, 2001 attack

28۔ مستنصر حسین تارڑ۔ خس و خا شاک زمانے میں۔2017ء،ص504

29۔ Your.m.wikipedia.org/wikiوقت ملاحظہ18 اگست2024ء

30۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی۔کشاف تنقیدی اصطلاحات(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان1989ء)ص171

31۔ منیر فیاض۔ عالمی افسانوی بیانیے کا اجمالی ارتقا اور انواسی: مشمولہ؛اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ (اسلام آباد: ناول نمبر جنوری تا جون سہ ماہی ادبیات جلد دوم۔2020ء)ص355،354

32۔ طاہرہ اقبال۔نیلی بار ۔اسلام آباد۔ص78

33۔ طاہرہ اقبال۔ گراں (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز،2019ء)ص88

34۔ طاہر نواز۔شہر مرگ(راولپنڈی: ازونک پرنٹر اینڈ پبلشرز۔2020ء)ص91

35۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خا شاک زمانے میں ۔2017ء،ص699

باب: پنجم

اکیسویں صدی کے ناولوں میں موجود مقامیت کے عناصر کا تقابل

اکیسویں صدی، بیسویں صدی کے اس تسلسل میں مزید اضافے کی صورتحال ہے۔ جو ایجادات اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہونے والے انقلابات کی صورت میں آئی۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں اردو ناول کی جو موضوعاتی صورتحال سامنے تھی، وہ تو چند دہائیوں میں ہی متنوع صورتحال اختیار کر گئی۔ اردو ناول میں موضوعات مختلف تحریکوں اور برصغیر میں ہونے والے سیاسی اور سماجی انقلابات نے اردو ناول کے موضوعات کو بھی وسعت عطا کر دی تھی۔ جو صدی کے اختتام تک ہر موضوع کا احاطہ کر چکی تھی۔ اکیسویں صدی نے بیسویں صدی کی فراہم کردہ بنیاد میں وسعت کا عمل تیز کیا۔ اکیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے دنیا مزید جدید تر ہو چکی تھی۔ اس صدی میں سائنس کی ترقی نے فاصلوں کو مٹانے کے ساتھ ساتھ پرانی قدروں کو بھی تیزی سے مٹانے کی کوشش تیز کر دی۔

اکیسویں صدی کے منظر نامے کو دیکھا جائے تو موبائل فون انٹرنیٹ نے زندگی کو نئے امکانات سے روشن کر دیا۔ قوموں، ملکوں اور تہذیبوں کے درمیان فاصلے سمٹ گئے۔ بڑی قوموں سے چھوٹی قوم و تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان مکالمے کی صورتحال دیکھی جانے لگی۔ فاصلے سمٹ گئے اور لوگ ایک دوسرے کی تہذیب و ثقافت سے بھی آگاہ ہونے لگے۔ سہولتوں کی فراوانی سے عام لوگوں کو بھی فائدہ ہوا۔ بڑی ثقافتوں کی یلغار میں تیزی آئی۔ چھوٹے ثقافتی گروہوں کے لوگ موبائل فون کے ذریعے دور دراز بیٹھ کر بھی دوسری ثقافتوں سے آگاہ ہونے لگے تو بڑی ثقافتوں کو اپنے بیانیے کی ترویج میں بھی زیادہ آسانی محسوس ہوئی۔ ان حربوں سے مقامی لوگ ان بڑی ثقافتوں کے رعب اور مرعوبیت میں کھونے لگے۔ لوگوں کے رابطے بیرون ملک لوگوں سے ہونا بھی کوئی بڑی بات نہیں رہی۔ سوشل میڈیا کے ذریعے لوگ دوسری قوموں ممالک کے افراد سے جڑ رہے ہیں اور ان سے متاثر ہو رہے ہیں۔

اکیسویں صدی کے آغاز میں نائن الیون کے کی صورتحال سامنے آئی اس نے ایک نئے مہابیانیے کو تقویت دی۔ جہاں اس مہابیانیے کا مقصد مخصوص مذہب کے خلاف پروپگنڈا کرنا تھا وہیں اپنی خوشحالی روشن خیالی اور ترقی کا بیانیہ بھی شامل کرنا تھا۔ مقامی ثقافتوں پہ ان مہابیانیوں نے اثرات مرتب کیے۔ جدیدیت کی تقلید میں اٹھنے والی لہر میں مزید اضافہ ہوا۔ مگر اس کے بعد ایک نئی خوفناک صورتحال سامنے آتی ہے اور وہ تھی بڑے گروہوں کی تقلید کے بعد مستقبل میں شناخت کا مسئلہ فرد کی تنہائی اور شناخت کے بحران جیسے مسئلوں نے سر اٹھایا۔

اکیسویں صدی کا ادب بھی ان معاملات سے متاثر ہوا۔ شاعری ہو یا نثر لوگوں نے اس صورتحال کے تحت یا اس صورتحال سے متاثر ہو کر ایسے موضوعات کو زیب قرطاس کیا۔ ناول کی صنف حیرت انگیز طور پر جدید عہد میں

وقت کی کمی کے باعث بھی اضافے اور دوسری نثری اصناف سے زیادہ مقبول ہے۔ ناول پڑھنے والوں کی تعداد کے حساب سے لکھنے والوں میں بھی اضافہ اور بعض عمدہ اضافے ہوئے، پہلے سے لکھنے والوں کے ہاں بھی روایتی ناولوں کے بجائے موضوعات اور بیانیہ میں تنوع دکھائی دیتا ہے۔ ناول نگاروں نے بھی اس نئی پیدا ہونے والی صورتحال کے تحت اپنے موضوعات کو ڈھالا اکیسویں صدی کے ناولوں میں مقامیت کا رجحان زیادہ دیکھنے میں آیا ہے۔ ناولوں میں موضوعاتی ،اسلوبیاتی، بیانیاتی اور سماجی حوالوں سے مقامیت کی طرف رجحان زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ زیرِ نظر مقالہ کا موضوع بھی یہی ہے۔اس باب میں اکیسویں صدی کے ناولوں میں پائی جانے والے موضوعات میں مقامیت کا مختلف انداز میں بیان دیکھا جائے گا۔اس بیان شدہ مقامیت کی صورتحال ہر ناول میں مختلف ہے۔ کسی کے ہاں محض بیانیہ مقامی ہے تو کسی کے ہاں کردار مقامی ہے۔ کسی کے ہاں کردار اس مقامیت کے حق میں ہیں؛ تو کہیں کردار اس مقامیت سے انحراف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ ناولوں میں محض مقامی بیانیہ ہے۔ کردار مقامیت سے دور رہ کر اس کے بیانیے کی کسی صورت میں آبیاری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں مقامی کردار خود اس مقامیت سے منحرف ہیں۔ کسی مقامیت میں سیاسی اثر اندازی زیادہ ہے اور کہیں مقامی زبان کا استعمال بھی زیادہ دکھائی دیتا ہے ۔زیر نظر باب میں اکیسویں صدی کے منتخب اردو ناولوں میں مقامیت کے عناصر کا اختلاف اور اشتر کات کا جائزہ لیا جائے گا کہ مقامیت کس انداز میں بیان ہوئی ہے اور کون سا ثقافتی عنصر کس ناول نگار کے ہاں زیادہ ہے۔

5.1 اکیسویں صدی کے ناولوں میں مقامیت کے عناصر میں موجود اشتر کات

اکیسویں صدی کے اردو ناول مقامی لوکیل کی صورتحال

اکیسویں صدی کے ناول میں مقامیت کی صورتحال زیادہ ہے۔ ناول نگاروں نے مختلف انداز میں اپنی مقامیت کا بیان کیا ہے کہیں ناول نگاروں نے مقامی بیانیے کو اپنایا تو کہیں لوکیل میں چلے گئے۔ مندرجہ بالا عنوان کے تحت ناولوں میں موجود مقامیت کے عمومی تصور کو دیکھا جائے گا کہ کس ناول میں کس عنصر کی فراوانی ہے۔

جاگے ہیں خواب میں اختر رضا سلیمی نے ہزارہ کے مقامیت کو بیان کیا ہے۔اس ناول میں انہوں نے ہزارہ کی مقامیت کو مختلف حوالوں سے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ان کا لوکیل بھی ہزارہ کا ہے۔ ناول کی کہانی اسی مقامیت میں آگے بڑھتی ہے۔ان کی تہذیب اور ثقافتی صورتحال کے ساتھ ساتھ علاقائی صورتحال زیادہ ہے اور انہی نواحات میں کہانی کو آگے لے کر چلتے ہیں۔ان کے ہاں مقامیت کی عناصر کی فراوانی دکھائی دیتی ہے ۔ناول خالصتاً ہزارہ کی مقامیت کا بیان ہے۔تاریخی تناظر میں بھی اس کا سفر مقامیوں تک محدود رہتا ہے۔

> آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے دریائے ہرو سے نور آباد تک ایک دشوار گزار سڑک محض گلیات سے دیوار کی لکڑی اور خان پور سے قیمتی پتھر لانے کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔ایک ایسے دور میں جب لوگ ڈھاروں اور کچے مکانوں

میں رہتے تھے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں سے میلوں دور واقع گلیات کے بلند و بالا پہاڑوں سے دیواروں کی لکڑی یہاں لائی جاسکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس عجوبہ روزگار حویلی کو جس کی تعمیر کے قصے علاقے کی لوک روایات کا حصہ بن چکے ہیں۔آج بھی لوگوں رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔(1)

ناول میں مقامیت کے مختلف عناصر کی کثرت ہے۔ناول نگار گلی کوچوں اور ستوں،ڈھلوانوں درختوں ہر ایک شے میں ہزارہ کی مقامیت کو قائم رکھتا ہے۔ناول مختلف تاریخی ارتقاء سے گزر کر اپنی مقامیت میں ہی ختم ہوتا ہے۔جندر اختر رضا سلیمی کا دوسرا ناول ہے۔جندر میں بھی ایک بات پہلے ناول کے ساتھ مشترک ہے کہ اس میں ہزارہ کی مقامیت کا بیان ہے۔مگر یہاں ایک کردار اپنے ماضی کی تناظر میں اس مقامیت کی معراج کو بیان کرتا ہے۔اس جندروئی کے قصے میں بار بار اس بات کا نوحہ ہے کہ اب یہ تہذیب ثقافت زوال پذیر ہونے والی ہے۔جندر میں بھی ہزارہ کی مقامیت کا بیان ہے۔ناول کا مرکزی کردار جندروئی اپنی یادداشتوں کے ذریعے مقامیت کے گرد گھومتا ہے۔اس کے بیانیے میں اس مقامیت کا نوحہ ہے۔اس کا دائرہ کار بھی علاقائی صورتحال تک محدود ہے۔مقامیت کے مختلف عناصر جندر میں موجود ہیں۔بیانیہ کے ساتھ ساتھ مقامی کردار اور لوکیل بھی مقامی نوعیت کا ہے۔جندروئی کے گرد گھومتا یہ ناول اس کے بیانیے سے چلتا ہے۔اس کا بیان خالصتاً مقامی نوعیت کا ہے۔ناول میں اس مقامیت کے معدوم ہونے کے خدشات کا اظہار ہے۔جدیدیت کی لہر نے اس مقامیت کو معدومیت کے خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ناول کا مرکزی کردار کسی صورت اپنی مقامی شناخت کو کھونا نہیں چاہتا مگر اسے اصل میں اس بات کا افسوس ہے کہ ان کے مرنے کے بعد مقامیت کی بہت سی نمایاں خوبیاں/عناصر بھی معدوم ہو جائیں گے۔جندر ایک تہذیب کی علامت کے طور پر آیا ہے اس کے خاتمے کے ساتھ ایک تہذیب کا خاتمہ جڑا ہے۔

"ندی جوڑیاں میں واقع میرے اس جندر کی پونے دو سو سال سالہ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ یہ پینتالیس دن تک ایک بھی دانہ پیسے بغیر مسلسل گھومتا رہا ہے اور اس کی درد اور یاسیت بھری کوک نے نہ صرف مجھے بلکہ اس کے در و دیوار کو بھی انہیں نڈھال کر دیا ہے اور ابھی تو اسے ایک وقت تک اس طرح گھومتے رہنا ہے جب تک اس سے پہلے شخص کی یہاں آمد نہیں ہو جاتی جس نے گاؤں والوں کو میری موت کے بارے میں مطلع کرنا ہے۔"(2)

ناول کا مرکزی کردار اس مقامیت کے مختلف عناصر کی وضاحت کرتا ہے وہ اس بات کا فکر مند ہے کہ اس کی چکی جندر کے بند ہونے سے ایک عہد کا اختتام ہو جائے گا وہ مقامی قدریں جو تیزی سے بدل رہی ہیں ان کا اختتام ہو جائے گا۔

ادھورے لوگ حفیظ خان کا یہ ناول بہاولپور کی مقامیت کا بیان ہے۔اس کا غالب موضوع سیاسی نوعیت کا ہے۔اس ناول میں بہاولپور کی ثقافت کا بیان ہے۔ناول کا لوکیل مقامی ہے۔مقامی کردار ہیں جو اپنی شناخت کے متلاشی

ہیں۔ناول میں مقامی بیانیہ مقامیت سے ناول کے کردار کو ان کے مقامی عناصر کی ترجمانی کرتے ہیں۔اس مقامیت کے معدوم ہونے میں سیاسی فیصلوں کا عمل دخل ہے۔ناول کا مرکزی کردار اپنی مقامی شناخت کو اصل صورت میں بحال کرنے کے جتن کرتا ہے۔تاہم ایک بڑے سیاسی فیصلے نے اس کی امیدوں کو توڑ دیا ہے۔ناول نگار نے اس فیصلے کے گرد ناول کا قصہ بُنا ہے۔ناول کا لوکیل مقامی ہے۔اس ناول میں بھی بنیادی قدر مشترک ہے کہ ناول نگار نے اپنی ایک مقامی ثقافت کے بیانیے کو ناول میں بیان کیا ہے۔اس میں علاقے کے مقامی عناصر کو نمایاں دیکھا جا سکتا ہے۔مصنف کے ہاں تہذیبی صورتحال سے زیادہ علاقائی صورتحال دکھائی دیتی ہے۔

ناول کا مرکزی کردار سیاسی فیصلے کے تناظر میں مخصوص شناخت کے گم ہونے کے بعد اس شناخت کی بحالی کا متلاشی ہے۔ناول نگار نے اس مقامی مسئلے کو اس مقامی تناظر میں بیان کرتے ہوئے اکیسویں صدی کے ایک بڑے مسئلے کی طرف نشاندہی کی ہے۔جہاں مقامی ثقافتوں کے اس طرح بے نشان ہونے کا مسئلہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔

"کیا یہی چھوٹی سی بستی محراب والا ہی اس کی شناخت ہے۔اگر یہ بھی رہی تو کیا یہ ریاست بہاولپور اس کی شناخت بنے گی کہ جس کی اپنی شناخت ہی ایک بہت بڑا سوال بنی ہے۔پاکستانی بہاولپور یا پھر ہندوستانی بہاولپور۔"(3)

"انو اسی" لودھراں اور ملتان کے درمیان بننے والے ریلوے ٹریک کے تاریخی واقعے سے ماخوذ ایک ایسا ناول ہے جو اس چھوٹے ثقافتی گروہ کا بیانیہ ہے۔ناول میں مقامی ثقافت کا بیان ہے۔لوکیل مقامی اور کردار بھی، علاقائی تناظر میں لکھا گیا ناول ہے۔یہ ناول اپنے مقامی ثقافتی عناصر کی وضاحت کرتا ہے۔ناول میں ایک چھوٹے ثقافتی گروہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔تاریخی تناظر میں اس مقامیت کا بیان ہے، جو اپنے تمام مقامی عناصر کے ساتھ موجود ہے۔

"بستی آدم واہن صوبہ ملتان اور ریاست بہاولپور کی سرحدوں پہ واقع ہونے کے سبب ہے کہ ایک دور افتادہ اور محرومیوں کا شکار بستی تھی۔جہاں تک آتے آتے دونوں طرف کے حاکموں کو خود اپنی خبر بھی نہیں آتی تھی۔"(4)

ناول میں ایک ایسی بستی کے تناظر میں مقامیت کا بیان ہے جو بڑے شہروں سے دور ہے۔ایک ایسے دور میں جو نوآبادیاتی عہد کا ہے۔اس دور میں وہ اپنے مقامی حاکموں کی بھی نگاہ الفت سے محروم تھے۔پسماندگی کا شکار ان علاقائی رسم رواج کو مقامی کرداروں کے ذریعے سے ناول نگار نے بیان کیا ہے۔ناول نگار نے ایک واقعے کو بنیاد بنا کر اس مقامیت کو بیان کیا ہے۔مقامیت کے بیان کا دائرہ کار بھی اس واقعے اور وقت تک محدود ہے۔ناول کے آخر میں اس مقامیت کی تبدیلی کے اشارے بھی ناول نگار نے دیے ہیں تاہم اس میں کوئی بڑا واقعہ رونما نہیں ہوتا۔یہ لوگ اپنی مقامیت پہ قائم رہتے ہوئے ہی عروج اور زوال کا شکار ہوتے ہیں۔

نیلی بار میں طاہرہ اقبال نے بار کے علاقے کی مقامیت کو بیان کیا ہے۔اس ناول میں مصنفہ نے مقامی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔تاہم ناول کا لوکیل مختلف علاقوں کا احاطہ کرتا ہے۔ناول کے کرداروں کے بیان میں

مقامیت کے عناصر کارفرماہیں مگر وسیع تناظر میں یہ کردار مقامیت سے بڑھ کر ملکی سیاست اور دوسرے معاملات تک پھیل جاتے ہیں۔ یہ کردار بھی اسی بیان کردہ مقامیت کے ہیں تاہم ان کی وسعت زیادہ ہے۔ ناول میں سیاست اور مذہب کے گٹھ جوڑ کو مقامی تناظر اور ملکی تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ علاقائی بیانیہ بھی ناول میں موجود رہتا ہے۔ اس مقامی ثقافت کے نمائندہ کردار بھی آخر تک ناول میں موجود رہتے ہیں۔ مختلف ثقافتوں کے نمائندے ایک مقامیت میں در آتے ہیں جو اپنی مقامیت کے عناصر کو بھی مقامی لوگوں سے ملاپ اور اختلاط کا باعث بنتے ہیں۔ مجموعی طور پر اس میں بھی اکیسویں صدی کے دوسرے ناولوں کی طرح مقامیت کی طرف مراجعت ملتی ہے۔ کرداروں کا بیانیہ بھی مقامی نوعیت کا ہے جو مقامی لوکیل میں دکھائے گئے ہیں۔

گراں مقامیت کے ضمن میں ایک نمایاں تحریر ہے جس میں مصنفہ نے پوٹھوہار کی خطے کی مقامیت کو بیان کیا ہے۔ ناول میں مقامی ثقافت، اس کے کردار، لوکیل مقامی نوعیت کے ہیں۔ ناول نگار نے محض بیانیہ ہی نہیں بلکہ مقامی علاقے اور ثقافت کو بھی بیان کیا ہے۔ ناول کے کردار اپنی مقامیت سے نکل کر دوسرے علاقوں میں بھی مقامی بیانیے کا تسلسل جاری رکھتے ہیں۔ ناول میں مقامی ثقافت کے دوسرے عناصر کے ساتھ ساتھ زبان کے عنصر کی فراوانی ملتی ہے۔ ناول کے کردار مقامی نوعیت کے ہیں۔ علاقائی ثقافت کے ساتھ ساتھ آخری حصے میں مقامی کرداروں اور دوسرے علاقوں میں بھی مقامی بیانیے کی آبیاری کرنے اور مقامی کرداروں کو مقامی ثقافت سے انحراف کی صورتحال کی وضاحت تفصیل سے ملتی ہے۔ خطہ پوٹھوہار کی مقامیت مقامی الفاظ اور کردار ناول میں جابجا ملتے ہیں۔ ایک گاؤں کے پیرائے میں مصنفہ نے اس خطے کے مخصوص ثقافتی عناصر کی وضاحت کی ہے۔ ساتھ ہی وقت کے ساتھ ساتھ چھوٹی ثقافتوں کے معدوم ہونے کے خدشات سے آگاہ کیا ہے۔ سماجی زندگی کے مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں۔ روایت پسندی اپنی جگہ مگر فرسودہ رسومات بھی روایت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ جو سماجی زندگی کے لیے مشکلات کا باعث بنتی ہیں۔ پرانی نسل کے لوگ مرتے دم تک ان فرسودہ رسومات کی پیروی کرتے ہیں جبکہ نئی نسل یکسر انحراف کا انداز اپناتی ہے۔

دائرہ میں عاصم بٹ لاہور کی مقامیت کو بیان کیا ہے۔ لاہور ایک قدیم ثقافتی ورثے کا حامل شہر ہے۔ لاہور کی تاریخ میں کئی اہم موڑ آئے ہیں۔ جس نے اس شہر کے حالات وواقعات اس کی معاشرت کو متاثر کیا۔ لاہور ایک روایتی قدیم شہر ہے۔ یہاں کی زندگی جو اپنی روایتی لاہوری زندگی کی وجہ سے مشہور ہے، ناول نگار نے مقامی الفاظ اور لہجے ملتے ہیں۔ شہر کے باسیوں کی سماجی زندگی کا تفصیلا بیان ملتا ہے۔ اندرونی شہر کی تنگ وتاریک گلیوں سے مزارات، درگاہیں اور قدیم عمارتوں تک ناول میں سبھی کچھ شامل ہے۔ ناول نگار نے مقامی زندگی کو اسی لوکیل میں بیان کیا ہے۔ ناول کے کردار اور قصہ مقامی نوعیت کا ہے جو کہ مقامی سماجی زندگی کو بیان کرتا ہے۔ اس ناول کے کرداروں میں بھی روایتی مقامی زندگی کا رنگ موجود ہے۔

عاصم بٹ کا اپنا تعلق بھی لاہور سے ہے۔انہوں نے اس ناول میں مقامی زندگی کے خدوخال کو بیان کیا ہے۔ لاہور ایک مرکزی حیثیت کا حامل بڑا شہر ہے۔ باہر آنے والے اس ثقافت میں ضم ہو جاتے ہیں۔ جدیدیت کے باوجود مقامی ثقافتی رنگ موجود ہیں۔ناول نگار نے بھی اس سے ثقافت کی انفرادیت کو بیان کیا ہے۔

"بھید "میں بھی عاصم بٹ اپنی لاہوری ثقافت اور مقامیت کو بیان کیا ہے۔ بھید کے کردار مقامی ہیں۔ ناول کا لوکیل اور ثقافت مقامی کرداروں کے ذریعے سے بیان کی گئی ہے۔ ناول کے کردار مقامی ہیں۔ان کے نام بھی عام زبان کے الفاظ ہیں۔ مقامی نوعیت کے کردار اس مقامی سماجی زندگی کو بیان کرتے ہیں۔ ناول کے کرداروں کا مقامی پن بھی ہے اور اس میں وقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہونے والے حالات کا بیان بھی ہے۔ نوجوان نسل کس طرح اپنے مستقبل کے بارے میں بے چین اور بیزار ہے۔ ناول کے یہ کردار اپنی مقامیت کے نمائندے ہیں۔ مقامی روایتی زندگی کے یہ کردار لاہور کے ڈھابوں، ٹی سٹالوں پہ بیٹھے گفتگو کرتے ہیں۔ لاہور کی ثقافتی روایتی زندگی کرداروں کے ذریعے سے رواں دواں دکھائی دیتی ہے۔لاہور کے بازاروں ہوٹلوں کا بیان جا بجا ملتا ہے۔عاصم بٹ کے کردار حقیقت کے عین قریب معلوم ہوتے ہیں۔ان میں وہی مستی و سرشاری ہے جو لاہور کی مقامی اور روایتی زندگی کا خاصہ ہے۔لاہور جیسے بڑے اور قدیم ثقافتی شہر کی مقامی زندگی کو جزئیات کے ساتھ ناول نگار نے بیان کیا ہے۔ان تنگ و تاریک راستوں، ہجوم والے بازاروں، چوراہوں، مصروف سڑکوں میں لاہور کی ثقافت کو تھامے یہ مقامی کردار رواں دواں دکھائی دیتے ہیں۔

"شہر مرگ "طاہر نواز کا ناول بھی اکیسویں صدی کے ان ناولوں میں سے ہے جو مقامیت کے عناصر کا بیان لیے ہوئے ہے۔شہر مرگ کی انفرادیت یہ ہے کہ اس ناول میں کوئی طے شدہ مقامیت نہیں۔یعنی اس میں کسی خاص شہر کا نام لے کر نہیں بتایا گیا بلکہ اس کے مشاہدے اور مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں شہر کا جو تصور ہے وہ برصغیر میں نوآبادیاتی ہے جس میں لوگ بھوک اور قحط سے مر رہے ہیں۔اس کی خستہ حالی، مقامی اور بیرونی اشرافیہ دونوں کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہے۔ناول میں مقامی کرداروں کے علاوہ نواب، دیہاتی کردار بھی ہیں۔ ناول میں کہانی اور جگہ دونوں مقامی ہیں۔مقامیت کے عناصر کی وضاحت تو نہیں ملتی تاہم چند عناصر کا بیان ضرور ملتا ہے۔ مقامی نوابوں، گلیوں میں چراہوں کا بیان ہے جو اس ثقافت کو واضح کرتے ہیں۔

> "نواب صاحب کی تین بیویاں تھیں پر ان سے ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔۔۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ نقص نواب صاحب کے اندر ہے پر یہ بات تو نواب صاحب مانتے نہیں تھے۔۔۔ شکار سے واپس آئے تو اونچے گھنگرے والی حویلی میں رقص کی محفل سجاتے۔۔۔ شادی وہ صرف اس اپنے جائز وارث کے لیے کرنا چاہتے تھے۔۔۔ پر انھیں وارث نہ ملا۔۔۔ شکار اور رقص میں انہوں نے تمام دولت کو لٹادیا۔"(6)

ناول میں واضح اشارے اس بات کی دلیل ہیں کہ ناول میں برصغیر کی مقامیت کا بیان ہے۔ کرداروں کی اکثریت بھی مقامی ہے۔ مقامی کردار اس ثقافت کے مختلف عناصر کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔

نو لکھی کوٹھی مشرقی پنجاب کی مقامیت کا بیان ہے۔ ایک ایسا عہد جو نو آبادیاتی زمانے میں ہے۔ نو آباد کاروں کی حکومت ہے۔ تاہم اس کے باوجود زندگی اپنے تمام تر ثقافتی رنگوں کے ساتھ موجود ہے۔ ناول میں سیاسی پہلو نمایاں ہیں کہ اس میں بھی تقسیمِ ہند کا مسئلہ سر دست بیان ہوا ہے۔ تقسیم سے قبل کا پنجاب قاری کے سامنے اپنی ثقافتی سر بلندی، مقامی کرداروں کے ذریعے مقامیت کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے مقامی کرداروں کے ذریعے سے مقامیت کو بیان کیا ہے۔ ان کا نہ صرف بیانیہ مقامی ہے بلکہ ثقافت کے مختلف عناصر کی فروانی ملتی ہے۔ پنجاب کے زمینداروں کی روایتی زندگی، آپس میں معمولی لڑائی جھگڑے ناول کے کرداروں کے ضمن میں دکھائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ نو آبادیاتی عہد میں ناول کا قصہ ہونے کی وجہ سے ناول نگار نے نو آبادیاتی کردار بھی شامل کیے ہیں۔ اس ناول کی خاص بات یہ ہے کہ ناول کے کردار مقامیت سے جڑے ہیں۔ ناول میں مقامیت کے مختلف عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ سیاست اور مذہب ان میں نمایاں ہیں۔ ناول نگار نے محض اس علاقے کی کہانی بیان نہیں کی بلکہ اس کو دیکھا بھی ہے۔ پنجاب کے کھیتوں کی ہریالی، پنچایتیں کھانے، رسم و رواج تمام ثقافتی عناصر ناول میں دکھائی دیتے ہیں۔

"کھیتوں کی لمبی سیر نے سودھا سنگھ کی طبیعت میں جوانوں کی سی زندگی بھر دی۔ رات بھر اوس پڑتے رہنے سے ہر طرف پھیلی ہوئی فصلوں پر سبزے پر اور پگڈنڈیوں پر ٹھنڈک اور تریل جمع ہو چکی تھی۔ بہت سارے لوگ ادھر ادھر اپنے ہل جوتے ہوئے بیلوں کو ہانک رہے تھے۔"(7)

غلام باغ ایک وسیع تناظر کا ناول ہے۔ ناول میں بنیادی طور پہ ارزل نسلوں کے قصے سے آغاز ہوتا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ یاور عطائی نے اپنی ذہانت کی بنا پر امیر ترین لوگوں میں رہ کر ان کی برابری کا مقام پیدا کیا۔ اس کی بیٹی کا کردار ناول میں اس نسل کی یادگار کے طور پر آخر تک قائم رہتا ہے۔

ناول میں دوسری مقامیت کبیر مہدی کا آبائی علاقہ خطہ پوٹھوہار ہے۔ یہ علاقہ اپنی مخصوص جغرافیائی حالات کے تحت ایک الگ ثقافت اور مقامیت ہے۔ اس کی مخصوص بود و باش رسم و رواج ہیں۔ ان کے ذریعے ناول نگار نے اس مقامی کو بیان کیا ہے کبیر مہدی شہر میں رہتا ہے تاہم وہ جب گاؤں جاتا ہے تو وہ وہاں کی تفصیلات بھی بتاتا ہے۔ ناول نگار محض اس خطے کا بیان نہیں کرتا مذہبی تصورات سے بھی قاری کو آگاہ کرتا ہے۔ ناول کے اس حصے میں مقامیت کے عناصر میں مذہبی تصور غالب دکھائی دیتا ہے۔ ننگے افلاطون کے بیان میں اس کی وضاحت ملتی ہے مقامیت کو جزئیات کے ساتھ بیان بھی کیا گیا ہے۔

"کھلے نیلے آسمان میں سورج تھا اور اونچی پہاڑیوں اور گہری گھاٹیوں میں کٹی پھٹی پوٹھوہار کی زمین پر دن روشن چمکتا تھا۔ کبیر نے چٹان کی طرف دیکھا اور مٹی کے اس پیالے کی طرف جو چٹان کے نیچے رکھا تھا اور اوپر سے

گرتے پانی کے قطرے کو ایک ایک کر کے اکٹھا کرتا تھا۔ چٹان جھنڈ کے درختوں کے اس چھوٹے سے جھنڈ سے
زیادہ دور نہ تھی جہاں کبیر بیٹھا تھا۔"(8)

انعام گڑھ کی مقامیت بھی ناول میں بیان ہوئی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار یاور عطائی اور اس کی بیٹی زہرہ کا آبائی علاقہ بھی ہے۔ ناول نگار نے اس مقامیت کو بھی بیان کیا ہے۔ ایسی نسل جسے انسانیت کے معیار سے بھی کم درجہ خیال کی کیا گیا۔ ناول نگار نے محض اس کا قصہ شامل نہیں کیا بلکہ زہرہ اپنے اصل کی تلاش میں اس علاقے میں خود بھی جاتی ہے۔ اس کے بیان میں سیاسی نظریات کی بھی کلی کھلتی ہے۔ ناول نگار نے اس حصے میں سیاست کا پہلو بھی واضح کیا ہے۔

"مانگر لوگ اب ہمیں بالکل نظر انداز کر کے اپنی آمدِ شب کی مصروفیات میں لگ گئے تھے۔ ایک عورت ایک
تندور نما گڑھے میں خشک ٹہنیاں اور پتے جھونک کر آگ جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کا ہمیں نظر انداز
کر نا در حقیقت عام نظر انداز کرنے کے معنوں سے کہیں مختلف تھا۔"(9)

خس و خاشاک زمانے ایک وسیع زمانی تناظر کا ناول ہے۔ مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر کا حامل یہ ناول زمانے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ نسل در نسل اس کے قصے میں مقامی کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس کے کردار سات سمندر پار بھی اپنی مقامیت کے نمائندے ہی رہتے ہیں۔ ناول کا آغاز مغربی پنجاب کے علاقے گجرات اور گوجرانولہ کے درمیانی علاقے میں 1929ء کے لگ بھگ ہے۔ ایک مشترکہ تہذیب کا دور ہے۔ قصہ اور مقام بھی یکساں ہیں۔ مقامی کردار اس مقامیت کو بھرپور انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ناول نگار نے مقامیت کے تمام عناصر کی مقامی کرداروں کے ذریعے سے وضاحت کی ہے۔ مقامی ثقافت اور زندگی جابجا دکھائی دیتی ہے۔ پہلے حصے میں تقسیم سے قبل اور تقسیم کا زمانہ ہے اور کردار مقامیت کے وارث اور اس کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے کرداروں میں مقامیت کا لحاظ اور پاس موجود ہے بلکہ تقسیم کے جبر نے ان کو مجبوراً اپنی مقامیتوں سے دور کر دیا؛ پھر بھی وہ اس کے لیے تڑپتے ہیں۔ جب کہ آنے والی نسلیں اپنی مقامیت سے دور ہیں اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جو باہر رہ کر بھی تڑپتے ہیں؛ کچھ پاس رہ کر بھی اس کا رد کرتے ہیں۔ ناول میں مختلف قسم کے کردار موجود ہیں۔ اس کے باوجود مقامیت اپنے رنگوں کے ساتھ موجود ہے۔ مقامیت کے مختلف عناصر زبان، رسم و رواج، بود و باش سب کی وضاحت ملتی ہے۔ اس عہد کے پنجاب کے حوالے سے ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو جو اس عہد میں پنجاب کی زندہ تصویر تھا:

"پنجاب کے میدانوں میں جہاں سرسبز وسعتوں میں کہیں کہیں کچے گھروندوں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے گاؤں
آباد تھے وہاں ان سے دور کلی فضاؤں میں۔۔۔ ڈیرے بھی تھے۔ جن جاٹوں کے رقبے ذرا زیادہ ہوتے، وہ گاؤں
میں رہائش کے بجائے اپنی زمینوں پر کچے کوٹھے ڈال کر بال بچوں اور مویشیوں کے ہمراہ وہاں جا آباد
ہوتے۔"(10)

ناول کے کردار مختلف علاقوں اور شہروں ملکوں میں آباد ہو جاتے ہیں۔ تاہم وہ اپنی مقامیت کو نیچا دکھانے کے بجائے اس کے نمائندے کے طور پر موجود ہوتے ہیں۔ ناول کے آخر تک اس مقامیت کا پرچار رہتا ہے۔ تمام عناصر کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ناول نگار اس کی از سر نو بازیافت بھی کر دیتا ہے۔

شہر خالی کوچہ خالی یہ ناول اگرچہ لاہور کی مقامیت کا بیان ہے۔ تاہم ایک ایسے دور کی کھتا ہے جب بین الاقوامی سطح پر ایک بیانیہ وجود میں آیا۔ زندگی کی ترتیب میں نمایاں فرق آئے۔ یہ زمانہ کرونا وبا کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں تمام دنیا ایک نئے کرب میں مبتلا ہوئی۔ اس وائرس سے دنیا کو سمٹ کر رکھ دیا۔ ناول کا کردار واحد متکلم ہے۔ جوان ایام میں گزری اپنی زندگی زندگی کے واقعات کو بیان کرتا۔ اس سے کرونائی دور میں مہابیانیے کے تصور کو بھی رد کر دیا اور ایک نیا بیانیہ تشکیل پایا۔ ایسے حالات میں بڑی ترقی یافتہ سے زیادہ ثقافتیں زیادہ متاثر ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس وباء میں گزرے دنوں میں مصنف جدید دور میں فرد کی تنہائی کی تصور کو بھی واضح کر دیتا ہے۔ مقامیت کے اعتبار سے مصنف کے ہاں مختلف صورتوں میں اس کی وضاحت ملتی ہے۔

(ii) کرداروں کی پیش کش

کرداروں کی نوعیت

اکیسویں صدی کے ناولوں میں مقامی بیانیے کو زیادہ ناولوں میں برتا گیا ہے۔ ناول نگاروں کے ہاں مقامی ثقافتوں کے طرف رجحان زیادہ ہے۔ اب اس ضمن میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس بیانیہ کے ساتھ ساتھ ان کے کرداروں کی پیشکش کی نوعیت کیا ہے۔ آیا کہ وہ اپنے مقامی بیانیے کو بیان کرتے ہوئے اس کے نمائندے ہیں یا ان میں اپنے مقامی بیانیے سے انحراف کی صورتحال دکھائی دیتی ہے۔ آئندہ صفات میں اسی موضوع کے تحت کرداروں کا جائزہ لیا جائے گا۔

جاگے ہیں خواب میں ناول میں ہزارہ کی مقامیت کو مقامی کرداروں کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔ ناول کا زمانی تناظر خاصہ وسیع ہے۔ جو آغاز سے انجام تک اپنے مقامی علاقے میں رہتا ہے۔ تاریخ کے اعتبار سے اس میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں آتی کہ جس سے اس کے زوال کا کوئی اندیشہ ہو۔ تمام کردار مقامی نوعیت کے ہیں۔ ان کرداروں میں مقامیت کی نمائندگی دکھائی دیتی ہے۔ مقامیتوں سے انحراف کی صورت نہیں ملتی۔ ناول کے کچھ کردار سلام آباد جیسے بڑے شہر میں رہتے ضرور ہیں تاہم ان کا روایتی تعلق بدستور اپنی مقامی ثقافت سے قائم رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ناول کا اختتام بھی ہزارہ کے پر فضا مقام میں ہوتا ہے۔ نئے زمانی تناظر میں بھی مقامیت سے جڑت برقرار رہتی ہے۔

جندر کے کرادر بھی مقامی کردار ہیں۔ جندر روئی اس کا مرکزی کردار ہے۔ جو گزشتہ عہد کے تناظر میں اپنی زندگی کے واقعات کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافت، معاشرتی سماجی زندگی کو بھی بیان کرتا ہے۔ اس کا یہ بیان ماضی کی یاد ہے

جبکہ وہ اس بات سے خائف ہے کہ اس کے بعد ایک تہذیب و روایت کا خاتمہ ہو جائے گا۔اس کو اس بات کا علم ہے کہ آنے والی نسل میں سے زیادہ لوگ شہروں میں منتقل ہو گئے ہیں۔ جو اپنی روایتی ثقافتی زندگی سے تیزی سے کٹ رہے ہیں ان میں اضافہ ہو گا۔ان کی تہذیب اور ثقافت مٹ جائے گی۔ وہ اپنی اولاد کی مثال سامنے رکھتے ہوئے اس خدشے کو یقین میں بدلتا ہے۔اس ناول میں مقامی کرداروں کے رویوں کو ناول نگار نے بیان کیا ہے۔ پرانی نسل کے لوگ تو اپنی مقامیت سے نبھا کر گئے۔تاہم آنے والی نسل آسائشوں کی وجہ سے کٹ رہی ہے۔اس میں مقامی کردار ہونے کے باوجود انحراف کی صورت بھی دکھائی دیتی ہے۔

> "جب وہ جانے لگا تو اس نے حسبِ روایت میری جیب میں کچھ روپے بھی ٹھونس دیے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جندر کی دہلیز پار کرتے ہوئے، ہمیشہ کی طرح اس نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا تھا کہ اگر میں اس کے ساتھ شہر جانا چاہوں تو اسے خوشی ہو گی۔کاش وہ جان سکتا کہ میری خوشی یہیں رہنے میں ہے۔"(11)

اس جندروئی کا بیٹا بھی گاؤں میں آتا ہے۔ مگر اس کا دورانیہ سال کے محض چند دن اور دو دفعہ ہے۔ جندروئی کو اس بات کا خدشہ ہے کہ اس کی آنے والی نسل اس مقامیت سے یکسر کٹ جائے گی۔ایک پوری تہذیب کا اختتام ہو جائے گا۔

ادھ ادھورے لوگ حفیظ خان کا یہ ناول بہاولپور کی مقامیت کا بیان ہے۔ناول میں ایک سیاسی المیے / فیصلے کے نتیجے میں ہونے والی ناانصافی کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ناول کے کردار مقامی کردار ہیں۔ناول کا مرکزی کردار تو اسی مٹی سے نسبت اور اپنی پہچان کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ حقیقی تاریخ میں لکھا گیا یہ ناول فرضی کردار فیاض کے ذریعے سے چلتا ہے۔بہاولپور کی ریاست سے صوبے اور صوبے سے ڈویژن بننے کے سانحے کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ اس کردار کے ذریعے ناول نگار نے جڑت کے ساتھ ساتھ دوسرے کرداروں کی خود غرضی اور موقع پرستی کو بھی بے نقاب کیا ہے۔اس کے علاوہ حکیم رام لال اور اس کا گھرانہ جو بامر مجبوری ہجرت کر کے جاتا ہے۔آخر کار اپنی اس مٹی میں دفن ہو گئے۔ناول کے مقامی کردار مقامیت کی جڑت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ناول کا موضوع ہی مقامیت ہے اور اسی کی بازیافت میں اس کے مقامی کردار سرگرداں نظر آتے ہیں۔

انواسی کے کردار مقامی کردار ہیں۔ان کرداروں میں فرق یہ ہے کہ یہ اپنی مقامیت کے نمائندے ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جدید قوم کے خلاف برسرِپیکار بھی ہیں۔نو آبادکاروں سے ان کا واسطہ پڑا ہے۔" انو اسی" کا نام ہی مصنف نے مقامی لفظ سے لیا ہے۔اس کا مرکزی کردار ایک نسوانی کردار "سنگری" ہے۔ جو اس مقامیت کا نمائندہ کردار ہے۔ایک چھوٹی سی بستی کے پیرائے میں لکھا گیا یہ ناول اپنے عہد کی ایک بڑی ثقافت کے سامنے ڈٹ کہ کھڑا ہے۔ان کرداروں کی زندگی اسی مقامیت کے گرد گھومتی ہے۔ان کی رسائی اس سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ ناول بھی

مصنف نے ایک تاریخی تناظر میں لکھا ہے۔ انگریزوں کی عملداری تھی اور وہ ریلوے میں لائن بچھا رہے تھے۔ ناول کے یہ کردار اپنی مقامیت کے علمبردار ہیں۔ ناول کے آخر میں سیلاب ان سے ان کی بستی چھین لیتا ہے۔ وہ گھروں سے محروم ہو کر انگریزوں کی طرف سے امداد میں دیے گئے ٹینٹوں میں جا بستے ہیں۔ جو ایک طرح سے اس مقامیت کے نئے رخ کا اشارہ بھی ہے۔انواسی کے مقامی کردار اپنی مقامیت کے وفادار اور اس کی جڑت کا پتہ دیتے ہیں کہ سب مغربی تہذیب کی نمائندہ کرداروں کا بھی ہے۔ تاہم ان کرداروں کا براہ راست مقامی لوگوں سے واسطہ نہیں پڑتا کہ وہ ان کو متاثر کر سکیں۔ مقامی کردار شروع سے آخر تک ناول میں موجود رہتے ہیں۔ جو نہ صرف مقامی ہیں بلکہ مقامیت کے علمبردار ہیں اور اسی پہ آخر تک قائم رہتے ہیں۔

نیلی بار طاہرہ اقبال کا مقامیت کی ذیل میں لکھا گیا ایک نمایاں ناول ہے۔ ناول میں بار کے قدیمی باشندوں کے بیان میں طاہرہ اقبال نے ان لوگوں کی ثقافت کو مقامی کرداروں کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔ ایک ایسا خطہ جہاں مقامی لوگوں کے ساتھ ساتھ دوسرے علاقوں سے آنے والوں کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ تہذیب جنم لیتی ہے۔ بیرونی آنے والے بھی ان مقامی لوگوں پہ غلبہ پا جاتے ہیں۔ یہ اس قدر پسماندہ ہیں کہ ان کو مذہب سے بھی آشنائی نہیں ہے۔ مصنفہ نے تاریخ کے مختلف ادوار میں ان کو اس حالت میں بیان کیا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بھی اپنی حالت نہیں بدل پاتے۔ ان کا استحصال ہر دور میں جاری رہتا ہے۔ ان کا سربراہ زمیندار یا ذیلدار ان سے فراصت میں اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ ہر عہد میں ان کا استحصال کرنے کی راہ نکال لیتے ہیں۔ زمینداروں، ذیلداروں نے وقت کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی اپنا اثر ورسوخ قائم کر لیا تاکہ وقت اور حالات کے مطابق اپنی اجارہ داری کو قائم رکھ سکیں۔ ناول میں مصنفہ نے سیاسی نظام کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس مقامیت پہ اثرات کا بھی بیان ملتا ہے۔ اس مقامیت سے نکل کر مصنفہ ملکی حالات تک اسے طول دیتی ہے۔ حکومتوں کے بدلنے سے بھی اس مقامی زندگی میں فرق نہیں آیا۔ تاہم زمینداروں اور جاگیرداروں نے ذاتی مفادات کی خاطر اپنی روایتی اصول کو تبدیل نہ کیا۔ ایک مقامی کردار کی کتھا ناول میں کچھ اس انداز سے ملتی ہے:

> "نیلی بار کے آگ اگلتے میدانوں میں نہری پانیوں سے سیراب ہوتے تیس مربوں کی ملکیت والی منہ بند حویلی تین دہائیاں گزار چکنے کے بعد پاکیزہ پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ جو چاہے گی اس کی منظوری اس کے مقدر میں نہ لکھی جائے گی۔ اس نے چاہا کہ وہ سکول کالج میں پڑھنے کا رواج ہو چلا تھا۔ جو قصبے کے کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں رہ کر تعلیم پانے لگی تھیں، لیکن اس کی عمر کا گوشوارہ صرف ان اندھی، بہری دیواروں پر ٹنگا رہ گیا تھا۔ جس کے کیلنڈر پر سیاہی مل دی گئی تھی۔ دن، تاریخ، سن، ماہ فیل تاریخ کے اندھے غبار میں سب دفن۔۔"(12)

ناول نگار نے پوٹھوہار کی مقامیت کو اردو ادب کے قاری سے روشناس کرایا ہے۔ "گراں" کا مطلب گاؤں ہے۔ ایک گاؤں کے پیرائے میں لکھا گیا۔ یہ ناول مقامی کرداروں کے ذریعے پروان چڑھتا ہے۔ اس کے کردار دو

طرح کے ہیں۔ ایک روایت پسند اور روایتی کردار ہیں اور دوسرے وہ کردار جو اپنی مقامیت سے انحراف یعنی فرار کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک طرف وہ کردار بھی ہیں جو بیرونی ملک رہ کر بھی اپنی شناخت کو برقرار رکھے ہوتے ہیں اور دوسری طرف وہ کردار بھی ہیں جو باہر سے آنے والوں کی کمائی پر راج کرتے ہوئے یہاں رہ کر بھی اپنی روایت، ثقافتی، مقامی قدروں سے انحراف کر رہے ہیں۔ ناول میں مصنفہ نے یہی المیہ بیان کیا ہے کہ آنے والی نسل اپنی مقامیت سے کٹ رہی ہے۔ گلوبلائزیشن، جدیدیت نے لوگوں کو آپس کی جڑت اور مٹی کی جڑت سے آزاد کر دیا ہے۔

"یہ گھرانہ جو کبھی صوبے دار حکم داد کے نام کی شناخت رکھتا تھا۔ اب ولائیتوں کے نام سے مشہور تھا۔ یہ گراں جہاں بیٹھکیں اسلحے، برتن، بچے سب کے سانجھے تھے اب اپنی شناخت چاہنے لگے تھے۔ اب پوٹھوہار کے ہر گراں کے نوجوان اس حسرت میں جیتے تھے کہ وہ کون سا جہاز ہو گا جو انھیں انگلینڈ یا پھر مشرق وسطی کی کسی ریاست میں چھوڑ آئے گا۔۔۔"(13)

نئی نسل کے کردار بھی مقامی کردار تھے۔ مگر ان کے ہاں روایت کی تقلید کے بجائے اس سے انحراف کی صورت ملتی ہے۔ وہ ان اخلاقی اور ثقافتی قدروں کو چھوڑ کر نئے راستوں کے مسافر بننے کو تیار ہیں۔ نئے کرداروں نے اپنی مقامیت سے انحراف کی صورت اپنائی ہے اور ان کے اندر روایتی تسلسل کے بجائے ایک باغیانہ بند دکھائی دیتا ہے۔

شہر مرگ میں بھی مقامی کردار موجود ہیں۔ نو آبادیاتی عہد کی یہ مقامیت اپنے مقامی کرداروں سے بھی مزین ہے۔ ناول میں نو آبادیاتی کردار بھی موجود ہیں۔ ناول میں نو آبادیاتی کردار زیادہ ہیں۔ مقامی کردار اپنی مقامیت کو بیان کرتے ہیں۔ ناول نگار نے مقامی کرداروں کے ذریعے مقامی ثقافت کے پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ روشن آراء اور نواب کے مقامی کرداروں میں مقامی شناخت، ثقافت کے نقوش کا علم ہوتا ہے۔ روشن آراء کی جوانی ایک رقاصہ / طائف کی زندگی تھی۔ اس کردار کے ذریعے ہندوستان کی ثقافت کا ایک نمایاں پہلو دکھائی دیتا ہے۔

"جوانی میں تو اسے عبادت کی فکر نہ ہوئی تھی البتہ حضرت جی کے دربار پر وہ ضرور حاضر ہوا کرتی تھی۔۔۔ خاص طور پر جب میلہ لگتا تھا تو وہاں وہ نہ صرف حاضر ہوتی بلکہ چادر بھی چڑھاتی تھی۔۔۔ اور ایسا صرف وہ نہیں کرتی تھی بلکہ اس کے ساتھ کی دیگر کوٹھے والیاں بھی ایسا ہی کرتی تھیں۔"(14)

اس کے علاوہ چند اور کردار بھی مقامی کردار ہیں جن کے ذریعے ناول نگار نے مقامیت کو بیان کو واضح کیا ہے۔ ان کرداروں میں مقامیت کے ساتھ جڑت کا عنصر ہے اور انحراف کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ یہ اپنی مقامی ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مقامی ثقافت کے نقوش اس پہ گہرے ہیں۔

دائرہ میں عاصم بٹ کی کہانی اور لوکیل ثقافت زبان غرض تمام ان مقامی عناصر میں مقامیت پوری آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے کردار بھی عام زندگی کے کردار اور اپنی ثقافت کی نمائندہ کردار ہیں۔ دائرہ میں ان کے تمام کردار مقامیت کے نمائندہ ہیں۔ ان کے داروں میں مقامی کا رنگ نمایاں ہے ناول نگار چھوٹے چھوٹے

کرداروں کے ذریعے سے مقامیت کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتا ہے۔ ناول میں ٹھیلے، پان والے، ڈھابے والے سبھی کردار اس مقامیت کے نمائندہ کردار ہیں۔ ان کی بول چال بھی لاہور کی مقامی فضا کے مطابق ہے۔ ناول میں محض مقامی بیانیہ ہی نہیں بلکہ کرداروں کا تعلق بھی مقامیت سے ہے۔ ان کرداروں میں مقامیت کے مختلف ہیں عناصر دکھائی دیتے ہیں۔

"اس نے گلاس خالی کر کے سبیل سے پانی پیا اور گلی کی بشیر پان شاپ سے پیلی پتی کا قوام والا پان بنوا کر گلے میں دبا لیا بشیر نے ٹیپ ریکارڈر پر مکیش کے درد بھرے گانے لگا رکھے تھے۔

"کی رونڑ پایا ہوای چاچا۔ اس نے ذرا خفگی سے بشیر سے شکایت کی۔ "کچھ ڈسکوس شسکولا۔"(15)

دائرہ میں مقامی کردار ہی چلتے پھرتے متحرک ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اس مقامیت کو تفصیل سے بیان کرنے اوراس کی ثقافت کے مختلف عناصر کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ انحراف کی کیفیت کم دکھائی دیتی ہے۔ کوئی ایسا کردار دکھائی نہیں دیتا جو عموماً اس مقامیت سے انحراف کرے۔ مقامی لوکیل کو مقامی کرداروں کے ذریعے مقامی زبان و بیان کے تناظر میں ناول نے جزئیات نگاری کا حق ادا کرتے ہوئے لاہور کی مقامیت کو واضح کیا ہے۔

"بھید " کے کردار بھی لاہور کے مقامی زندگی کے کردار ہیں۔ مصنف نے ان کرداروں کے ذریعے مقامی زندگی ثقافت کے مختلف عناصر کی وضاحت کی ہے۔ عاصم بٹ کا خاصہ یہ ہے کہ ان کے ناولوں کے کردار عام طبقے کے کردار اور ان کے نام بھی اس طرز کے ہوتے ہیں۔ جن کی صورت حقیقت میں دکھائی دیتی ہے۔ ناول نگار نے ان کرداروں میں لاہور کھیل تماشے، محفلیں، رونقیں، بحث و مباحثے سب کچھ یکجا کر دیا ہے۔ موٹے کے کردار میں ایسے نوجوان کا تذکرہ ضرور ملتا ہے جو ملک میں معاشی بدحالی غربت اور بے روزگاری سے تنگ آکر دوسرے ملکوں کا رخ کرتے ہیں۔ ان نوجوانوں کو بھی مقامیت سے انحراف کرنے پہ مجبور کیا جاتا ہے۔ ورنہ وہ اپنی ذاتی خوشی سے ہو سکتا ہے کہ کبھی بھی اس سے رخ نہ موڑیں۔ یہ کردار لاہور ثقافت کے مطابق ہوٹلوں ڈھابوں ٹی سٹال پہ بیٹھ کر رات گئے تک بات چیت کرتے ہیں۔ ان کے درمیان مختلف موضوعات پہ گفتگو اس مقامیت کا ایک اہم پہلو ہے۔ مٹھو ایلین مشتاق چھرا ناول کے مقامی کردار ہیں۔

"مٹھو ایلین چنگڑ محلہ میں ایک کٹڑی میں اکیلا رہتا تھا، کبھی اخبار میں کالم اور فیچر وغیرہ لکھنے کا کام کرتا رہا تھا۔ اب مدت ہوئی بے روزگاری کے مزے لوٹ رہا تھا۔"(16)

نولکھی کوٹھی مشرقی پنجاب کی مقامیت کے بیانیے سے مزئین یہ ناول خالصتاً پنجاب کی ثقافت کا حامل ہے۔ ناول کا بیانیہ اور کردار مقامی ہیں۔ اس عہد کا بیان ہے جب ہندوستان انگریزوں کے زیر تسلط تھا۔ ناول میں ایک طرف مقامی کردار ہیں تو دوسری طرف نوآبادکار ہیں۔ ناول کے مقامی کرادر مصنف کے گہرے مشاہدے کے حامل

ہیں پنجاب کی روایتی زندگی ان میں دکھائی دیتی ہے۔ ناول کے کرداروں میں مقامیت کی پہچان اور رنگ نمایاں ہے۔ یہ کردار اپنی مقامیت کے نمائندے ہیں چودھری اور سکھوں کے ضمن میں ناول کی کہانی آگے بڑھتی ہے۔ جو تقسیم ہند پہ اختتام پذیر ہوتی ہے۔ ان کرداروں میں مقامیت سے جڑت موجود ہے۔ تقسیم کے وقت یہ لوگ زبردستی اپنے علاقوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ولیم کا کردار تو نو آبادیاتی کردار کا نمائندہ کردار ہے۔ تاہم مٹی کی جڑت اس پہ بھی غالب جاتی ہے۔ وہ واپس اپنے ملک جانے کے بجائے، تقسیم ہند کے بعد اسی ملک میں رہ جاتا ہے۔ مشرقی اور مغربی پنجاب کے تناظر میں ناول نگار نے پنجاب کے مقامی ثقافت کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔

غلام باغ میں مختلف مقامیتوں کا بیان ہے۔ ناول میں مختلف مقامی ثقافتوں کے شواہد ملتے ہیں۔ ناول میں ان دو مختلف مقامی ثقافتوں میں ارزل نسلوں کے انعام گڑھ اور دوسری پوٹھوہار کی مقامیت کا بیان ہے۔ ناول میں مختلف طبقوں اور ثقافتوں کے کردار ہیں۔ ان میں غیر ملکی کردار بھی ہے۔ یاور عطائی کی بیٹی زہرہ اور ناول کا ہیرو کبیر مہدی دو الگ مقامی ثقافتوں کے حامل کردار ہیں۔ ان دونوں مقامی ثقافتوں کا بھی ناول میں الگ الگ وضاحت سے بیان ہے۔ انعام گڑھ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی ثقافت کا تذکرہ ملتا ہے۔ ناول کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ ایک بڑے مرکز پر مختلف کرداروں کو جمع کرتا ضرور ہے۔ تاہم اس کے باوجود یہ کردار اپنی مقامی ثقافتوں کے ساتھ جڑے رہتے ہیں۔ کبیر مہدی کا انجام بھی اپنے آبائی علاقے میں ہوتا ہے۔ تو دوسری طرف زہرہ اپنا اصل کھوجنے کے لیے اپنے آبائی علاقے کا سفر کرتی ہے۔ دونوں کردار اپنی مقامیت کے نمائندے ہیں۔ ان کرداروں میں مقامیوں سے انحراف کی نئی جڑت کی صورت نظر آتی ہے۔ وہ اپنی مقامیت سے جڑنے کے لیے تیار ہیں۔ مابعد جدید نقطہ نظر کا حامل یا ناول اور اس کے کردار مقامیت کو کسی طور پہ موقع پر بھی پست خیال نہیں کرتے۔ وہ اپنے بڑے مرکز میں رہ کر بھی مقامی شناخت باقی رکھتے ہیں۔

خس و خاشاک زمانے 1929ء کے قریب کا زمانہ میں پنجاب کی ثقافت کا بیان ہے۔ ناول میں سکھوں اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب کے دور کا بیان ہے۔ ناول وسیع زمانی تناظر کا حامل ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے ناول کے آغاز میں تقسیم سے قبل کا پنجاب اور اس کی سخاوت کو مقامی کرداروں کے تناظر میں بیان کیا ہے۔ ناول کا زمانی ارتقاء اکیسویں صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ ناول مقامی کردار مقامی ثقافت کے نمائندے ہیں۔ ان کرداروں میں مقامیوں سے جڑت دکھائی دیتی ہے۔ لہنا سنگھ تقسیم ہند کی کئی سال بعد بھی چھپ کر اپنی جنم بھونی چلا آتا ہے۔ ہانسی نسل کے باشندے سروہانسی کی صورت میں ناول نگار نے برصغیر کی اس قدیم نسل کا بیان بھی کیا ہے۔ جو اپنی مخصوص خصلتوں کے باعث مشہور ہے۔ ناول میں پنجاب کی مشہور جاٹ نسل کا بیان بھی واضح ہے۔ ان کے کردار دو مختلف مذاہب کے

نمائندے ہونے کے باوجود اپنے نسلی تفاخر میں ہم خیال ہیں۔ان کے رسم و رواج ثقافتی پہلوؤں کے زیر اثر ہیں۔ جن پہ مذہب کا زیادہ دخل نہیں ہے۔

سروہانسی جب کبھی کچھ بھی کماتا امیر بخش ہتھیلی پہ رکھ دیتا۔۔۔چوہدری۔۔۔۔نہ میں نے بہت دن سے کوئی نیولا نہیں کھایا ہے اور نہ سلفے کا سوٹا لگایا ہے۔ میرا جثہ ادھڑنے لگا ہے مجھے دو چار آنے دے تا کہ میں اسے جوڑ سکوں ۔۔۔تو مان نہ مان میں تیرا کتا ہوں۔"(17)

ناول میں کچھ ایسے کردار بھی ہیں جو مقامی ہیں مگر انہیں دوسرے ملک جا کر رہنا اور روزگار کرنا پڑا۔ تاہم وہ اپنی ثقافت کے نمائندے ہیں۔ وہ اپنی مٹی سے وفاداری نبھاتے ہیں۔ تین نسلوں بعد بھی سروہانسی کی پوتی ہو یا چوہدری بخت جہان کا پوتا اپنے اصل کی طرف ضرور لوٹتے ہیں۔ وہ اپنی مقامیت سے دور رہ کر بھی اس کا حصہ ہیں۔ ان مقامی کرداروں میں روایتی جڑت سے انحراف نہیں ہے۔

شہر خالی کوچہ خالی اس ناول میں واحد متکلم کردار ہے۔ جو کرونا کی وبائی صورتحال میں زندگی کے شب و روز گزار رہا ہے۔ اس ناول میں مصنف خود ہی مرکزی کردار ہے۔ لاہور کی مقامیت میں لکھا گیا یہ ناول مختلف خیالوں کے ذریعے سے قاری پر سوچ کے کئی در وا کرتا ہے۔ یہ کردار اپنی مقامیت کا نمائندہ کردار ہے۔ اس کردار کے ذریعے لاہور کی مقامیت میں اس عالمی وباء کے اثرات ایک شخص کے شب و روز کے ذریعے دکھائی دیتے ہیں۔

(iii) مقامیت میں ثقافتی صورتحال (رسم و رواج، عقائد زبان اور دوسرے عناصر)

اکیسویں صدی کے ان ناولوں میں مقامیت کی ترجمانی زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ یہ ناول مقامیت کے نمائندہ کے طور پر موجود ہیں۔ مقامی ثقافت کا بیان ان سب ناولوں میں کسی نہ کسی پیرائے میں موجود ہے۔ مندرجہ بالا عنوان کے تحت ان ناولوں میں موجود ثقافت کے عناصر کا جائزہ لیا جائے گا کہ مجموعی طور پر ان میں سے کون سے عناصر کس ناول میں زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ مقامی ثقافت کا بیان تو سبھی ناولوں میں موجود ہے۔ اس کے عناصر کی وضاحت کے تناظر میں فرق بھی دیکھنے میں ضرور آیا ہے۔

ان ناولوں کے ثقافتی عناصر کی بات کی جائے تو تمام ہی مقامی ثقافتوں میں ثقافت کے پہلو کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں بطور خاص رسم و رواج اور بود و باش کی بات کی جائے تو تمام ناولوں میں اس کی ترجمانی ملتی ہے۔ ناول نگاروں نے جس مقامی ثقافت کے بیانیوں کو شامل کیا ہے اس کے بیان میں وضاحت کے لیے مقامی کرداروں کے رسم و رواج کا اظہار بھی ضرور کیا ہے۔

جاگے ہیں خواب میں اور جندر دونوں ہی اختر رضا سلیمی کے ناول اکیسویں صدی میں منظر عام پہ آئے ہیں۔ دونوں کا لوکیل ہزارہ ہے۔ ہزارہ کی مقامیت کے ضمن میں لکھے جانے والے یہ دونوں ناول اس مقامیت کی وضاحت

کرتے ہیں۔ جاگے ہیں خواب میں وسیع زمانی تناظر میں مقامی رسم ورواج، بودوباش، سمیت مقامیت کے ان عناصر کی وضاحت کی عملی شکل دکھائی دیتی ہے۔جاگے ہیں خواب میں اور جندر دونوں میں ناول نگار نے مقامی بودوباش اور رسم ورواج کو مقامی کرداروں کے ضمن میں خوب نبھایا ہے۔ان مرقعوں کی متحرک تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔جاگے ہیں خواب میں کاایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "گاؤں کے تمام مکان کم وبیشی ترتیب سے بنے ہوئے تھے مکان ڈھلوانوں ٹیلوں پریوں بنے تھے سب سے آگے والے مکان کی چھت اپنے سے پیچھے والے مقام کا صحن تھااور اس کی چھاتی سے پیچھے مکان کااور یہ سلسلہ کافی اوپر تک پھیلا ہوا تھا دور سے دیکھنے پریوں دکھائی پڑتا تھا کہ یہ کئی کئی منزلہ مٹیالی عمارتیں ہیں۔"
>
> ناول جاگے ہیں خواب میں۔"(18)

ناول میں مقامی ثقافت کی جزئیات میں کئی عناصر موجود ہیں۔ان میں رسم ورواج معاشرتی زندگی اس کے مسائل بھی موجود ہیں۔ مقامیت کے مختلف عناصر اس ناول میں بیان ہوئے ہیں۔ ناول کو مقامی ثقافت کے پیرائے میں بیان کرتے ہوئے ناول نگار نے دونوں ناولوں میں ہزارہ کی ثقافت کے نمائندہ کرداروں کے ذریعے سے عناصر کی وضاحت بھی کی ہے۔ سماجی زندگی کے بیان میں ان عناصر کی وضاحت بھی ملتی ہے۔

جندر میں جندروئی ثقافت کا کردار ہی نہیں ایک محور ہے جس کے گرد پورا ثقافتی ماحول چل رہاہے۔ وہ اپنے ماضی وحال کے بیان میں مقامی ثقافتوں کے عناصر کو بیان کرتا ہے۔اس طرح یہ کہانی اس لوکیل میں مقامی کردار کے ذریعے چلتی ہے۔ مختلف واقعات کی منظر کشی میں مقامی ثقافت ملتی ہے۔اس کی ثقافت آنے والے وقت میں زوال کا شکار نہ ہو جائے۔ ثقافت کی مجموعی صورتحال کی بات کی جائے تو دونوں ناولوں میں ہزارہ کی مقامی ثقافت کا نہ صرف بیان واضح ہے بلکہ اس کے کردار بھی اسی ثقافت کے نمائندے ہیں۔ جن کے ذریعے مزید جزئیات نگاری سے ناول نگار نے اس مقامیت کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

ادھ ا دھورے لوگ میں بہاولپور کی مقامیت کا بیان ہے۔ ناول میں بہاولپور کی سیاسی تاریخ کے پیرائے میں لکھی گئی کہانی کو بہاولپور کے مقامی ثقافت کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔ ناول کے کردار بھی اس مقامیت کے ترجمان ہیں۔ ناول ایک سیاسی واقع کے پس منظر اور اس کے اثرات کا بیان ہے ۔حفیظ خان کے اس ناول میں مقامی کردار ،مقامی ثقافت کو بھرپور انداز میں بیان کرتے ہیں۔ان ناولوں کے بیان میں زیادہ جزئیات تو نہیں تاہم مقامی ثقافت کے نقوش ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار اپنی شناخت کا متلاشی ہے۔ وہ شناخت جو اس کی دھرتی کی مقامی شناخت ہے۔ زبان و بیان میں مکمل الفاظ کی کثرت زیادہ نہیں ہے۔ مقامی الفاظ، رسم ورواج، لب ولہجہ اور توہم پرستیاں ان مقامی کرداروں کے بیان میں موجود ہیں۔ جس سے اس مقامی ثقافت کی ترجمانی ہوتی ہے۔ فیاض کا کردار

مرکزیت کا حامل ہے۔ناول کے پہلے حصے میں قیام پاکستان سے قبل کی مقامی زندگی میں مقامی ثقافت کی وضاحت ملتی ہے۔

"چینن پیر کے بیلے کی رت آتے ہی ہر منگل کے شام کو احمد پور کی کلو والی چُنگی کے نزدیک عبدالعزیز خان کے پرانے باغ کے وسیم میدان میں میلے والوں کے قافلے منزل کا پڑاؤ کرتے۔یوں ساتویں جمعہ تک ہر بدھ کو سویرے سویرے یہ عقیدت مندکیکی میکی اور نیزان شرعان کرنے کے بعد چنن پیر کی اگلی منزل کی جانب روانہ ہو جاتے جو عام طور پر ڈیرہ نواب صاحب کی آبادی سے گزر کر دوسری طرف ہوتی۔"(19)

ناول میں مقامی نوعیت کے رسم و رواج کا حصہ ہیں۔جو اس ثقافت کے عناصر کی وضاحت کا ذریعہ بھی ہیں۔ ناول میں 1947ء کے بعد کی مقامی سماجی زندگی اس قدر واضح نہیں ہے۔وہ مختلف ثقافتوں سے متاثر دکھائی دیتی ہے۔ تاہم ناول نگار اس کے باوجود مرکزیت اسی ثقافت اور مقامی کردار کو دیتا ہے۔دوسرے ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی ناول نگار مقامی بیانیے تک محدود رہتا ہے۔ بہاولپور کی ثقافت کی ہی وضاحت ملتی ہے۔ناول کا لوکیل اور کردار مقامی ہیں۔مقامی کرداروں کے ذریعے مقامی ثقافت کو بیان کیا ہے۔ناول کا مرکزی کردار تو اس وقت مقامی زندگی میں تبدیلی کے خدشے کے لیے پریشان ہے۔وہ ہر صورت اپنی اس مقامی شناخت اور زندگی کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔سماجی زندگی میں تبدیلی آتی ہے۔اس سب کے باوجود ناول کے مقامی بیانیہ میں زیادہ فرق نہیں پڑتا۔

حفیظ محمد خان کا ناول انو اسی بھی مقامیت کے نمائندہ ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ناولوں میں ناول نگار نے ایک مقامی ثقافت کو نو آبادیاتی عہد میں بیان کیا ہے۔نو آبادکاروں کی ترقی اور فراست ایک طرف اور دوسری طرف ایک مقامی بستی ان کے خلاف صف آراء ہے۔اس بستی کے بیان میں ناول نگار نے اس کی ثقافت کو بیان کیا ہے۔سماجی زندگی کے روایتی نظام کے تحت چل رہی ہے۔ناول کے عنوان سے ناول کے کردار اور بیانیے تک مصنف نے مقامیت ہی کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ناول کے مقامی کردار اس مقامیت کو بیان کرتے ہیں۔ناول میں ثقافت کے مختلف عناصر کے ساتھ ساتھ مذہبی پہلو کو بھی بطور خاص ناول میں شامل کیا گیا ہے۔ناول میں ثقافت کے مختلف عناصر ملتے ہیں۔اس مقامیت کے تناظر میں مقامی ثقافت کے نمائندے کردار موجود ہیں۔ان کرداروں کا بیانیہ بھی مقامی ہی ہے باقی عناصر کے مقابلے میں مذہبی رنگ زیادہ نمایاں ہے اور اس کے بعد مقامی رسوم و رواج کی کثرت ہے۔مقام الفاظ، لب ولہجہ ان کرداروں میں موجود ہے۔

"یاد رکھ اس نے سن لیا تو تیرے ٹوٹے کر دے گا اور اس کے سننے سے پہلے میں تیرا گلا دبا کر ماردوں گی کتے یدھی۔ملوکاں نے اسے دونوں ہاتھوں سے بُجے دینے شروع کر رکھے تھے۔جب کہ سنگری پورے مزے لے لے کر باتیں کیے جا رہی تھی جیسے بات نہیں بلکہ چڑھ والے سوہن حلوے کی ڈلی چبانے جا رہی ہو۔"(20)

ناول میں مقامی ثقافت کے عناصر ان مقامی کرداروں کے ذریعے سے واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ انو اسی ناول میں ناول نگار نے مقامی ثقافت کے تمام ہی عناصر کی وضاحت کی ہے۔ناول کا بیانیہ، کردار، لوکیل تمام کے تمام عناصر مقامی ہیں۔

نیلی بار طاہر اقبال کا ایک مقامی ثقافت کے ضمن میں لکھا گیا ناول ہے۔ناول کا کینوس دیہات سے ملکی سطح تک ضرور جاتا ہے۔تاہم مقامیت کے کردار ناول میں چلتے ہیں۔مقامی ثقافت کے مختلف ادوار کے تناظر میں ناول نگار نے یہاں کی ثقافت کے مختلف عناصر کی وضاحت کی ہے۔ایک روایت پسند معاشرہ جہاں کے لوگ اپنے روایتی اصولوں کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔اس ثقافت کے مختلف عناصر کی وضاحت مقامی کرداروں کے ضمن میں ملتی ہے۔اس میں رسم و رواج کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ثقافتی رسم و رواج مقاصد کے لیے ہوں یہاں پر بامر مجبوری دونوں صورتوں میں ان کی تقلید ضروری دکھائی دیتی ہے۔

> "ماسی ستو چار خانہ کھیس میں لپٹی ٹھنڈے فرش پر اکھڑوں بیٹھی کہانی ڈال رہی تھی۔ کبھی آواز تھرا جاتی کبھی دانت بج اٹھتے۔پختہ فرش سے اٹھتی یخ بستگی رونگٹے کھڑے کر رہی تھی۔پاکیزہ کا دل رقعت کے مارے کئی بار آیا کہ وہ اسے کہہ دے کہ سامنے پلنگ پر بیٹھ جاؤ لیکن اس گھرانے میں ایسا کوئی رواج نہ تھا کہ نوکر چاکر چارپائیوں پر بیٹھ سکیں۔بھاپ مارتی گرم دھول ہو کہ کہرا جمی انہیں فرش نشین ہی رہنا تھا۔"(21)

ناول میں مصنفہ نے مقامی طبقوں، قوموں، نسلوں، پیشوں کا بیان بھی کیا ہے۔مقامی ثقافت کے عناصر کے ساتھ ساتھ زبان کا لب و لہجہ موجود ہے۔مقامی الفاظ کے بیان سے ان مقامی کرداروں کا بیانیہ مزید مستحکم ہو جاتا ہے۔و ڈیروں، جاگیرداروں، ان کے مزارعوں کے بیان کو مقامی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ثقافت کی وضاحت بھی بخوبی ملتی ہے۔

گراں میں پوٹھوہار کے خطے کی مقامی ثقافت کا بیان ہے۔ناول میں مصنفہ نے اس ثقافت کے عروج و زوال کی کہانی کی بات کی ہے۔ناول میں ثقافت کا بیان اس کے مختلف عناصر کی وضاحت کے ساتھ ملتا ہے۔ان عناصر میں رسم و رواج اور زبان کا عنصر نمایاں ہے۔ناول میں پوٹھوہاری زبان کے الفاظ کی کثرت ملتی ہے۔بعض مقامات پہ پورے جملے مقامی زبان میں لکھے گئے ہیں۔رسم و رواج کی بات کی جائے تو ناول نگار نے اس ثقافت کو بیان کرتے ہوئے مقامی رسم و رواج کے پہلو کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے۔مقامی رسومات کے منفی اور مثبت پہلوؤں کی ابتداء سے ناول کا قصہ شروع ہوتا ہے۔آنے والی نسلیں جدیدیت کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے روایتی نظام سے انحراف کرتے ہوئے مقامی ثقافت کو یکسر بھلا دیتی ہیں۔مصنفہ کو اس مقامیت کے زوال کا خدشہ بھی مد نظر ہے۔ناول میں مقامی رسومات کا اظہار اور مقامی الفاظ اور لب و لہجہ ان کرداروں کے بیان کو واضح کرتا ہے۔

"توبہ توبہ ہڈا اُچاناں تے ہڈے ہوئے آلا (اتنا بڑا نام اور ثروت مند) سگا بھتیجا۔۔۔ بیٹی لینے سے اوکا انکاری ہو گیا۔ ہائے لوٹی! کہنے لگا ان پڑھ ہے آپ چودویں جماعت میں پڑھتا ہے نہ جاتک (لڑکا) زمیندار کالج میں اپنے جیون جوگے اظہار الحق کا جماعتیا ہے نا۔۔۔"(22)

بچپن کی شادیاں / رشتہ منسوب ہو یا اجتماعی زندگی کا بیان ناول نگار نے مقامی ثقافت کے عناصر کو ان کے ضمن میں واضح کیا ہے۔ سماجی زندگی کا بیان بھی اس ناول میں قدر واضح ہے۔ مقامی ثقافت کے عروج کے زمانے میں سماجی زندگی میں جڑت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ لوگوں کی خوشی غمی کا بیان ہو یا تہواروں کا لوگوں کے درمیان سماجی جڑت نمایاں ہے۔ ناول میں ان معاملات کا بیان بھی وضاحت سے ملتا ہے۔

"یہاں بال بچے دھی دھانیاں، مال ڈنگر فصل کھیت کھلیان خوشی غمی سب سانجھے تھے۔ زمینوں مکانوں کی ملکیت آباؤاجداد کے نام پر تھی جنہیں مرے بھی آدھی پون صدی گزر چکی تھی۔ کبھی ملکیت یا تقسیم کا قضیہ اٹھا ہی نہ تھا کہ بٹوارہ ہوتا۔"(23)

سماجی زندگی کے بیان میں امور کی وضاحت ناول میں ملتی ہے۔ سماجی زندگی کی معراج اور بعد ازاں اس کا زوال دونوں کا تقابل ناول میں موجود ہے۔ مقامی کرداروں کے ضمن میں یہاں بیان کردہ مقامی ثقافت کے مختلف عناصر کی وضاحت ناول کا خاصہ ہے۔ سماجی رسم ورواج، زبان وبیان، دین، اس مقامی ثقافت کے اہم اور نمایاں اوصاف ہیں۔

شہر مرگ میں نوآبادیاتی عہد کا بیانیہ ہے۔ چند ایک معاملات پر مقامی ثقافت کے نقوش ملتے ہیں۔ طے شدہ مقامیت کا نہ ہونا بھی شاید اس کے عناصر کی تفہیم میں ایک مسئلہ ہو سکتا ہے۔ ناول نگار نے ناول کے بیانیے میں ہندوستان کی مجموعی مقامیت کا بیان کیا ہے۔ چند مقامی کرداروں کے ذریعے اس مقامی ثقافت کے چند پہلو ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم اس میں اتنی وسعت نہیں کہ تمام عناصر کی وضاحت ہو سکے۔ مجموعی طور پر ثقافت کے اثرات اور نقوش ناول میں موجود ضرور ہیں جہاں آراء کا کردار مقامی کردار ہے۔ اس کے بیان کی وضاحت میں مقامی ثقافت کا کسی قدر اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ اس کے خدوخال کا علم بھی ہوتا ہے۔

دائرہ عاصم بٹ کا تحریر کردہ ناول ہے۔ دائرہ میں لاہور کی ثقافت کا بیان ہے۔ بڑے شہروں میں مختلف نواحی علاقوں سے لوگ آ بستے ہیں۔ جو اپنے رسم ورواج کو اپنے ہمراہ لاتے ہیں مگر وہ مقامی رنگ میں ضرور رنگے جاتے ہیں عاصم بٹ نے لاہور کی مخصوص مقامی فضا میں مقامی کرداروں کے ذریعے سے اس ثقافت کو بیان کیا ہے۔ دائرہ میں سماجی زندگی کا بیان زیادہ ہے ناول نگار نے مقامی فضا میں پروان چڑھنے والی زندگی کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔ لاہور کے گلی کوچوں، چوراہوں میں پھرتے متحرک کردار اپنے مخصوص بیانیے کو واضح کرتے ہیں۔ ثقافت کے باقی عناصر کے ساتھ ساتھ مقامی زبان کے الفاظ کی بھی بہتات ملتی ہے۔ مقامی کرداروں کے بیانیے میں مقامی زبان کے الفاظ جملے اور لہجہ دکھائی دیتا ہے۔ ناول کے کردار بھی مخصوص مقامی لب ولہجہ کے حامل ہیں۔ ان کرداروں کا بیانیہ ہو یا

الفاظ مقامی ثقافت نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ دائرہ میں مقامی ثقافت کے یہ ہی اہم پہلو ہیں۔ لاہور کی ثقافت کا اہم مرکز بازار حسن کا تذکرہ بھی ناول میں موجود ہے۔

لاہور کی سماجی زندگی کے بیان میں ناول نگار نے ہوٹلوں، ٹی سٹالوں، ڈھابوں ان پہ ہونے والی گفتگو کے ذریعے مقامی لوگوں کی ثقافت اور ان کے حالات اور ان کی سوچ سے بھی آگاہ کیا ہے۔ یہ کردار اپنی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے دکھائی دیتے ہیں ناول میں خارجی زندگی کے بیان کو زیادہ وسعت سے بیان کیا گیا ہے۔

> "وہ حسب معمول تیار ہو کر بوٹاٹی سٹال پر احمد علی اور رحیم بخش سے ملنے جا رہا تھا۔ جہاں پہ بیٹھ کر وہ چائے اور سگریٹ پیتے یا پھر ادھر ادھر سڑکوں یا باغوں میں مٹر گشت کرتے حتیٰ کہ اچھا خاصا وقت گزر جاتا اور شام ہو جاتی جو بہت سے دوسرے ساتھیوں کو بھی کشاں کشاں پرانی انار کلی میں بوٹاٹی سٹال کی طرف سے لے آتی اور پھر محفل جمتی جو رات گئے تک رہتی۔"(24)

بھید ناول میں عاصم بٹ کا ثقافتی ماحول میں لکھا گیا ناول ہے۔ اس ناول میں بھی لاہور کی ثقافت کے مختلف خدوخال کا بیان ہے۔ ناول نگار نے مقامی کردار تخلیق کر کے ان کے بیانیے میں ثقافت کی وضاحت کی ہے۔ سماجی زندگی کے مسائل اصل موضوع ہے۔ ناول نگار نے آنے والی نسلوں کو درپیش مسائل ان کے ذہنی کرب کو ناول میں بیان کیا ہے۔

نو لکھی کوٹھی میں مقامی ثقافت مشرقی پنجاب کا بیان ہے۔ ناول میں اس مقامی قصے کو ایک ایسی لوکیل میں مقامی کرداروں کے ذریعے سے بیان کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے ثقافت کے مختلف عناصر کی وضاحت کی ہے۔ ناول میں ثقافت کے تمام ہی عناصر کار فرما دکھائی دیتے ہیں۔ مذہبی، سماجی زندگی سے ناول میں بیان کیا ہے۔ سکھوں اور مسلمانوں کے مذہب کے اتفاق پھر تضاد اور شدید تضاد کی وضاحت ناول ملتی ہے۔ زبان و بیان، لب و لہجہ بھی مقامی بیان ہوا ہے۔ ناول میں مقامی ثقافت کے نقوش گہرے ہیں۔ نوآبادیاتی عہد میں ہونے کے باوجود بھی اس مقامیت کا بیان واضح ہے۔ ناول کے مقامی کردار مختلف حوالوں سے مقامی ثقافت کو واضح کرتے ہیں کلچر کے تمام عناصر کی وضاحت ہے یہاں ثقافت بیان میں رسم و رواج بود و باش اور مذہب کے رنگ کو بطور خاص اپنایا گیا ہے۔ علاقائی صورتحال زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ ناول کے کردار اپنے مقامی علاقے تک محدود ہیں۔ ان کے بیان میں بھی اسی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ دو بڑے مذاہب کو بنیاد بناتے ہوئے مذہبی عنصر بھی نمایاں کیا گیا ہے۔

غلام باغ میں دو مختلف مقامی ثقافتوں کا بیان ہے۔ مرکز میں بیٹھے لوگ بھی اپنی آبائی علاقوں کی مقامیت کو بیان کرتے ہیں جو بڑے مرکز میں رہ کر بھی اپنی شناخت کے حامل ہیں۔ ان کرداروں میں زہرہ اور کبیر مہدی کے ذریعے ناول میں ان کی آبائی نسل اور ثقافت کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں ایسی صورتحال ملتی ہے۔ انعام گڑھ ہو یا پوٹھوہار کا بیان ناول میں ان کے لوکیل کی وضاحت کی گئی ہے۔ دونوں مقامی ثقافتوں کی سماجی زندگی کو بطور خاص

موضوع بنایا گیا ہے۔ان علاقوں کے بود و باش پر جغرافیائی حالات کو بھی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ثقافت کے پہلوؤں میں مذہب عنصر کو زیادہ لیا گیا ہے۔چٹا سائیں کے بیان میں مذہب کے علاقائی تصور سے بھی واقفیت بھی ملتی ہے ۔سماجی زندگی کی بھی وضاحت ملتی ہے۔ایک طرف مانگر جیسی معدوم ہوتی ہوئی نسل اور دوسری طرف پوٹھوہار کے جفا کش لوگ جو کان کنی اور محنت مزدوری کر کے اپنا گزر اوقات کرتے ہیں۔مقامیت کے مختلف ثقافتی عناصر کی وضاحت کے ساتھ ساتھ آب و ہوا جغرافیہ اور بود و باش بھی دکھائی دیتا ہے۔مقامی احوال کی عکاسی بھی ملتی ہے۔

"مئی کے شروع دنوں کا سورج آدھے آسمان سے کچھ ہی نیچے تھا مگر درختوں میں سایہ ٹھنڈا تھا اور جنگلی پہاڑی پودوں کے خوشبو سے بھری ہوا بھی ٹھنڈی تھی مگر ان کی نمی تیری سے سوکھ رہی تھی۔کچھ ہی راتوں کی بات ہے اور پھر ہلکی سی خنکی بھی تحلیل ہو جائے گی چٹانیں اور پہاڑیاں تپنے لگیں گی اور ان میں سے شفاف سینک نکلے گا اور دن کو پوٹھوہار تندور کی طرح دہکے گا مگر اس کی راتیں پھر بھی ٹھنڈی رہیں گی اور سینمال کی مٹی پتھروں کے گھروں کی چھتوں پر لوگوں کو گہری نیند سلائیں گی۔"(25)

انعام گڑھ کے بیان میں ان مقامی لوگوں کے رہن سہن کی وضاحت زیادہ ہے۔ ناول میں مقامی زبان کا استعمال بہت کم ہے۔کرداروں کے لب و لہجے میں بھی مقامی پن نہیں ہے۔رسم و رواج کے ضمن میں بھی ناول میں زیادہ بیان نہیں ہے۔زیادہ تر زندگی کے خارجی مثال سے بحث کرتا ہے۔

خس و خاشاک زمانے وسیع زمانی تناظر کا حامل ناول ہے۔مقامی کرداروں کا آغاز ان کے اپنے ماحول میں ہوتا ہے۔اور آخر کار انجام بھی اپنے ہی آبائی علاقے میں۔ناول میں ثقافت کہ عناصر کی وضاحت ملتی ہے۔رسم و رواج ،زبان و بیان مذہب، بود و باش سبھی ثقافتی عناصر کی وضاحت ملتی ہے۔سیاسی بیانیہ بھی کسی طور ناول میں شامل ہیں ۔مقامیت کو بیان کرتے ہوئے ناول میں تمام ثقافتی عناصر کو مقامی کرداروں کے ذریعے سے واضح کیا گیا ہے۔پنجاب کی روایتی حقیقی زندگی کا بیان ان مقامی کرداروں میں ملتا ہے۔

"زینب بیگم اپنے چاچے کے صحن کارج کرتی۔۔۔اس کا حقہ تازہ کرتی۔۔۔کڑوے تمباکو کو ہتھیلیوں میں مسل کر اس پر گڑ کی ایک ڈھیلی جما کر ٹوپی میں سلگتے اپلے بھرتی اور پھر اونگتے ہوئے بخت جہاں کے کھلے منہ میں حقے کی نال دے دیتی۔"(26)

مقامی کرداروں کے باہمی برتاؤ میں ثقافتی عناصر کی وضاحت ملتی ہے۔ان عناصر میں رسم و رواج روایتی نظام زبان و بیان کے علاوہ مذہبی عناصر بھی دکھائی دیتے ہیں اگرچہ ان کا بیان زیادہ تفصیل سے نہیں ہے۔تاہم تصور ضرور موجود ہے۔مابعد جدید صورتحال کے تناظر میں بیانیہ میں ان تصورات کی عالمی سطح پہ سوچ کی بھی عکاسی ملتی ہے۔ناول کی معراج بھی یہی ہے کہ بالآخر اصل کی طرف لوٹنے والے کردار پھر سے اس مقامیت کو زندہ کر دیتے ہیں۔بخت

جہاں کے پوتے کا آنا اس کی مثال ہے۔ جو وقت گزرنے کے باوجود بھی ثقافت کی علامت حقے سے تو دوبارہ اس کا بیان شروع کرتا ہے۔ ناول میں مقامی ثقافت کے تمام ہی عناصر واضح دکھائی دیتے ہیں۔

شہر خالی کوچہ خالی کرونا وباء کے دوران لکھا گیا ایک مختصر ناول ہے۔ ناول کا موضوع تو اس وباء کی ہولناکی اور انسانیت کے ایک نیا دور سے گزرا۔ ناول میں بیان ہونے والی مقامیت لاہور کی ہے لاہور کی ثقافت کا زیادہ تفصیلی بیان تو نہیں مگر ناول کا کردار اس وباء کے دن میں داتا دربار آنا لوگوں کا ان پابندیوں کے باوجود بھی وہاں جمع ہونا، جن میں زیادہ اکثریت بچوں کی ہے۔ جو اس وباء کے دنوں میں بھی باامر مجبوری گھروں میں مقید نہیں رہ سکتے۔ ناول کے کردار کو کوئی فقیر مان کر لوگوں کا اس کے جمع ہو جانا۔ اس ثقافت کے مذہبی عنصر کی ترجمانی ہے۔ ناول میں ثقافت کی زیادہ وضاحت نہیں ہے کیونکہ ایسے دور کی کہانی ہے جب تمام قدریں ٹوٹ چکی ہیں اور انسانیت ایک نئے دور سے گزر رہی ہے۔ چند مقامات پہ کچھ اشاروں کے سوا زیادہ وضاحت نہیں دکھائی دیتی۔

5.2: مقامیت کے بیانیے میں موجود اختلافات

اکیسویں صدی کے ان منتخب ناولوں میں مقامیت کا پہلو تو مشترک ہے۔ ان میں موجود ہر ایک ناول اپنے اندر کسی نہ کسی مقامیت کا بیان لیے ہوئے ہے۔ ان ناولوں کی مشترک قدر بھی یہی ہے۔ تاہم ان مطالعے اور ان میں موجود مقامی عناصر کا جائزہ لینے سے اس کی تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ ان تمام ناولوں کی جو قدر مشترک ہے وہ کسی مقامیت کا بیان ہے۔ اس میں سے ثقافت کے عناصر ہوں یا کہانی کے بیان کا انداز کسی میں مقامی قصہ تو ہے تو مگر ارد گرد کا ماحول کسی بھی واقعتاً وہی ہے اور کسی میں محض اس کا تذکرہ موجود ہے۔ کسی میں ثقافت کے کسی خاص پہلو پہ زیادہ بات ہوئی ہے اور کوئی پہلو بالکل موجود نہیں ہے۔ ثقافت کی مزید تشریح کی جائے تو اس کی ذیل میں بہت سے عناصر آتے ہیں۔ جہاں کچھ عناصر مشترک ہیں تو کچھ مقامیت کے ہوتے ہوئے بھی مختلف ہیں کچھ میں تو نوآبادیاتی عہد کا بیان ہے تو کچھ میں تقسیم ہند کے واقعے کے اثرات اور نقوش گہرے ہیں۔

باب کے اس حصے میں ناولوں میں موجود اختلافات جو کسی خاص میں زیادہ نمایاں ہیں، بعض ناولوں میں مذہبی بیانیے اور بعد میں سیاسی بیانیہ کثرت سے موجود ہیں۔ جو ان کو دوسرے ناولوں سے مختلف بناتے ہیں۔ اب ان عناصر کا تجزیہ کیا جائے گا جو ان تمام ناولوں میں مختلف ہیں۔

سیاست:

اکیسویں صدی کے ان ناولوں میں مختلف ثقافتی عناصر کی تفہیم کی گئی ہے۔ ان ناولوں میں موجود مختلف عناصر کا تقابل و تجزیہ کیا گیا ہے بعض ناولوں میں بطور خاص سیاست کا اثر یا کسی خاص سیاسی فیصلے کے اثرات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ کچھ محض سیاسی نظریات ہیں اور کچھ کی بنیاد ہی کسی سیاسی فیصلے کے نتیجے میں ہوئی ہے۔ ادھ ادھورے لوگ

کی بنیاد ایک تاریخی سیاسی فیصلے پر رکھی گئی ہے۔ 1947ء میں قیام پاکستان کے بعد ریاست بہاولپور کا پاکستان کے ساتھ الحاق اصل بنیاد ہے۔ ناول میں اس تاریخی فیصلے اور بعد ازاں ہونے والے سیاسی فیصلوں کے نتیجے میں ہونے والے اثرات کو ناول میں بیان کیا گیا ہے۔ بہاولپور کی مقامیت ان سیاسی فیصلوں کے نتیجے میں معدوم ہو جانے کے قریب ہے۔ ناول کا مرکزی کردار سیاسی فیصلوں کے نتیجے میں محض اپنی شناخت کی تلاش کے جرم میں سزاوار ٹھہرا کر جیلوں میں رکھا جاتا ہے اور بعض انہی سیاسی فیصلوں کے بننے میں گمنام موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ ناول نگار نے تمام شعور تاریخی واقعات سے اخذ کیا ہے۔ ملکی سیاست کے اثرات مقامیت پہ اثرانداز ہونے کا بیان ہے۔ ناول میں یہ مجموعی فضا باقی عناصر پہ حاوی دکھائی دیتی ہے۔ ریاست کو پہلے صوبے اور پھر سیاسی فیصلوں کی روشنی میں ڈویژن قرار دیا گیا۔

"گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین ریاست کو 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ایک صوبے کے طور پر پاکستان میں شامل کرنے کے لیے دباؤ ڈالا اور ڈلوایا تو نواب صاحب بالکل ہی برداشت نہ کر سکے اور چپ چاپ اس بارے میں ہونے والے معاہدے پر 30 اپریل کو دستخط کر دیئے جس کے تحت دفاع مواصلات اور خارجہ امور مرکزی حکومت کے حوالے کرنے کے بعد بہاولپور میں 49 ممبران پر مشتمل صوبائی قانون ساز اسمبلی کے الیکشن کر دیے گئے۔"(27)

ناول کے آغاز سے لے کر اختتام تک مختلف سیاسی فیصلوں کے اثرات کو اس مقامیت کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں اس بات کا بارہا تذکرہ ملتا ہے کہ سیاسی نظام میں ہونے والی خرابیاں اور اس سے اثرانداز ہونے والے یہ مقامی لوگ کس طرح اپنی زندگیوں میں جبر برداشت کرتے ہیں۔ ناول میں سیاست کے اس پہلو کی نمائندگی باقی تمام عناصر سے زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ پاکستان کی مجموعی سیاسی صورتحال کو اس مقامیت کے ساتھ جوڑ کر بیان کیا گیا ہے۔ مرکزی حکومتوں میں ہونے والے ردوبدل کس طرح عام آدمی کی زندگی کو اور بعض اوقات پورے ضمنی گروہ کو متاثر کرتے ہیں۔ فیاض حسین کا کردار مختلف ادوار میں حکومتوں کے جبر کو برداشت کرتا ہے۔ ون یونٹ کے قانون کے اثرات سے مقامیت زیادہ اثرانداز ہوتی ہے۔ ناول میں باقی عناصر کے ساتھ ساتھ سیاسی عنصر سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ جو باقی ناولوں کی نسبت ایک الگ شناخت کا حامل ہو جاتا ہے۔

نیلی بار کی قدیمی ثقافت کا بیان ہے۔ اس خطے کے قدیم باشندوں کے حالات و واقعات موجود ہیں۔ ناول میں سیاسی منظر نامے کے حوالے سے بھی وضاحت موجود ہے۔ ناول ملکی سیاست کو اس مقامی ثقافت کے ساتھ جوڑتا ہے۔ مقامی لوگ بھی ان مرکزی حکومتوں کے عروج و زوال سے متاثر ضرور ہوتے ہیں۔ مقامی وڈیرے زمیندار ،ذیلدار موقع پا کر سیاسی میدان میں بھی کود پڑے۔ ناول نگار نے ان کے بیان میں ملکی اور مقامی سیاست کا تال میل بھی واضح کیا ہے۔ اس ناول میں موجود باقی عناصر کے ساتھ ساتھ سیاست بھی ایک اہم عنصر کے طور پر سامنے آتا ہے۔

"فوجیوں کا راج آ گیا ہے جو اٹھائی ہوئی عورتیں اور کھولے ہوئے مویشی واپس کروا رہے ہیں۔ان فوجیوں سے بڑے بڑے زمیندار ذیلدار تک ڈرتے ہیں۔"(28)

مقامی سماج کی ناانصافیوں کا شکار یہ لوگ بدلتی حکومتوں سے توقعات وابستہ کرتے ہیں۔ مگر ان کے اندر ذیلدار اور زمیندار اس میدان میں خود پڑے۔ ان کے نزدیک تو عزت اور ذلت کا معیار ان کے حاکم کی فتح اور شکست پر منحصر ہے۔ وہ ان کو اس منصب پر بٹھاتے ہیں جہاں براجمان ہو کر وہ ان کا ہی استحصال کرتے ہیں۔ایک ریٹائرڈ فوجی ریڈیو کی خبریں سن کر ان مقامی لوگوں میں کسی قدر کچھ خوش فہمیاں پیدا کرتا ہے۔ لیکن جلد ہی مقامی حکمرانوں کے ذریعے سے ان خوش فہمیوں کا ازالہ کر دیا جاتا ہے۔

"اوئے نالائقو جنگلیو! فوجی اندر کا بندہ ہے اور اب سرکار فوج کی ہے۔اس کے پاس اب خفیہ خبریں ہیں۔ غور سے سنو تمہارے دن پھرنے والے ہیں نیا بادشاہ غریبوں مزاروں کا ہمدرد ہے۔"(29)

ملکی سیاست میں یہ موقع پرست مقامی زمیندار اور وڈیرے بھی کود پڑے۔ان کو اپنے اختیارات کی وسعت کی فکر تھی۔ دوسری طرف ان لوگوں کی کم علمی کے تحت مذہبی رہنما بھی سیاست کے میدان میں کود پڑا۔ان لوگوں نے مقامی لوگوں کے یقین کو اپنے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور ووٹ لے کر اسمبلیوں میں جا پہنچے۔ ناول میں سیاست کے ضمن میں ان دونوں اشرفیہ کے طبقوں کا ذکر ہے۔ جو اپنے مفادات کی خاطر ہیں لوگوں کو پرانے نظام میں جکڑ کر رکھتے ہیں۔ایک طرف جاگیردار تو دوسری طرف مذہبی لبادے میں چھپے یہ مذہبی رہنما دونوں کا مقصد محض طاقت کا حصول ہے۔ڈاکٹر مبارک علی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ

"لوگوں کے ذہن میں اب تک اشرافیہ، جاگیرداروں، پیروں اور سجادہ نشینوں کی برتری اور فضیلت بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ خاندان اس کی شرافت اور موروثیت پر یقین رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چونکہ یہ خاندانی اور اشرافیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے پاس دولت، جائیداد اور اثر ورسوخ ہے۔اس لیے وہی ان کے صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں (30)"۔

وڈیروں اور مذہبی رہنماؤں کی اولادوں نے آنے والے وقت میں سیاست میں قدم رکھا اور اس بار بھی یہ مقامی لوگ ان کا سہارا بنے۔ان لوگوں نے ان مقامی لوگوں کے ووٹوں سے حکومت کے ایوانوں میں قدم رکھا اور اپنے آپ کو زیادہ طاقتور مضبوط بنانا تو کچھ مذہبی لبادہ اوڑھ کر ان لوگوں کا استحصال کرنے لگے۔ دونوں صورتوں میں سیاست کا کھیل بھی شامل رہا۔ناول نگار نے مجموعی ملکی سیاست کا بیان کر کے اسے مقامت سے جوڑ کر ناول میں سیاسی نظریات کی بھی بھرپور نمائندگی کی ہے۔یہ ناول مقامی ثقافت کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور کا حامل بن جاتا ہے جس میں مہابیانیے اور مقامیت دونوں کا بیان ہے۔

ناول میں اس منافقانہ روش کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے کہ کس طرح ان لوگوں کی اپنی بیٹیاں ملکی سیاست تک جا پہنچی جو لوگوں کو تعلیم دلوانے سے گریزاں ہیں جن کے نزدیک عورتوں کی تعلیم غیر ضروری اور غیر شرعی ہے۔ان کے اولادوں نے ان زمینوں سے نکل کر ملک کی حکومتوں تک اپنے تسلط کو پھیلا دیا۔اس مقامی بیانیے ثقافتی پہلو کا بیان ہے جس کی پاسداری محض عام لوگوں تک محدود تھی۔اشرافیہ کے لئے ایسی کوئی قدغن نہیں تھی۔

"وزیر حج جو مذہبی امور زارا فتح شیر نے ٹرالیاں بھر بھر کر گھومتی ہوئی حسین و جمیل فضائی میزبانوں کو تحسینی نگاہوں سے دیکھا، وی آئی پی حاجیوں کے لیے وی آئی پی میزبان حسینائیں۔۔۔اس سفر حج کا انتظام حج منسٹر زارا فتح شیر کے دستخطوں سے ہوا تھا۔"(31)

ناول مقامی ثقافت کے بیان کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور کا حامل بھی بن جاتا ہے۔اس پہلو کی وضاحت ناول میں زیادہ ہے۔

غلام باغ ایک وسیع تناظر کا حامل ناول ہے جس میں فلسفہ سمیت کئی دوسرے اہم عوامل کارفرما ہیں۔ناول میں سیاسی بیانیہ بھی موجود ہیں۔اس ناول میں بہت سے دوسرے عناصر کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور بھی ملتا ہے۔اقتدار کے ایوانوں اور طاقت کے گرد گھومتا سلسلہ یہ ایک الگ شعور عام قاری تک پہنچاتا ہے۔ناول نگار نے ان کے گٹھ جوڑ، زبان و بیان میں ان سیاسی پہلوؤں کی بھی بازگشت سنائی دیتی ہے۔یاور عطائی اس اشرافیہ میں آبستا ہے۔جہاں طاقت نے سب کو ایک جگہ جمع کر رکھا ہے۔مفادات کی اس ریل پیل میں سبھی لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔اس وقت ان کو نہ تو ذاتی نقصان یاد آتا ہے اور نہ ہی آپس کے اختلافات، یاور عطائی کا ڈرائنگ روم ایک مرکز بن جاتا ہے۔جہاں سیاستدان بیوروکریٹ سمیت اشرافیہ کے سبھی لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ناول میں سیاسی تناظر میں ان کے گٹھ جوڑ کو بیان کیا گیا ہے ۔ناول کے اختتام میں مقامی وڈیروں، زمینداروں طاقتور لوگوں کا ملکی سیاست، میں اثر و رسوخ بھی بیان ہوا ہے۔یہ وڈیرے سیاست میں کودے، ان نسلی خدمتگاروں کے ووٹ لے کر ملک کے لوگوں کو بھی اب اپنی بے زبان رعایا بنا رہے ہیں۔دو وقت کی اچھی روٹی کے بدلے اپنے ووٹ دینے والے اس بات سے بے خبر ہیں کہ وہ ان کو کس قدر طاقتور بنا رہے ہیں۔انعام گڑھ کے بیان میں مقامی لوگوں کی سوچ کے عکاسی مصنف نے اس انداز سے کی ہے:

"پر اب آگے سنا ہے ووٹ پڑنے ہیں گڑھ میں ہر طرف بڑے بڑے نامی گرامی سردار آئے ہیں۔آج پھر جلسہ ہے ادھر انہوں نے لنگر کھولا ہے کوئی آئے جتنا کھائے۔"(32)

ایسے پسماندہ علاقوں کے لوگ صدیوں سے ان وڈیروں کی غلامی کرتے آرہے ہیں اور اب ان کی اولادوں نے ان کی حمایت سے ملکی سطح پہ قدم رکھ ڈالا۔جو نہ صرف اہل علاقہ بلکہ ملک کے لوگوں کے بھی حکمران بن گئے ہیں۔ناول میں سیاست کے اس نظام پہ طنز ملتا ہے۔سیاسی حوالے سے شعور بھی ناول کا نمایاں پہلو ہے۔

"ہم نے ڈاکٹر سے معذرت کی اور اجازت مانگی۔اس نے کہا اچھا آپ نے جلسے کی کوریج بھی کرنی ہو گی ویسے یہ بڑا حساس سیاسی علاقہ ہے اور ثقافت سائنس اور مذہبی امور کی وزارتیں اکثر ادھر کے بڑوں کو مل جاتی ہیں۔" (33)

غلام باغ بھی ان ناولوں میں شامل ہے۔جن میں سیاسی بیانیہ زیادہ واضح ہیں ناول میں سیاسی بیانیے زیادہ نمایاں ہیں جو دوسرے ناول نگاروں کے مقابلے میں اس میں زیادہ ہے۔غلام باغ میں ثقافت کے دوسرے عوامل میں سے ریاست کا عنصر نمایاں ہے۔جو اپنے علاقائی ماحول کی سیاسی نظام کی وضاحت بھی ہے اور اس کی خرابیوں پہ طنز بھی ہے۔

مذہبی عناصر :

کسی بھی ثقافت میں مذہب اس کا اہم عنصر ہوتا ہے۔ثقافت کی چھاپ مذہب پہ پڑتی ہے تو وہیں مذہب کے اثرات بھی مقامی ثقافت پہ ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔اس کے بیانیے میں مذہبی بیانیے کا رنگ بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی کے ناولوں میں مقامیت کی طرف رجحان تو زیادہ ہے۔ان میں مقامیت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔بعض مقامیتوں میں مذہبی اثرات زیادہ ہوتے ہیں۔ان کا بیانیہ مذہب کے تحت ہی پروان چڑھتا ہے۔ان ناولوں میں بھی چند ناول ایسے ہیں جن میں یہ رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ان ناولوں میں مذہب کے عنصر کو واضح برتری حاصل ہے۔مقامی مذہبی تصورات کا اثر اور بیانیہ بعض ناولوں میں زیادہ ہے۔

نیلی بار میں مقامی مذہبی تصورات کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ان تصورات کو جو عموماً طاقتور طبقہ کے من گھڑت ہوتے ہیں۔جو اصل مذہب سے مطابقت نہیں رکھتے۔ان کا مقصد ان تصورات کے تحت لوگوں کو اپنا مطیع بنانا،ان کی دولت سے اپنے وسائل کو زیادہ کرنا؛ یہاں تک کہ ان کی عزتوں تک کے مالک بن جاتے ہیں۔بار کے قدیمی باشندے جو زمانہ قدیم سے ہی جہالت کے اندھیروں میں اٹے پڑے ہیں؛ان کو مزید جہالت میں دھکیل کے ان کی آنے والی نسلوں نے ملکی سیاست تک اپنے پنجے گاڑھے۔مذہب کے تقدس میں ہونے والے استحصال کو بھی ناول نگار نے بیان کیا ہے۔درگاہی نظام میں درپردہ ہونے والی خوفناک حقیقتوں سے پردہ چاک کرنا بھی ناول نگار کا گہرا مشاہدہ اور اس مقامیت میں مذہبی تصورات کے پہلوؤں کی وضاحت بھی ہے۔

"یہاں کی بیشتر آبادی تو پہلا کلمہ سیکھے بنا ہی مر جاتی ہے لیکن جنازہ اٹھاتے وقت کلمہ شہادت کا ورد ضرور نصیب ہو جاتا ہے شاید اسی لیے تو درختوں، قبروں، ہولوں، سایوں، درگاہوں، پیروں سے منتیں مانگتے اور چڑھاوے چڑھاتے عمرے گزر جاتیں، لیکن براہ راست خدا سے کبھی نہ مانگتے "پیر دستگیر کے کرم سے، شاہ جی کے تعویز کی برکت سے پیر جھنڈاؤں والا کی دعا سے رب سونا بیڑا پار لگائے گا تو پیر جی کی قبر پر چادر چڑھاؤں گی۔ شاہ جی کو گابن بھینس پیش کروں گی۔ جھنڈاں والے کا دیا جلاؤں گی۔"(34)

ایسے کم علم لوگوں کو مختلف طریقوں سے استحصال کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ناول میں وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی مذہبی تصورات اور استحصالی قوتوں کے حربوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔یہ ضعیف الاعتقاد لوگ ان کے حربوں کا آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔سیاست کے میدان میں بھی ان کے بل بوتے پہ کامیابی سمیٹی۔ناول نگار نے اکیسویں صدی میں پیش آنے والا واقعہ نائن 1 لیون اور اس کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال کو بھی بیان کیا ہے۔مفاد پرستوں نے کس طرح ملکی اور غیر ملکی سازشوں کی آگ میں غریب علاقے کے بچوں کو مذہب کے نام پہ اس آگ میں جھونکا۔ محض اپنے مفادات کی خاطر مذہب کے نام پر پیسے کمانے والے لوگوں نے مقامی لوگوں کا کس طرح استحصال کیا ۔اسلام کے نام پر ان گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی وجہ سے دی جانے والی قربانیوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ سادہ فہم لوگوں کو کس طرح مذہبی لبادے میں استحصال کا نشانہ بنایا۔اپنے مفادات کی خاطر مذہب کا لبادہ اوڑھے ان لوگوں نے دوسروں کی اولادوں کو موت کی وادی میں کس طرح سے دھکیلا۔

> "گل خان اور صابر جان جیسے تربیت یافتہ تو ان غاروں میں چھپے محفوظ تھے۔جن پر دن رات بارود گرایا جا رہا تھا۔ لیکن موت کا خوف تو اسی روز دونوں کے دلوں میں سے جاتا رہا تھا جب مصری استاد کو کاٹنے پھاٹنے کے بعد وہ علامہ معاویہ کے وعدہ "رب جلیل" نامی عسکری کیمپ کے میں لائے گئے تھے اور ان کی چھپی ہوئی صلاحیتیں خود ان پر پہلی بار آشکار ہوئی تھی۔"(35)

ناول میں بار کی قدیمی زندگی سے اکیسویں صدی کے نئے عالمی تناظر تک مذہبی تصورات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ناول نگار نے مقامیت کے عناصر کے ساتھ ساتھ مذہب کے بیانیے کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ناول نگار مختلف ادوار میں مذہب کے پہلوؤں اور ان کی رہنما اس کے پردے میں چھپے ہوئے طاقتور اشرافیہ کے طبقے کو بھی بے نقاب کیا ہے۔اس طرح اس ناول میں دوسرے عناصر کی نسبت مذہبی عناصر زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔

> "جب کسی سماج کی نوجوان نسل بے روزگاری، معاشی تنگدستی، اقرباء پروری اور جدید اور قدیم زندگی کے جھمیلوں میں الجھ جائے تو سماج دراصل ایسے راستے پر چل نکلتا ہے جس کی منزل سوائے تباہی کے کچھ نہیں ہوتی۔ اسی سماج میں جب حکمرانی اور طاقتور طبقہ کلی طور پر آسائشات زندگی سے فیض یاب ہو تو یہ تباہی مزید بھیانک ہو جاتی ہے۔بیسویں صدی کے آخری عشرے میں پاکستانی سماج بھی اسی ڈگر پر چلتے ہوئے تباہی کی انتہا کے قریب پہنچ چکا تھا۔مگر حکمران طبقہ ہمیشہ سب درست ہے کی رٹ لگاتے رہے۔"(36)

نو لکھی کوٹھی نو آبادیاتی عہد کی داستان ہے۔ناول کے آغاز سے ہی مشرقی پنجاب میں سکھوں اور مسلمانوں کے خاندانی لڑائیوں جھگڑوں سے کے ساتھ چلتے ہوئے قیام پاکستان کی بعد تک آتا ہے۔ابتدائی عرصے میں دونوں مذاہب کے لوگ ایک ثقافت کے تحت مشترکہ نظام ہیں رہ رہے تھے۔ان کے درمیان ہونے والی لڑائیاں زیادہ تر مقامی نوعیت کی لڑائیوں جھگڑوں پر مشتمل تھیں۔بعد ازاں یہ مذہبی صورتحال اختیار کر گئیں۔مذہب کی تخصیص

اگرچہ روز اول سے موجود تھی۔ باہمی صلح کا رشتہ قائم تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات کے مطابق اس میں مذہبی شدت پسندی بھی غالب آ گئی۔ دو مختلف مذاہب کے لوگ صدیوں تک ساتھ رہے۔ تقسیم سے قبل دونوں کے درمیان فاصلے بڑھنے لگے اور مذہب کی بنیاد پر تقسیم اور فرق بڑھنے لگا۔ یوں ایک مقامیت اور ثقافت کے لوگ مذہب کی بنیاد پر تقسیم ہو گئے اور ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن گئے۔ ناول میں مذہبی بیانیے کو بھی مرکزیت حاصل ہے۔

غلام باغ میں انعام گڑھ اور پوٹھوہار میں چٹا سائیں کے ضمن میں مقامی مذہبی بیانیے کی ترجمانی ملتی ہے۔ انعام گڑھ میں اور ارذل نسلوں کے بیان میں ناول نگار نے ان کے قدیمی خصلتوں کے بارے میں بتایا ہے۔ مذہبی حوالے سے زیادہ تفصیل کبیر مہدی کے گاؤں میں ملتی ہے۔ اس مقامیت میں مذہبی تصورات کو ناول میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مذہب کے ساتھ مقامی ثقافت کے زیر اثر بعض اوقات غیر منطقی اور غیر مذہبی چیزیں بھی مذہب کا حصہ تصور کی جانے لگتی ہیں۔ ننگا افلاطون نامی مجذوب ہو یا مدد علی دونوں کو معاشرہ تقدس کی ایسی سطح پر لا بٹھاتا ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ایسی کرشمات جوڑ دی جاتی ہیں جو اس میں موجود نہیں ہوتی۔

> "چٹا سائیں ساری عمر لباس فطرت میں رہا تھا مگر اس کا جانشین اس کا مجاور اعلیٰ۔۔۔ مدد علی عرف گونگا سائیں مٹیالے لباس میں رہے گا جو کھوچے سائیں کے علاقے کی چٹانوں کا رنگ ہے اس طرح وہ کبھی نظر نہ آ پائے گا۔"(38)

ناول میں چٹا سائیں کی کردار میں ناول نگار کے مذہبی بیانیوں کی وضاحت ملتی ہے۔ اسے اس مقامیت کے مجموعی ثقافتی رجحان کا علم بھی ہو جاتا ہے۔ مابعد جدیدیت کے نقطہ تکثیریت کی بھرپور نمائندگی ہے۔ مذہب ایک ہونے کے باوجود ہر علاقے میں کچھ خاص رسومات اور عقائد ان کے ساتھ مخصوص ہو جاتے ہیں۔ جن کا دائرہ کار محدود اور اپنی مقامیت تک قائم رہتا ہے۔

خس و خاشاک زمانے پنجاب کی ثقافت کے عروج کے زمانے سے اکیسویں صدی میں نائن الیون کے بعد کے زمانے تک ہے۔ مسلمانوں اور سکھوں کا تعلق ایک قوم سے ہونے کے باوجود مذہب کے فرق کی وجہ سے کچھ معاملات میں مختلف تھے۔ دونوں مذاہب مذہبی ہم آہنگی کے مدنظر مل جل کر رہ رہے تھے۔ تقسیم کے وقت حالات نے دونوں کے درمیان خلیج کو بڑھایا۔ یوں مذہبی ہم آہنگی کے بجائے دشمنی کی صورتیں پیدا کر دی۔ اس قدر شدت کہ جن میں ایک دوسرے کو چن چن کر مارا جانے لگا۔ نائن الیون کے بعد کی دنیا اسلام فوبیا میں مبتلا ہوئی اور اس واقعے کے بعد مسلمان کو دہشت گرد سمجھا جانے لگا۔ ناول نگار کی مہارت یہ ہے کہ اس نے اکیسویں صدی کے ایک اہم واقعے اور اس کے بعد ہونے والی صورتحال کو بھی بخوبی بیان کیا ہے۔ یہ مذہبی بیانیہ ناول کے اس اہم حصے میں بھی بیان ہوا ہے۔ ناول

میں مختلف مذہبی تصورات کا بیان ہے۔اسلام کے متعلق مغرب میں پائے جانے والے تصورات کا بھی ناول میں تذکرہ موجود ہے۔

"امریکہ میں یکدم چھوت چھات کا نظام رائج ہو گیا تھا۔اچھوتوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا بلکہ دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی موزلم آباد تھے وہ سب کے سب شودھر ہو گئے تھے ان ٹچ ایبل۔"(39)

ناول میں ثقافت کے دوسرے عناصر کی وضاحت کے ساتھ ساتھ مذہبی بیانیوں کی بھی کثرت ملتی ہے۔اس طرح یہ ناول نائن الیون کے بعد کی صورتحال مسلمانوں کے لیے خاصی اہم ہو گئی مذہب کی بنیاد پر وان کے ساتھ تعصب والا رویہ اختیار کیا گیا۔دیارِ غیر میں رہنے والوں کے ساتھ ساتھ خود اپنے ملکوں میں رہنے والے مسلمان بھی زہری اذیت کا شکار ہوئے ناول میں مختلف نسلوں کا بیان بھی ہے،جو مختلف مذاہب کے حامل ہیں اس سے بھی مذہبی بیانیوں کی وسعت ہوتی ہے۔مجموعی طور پر اس میں مذہبی بیانے کی کثرت ہے۔

نوآبادیاتی بیانیے:

بعض ناولوں کا دورانیہ نوآبادیاتی عہد کا ہے۔ان کے بیانیے میں ان کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ان پہ براہ راست نوآبادکاروں کے اثرات موجود ہیں۔نوآبادیاتی عہد کا یہ دور،اس کے اثرات،ان نالوں میں موجود ہیں۔بعض ناولوں میں یہ عناصر زیادہ کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔

جاگے ہیں خواب میں بھی نوآبادیاتی عہد کا ناول ہے۔ناول کا قصہ اگرچہ اکیسویں صدی کے آغاز تک پھیلا ہوا ہے۔تاہم اس میں نوآبادیاتی عہد کا دورانیہ زیادہ ہے۔ناول کے بنیادی کردار اسی دور اور اس کے اثرات سے متاثر ہیں ۔ناول میں جن مقامی سرداروں کا تذکرہ ہے،ان کا براہ راست مکالمہ نوآبادکاروں سے ہے۔ناول نوآبادیاتی عہد کی وضاحت کی ہے۔میجر رایبٹ کا کردار بھی نوآبادکار کردار ہے۔جو امن چاہتا ہے اور علاقے میں ترقی اور خوشحالی کا خواہش مند ہے۔اس دور میں مقامی لوگوں کی حمایت اور مفاہمت کے بعد اپنے مقاصد کی تکمیل بھی دیکھی جاسکتی ہے کہ کس طرح وہ اپنے ہم نواؤں کو نواز کر،ان کی حمایت حاصل کر کے اپنے اقتدار کو استحکام بخشتے ہیں۔انہوں نے کہیں ترقی کے نام پر اور کہیں صلح کے نام پر لوگوں کے درمیان اپنی جگہ بنا کر انہیں اپنا احسان مند کر کے ان پہ اپنی عنایت کرتے یوں مقامی لوگوں ان کی فراغ دلی کا اعتبار کر لیتے ہیں اور ان کی وفاداری بھی نبھاتے ہیں۔ڈپٹی کمشنر سردار فقیر خان کی حویلی خصوصی افتتاح کے موقعے پر جو انگریز سرکار نے ان کے لئے تعمیر کرائی تھی۔ان خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔

"ہمارے لیے یہ بات قابل فخر ہے کہ خان بہادر سردار فقیر محمد خان ڈپٹی کمشنر میجر جیمز ایبٹ کے ساتھ مل کر اس خطے میں امن قائم کیا۔ان کے قبیلے نے جو پہلے انگریز سرکار کے خلاف صف آراء تھا ان کے کہنے پہ ہتھیار

ڈالے اور انگریز سرکار کا وفادار ہوا۔ پھر انہوں نے کیپٹن جے آر بچر کے ساتھ مل کر حکومت انگلشیہ کے لیے بے پناہ خدمات سرانجام دیں۔"(40)

ناول میں اس طرح کے کئی واقعات ایسے ہیں جن میں انگریزوں اور مقامی لوگوں کے درمیان براہ راست مکالمہ ہے۔اس کے علاوہ علاقے کے سماجی زندگی پر بھی اس عہد کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ سڑکوں کی تعمیر ہو یا سکولوں کا قیام نوآبادیاتی عہد کی اہم پیش رفت ہیں۔ ناول کا اس طرح کے واقعات سے جڑت نوآبادیاتی عہد اور اس عنصر کی بھی نمائندگی کرداروں کے ضمن میں ملتی ہے اور اس کے بیانیے کو واضح کرتے ہیں۔ نوآباد کار براہ راست تو محض چند کرداروں تک اس ناول میں آتے ہیں۔ یہ بحیثیت مجموعی نوآبادیاتی عہد کے بیانیے میں بھی مقامی کرداروں کے ذریعے ناول میں موجود ہیں۔

انواسی کا زمانہ نوآبادیاتی عہد میں ایک مقامی بستی کا براہ راست نوآبادکاروں سے مکالمہ ہوتا ہے۔ یہ نوآبادکار دریا پہ پل بنا کر اس بستی سے ریلوے لائن گزارنے کے لیے اس جگہ آتے ہیں۔ بستی کے قبرستان سے انہوں نے ریلوے لائن گزارنی ہے۔ وہ لوگ ان کے مقابلے میں بہت کمزور ہیں۔اس کے باوجود وہ اپنی اخلاقی مذہبی اقدار کو پامال ہوتے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ مزاحمت ضرور کرتے ہیں تاہم ان کی مزاحمت رائیگاں جاتی ہے اور بالآخر وہ شکست کھا کر نہ صرف یہ کہ ان کے حکم کے تحت یہ کام کرنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں بلکہ رزق کی تلاش میں انہیں نوآبادکاروں کی تعمیرات میں بطور مزدور شامل ہو کر کردار بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔

"حفیظ خان نے اپنے ناول میں اس جوکھم کو خوب نبھایا ہے۔اس ناول میں مقامیت کی بے بسی اور کسم پرسی کو بیان کیا گیا ہے۔ جو سائنس کی ثقافت سے شکست کھا جاتی ہے اور یہ کہ انگریز کا عارضی کیمپ پرانی مستقل آبادی سے زیادہ منظم اور پرآسائش ہے۔"(41)

نوآبادکاران پسماندہ لوگوں کی بستی پہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کو باآسانی شکست دے دیتے ہیں۔ ایسے کردار بھی واضح ہوتے ہیں، جو موقع پرستی کا شکار ہو کر اپنے مقامی لوگوں کو بھی اس کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں ۔نوآبادکاروں کے حربوں میں یہ بھی ایک کامیاب حربہ ہوتا ہے۔ وہ ان میں تفریق ڈال کر اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ ناول میں مجموعی طور پر ان نوآبادکاروں کا ہی بیان ہے۔ان کے کرادروں میں یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے بجائے اپنے ملک کے مفاد کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔اس ناول کا زمانہ بھی ایسا عہد ہے جس میں نوآبادکار اپنے ارادوں کی تکمیل کر رہے تھے۔

شہر مرگ کا قصہ بھی ایسے عہد کا ہے جب نوآبادکار یہاں اپنی حکومت کر رہے تھے۔ اس ناول میں نوآبادیات کے باقی حربوں کے ساتھ ساتھ ان کے مذہبی عزائم کا بھی علم ہوتا ہے۔ نوآبادکاروں نے اپنی ثقافت، حکومت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی بھی ترویج کی۔ مقامی لوگوں کے مذہب تبدیل کر کے ان کی سوچ واذہان کو

اپنے ماتحت کرتے ہیں۔ شہر مرگ میں بھی روز مری سے جڑے ایسے کئی کردار واضح ہوتے ہیں جو بظاہر مذہب کا لبادہ اوڑھ کر اپنے سیاسی اور مذہبی مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ ناول میں نوآبادیاتی بیانیہ بھی موجود ہے۔

زبان:

اکیسویں صدی کے ناولوں میں مقامیت کے مختلف عناصر کی بہتات تو موجود ہے تاہم ان میں سے چند ایک ناولوں میں زبان کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ بعض ناولوں میں محض لب ولہجہ ہے اور بعض میں لب ولہجہ بھی زیادہ واضح نہیں، محض مقامی کردار اور لوکیل ہیں۔ کچھ ناولوں میں زبان وبیان کو ناول نگاروں نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ان ناولوں میں مقامی الفاظ کی کثرت بلکہ کچھ میں تو مکمل جملے موجود ہیں۔اس کے محرکات مختلف ہو سکتے ہیں تاہم یہاں اس بحث کا مقصد ان ناولوں میں سے ایسے ناولوں کی نشاندہی کرنا ہے جس میں زبان کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ زبان کسی بھی علاقے کی ثقافت کا ایک اہم وسیلہ ہوتی ہے۔

گراں ناول کی بات کی جائے تو پوٹھوہار کی مقامیت میں لکھا گیا یہ ناول زبان کے حوالے سے خاص ہے۔ ناول میں مصنفہ نے مقامی پوٹھوہاری زبان کی صحیح انداز میں ترجمانی کی ہے۔ ناول میں مقامی کرداروں کے بیان میں مقامی زبان کے الفاظ کی کثرت بلکہ پورا پورا جملہ لکھا گیا ہے۔ ناول نگار کا آبائی علاقہ بھی یہی تھا۔اس کے آباؤاجداد کا تعلق اسی خطہ پوٹھوہار سے ہے۔انسان جتنا بھی اپنے اصل سے دور جانے کی کوشش کرے وہ اس تعلق کو توڑ نہیں سکتا۔ وہ اپنے مرکز سے دور رہ کر بھی دور نہیں ہو سکتا۔اس کی یادوں، خیالوں زندگی کے ڈھنگ میں کسی نہ کسی طرح اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ ناول کی زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار کو اس زبان پر عبور حاصل ہے اور وہ اس مقامیت کے خد وخال کو بہتر انداز میں جانتی اور سمجھتی ہے۔ روایتی الفاظ اور جملوں کی تکرار اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس مقامیت سے بخوبی آگاہ ہے۔ ناول میں ثقافت کے تمام پہلوؤں کا بیان ہی جزئیات نگاری سے کیا گیا ہے۔ زبان کو اس حوالے سے خاص برتری حاصل ہے۔

> "ہائے کوئی زنانی ہیڈی وی بے وفا ہوسی۔ ایسا تو کنجریاں کرتی ہیں۔ ہائے لوٹی۔ ہو کو لوٹی!"
>
> "توبہ توبہ چودھویں صدی۔ دن دیہاڑے جنے نال اندر وڑی گشنی۔"(42)

کئی مقامات پر ناول کے کرداروں کی زبان وبیان اور مکالمے میں پورے پورے جملے پوٹھوہاری زبان کے ملتے ہیں۔ ناول نگار نے آسانی کے لیے ساتھ ہی اس کا اردو میں مطلب لکھ کر اردو ادب کے قاری کے لیے کسی قدر آسانی پیدا کر دی ہے۔گراں ناول میں زبان کا عنصر خاص وصف کی صورت میں برتا ہے۔ ناول کی مجموعی فضا میں ایک اہم عنصر کے طور پر موجود ہے۔

نیلی بار میں بار کی قدیمی ثقافت کے بیان میں مقامی زبان و بیان بھی دیکھنے میں ملتا ہے۔ ناول کے مقامی کرداروں کے بیان میں مقامی زبان کے الفاظ لب و لہجے کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں ثقافت کے اس عنصر کی نمائندگی بھی ملتی ہے۔ مقامیت کے نمائندہ اس ناول میں زبان کا پہلو بہت واضح ہے، بار کی ثقافت بھی مختلف ادوار سے گزری، مہاجروں اور ذیلداروں کے آنے سے مقامی ثقافت میں تنوع آیا۔ الفاظ کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے الفاظ بھی شامل ہو گئے اس طرح مقامی بولی میں بھی نئے الفاظ سے وسعت آئی۔

> "ہائی وے ربا کیوں پائیاں نی لوٹیاں کیوں چھٹے دیس پیارے ہائے بھرے بھکنے گھر، دودھ دیتی لیریوں (بھینسوں) سے بھرا ویہڑا (صحن) دودو بھڑولے دانوں سے بھرے ہوئے۔ ادھر ہی رہ گئے ہائے چھٹ گئے۔ کھانے والے بھی وہیں کٹ مرے۔ بھرے بڑوے بھی وہیں رہ گئے تو پھر ہم بھوریاں ہائے ہم کیوں جیتی بچ آئیں۔"(43)

بار کے اس علاقے کی مقامیت سے شروع ہونے والا قصہ ملکی تناظر اور بین الاقوامی حالات کو بھی اپنے ساتھ لپیٹتا ہے۔ مقامیت کی نمائندگی ناول میں آخر تک رہتی ہے۔ مذہب کے کرداروں کا بیان ہو یا سیاسی کرداروں کا مقامی کرداروں کے بیان میں مقامی زبان کے اثرات بھی موجود رہتے ہیں۔

دائرہ اور بھید عاصم بٹ کے ناول ہیں۔ دونوں ناولوں میں لاہور کی مقامیت ہے۔ مقامی ثقافت کے بیان میں ناول نگار نے کرداروں کا انتخاب مقامی سطح پہ ہی کیا ہے۔ ان کے کرداروں کا تعلق عموماً لاہور کے روایتی اور متوسط طبقے سے ہے۔ ناول میں کرداروں کا زبان و بیان لاہوری ہے۔ لاہور کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کے کرداروں کے باسیوں کی زبان کا مخصوص مقامی لب و لہجہ موجود ہوتا ہے۔ ان ناولوں کے کرداروں میں یہی اثرات دکھائی دیتے ہیں یہ کردار اپنی زبان کے ذریعے مقامیت کی درست انداز میں وضاحت یا نمائندگی کرتے ہیں۔

> "پتر میاں آصف دانہ بچھڑے ہوں۔ اونہاں دی نوداپکا ملتان اے۔ اودھے پکیوں نہ آئے ہوں پروہنے۔ نہیں ابا!" نوجوان کے لہجے میں بیزاری تھی "اے فلماں دے اداکار نے توہانوں نہیں پتہ۔"(44)

ناول کے کرداروں کے مطالعے میں زبان کے الفاظ کی کثرت کے ساتھ ساتھ ان میں مکمل جملے بھی موجود ہیں۔ ان ناولوں کے مقامی کردار میں مقامی زبان کی نمائندگی ملتی ہے۔ جس سے ان کے کرداروں کا بیان بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ان ناولوں میں زبان کے عنصر کی فراوانی ہے۔ اس میں کرداروں کا مقامیت کی ذیل میں یہاں زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ ان کرداروں کے یہاں ناول نگار نے زبان کے عنصر کو زیادہ نمایاں دکھایا ہے۔

مقامی بیانیہ مختلف لوکیل میں:

اکیسویں صدی کے ان ناولوں میں مجموعی طور پر مقامی بیانیہ ہی زیادہ ہے۔ یہ کسی خاص مقامی ثقافت کے تحت لکھے گئے ہیں۔ زیادہ ناولوں کی کہانی اور کردار اپنے مخصوص علاقے ہی میں رہتے ہیں۔ کچھ ناول ایسے بھی ہیں جن

کا زمانی تناظر وسیع ہے اور ان کے کردار محض اپنے علاقے میں ہی نہیں بلکہ ان کی حدود سے باہر جا کر بھی یہ کردار اس مقامیت سے انحراف نہیں کرتے بلکہ اس کے نمائندہ کے طور پر موجود ہوتے ہیں۔ ایسے کرداروں کے ذریعے سے مقامیت دوسرے علاقوں میں بھی متعارف ہوتی ہے۔ یہ کردار اپنی ہی ثقافت کے نمائندے ہوتے ہیں اور یہی اس کی کامیابی ہے۔ وہ وقت اور حالات کے اثرات کو برداشت کر کے بھی اپنے ارتقاء کا سلسلہ جاری رکھتی ہے۔ اس نقطہ نظر کے تحت چند ناولوں کا تذکرہ کیا جائے گا۔ جن کے ہاں مقامی بیانیہ ان کے کرداروں کے ذریعے دوسرے علاقوں میں بھی پہنچا۔ وہ اپنے اصل سے دور رہ کر بھی اس کی نمائندگی کرتے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

گراں میں پوٹھوہار کے علاقے کی کتھا ہے۔ یہاں کے بارانی علاقے میں کھیتوں میں فصلوں کی مقدار میدانی علاقوں کی نسبت بہت کم ہے۔ ان علاقوں میں صنعتی ترقی بھی اس قدر نہ تھی۔ یہاں کے لوگوں نے بیرون ملک سفر شروع کیا جو کامیاب بھی رہا اور اس طرح یہاں کے لوگوں میں اسی طرف رجحان بڑھنے لگا۔ بعد میں آنے والی نسل تو یہاں رہنے کے بجائے فوراً وہاں پہنچنے کی منتظر تھی۔ ناول میں اس رویے کو دکھایا گیا ہے۔ یہاں بیٹھے لوگ ان دوسرے ملکوں کی ثقافت کی آبیاری کرنے لگے۔ ان کے نزدیک ترقی کا آغاز اسی میں پوشیدہ ہے۔ دوسری طرف وہاں جانے اور رہنے والے شدت سے روایت پسند ہو گئے۔ اپنے آبائی ورثے کو قائم رکھنے کے جتن کرنے لگے۔ اپنی روایت، مقامی شناخت کو قائم رکھا جانے لگا۔

> "یہ ستر کی دہائی تھی جب پوٹھوہار میں سے ہر وہ مرد جو اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکتا تھا ہر وہ بچہ جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ پاسپورٹ بنوا کر بیرونی ملک کمائی کرنے چلا گیا تھا۔"(45)

پاکستان اور ہندوستان سے بہت سے لوگ ان ملکوں میں روزگار کے حصول کے لیے جاتے ہیں اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس معاشرت میں رہنے والے اس کے باوجود بھی اپنے رسم و رواج روایات سے جڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کے کرداروں کے ذریعے جس کا تعلق پوٹھوہار سے تھا۔ ان کے بیان میں ایسے مرقعے ملتے ہیں۔ غزل جان مقامی کردار ہے۔ تاہم اس کی تفصیل میں یورپ میں مقیم ایشیائی پاکستانی خاندانوں کا بیان کرتے ہوئے وہ کہتی ہے کہ:

> "انہوں نے برطانوی آئین سے وفاداری کے معاہدے میں پناہ تو لے لی تھی لیکن کچھوے کی طرح اسی دہائی کے شیل میں خود کو چھپا کر جیسے ارد گرد کے ماحول کو اپنی دہلیز سے باہر کھڑا کر دیا ہو۔"(46)

ناول کے یہ کردار دوسری ثقافتوں میں جا کر بھی اپنے روایتی طریقوں پر قائم رہتے ہیں۔ غزل جان پڑھی لکھی لڑکی یورپ میں پڑھ کر واپس آ کر خاندانی فیصلے کے مطابق شادی کرتی ہے اور دوسری طرف یہاں بیٹھے نوجوان ہر دم دوسرے ملکوں کے رسم و رواج کو اپناتے ہیں۔ ناول میں مقامی کردار بیرون ملک بھی اپنے علاقے کی نمائندگی کے طور پر نظر آتے ہیں۔

غلام باغ میں مختلف گروہوں اور طبقوں کے نمائندہ کردار ہیں۔ ناول میں ایک مرکزیت پر ناول نگار نے مختلف لوگوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہ کردار مختلف طبقوں اور علاقوں کی نمائندہ ہیں۔ ان کرداروں کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ایک بڑے مرکز میں رہ کر بھی اپنے اصل سے جڑے رہتے ہیں۔ ایک طرف یاور عطائی کا کردار ہے جو اپنے ماضی کو بھلانے کے لیے اشرافیہ میں اپنا مقام حاصل کر کے ان کے درمیان رہتا ہے۔ اپنے ماضی کو فراموش کر کے ایک باعزت مقام بنانا چاہتا ہے تو دوسری طرف اس کی بیٹی اپنے اصل کو تلاش کرنے کی متلاشی ہے۔ یہ کردار اپنے اصل کی طرف لوٹتا ہے۔ وہ شہر میں پیدا ہوئی وہیں پلی بڑھی۔ مگر اپنی نسل کے بارے میں جاننا چاہتی ہے۔ اس کی تلاش میں وہ انعام گڑھ جاتی ہے۔ ایک پوری نسل شہر میں گزرانے کے باوجود اس کا نسلی فطری پن اسے اپنی جڑت تک لے جاتا ہے۔ دوسرا نمایاں کردار کبیر مہدی کا ہے۔ یہ کردار بھی ایک بڑے مرکز پر رہتا ضرور ہے تاہم اس کے باوجود اپنے اصل سے واقف بھی ہے اور وہ گاؤں جا کر وہاں کے حالات دوستوں کو لکھتا ہے۔ اس کی جڑت اپنی آبائی مٹی سے برقرار رہتی ہے۔ کبیر مہدی اپنے آبائی علاقے آ کر یہاں دن بھی گزارتا ہے۔ یہاں کے حوالے سے دوستوں کو آگاہ بھی کرتا ہے۔ اس کی جڑت اپنی مٹی سے برقرار رہتی ہے۔ زیادہ وقت ان سب کرداروں کا ایک مرکز پر گزرتا ہے اور اس کے باوجود وہ اپنی علاقائی شناخت کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس کو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دوسری مقامیت میں جا کر بھی اپنے مخصوص مقامی بیانیے کہ آبیاری کرتے ہیں۔ اور اس کے نمائندے بھی ہیں۔ ہاف مین، مدد علی اس کے مزید کردار ہیں جو سب کسی نہ کسی بیانیے کے حامل اور نمائندہ کردار ہیں۔

خس و خاشاک زمانے اس ضمن میں ان ناولوں میں سب سے نمایاں ناول ہے۔ اس کا وسیع زمانی تناظر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے کردار مختلف قوموں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ناول کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے متنوع کردار ہر صورت میں اپنی مقامیت کے ساتھ جڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اکیسویں صدی کا زمانہ ہو یا ہجرت کا تجربہ مقامی لوگ اس مقامیت سے جڑت برقرار رکھتے ہیں۔ بخت جہاں کا بیٹا اکبر جہاں ہو یا سروہانسی کا بیٹا موتی دونوں دور دیس میں زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی جڑت اپنی مٹی سے قائم رہتی ہے۔ یہ وہاں رہ کر بھی اس نظام کا حصہ نہیں بن پاتے بلکہ اس کا بیانیہ مقامی ہی رہتا ہے۔ ناول کے مقامی کردار ہر جگہ اپنی خصوصیت کو برقرار رکھتے ہیں۔ مقامی کردار اپنے وطن میں ہو یا دیارِ غیر میں اس کا فطری پن تبدیل ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ ڈاکٹر شاہد نواز اس ضمن میں رقم طراز ہیں کہ

> "ناول نگار نے ناول کے مرکزی کرداروں میں سے لے کر مرکزی واقعات تک سب کو دل آویز رنگ میں پیش کیا ہے۔ بخت جہاں ہو یا پھر سروہانسی، ماہو ہو یا پھر سردارنی امرت کور سب کردار مقامی روپ میں نظر آتے ہیں۔"(47)

اکبر جہاں روزگار کی تلاش میں کینیڈا جابستا ہے۔ وہیں وہ شادیاں کرتا ہے تاہم اس کی اولاد کے نام بھی مقامی ہوتے ہیں۔ وہاں ملنے والی زمین جہاں وہ آباد ہوا۔ اس کا نام بھی اپنے خاندانی نام کی نسبت سے "جہاں آباد" رکھتا ہے۔ اس کے اندر خاندانی وضع داری بھی موجود ہے۔ اپنی اولاد کو بھی ایسا دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی بیٹی تو اس کے برعکس مقامی ماحول میں ڈھل جاتی ہے۔ مگر بیٹے روایتی کردار ثابت ہوتے ہیں۔ اکبر جہاں اپنی اولاد کو اپنی خاندانی وجاہت کے بارے میں آگاہ کرتا رہتا ہے، اس نسل کے لوگ جو روزگار کی تلاش میں کسی مجبوری میں اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں آباد ہو وہاں رہ کر تنہائی کا کرب برداشت کرتے ہیں۔ ناول کی خاص خوبی یہ ہے کہ ان کی آئندہ آنے والی نسلیں بھی اپنے نسلی روایت کے نمائندے ہیں۔ وہ اپنی اصل شناخت کو گم نہیں کرتے۔

> "تمہارے دادا وقت جہاں کا اور اس کے باپ کا ایک طرح کا رشتہ تھا برابری کی سطح کا تو نہ تھا پر یہاں اس کڑی یا ہوی سرزمین پر اور کوئی بھی نہیں جو ہمارا آبائی سگا ہو۔۔۔اسے اپنے دکھوں میں شریک کرنے کے لیے گیا تھا۔۔۔بخت جہان اپنے ان اکلوتے دور پار کے رشتوں سے رابطہ رکھنا چاہیے کہ ان کے سوا یہاں ہمارا کوئی نہیں ہے۔"(48)

شباہت کینیڈا میں پلی بڑی، اس کے باوجود وہ اپنی اصل نسل کے بارے میں متجسس ہے کہ وہ اپنے آبائی علاقے اور نسل کے بارے میں جان سکے۔ اسی کھوج میں وہ پاکستان آتی ہے۔ کینیڈا میں رہتے ہوئے بھی وہ اس اپنی بنگالی ماں اور پاکستانی باپ کی روایتی وضع داری کو قائم رکھتی ہے۔ یہ اس دنیا کی رنگینیوں سے متاثر ہونے کے بجائے اپنے اصل کی طرف متوجہ رہتی ہے۔ اس کردار کے ذریعے مقامی بیانیہ جاری رہتا ہے۔ وہ اپنے اصل کو جاننے کے لیے پریشان ہے۔ اس کی چچازاد بہنوں اور اس میں فرق واضح دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے اصل وطن میں رہ کر بھی اس سے دور ہیں جبکہ وہ دور رہ کر بھی روایتی لحاظ سے مزین ہے۔ وہ اپنے دادا سر وہانسی کو بطور خاص وقت دیتی ہے۔ وہ اس سے اپنی نسل کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا چاہتی ہے۔

> "تو میری اکلوتی پوتی ہے۔ ان کو چھوڑ جو دو چار ماہ بعد میرے کمرے میں جھانک لیتی ہیں۔۔ ہیلو گرینڈ پا۔۔ اس انداز میں کہتی ہیں کہ اچھا تم ابھی زندہ ہو۔۔۔ اور چلی جاتی ہیں۔۔۔ تیرا تو کوئی سانسی نام ہونا چاہیے تھا۔۔۔ جھیرو۔ کموں یا بھاتی وغیرہ۔ پتر تو اتنے دور ملکوں سے اس لیے یہاں آئی ہے نا کہ یہ جان سکے کہ تیرے بیج بوٹے کہاں اور کس مٹی سے پھوٹے ہیں۔"(49)

یہ کردار موقع کے باوجود بھی دوسری تہذیبوں میں مدغم نہیں ہوتے بلکہ اپنی روایت کے مطابق چلتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں رہنے کے باوجود ان کے ہاں مقامی بیانیہ چلتا ہے۔ جو موقع ملنے پہ اپنے آبائی علاقوں میں لوٹنے کے بھی متلاشی ہیں۔ جو ان کے والدین نہ کر سکے وہ یہ کرنے کے درپے ہیں۔ بخت جہاں تو اس میں کامیاب بھی

ہو جاتا ہے۔ جو اپنے دادا کی زمین کے حصول کے لیے پاکستان چلا جاتا ہے اور پھر اس ثقافت کو از سر نو نو زندہ کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ناول نگار نے اس کردار کے ذریعے مقامیت کی برتری کو پھر سے قائم کر دیتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ اختر رضا سلیمی۔ جاگے ہیں خواب میں(راولپنڈی:رومیل پبلشرز،نومبر2022ء)ص20،21
2۔ اختر رضا سلیمی۔ جندر (راولپنڈی:رومیل پبلشرز،فروری2020ء)ص29
3۔ محمد حفیظ خان-ادھ ادھورے لوگ (جہلم: بک کارنر شوروم،اشاعت دوم2019ء)ص38،39
4۔ محمد حفیظ خان۔ انواسی ۔(جہلم: بک کارنر شوروم اشاعت دوم دسمبر،2019ء)ص24
5۔ محمد عاصم بٹ۔ دائرہ -(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز)2014ء-ص192
6۔ طاہر نواز- شہر مرگ۔ (رواولپنڈی:اوزونک پبلشرز،2020ء)ص46
7۔ علی اکبر ناطق۔ نولکھی کوٹھی(جہلم: بک کارنر شوروم۔اشاعت ہفتم2021ء)ص130
8۔ مرزا اطہر بیگ- غلام باغ ۔(لاہور:الحمد پبلی کیشنز۔اشاعت ہفتم۔2021ء)ص146
9۔ مرزا اطہر بیگ۔غلام باغ۔2021ء۔ص779
10۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خاشاک زمانے (لاہور:سنگ میل پبلشرز2017ء)ص106
11۔ اختر رضا سلیمی۔ جندر ۔2020ء۔ص12
12۔ طاہرہ اقبال۔ نیلی بار(اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،اشاعتِ دوم2020ء)ص526،525
13۔ طاہرہ اقبال- گراں (اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،2019ء)ص69
14۔ طاہر نواز-شہر مرگ ۔2020ء۔ص55،54
15۔ محمد عاصم بٹ۔ دائرہ ۔ 2014ء۔ص135
16۔ محمد عاصم بٹ۔ بھید(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز۔2018ء)ص119
17۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خاشاک زمانے ۔2017ءص191
18۔ اختر رضا سلیمی-جاگے ہیں خواب میں ۔2022ء،ص90
19۔ محمد حفیظ خان۔ ادھ ادھورے لوگ۔2019ء۔ص75
20۔ محمد حفیظ خان۔ انواسی،2019ء،ص132
21۔ طاہرہ اقبال-نیلی بار۔2019ء۔ص139
22۔ طاہرہ اقبال،گراں ۔2019ء،ص31
23۔ طاہرہ اقبال، گراں ۔2019ء،ص
24۔ محمد عاصم بٹ- دائرہ ۔2014ء۔ص46

25۔ مرزااطہر بیگ- غلام باغ ۔2021ء۔ص148

26۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خا شاک زمانے ۔2017ء،ص22

27۔ محمد حفیظ خان- ادھ ادھورے لوگ ۔2019ء۔ص159،160

28۔ طاہرہ اقبال- نیلی بار۔2019ء۔ص66

29۔ ایضاً۔ص72

30۔ مبارک علی۔پاکستانی معاشرہ (لاہور: فکشن ہاؤس2020ء)ص77

31۔ طاہرہ اقبال- نیلی بار۔2019ء۔ص445،446

32۔ مرزااطہر بیگ۔غلام باغ ۔2021ء۔ص770

33۔ ایضاً۔ص790

34۔ طاہرہ اقبال- نیلی بار۔2019ء۔ص352

35۔ ایضاً۔ص466

36۔ شاہد نواز۔پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ 1947ءتا 2007ء(فیصل آباد: مثال پبلشرز2018ء)ص

37۔ مرزااطہر بیگ۔غلام باغ ۔2021ء۔ص148

38۔ مرزااطہر بیگ- غلام باغ ۔2021ء ص849

39۔ مستنصر حسین تارڑ۔خس و خا شاک زمانے ۔2017ء۔ص854

40۔ اختر رضا سلیمی۔جا گے ہیں خواب میں ۔2022ء۔ص84

41۔ محمد طارق ۔"انصاری حفیظ خان کے اردو ناول نواسی میں مقامیت کی تشکیل اور پیشکش"۔ مشمولہ: متن (بہاولپور: شعبہ اردو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور جلد تین شمارہ جولائی تا دسمبر 2022ء)

42۔ طاہرہ اقبال، گراں ۔2019ء۔ص62

43۔ طاہرہ اقبال- نیلی بار۔2019ء۔ص21

44۔ محمد عاصم بٹ۔دائرہ ۔2014ء۔ص84

45۔ طاہرہ اقبال۔گراں ۔2019ء،ص79

46۔ ایضاً۔ص106

47۔ شاہد نواز۔اکیسویں صدی کے اردو ناول میں مقامیت کی دل آویز۔ تشکیل۔ مشمولہ اکادمی ادبیات (اسلام آباد: خصوصی ناول نمبر، جولائی تا دسمبر جلد دوم۔2020ء)ص111

48۔ مستنصر حسین تارڑ۔ خس و خا شاک زما نے ۔2017ء۔ص535،536

49۔ ایضاً۔ص560،561

ماحصل

مابعد جدیدیت ایک وسیع تر اصطلاح ہے۔اس کے نظریات کے تحت ادب کو مختلف زاویوں سے پرکھا جارہا ہے۔مابعد جدیدیت کا خاصا یہ ہے کہ وہ ادب کو پرانی بندشوں سے آزاد کر کے نئے امکانات سے روشن کرا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ روایت کے ساتھ جڑت بھی موجود ہے۔مابعد جدیدیت کا تصورِ مقامیت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔اس تصور نے مہابیانیوں کا رد کیا ہے۔ان مہابیانیوں کے زیر اثر آنے والے چھوٹے ثقافتی گروہوں کی آواز کو بلند کیا ہے۔ وہ کسی بھی رائج بیانیے کو رد کرتے ہوئے اس کی حوصلہ شکنی کرتی ہے اور معنی آفرینی کے لیے چھوٹے سے چھوٹے ثقافتی گروہوں /بیانیوں کی طرف رجوع کرتی ہے۔ چھوٹے ثقافتی گروہوں کے بیانیے سے محض ان کی پہچان ہی نہیں ہوتی بلکہ ان کے مختلف مقامی عناصر کے بھی بازیافت ہوتی ہے۔ان عناصر میں ان میں انفرادیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔زیر نظر مقالہ اس تصورِ مقامیت کے تحت لکھا گیا ہے۔اکیسویں صدی کے منتخب اردو ناولوں میں مقامیت اور اس کے مختلف عناصر کی پیشکش کو بیان کیا گیا ہے۔

مابعد جدیدیت کا تصورِ مقامیت، مقامیت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔اس کا مقصد بڑے گروہوں اور بیانیوں کے غلبے کو ختم کرنا ہے۔اس ضمن میں چھوٹے گروہوں کی آواز کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ مقامیت کی ذیل میں اس کے مختلف عناصر کار فرما ہوتے ہیں۔زبان، ثقافت، بودوباش، رہن سہن، فنِ تعمیر سبھی شامل ہیں۔عناصر سے مقامیت کی عکاسی ہوتی ہے۔ان عناصر کی وضاحت سے اس مقامیت کا بیان واضح ہو جاتا ہے جس کی نمائندگی یہ کرتے ہیں۔مابعد جدیدیت ان تصورات کا رد کرتی ہے جو جدیدیت کے پیرائے میں قائم ہوئے۔ جنھوں نے اپنا تسلط قائم کرتے ہوئے باقی ثقافتی گروہوں کو معدوم اور غیر فعال کر دیا۔ چھوٹے گرہوان کے زیر اثر آ گئے اور ان سے ہی ان کی پہچان ہونے لگی۔زیرِ نظر مقالے میں تحقیق کے ذریعے ان ناولوں میں ایسے عناصر تلاش کیے گئے ہیں جو مقامیت کے بیان کو مکمل اور واضح کرتے ہیں۔

ناول ہی وہ صنف نثر ہے جس میں زندگی کی مکمل ترجمانی کی جاسکتی ہے۔ناول میں روایتی موضوعات تو چل ہی رہے ہیں، تقسیم سے متاثرہ ادب ہنوز تخلیق ہو رہا ہے۔ناول نگاروں کے موضوعات میں ابھی تک ہجرت کا تجربہ کسی نہ کسی صورت میں در آتا ہے۔ناول نگاروں نے اپنی مقامی ثقافتوں کی طرف بھی انحراف کیا ہے۔ان کے بیانیے بھی اب شامل ہونے لگے ہیں۔اکیسویں صدی میں اس رجحان میں تیزی سے اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ناول نگاروں نے بڑے شہروں میں رہتے ہوئے بھی مختلف چھوٹے ثقافتی گروہوں کو ناولوں میں بیان کیا ہے۔ان ضمنی ثقافتوں میں جن کو عموماً کسی بڑی ثقافت کے تحت ہی دیکھا جاسکتا ہے۔بڑے ثقافتی گروہوں کے اجارہ داری نے ان کی حیثیت کو کمتر اور

ان کے بیانیے کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اکیسویں صدی میں اس رجحان میں اضافہ دیکھا جا سکتا ہے کہ جدیدیت کی وہ لہر جس نے گلوبل ویلیج کا تصور دے کر لوگوں کو ایک مرکزیت پر لا کھڑا کیا۔ ایک ثقافت اور زبان کو اپنانے کا پر کشش نعرہ لگایا گیا۔ مگر اس دلفریب نعرے کے پیچھے تو ثقافتی یلغار تھی۔ جو چند قوتیں اپنے تسلط کو قائم کرنے کے لیے اپنا نعرہ لگاتی ہیں، جن کا مقصد اپنی ثقافت کی آبیاری کے ساتھ ساتھ دوسروں کے دلوں میں اس کی ہیبت بڑھانا بھی ہے۔ ان کی ثقافت بہر حال اس قدر وسعت والی ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ تمام صورتوں میں اس کی برتری ثابت کرنا ہے۔

زیرِ نظر مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مقالے میں انواسی، ادھ ادھورے لوگ، بھید، جندر، جاگے ہیں خواب میں، خس و خاشاک زمانے میں، غلام باغ، شہرِ مرگ، شہر خالی کوچہ خالی، نو لکھی کوٹھی، نیلی بار، دائرہ، گراں ناولوں کو مقامیت کے مابعد جدید تصور کے تحت پرکھا گیا ہے۔ مقالے کا پہلا باب تعارفی ہے۔ اس میں مابعد جدیدیت کی تفہیم کے لیے ماہرین کی چند تعریف کی روشنی میں مابعد جدیدیت کے اصل تصور اور مطلب کو سمجھا گیا ہے۔ مابعد جدید کے مختلف نظریات کو حوالوں کے طور پر مد نظر رکھا گیا ہے۔ مابعد جدیدیت کے تصورِ مقامیت کو واضح کیا گیا ہے۔ ادب اور مقامیت کو مختصراً بیان کرتے ہوئے جس کا مقصد ادب میں مقامیت کا مختلف اصناف اور انداز میں بیان ہے۔ باب کے دوسرے حصے میں اردو ناول کی تاریخ اور روایت میں مقامیت کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ ان ناولوں یا ناول نگاروں کا تذکرہ ہے جن کے ہاں بڑے بیانیوں سے انحراف اور مقامی ثقافتوں کا بیان موجود ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے ناولوں کو اس مختصر بحث میں سمیٹا گیا ہے۔ چند ناولوں میں بڑے بیانیے کے برعکس چھوٹے علاقائی بیانیوں کو شامل کیا گیا ہے۔ ان ناولوں کا تذکرہ مختصراً اس حصے میں موجود ہے۔

باب دوم میں مقامیت کے تین بنیادی پہلو معاشی، خارجی، بود و باش، داخلی رہن سہن، رسم و رواج اور زبان کا ان ناولوں میں جائزہ لیا گیا ہے۔ بعض ناولوں میں تو تمام ہی عناصر موجود ہیں۔ اس باب میں اس کی نوعیت کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ ان میں معاشی، سماجی، خارجی اور داخلی بیانیے کس نوعیت کے ہیں۔ اس مقامیت کے تناظر میں ان بیانیوں کی اہمیت کس حد ساتھ تک ہے۔ ناول نگاروں نے اسے کس حد تک برتا ہے۔ ہر مقامیت میں یہ عناصر مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان میں یہ انفرادیت موجود ہوتی ہے۔ تاہم کچھ ناولوں میں کچھ اختلافات بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ ان میں سے کچھ پہلو انفرادیت کے بجائے کسی بڑی ثقافت سے متاثر بھی نظر آئے ہیں یا کچھ ناولوں میں ماضی اور حال کا تقابل بھی ہے۔ بعض کے معاشی نظام کی تبدیلی نے پورے مقامی ماحول کو ہی یکسر بدل کر رکھ دیا۔ جس سے کسی ایک یا خاص عنصر میں اس کی انفرادیت ختم ہوئی یا پھر پورا ماحول ہی تبدیل ہو گیا۔ گراں ناول اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔

باب سوم میں ثقافت، مذہب، سیاست کے عناصر کو وضاحت سے دیکھا گیا ہے۔ منتخب ناولوں میں ثقافت تو سب ہی میں یکساں عنصر ہے۔ ان تمام ناولوں میں کسی نہ کسی ثقافت کا بیان ہے۔ ناولوں میں ثقافت کے تناظر میں یہ

بات بھی بطور خاص ملحوظ خاطر رکھی گئی ہے کہ کیاان ثقافت کے کرداروں اور لوکیل کے ذریعے ان کی عملی وضاحت کی گئی ہے یا محض اس کا بیانیہ ہے یاان ناولوں کی اکثریت کا قصہ اپنی مقامی ثقافت میں ہی بیان ہوا ہے۔ ناول نگاروں نے مختلف ثقافتوں کا انتخاب کر کے ان کو ادب میں نمایاں کیا۔ بعض ناولوں میں تو مقامی ثقافت کی حدود اس قدر بڑھ گئیں ہیں کہ وہ دوسرے علاقوں، ملکوں میں جا کر بھی اپنے وجود کو نہ صرف برقرار رکھتی ہیں بلکہ وہ اپنے اصل کی نمائندہ بن جاتی ہیں۔ مذہبی عنصر کے تحت ان مقامی ثقافتوں میں مذہبی بیانیے کی نوعیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان مقامی علاقوں میں مذہب کے مختلف تصورات، مخصوص رسم ورواج، اساطیر قائم ہیں۔ باہر سے آنے والے مذاہب نے بھی ان اثرات کو قبول کرتے ہوئے اپنے اندر جذب کر لیا۔ ان مقامی علاقوں میں مذہب کے مختلف تصورات مخصوص رسوم ورواج جو علاقائی ثقافت سے مذہب کے مقامی بیانیے کی صورت میں ڈھل گئے کچھ علاقوں میں مذہب کی تبدیلی کے باوجود مقامی رسم ورواج اساطیر قائم رہیں اور آنے والے مذہب کا حصہ تصور کیا جانے لگے ہیں۔ یوں بعض مقامات پہ معمولی اور بعض پہ کچھ حد تک زیادہ فرق کے ساتھ اس مذہبی بیانیے کی نوعیت مختلف دکھائی دی ہے۔ کچھ ناولوں میں مذہبی بیانیے کسی بڑی مقامیت کے تحت موجود ہیں جس میں کوئی تصور مخصوص نہیں ہے۔ سیاسی بیانیوں کا بھی اس باب میں جائزہ لیا گیا ہے۔ ناول میں سے چند ناولوں کے ہاں اس کی بہتات ہے کچھ کا قصہ ہی کسی سیاسی فیصلے کے زیر اثر پروان چڑھتا ہے، جو اس پورے مقامی ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ بعض سیاسی فیصلے اس مقامیت کو داخلی اور خارجی طور پر زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ ان کے فیصلوں کے اثرات سے علاقائی لوگوں کی زندگیوں پہ بھی اثرات مرتب کیے ہیں۔

باب چہارم میں اکیسویں صدی کے منتخب اردو ناولوں میں مقامیت کے تاریخی پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مقامیت پہ اپنی تاریخ کے اثرات بھی موجود ہوتے ہیں۔ جس طرح باقی عناصر کے تحت جائزہ میں دیکھا گیا کہ کس طرح ان مقامی ثقافتوں، علاقوں پہ اثرات پڑے۔ اس طرح مقامیت کی تاریخ کے اثرات بھی ایک اہم پہلو ہے۔ بعض ناولوں کو تو لکھا ہی کسی مخصوص تاریخی دور کے زیر اثر گیا ہے۔ کچھ ناولوں میں ان کی عمومی تاریخ نے ان کو متاثر کیا ۔ بیسویں اور اکیسویں صدی کے انقلابات ہوں یا نوآبادیاتی نظام ان ناولوں میں مختلف تاریخی ادوار کے مقامیت پہ اثرانداز ہونے کے شواہد موجود ہیں۔ کچھ کی علاقائی تاریخ میں آنے والے واقعات ان پر اثر انداز ہوئے ہیں تو بعض جگہوں پر تاریخ کے تناظر میں ہونے والے انقلابات نے اس مقامیت کے انفرادی نظام اور شناخت کو یہ یکسر تبدیل کر دیا۔ باب کے دوسرے حصے میں سماجی روابط میں تاریخ کی اہمیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے تحت ناولوں میں موجود سماجی روابط یا کسی بڑے بیاناتی تبدیلی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کچھ ناولوں میں کسی مخصوص تاریخی تناظر/واقعے نے یکسر سب کچھ بدل دیا ہے جو چند ناولوں میں موجود بھی ہیں۔

محقق نے باب پنجم میں اس سے قبل ابواب میں کئے گئے مقامیت کے مختلف عناصر کے جائزے کو مزید اس نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے کن عناصر کی زیادہ بہتات ہے۔ کون سے عناصر ایسے ہیں جو کسی ناول میں مشترک اور کون سے عناصر ہیں جو کچھ ناولوں میں ان کی انفرادیت کا باعث بنے ہیں۔ بعض ناولوں میں مذہبی، سیاسی اور معاشی عناصر کی بہتات ہے۔ ان میں سے چند ناولوں میں نوآبادیاتی نظام کی آویزش بھی ہے۔ کچھ ناولوں میں سیاسی عناصر زیادہ ہیں یا سیاسی نوعیت کا ناول ہے۔ جو اپنی اس خاص مقامیت میں لکھا گیا ہے۔ اس باب میں اشترکات اور اختلافات کے عنوانات کے تحت دونوں میں مقامیت کے عناصر کی تفہیم کی گئی ہے۔ کچھ ناولوں میں کسی خاص عنصر کی نمائندگی ملتی ہے جو دوسروں سے اسے مختلف بنا دیتی ہے ۔

اس مقالے کو تحریر کرتے ہوئے یہ کوشش کی گئی ہے کہ براہ راست ناول نگاروں کی تخلیقات کو بنیادی ماخذ کے طور پر ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔ ان کے متن میں موجود عناصر کی تلاش کی جا سکے۔ مقامیت کی ذیل میں ہمارے ہاں تحقیق بہت کم ہے۔ جس کی وجہ مقامیت کی غلط اور مبہم تفہیم ہے۔ مقامیت کے تصور کو باقاعدہ ایک الگ خیال نہیں جاتا۔ اسے عموماً ثقافتی تصور کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے اور اس کی ذیل میں پائی جانے والی ثقافتوں کو ایک الگ ثقافتوں کے تحت سمجھا اور پرکھا نہیں جاتا۔ بڑے ثقافتی گروہوں تک سوچ کو محدود کر کے اسی کے تحت پرکھا جاتا ہے۔ جب تک ان چھوٹے گروہوں کو ایک اکائی کے طور پر سمجھا اور تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ان کے عناصر کی تقسیم بھی آسان نہیں ہو گی۔ بڑے ثقافتی تصور کے تحت ان کو سمجھنے کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اکیسویں صدی کے ان ناولوں میں تصورِ مقامیت کے ذریعے سے جہاں مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر کی توثیق ہوتی ہے وہیں مقامی علاقوں اور مقامی بیانیوں کی آواز کو بھی طاقت ملتی ہے۔ اس طرح سے اس مقالے میں یہ گئے تجزیہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان ناولوں میں موجود مقامیت مختلف عناصر کے ساتھ موجود ہے اور بعض اوقات ماضی کے پیرائے میں بھی اس مقامیت کی انفرادیت، اس کی خصوصیات کو ناول نگاروں نے اپنے فن کے ذریعے سے از سرِ نو زندہ کیا ہے۔

مابعد جدیدیت کے تصورِ مقامیت کے تحت لکھے گئے اس مقالے میں تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ناولوں میں مقامیت کے اکثر عناصر موجود ہیں۔ ان ناولوں میں مختلف مقامی ثقافتوں کا بیانیہ شامل ہے۔ مابعد جدیدیت خود اس تصور کی قائل ہے کہ مہابیانیوں کی جگہ مقامی بیانیوں کی آواز کو طاقتور بنایا جائے۔ مابعد جدیدیت کے نظریات کے تحت ان ناولوں کو پرکھا گیا ہے۔ بعض عناصر تو بڑے گروہوں کے مقابلے میں اپنی اہمیت/اصلیت واضح کرنے کے جتن میں ہیں۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ان ناولوں میں موجود مقامیت کے عناصر مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر کی توثیق کرتے ہیں۔

نتائج

اس مقالے بعنوان "اکیسویں صدی کے منتخب اردو ناولوں میں مقامیت: مابعد جدیدیت کے تناظر میں" میں محقق نے منتخب ناولوں(انواسی، ادھ ادھورے لوگ، بھید،جندر ، جاگے ہیں خواب میں، خس و خاشاک زمانے ، غلام باغ، شہرِ مرگ، شہر خالی کوچہ خالی،نو لکھی کوٹھی، نیلی بار ، دائرہ،گراں)میں **مقامیت کا مابعد** جدیدیت کے تصور مقامیت کے تحت تجزیہ کیا ہے۔اس مقالے میں تحقیق میں سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ان ناولوں میں مقامت کے عناصر کی کارفرمائی ملتی ہے۔ان ناولوں میں موجود عناصر مقامی نوعیت کے ہیں۔ محقق کی رائے کے مطابق ان ناولوں میں مقامیت کے مندرجہ ذیل اہم عناصر کی کارفرمائی ملتی ہے:

I۔ ناولوں میں موجود مقامیت کی مختلف عناصر کے ذریعے وضاحت ملتی ہے۔

II۔ ناولوں کی اکثریت میں مقامیت کو اسی مقامیت کی حدود میں کرداروں کے ذریعے سے واضح کیا گیا ہے جو اس کی عناصر کی وضاحت کرتے ہیں۔

III۔ اردو ناول کی تاریخ میں ناولوں میں عرب، یورپی، فارسی،ہند اسلامی، نوآبادیاتی اور ہندوستان کی مجموعی تہذیب و ثقافت کا بیان ملتا ہے۔اکیسویں صدی کے ان ناولوں میں چھوٹے ثقافتی گروہوں کا بیانیہ ہے۔اس ضمن میں کچھ ثقافتیں پہلی بار اردو ادب میں بیانیاتی طور پہ شامل ہوئی ہیں۔

IV۔ ناولوں کی زبان میں مقامی الفاظ کی آمیزش ہے۔

V۔ جدیدیت کے اثرات، نئی نسلوں کا اس کی تقلید میں اپنی مقامیت سے انحراف کا مسئلہ بھی دیکھا گیا ہے۔

VI۔ ناولوں میں تاریخی تناظر میں بھی واقعات موجود ہیں جو نہ صرف اس مقامیت سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ کسی بڑے جغرافیائی ماحول کا بھی شعور دیتے ہیں۔

VII۔ مقامیت کے عناصر سماجی، مذہبی، سیاسی، بود و باش، خوراک، رسم و رواج، ثقافت، مقامی/علاقائی عناصر ان ناولوں میں موجود ہے۔

VIII۔ بعض ناولوں میں مقامیت کے پیرائے میں بڑے بیانیوں کے متخالف کا پہلو بھی دکھائی دیتا ہے۔

IX۔ ناولوں میں موجود مقامی بیانیے سے نہ صرف اس مقامیت کے بیانیے کو آواز ملی بلکہ مہابیانیوں کی طرف رجحان میں کمی کے ساتھ ساتھ علاقائی بیانیوں کی طرف بڑھتا رجحان دیکھا جاسکتا ہے۔

X۔ ناولوں کی کہانی مقامی کرداروں کے ذریعے مقامی لوکیل اور اس سے باہر بھی مقامی کرداروں کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔ مقامیت سے باہر بھی یہ کردار مقامی بیانیے کو اپناتے ہیں۔

ان تمام ناول نگاروں کے ہاں مقامیت کے شعور کے ساتھ ساتھ مقامیت کی مختلف ثقافتی اکائیاں بھی موجود ہیں۔یہ مخصوص مقامیتیں اپنے اندر پورا نظام رکھتی ہیں۔ان ناولوں کی تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ان میں سے بہت سی مقامیت محض بیاناتی طور پر نہیں بلکہ داخلی اعتبار سے بھی اپنے اندر ایک پورا نظام رکھتی ہیں۔ان ناولوں کی تحقیق و تنقید سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ضروری نہیں کسی مقامیت کا تجزیہ کرتے ہوئے اس میں سارے ہی عناصر تلاش کیے جا سکیں۔ بعض مقامی ثقافتیں اب اس طرح سے تمام عناصر کے ساتھ موجود نہیں ہیں۔بعض مقامیتیں کچھ عناصر بڑی مقامیتوں سے بھی اثر قبول کرتے ہوئے اپنا لیتی ہیں۔اس کے باوجود کچھ عناصر میں ان کی انفرادیت برقرار رہتی ہے۔مابعد جدید کے تصور مقامیت کے تحت ان ناولوں کی تجزیے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ان نالوں میں محض قصے کہانی کی حد تک ہی مقامیت نہیں ہے بلکہ مقامیت اپنے تمام تر خود کار نظام کے ساتھ موجود ہے۔ ان کی انفرادیت سے مہا بیانیوں کی حقیقت کا بھی پردہ چاک ہو گیا ہے۔ ان ناولوں میں تاریخی، سماجی، سیاسی مذہبی مختلف بیانیوں کے تجزیے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ان ناولوں میں موجود یا بیان کردہ مقامیتوں میں یہ تمام عناصر کسی نہ کسی صورت میں ضرور پائے جاتے ہیں۔ زبان جو ایک بڑے جزو کی حیثیت میں دیکھی جاتی ہے۔ان مقامی ثقافتوں کے تجزیے سے یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ زبان وبیان میں مقامی الفاظ اور جملوں نے ان مقامیت کے زبان کے پہلو کو بھی اجاگر کر دیا ہے۔بحیثیت مجموعی ناولوں میں مقامیت کے عناصر کی وضاحت کے ساتھ ساتھ یہ ساری چیزیں اس بات کی دلیل ہیں یا تمام ناول مقامیت کی ذیل میں لکھے گئے ہیں اور ان میں سب مقامی بیانیے مختلف حوالوں سے موجود ہیں۔جو مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر کے عین مطابق ہے۔

سفارشات

مابعد جدیدیت تنقید اور تحقیق کے میدان میں اس کے کئی پہلوؤں کو عمل میں لایا جارہا ہے۔ جامعاتی تحقیق میں مابعد جدیدیت کے مختلف نظریات کے تحت مقالہ جات تحریر ہو رہے ہیں اور اس پہ تحقیقی کام جاری ہے مگر دیکھا جائے تو مقامیت کی ذیل میں کام بہت کم اور ابتدائی نوعیت کا بلکہ یوں کہا جائے کہ ابھی تک اس کی تفہیم صحیح طرح سے کر کے اس کو عملی تحقیق میں عمل میں نہیں لایا گیا تو بے جا نا ہوگا۔ مقامیت کی ذیل میں اردو ادب میں باقی اصناف میں بھی تحقیق کے وسیع میدان موجود ہیں۔ نثر کی مختلف اصناف کے ساتھ ساتھ شعری اصناف میں بھی اس کی ذیل میں ایک وسیع تحقیقی کام ابھی بھی باقی ہے زیر نظر مقالہ صرف اکیسوی صدی کے منتخب کردہ ناولوں تک محدود ہے جبکہ اس کے علاوہ بیسویں صدی کے ناولوں سمیت ادب کی دوسری اصناف میں بھی مقامیت کے تحت جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ مقامی ثقافتوں کی بازیافت میں ایک اہم وسیلہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ باقی اصناف ادب کو بھی مقامیت کے مابعد جدید رویے کے تحت پرکھنا چاہیے تاکہ مقامی ثقافتوں سے لوگوں کو آگاہی ہو۔ ان کو ایک تاریخی انداز میں محفوظ بھی کیا جاسکے، بعض ثقافتیں ایسی ہیں جو اپنے مٹنے کے قریب ہیں اور ہو سکتا ہے کہ کچھ ایسی ثقافتیں بھی ہوں جو ادب میں تو در آئی ہوں مگر آج عملی طور پہ ان کے نقوش مٹ چکے ہوں تو ایسی ہی ثقافتوں کی بازیافت بھی اس تحقیق کے ذریعے سے کی جاسکتی ہے۔ مقامیت کے عناصر کی تفہیم بہتر انداز سے کی جاسکتی ہے۔ شعر و ادب کا سرمایہ ہمارے ہاں نثر سے بھی زیادہ ہے۔ اگر مقامیت کے اس نظریے کے تحت شاعری کو بھی پرکھا جائے تو بہت سی مقامی اور علاقائی ثقافتوں کا احوال مل سکتا ہے اس تناظر میں ان کی بہتر تفہیم ممکن ہے۔ جن کو تاریخی حوالے سے اور ادبی حوالے سے سامنے لانا یقیناً ایک بڑا ادبی کام ہوگا۔

اس حوالے سے زیر نظر مقالے کو مد نظر رکھتے ہوئے بہت حد تک رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے اور اس کی تقلید کرتے ہوئے اس نظریے کو ادب کی دوسری اصناف میں بھی تحقیق کے ذریعے سے بہت سے عناصر کی تفہیم اور وضاحت ممکن ہے۔

کتابیات

- صدیقی،ابواللیث۔ آج کا اردو ادب ۔ علی گڑھ: بھارت ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۹۸ء
- فاروقی،احسن۔ناول کیا ہے۔ لکھنو: دانش محل 1951ء
- فاروقی،احسن۔اردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔ لکھنو: ادارہ فروغ اردو، 1962ء
- احمد،اشتیاق۔کلچر منتخب تنقیدی مضامین۔لاہور: کتاب سرائے 2023ء
- احمد، عقیل۔ اردو ناول اور تقسیم ہند۔دہلی: ماڈرن پبلی کیشن ہاؤس، 1987
- آفاقی،اقبال۔ مابعد جدیدیت(اصطلاحات اور معانی تعبیرات و تشریحات)،اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن ،2018ء
- اقبال،طاہرہ۔ گراں ۔اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 2019ء
- اقبال،طاہرہ۔ نیلی بار ۔اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز،اشاعتِ دوم 2020ء
- احمد،انوار۔اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ۔اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان
- پاشا،انور۔ہندو پاک میں اردو ناول کا تقابلی مطالعہ۔ نئی دہلی: انیس پبلشرز، 1992ء
- سدید،انور۔اردو افسانے کی کروٹیں ۔لاہور: مکتبہ عالیہ،،۱۹۹۱ء
- بٹ، محمد عاصم۔ بھید۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔2018ء۔
- بٹ، محمد عاصم۔دائرہ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2014ء
- بدایونی، ضمیر۔مابعد جدید یت کا دوسرا رخ ۔ کراچی: شہرزاد پبلشرز، 2006ء۔ی: شہرزاد پبلشرز، 2006ء۔
- بیگ، مرزااطہر۔غلام باغ۔لاہور: الحمد پبلی کیشنز۔اشاعت ہفتم۔2021ء
- تارڑ، مستنصر حسین۔خس و خاشاک زمانے ۔لاہور: سنگ میل پبلشرز 2017ء
- تارڑ، مستنصر حسین۔شہر خالی کوچہ خالی۔لاہور: سنگ میل پبلشرز۔2020ء
- تھامس، ہنری۔ تاریخ و تمدن۔ مترجم (مولانا شبلی نعمانی) کراچی: بک ٹائم 2013ء
- بیگ، مرزاحامد۔اردو افسانے کی روایت۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۱ء
- بیگ، مرزاحامد۔افسانے کامنظر نامہ۔لاہور: مکتبہ عالیہ
- حسن، سید حامد۔ہندو فلسفہ مذہب اور نظام معاشرت۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲ء

- حسن، محمد۔جدید اردو ادب۔دہلی: مکتبہ جامعہ ملیا طبع اول، 1975ء
- حسینی، علی عباس۔ناول کی تاریخ اور تنقید۔انڈس بک ڈپو، لکھنو، ۲۰۰۰ء
- حیات، افتخار۔ اردو ناول میں ترقی پسند عناصر۔لاہور: نسیم بک ڈپو، ۱۹۹۸ء
- حیدر، عقیل۔ انواسی کی کھوج میں۔ملتان: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ ملتان، 2022ء۔
- حیدر، قرۃ العین۔آخر شب کے ہم سفر۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2010ء
- اشرف، خالد۔برصغیر میں اردو ناول۔ فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۰۵ء
- خان، محمد حفیظ۔ ادھ ادھورے لوگ ۔ جہلم: بک کارنر شوروم، اشاعت دوم 2019ء
- خان، محمد حفیظ۔ انواسی ۔ جہلم: بک کارنر شوروم، اشاعت دوم دسمبر، 2019ء
- اعظمی، خلیل الرحمٰن۔اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء
- رضا سلیمی، اختر۔جا گے ہیں خواب میں ۔راولپنڈی: رومیل پبلشرز، نومبر 2022ء
- رضا سلیمی، اختر۔جندر ۔راولپنڈی: رومیل پبلشرز، فروری 2020ء
- ہمدانی، ریاض۔اردو ناول کا نوآبادیاتی مطالعہ۔ فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۸ء
- سالک، عبدالمجید۔مسلم ثقافت ہندوستان میں۔ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۷ء
- سرور، آل احمد (مرتبہ)۔اردو فکشن۔ علی گڑھ: ۱۹۷۳ء
- سعید، ایڈورڈ، مترجم: یاسر جواد۔ثقافت اور سامراج۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان۔2009ء
- اختر، سلیم۔اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،، ۱۹۸۱ء
- اختر، سلیم۔افسانہ حقیقت سے علامت تک۔لاہور: مکتبہ عالیہ، طبع اول، ۱۹۷۶ء
- سمٹیا، خالد محمود۔ اختر رضا سلیمی کے ناول مابعدنو آبادیاتی مطالعہ۔راولپنڈی: رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، 2020ء۔
- فضل، سمیں ثمر۔ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ۔اے ون فوٹو آفشینٹ، نمبر ۱۹۹۱، ۶ء
- نگار، سنبل۔اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ۔لاہور: مکتبہ یوسفیہ۔2019ء
- بخاری، سہیل۔اردو ناول نگاری۔مکتبہ جدید، لاہور، س۔ن
- عقیل، سید محمد۔جدید ناول کا فن۔الٰہ آباد: نیا سفر پبلی کیشنز،، ۱۹۹۶ء
- سید، ایڈورڈ۔ثقافت اور سامراج۔ مترجم: یاسر جواد۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،، ۲۰۱۰ء

- نواز، شاہد۔پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ (۱۹۴۷ءتا۲۰۰۷ء) فیصل آباد: مثال پبلیکیشنز، ۲۰۱۸ء،
- اعظمی، شہاب ظفر۔اردو ناول کے اسالیب۔دہلی: تخلیق کار پبلیشرز،۲۰۰۶ء
- شہزادی، کومل۔ بازگشت۔(تحقیقی و تنقیدی مضامین): اسلام آباد: ادب سماج انسانیت پبلی کیشنز 2023ء
- زریں، صالح۔اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، (ابتداءسے ۱۹۴۷ء تک)۔الہ آباد : سرسوتی پریس، الہ آباد، ۲۰۰۰ء
- زریں، صالحہ۔اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ۔الٰہ آباد: ادارہ نیا سفر، ۲۰۰۰ء
- صدیقی، عظیم الشان۔اردو ناول آغاز و ارتقاء۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس ۲۰۰۸ء
- افراہیم، صغیر۔اردو فکشن فن تنقید و تجزیہ۔علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء
- افراہیم، صغیر۔اردوکا افسانوی ادب(تحقیقی و تنقیدی مضامین)۔مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ، ۲۰۱۰ء
- الطاف، راحیلہ۔ اردو ناول میں ماں باالطبیاتی عناصر۔ 1947ء کے بعد۔لاہور: مجلس ترقی ادب، 2018ء
- ظفر، سعید۔ تقسیم ہند اور اردو افسانہ۔پٹنہ، بھارت، ۲۰۰۰ء
- عبدالسلام۔اردو ناول بیسویں صدی میں۔کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، 1973ء
- علی، عبداللہ یوسف۔انگر یزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ۔لاہور، دوست ایسوسی ایشن، 2004ء
- عدیل، جمیل احمد۔اردو افسانہ،نقشِ تنقید۔راولپنڈی: صریر پبلی کیشنز، ، ۲۰۲۰ء
- زرین، عفت۔فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانیں۔مطبع مرکزی پرنٹر، دہلی، ۱۹۹۲ء
- حسینی، علی عباس۔ناول اور ناول نگار۔ملتان: کاروانِ ادب 1990ء
- عمران، میاں شاہد۔نیلی بار کا تجزیاتی مطالعہ۔مشمولہ: اردو ناول کی روایت تنقید اور تجزیہ و تلخیص۔مولف نثار دانش۔لاہور: ورلڈ ویو پبلشر 2022ء
- احمد، غفور۔ نئی صدی نئے ناول۔لاہور: دلنوادر، 2014ء
- فاروق، عثمان۔اردو ناول میں مسلم ثقافت۔ملتان: بیکن ہاؤس ۲۰۰۲ء

پوری، فرمان فتح۔اردو افسانہ اور افسانہ نگار۔کراچی: اردو اکیڈمی سندھ۔۱۹۸۲ء

- فرزانہ، نیلم۔اردو ادب کی خواتین ناول نگار ۔لاہور: فکشن ہاوس 1992ء

- پوری، فرمان فتح۔ اردو نثر کا فنی ارتقاء۔لاہور:الوقار پبلیکیشنز۔۱۹۹۷ء
- پوری، فرمان فتح۔ اردو افسانہ اور افسانہ نگار۔اردو:اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۸۲ء
- فیاض، محمود(مرتب)۔ تاریخ ادبیات پاکستان و ہند۔جلد نہم،لاہور:پنجاب یونیورسٹی، س۔ن
- کاظمی، کامران عباس۔ اردو ناو ل میں عصر یت۔لاہور:الوقار پبلشرز۔2023ء۔
- نارنگ، گوپی چند، ارتضیٰ کریم، اسلم جمشید پوری۔آزادی کے بعد اردو افسانہ (جلد اول) ترتیب ۔نئ دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۲۰۰۹ء
- علی، مبارک۔پاکستانی معاشرہ۔لاہور: فکشن ہاؤس، 2020ء۔
- فاروقی، محمد احسن۔اردو ناول کی تنقید۔لاہور: اکیڈمی۔۱۹۵۱ء
- اشرف، محمد۔ہندوستانی معاشرہ عہد وسطی میں۔مترجم۔لاہور: قمرالدین، فکشن ہاؤس، ۔۱۹۹۱ء
- بٹ، محمد افضال۔اردو ناول میں سماجی شعور۔اسلام آباد: پورب اکادمی۔۲۰۱۵ء
- تارڑ، مستنصر حسین۔قلعہ جنگی۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز2008ء
- خان، ممتاز احمد۔ آزادی کے بعداردو ناول ہیئت، اسالیب اور رجحانات۔کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان 1997ء
- خان، ممتاز احمد۔اردو ناول کرداروں کا حیرت کدہ۔کراچی: فضلی پبلشرز،۔۲۰۱۵ء
- خان، ممتاز احمد۔اردو ناول کے چند اہم زاویے۔کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۳۔ء
- خان، ممتاز احمد۔اردو ناول کے بدلتے تناظر۔مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، طبع ثانی: اپریل۔۲۰۰۷ء
- کنڈیرا، میلان۔ناول کا فن(مکالمے اور دیگر نگارشات) ۔محمد عمیر میمن(مترجم)، کراچی: شہرزاد۔2013ء
- نارنگ، چند گوپی۔اردو ما بعد جدیدیت پر مکالمہ۔دہلی اردو اکادمی دہلی، 1998ء
- ناطق، علی اکبر۔نو لکھی کو ٹھی۔جہلم: بک کارنر شوروم۔اشاعت ہفتم 2021ء
- قمر، ناہید۔اردو فکشن میں وقت کا تصور۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان۔۲۰۰۰ء
- احمر، نسیم عباس۔اردوافسانے کے نظری مباحث: تنقیدی تجزیہ۔فیصل آباد: مثال پبلشرز2005ء
- نواز، طاہر۔شہر مرگ۔ روالپنڈی: اوزونک پبلشرز، 2020ء
- نواز، شاہد۔پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ 1947ءتا 2007ء۔فیصل آباد: مثال پبلشرز2018ء
- اشرفی، وہاب۔اردو فکشن اور تیسری آنکھ۔دہلی: ایجوکیشنل ہاؤس، 1998ء
- یعقوب، قاسم۔فرد، سماج اور تہذیبی تجربہ۔کراچی: بک ٹائم 2017ء

- سرونجی، سیفی۔اکیسویں صدی میں اردو ناول۔لاہور: کتابی دنیااردو بازار،2022ء

ژاں،فرانسوالیوتار،مترجم اصغر بشیر۔علم پر ایک رپورٹ /مابعد جدید صورت حال۔کراچی: سٹی بکس 2022ء

- بیدی،کے۔ایس۔۔تین ہندوستانی زبانیں ۔دہلی: کتب خانہ انجمن اردو، ص۔ن
- احمد،ندیم۔ ترقی پسند جدیدیت، مابعد جدیدیت ۔دہلی:2015ء
- قمر، جمیل۔ اردو ادب کی سرحدیں (جلد اول)۔کراچی مکتبہ دریافت 2000ء
- سعید،ایڈورڈ،مترجم،یاسر جواد۔ ثقافت اور سامراج ۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان 2009ء
- زمان، فخر۔پنجاب، پنجابی اور پنجابیت۔لاہور: الحمد پبلی کیشنز 2003ء
- اشرفی،وہاب۔ تاریخ ادب اردو (ابتداء سے 2000ء تک) جلد دوم۔دہلی: ایجو کیشنل پبلشنگ ہاوس۔ 2007ء

English Books

- Lyotard J F.The Postmodern Condition : A Report on Knowlge. Manchester University‹Press 1984.
- Akbar S.Ahmad,Post Modernism and Islam ,Landon ,Routledge,1992
- Dictoinory and Literary Terms and Literary Theories ,J.A.Cuddon ,London ,Penguin Books ,1998
- Ziauddin Sardar, Postmodernism and the Other, 1998
- Robertson or in global modernisations furtherment strong ATL eds state publisher 1995
- Anthony Glidden's, The Consequences of Modernity, Stanford University Press, 1990,

رسائل

- ماہنامہ آجکل (شعبہ نشرواشاعت حکومت ہند) دہلی نومبر 2011ء
- سہ ماہی ادبیات۔ناول نمبر۔اسلام آباد،2020ء
- روپ۔کراچی: جولائی1987ء
- ترجیحات ۔دہلی: ورلڈاردوایسویشن
- متن۔بہاولپور: شعبہ اوردواسلامیہ یونیورسٹی2022ء
- معیار اسلام آباد: شعبہ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی 2021ء

ویب گاہ:

- www. Humsub.com.pk
- www. Wikipedia.com
- www. ur.englishlib.org